مکالماتِ افلاطون

(جلد اوّل)

مترجم

پروفیسر اے ڈی میکن

مقتدرہ قومی زبان ★ پاکستان

مکالماتِ افلاطون

(جلد اوّل)

مترجم

پروفیسر اے ڈی میکن

مقتدرہ قومی زبان ☆ پاکستان

۲۰۰۷ء

پیش لفظ

وطنِ عزیز میں علم وحکمت اور عقل ودانش کی روایات کو فروغ دینے کی خاطر مقتدرہ قومی زبان کے شعبۂ درسیات نے اپنے نئے ترقیاتی منصوبے ''سائنسی، تکنیکی وجدید عمومی موادِ خواندگی کی قومی زبان (اُردو) میں تیاری'' میں فلسفہ ونفسیات کے بنیادی تصورات پر مبنی دائمی اہمیت کی کتابوں کے اُردو تراجم کی اشاعت کا اہتمام کیا ہے۔ ''مکالماتِ افلاطون (چھ جلدیں)'' اِس سلسلۂ کتب کی پہلی کڑی ہیں۔ ''مکالمات افلاطون'' ایک اعتبار سے دُنیائے انسانیت کو مسلمانوں کی عطا ہے۔ یہ مسلمان اہلِ علم ہی تھے جنھوں نے پہلے پہل یونانی دانش کو عربی زبان میں منتقل کیا، اُسے ردوقبول کی چھلنی سے گزارا اور اُس پر تحقیقی، تنقیدی اور تجزیاتی کتابیں لکھیں۔ مسلمانوں کے یہ علمی کمالات پہلے پہل لاطینی زبان میں اور پھر لاطینی سے مختلف مغربی زبانوں میں منتقل ہو کر مغربی علم ودانش کا سب سے بڑا سرچشمہ بن گئے۔

افلاطون (۴۲۷-۳۴۷ قبل از مسیح) ایتھنز کی اشرافیہ کا ایک نامور فرد تھا۔ اِس کا دورِ حیات معاشرتی اور سیاسی بے چینی کا دور تھا۔ افلاطون اوّل اوّل سیاسی عزائم کا حامل تھا مگر جب سن ۳۹۹ قبل از مسیح میں عہد کے عظیم ترین مفکر اور اُستاد ارسطو کو سزائے موت دی گئی تو افلاطون ایتھنز کو خیر باد کہہ کر مدت تک یہاں وہاں پناہ کی تلاش میں سرگرداں رہا۔ وہ یونان، مصر، اٹلی اور سسلی وغیرہ میں مارا مارا پھرتا رہا اور بالآخر ۳۸۷ قبل از مسیح میں اُس نے واپس ایتھنز آ کر سائنس اور فلسفہ میں ریسرچ کی خاطر اکادمی قائم کی۔ ''مکالماتِ افلاطون'' اِسی دور کی یادگار ہے۔ ترقیاتی منصوبے کے تحت مقتدرہ قومی زبان یونانی دانش کے اِس عظیم شاہکار کی چھ کی چھ جلدوں کو پہلی بار اُردو دُنیا کی نذر کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہے۔ اُمید ہے کہ اِن مکالمات کی اشاعت ہمارے ہاں عقل ودانش کے فروغ میں نمایاں کردار ادا کرے گی۔

——— **پروفیسر فتح محمد ملک**

فہرست

☆☆☆

کارمیڈس یا اعتدالِ ذات

(Charmides or Temperance)

شرکائے گفتگو:

سقراط (Socrates) (جو راوی ہے)؛ **کارمیڈس** (Charmides)؛

چیریفون (Chaerephon)؛ **کرائیٹیاس** (Critias)

(منظر: شہنشاہ آرکون (Archon) کی بارہ دری سے بالکل قریب ٹاریاس کا اکھاڑا)

کافی عرصے کے بعد جب میں گزشتہ شام پوٹیڈیا (Potidaea) کی فوج کے پڑاؤ سے واپس آیا تو میں نے سوچا کہ مجھے اپنے ٹھکانوں پر ایک نظر ڈال لینی چاہیے۔ یہ سوچ کر میں شہنشاہ آرکون کی بارہ دری سے متصل عبادت گاہ کے بالکل سامنے واقع ٹاریاس (Taureas) کے اکھاڑے کی جانب چل دیا۔ وہاں لوگوں کی ایک کثیر تعداد موجود تھی جن میں سے کچھ کو تو میں جانتا تھا جبکہ ان میں سے کچھ لوگ میرے لیے اجنبی تھے۔ چونکہ میں اچانک وہاں پہنچا تھا اس لیے جونہی میں نے اکھاڑے میں قدم رکھا لوگ بے اختیار اپنی اپنی جگہ پر کھڑے ہو گئے اور دور ہی سے ہاتھ اٹھا کر مجھے سلام کرنے لگے ان ہی لوگوں میں سے کسی حد تک ذہنی طور پر کھسکا ہوا چیریفون نامی ایک شخص میری جانب لپکا اور میرا بازو پکڑ کر کہنے لگا۔

سقراط! تم کیسے بچ نکلے ہو؟

(میں یہاں یہ بات بتا تا چلوں کہ ہمارے آنے سے کچھ عرصہ قبل پوٹیڈیا میں ہمیں ہلاک کرنے کی سازش تیار کی گئی تھی لیکن اس کی اطلاع حال ہی میں ایتھنز پہنچی تھی)۔

میں نے جواب دیا، تم دیکھ لو میں یہاں ہوں۔

وہ بولا، ہمیں تو اطلاع ملی تھی کہ یہ جھڑپ خاصی شدید تھی جس میں ہمارے بہت سے ساتھی مارے گئے تھے۔

میں نے جواب دیا، ہاں اس اطلاع میں بڑی حد تک صداقت ہے۔

اس نے کہا، میرا خیال ہے آپ بھی وہاں موجود تھے؟

ہاں، میں نے کہا۔

وہ بولا، پھر آپ یہاں بیٹھو اور ہمیں اس واقعے سے متعلق تمام تفصیلات سناؤ جو ہم نے ابھی تک پوری طرح نہیں سنیں۔

اس نے مجھے کالسچیرس (Callaeschrus) کے بیٹے کرائیٹیاس کے پہلو میں بیٹھنے کو کہا، میں وہاں بیٹھ گیا۔ سب کو سلام کرنے کے بعد میں نے واقعات بیان کرنے شروع کیے۔ میں نے انھیں فوج کے بارے میں خبریں پہنچائیں اور ان کے متعدد سوالات کے جوابات دیئے۔

جب میں بہت کچھ بتا چکا تو میں نے ان سے ان کے گھر کے حالات سے متعلق پوچھا اور پھر بہت سے نوجوانوں نے فلسفے اور موجودہ حالات و معیار کے بارے میں سوالات کیے۔ جن کے میں جوابات دیتا رہا۔ پھر میں نے لوگوں سے پوچھا کہ کیا اس مجمع میں کوئی ایسا نوجوان ہے جس کے جمال و کمال دونوں کو مرکز توجہ بنایا جا سکے۔ اس موقع پر کرائیٹیاس نے میری توجہ سامنے سے دروازے میں داخل ہوتے ہوئے ان نوجوانوں کی جانب مبذول کروائی جو آپس میں اونچی آواز میں باتیں کر رہے تھے اور ان کے پیچھے پیچھے لوگوں کا ایک جم غفیر بھی چلا آ رہا تھا۔

پیکر جمال سقراط، اس نے مجھے کہا کہ مجھے یقین ہے کہ آپ خود بہت جلد اس بات کو خود پرکھنے کے قابل ہو جائیں گے۔ پھر اس نے بتایا کہ جو لوگ ادھر چلے آ رہے ہیں وہ اس خوبصورت ترین شخص کے محافظوں میں سے ہیں جو اتنا حسین ہونے کے باوجود بھی آپے سے باہر نہیں ہوا۔

میں نے پوچھا، وہ کون ہے؟ اور کس کا بیٹا ہے؟

کرائیٹیاس نے جواب دیا کہ اس کا نام کارمیڈس ہے اور وہ میرا چچا زاد بھائی ہے۔ میرے چچا گلوکون (Glaucon) کا بیٹا، میرا خیال ہے آپ بھی اسے جانتے ہوں گے لیکن جب آپ یہاں سے گئے تھے تب وہ اتنا جوان نہ تھا۔

میں نے کہا، یقیناً میں اسے جانتا ہوں کیونکہ بچپن میں بھی وہ منفرد ہی تھا اور میرا خیال ہے کہ اب وہ ایک خوبصورت جوان ہوگا۔

وہ بولا، آپ کچھ ہی دیر میں خود دیکھ لیں گے کہ وہ کیسا ہے اور ان گزشتہ سالوں میں اس کے حسن اور

شخصیت میں کتنا نکھار آیا ہے۔ اس نے ابھی اپنی بات پوری ہی کی تھی کہ کارمیڈس اندر داخل ہوا۔

میرے دوست تم جانتے ہو کہ میں اس عمر میں معیار حسن کو جانچنے سے قاصر ہوں۔ میری نظروں میں تو اب تمام نوجوان حسین دکھائی دیتے ہیں مگر جب میں نے اسے داخل ہوتے ہوئے دیکھا تو میں یہ اعتراف کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتا کہ میں اس کی وجاہت اور خوبصورتی کو دیکھ کر ورطۂ حیرت میں ڈوب گیا۔ گویا پوری کائنات اس کی خوبصورتی کے سحر میں گرفتار تھی۔ جیسے ہی وہ اکھاڑے میں داخل ہوا، وہاں پر موجود ہر شخص اس سے متاثر نظر آ رہا تھا۔ اس کے دیوانوں کا ایک ٹولا اس کے پیچھے پیچھے چلا آ رہا تھا۔ میری طرح بڑی عمر کے دوسرے لوگ بھی اس سے متاثر نظر آتے تھے۔ میرے خیال میں یہ کوئی حیران کن بات نہ تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ جوان لڑکوں کے احساسات بھی کچھ ایسے ہی تھے۔ یہاں تک کہ کم عمر بچے بھی اسے مسلسل یوں دیکھ رہے تھے جیسے وہ کوئی جیتا جاگتا انسان نہیں بلکہ کسی بیش قیمت دھات سے ڈھالا گیا کوئی حسین مجسمہ ہو۔

چیریفون نے مجھے مخاطب کر کے کہا۔

سقراط، اب بتاؤ تمھارا اس شخص کے بارے میں کیا خیال ہے؟

کیا وہ ایک خوبصورت شخصیت کا مالک ہے؟

نہایت حسین! میں نے جواب دیا۔

ہاں تم صرف اس کے حسین چہرے ہی کی بات نہ کرو اس کا پورا وجود ہی حسین اور کامل شخصیت ہے۔

اس بات پر وہ سب متفق تھے۔

میں نے کہا۔ ہراکلس (Heracles) کی قسم، اس کامل ہیرے کا کوئی ثانی نہیں ہے اگر اس میں ایک اور چیز کا اضافہ ہو جائے۔

کرائیٹیاس نے کہا۔ وہ کیا ہے؟۔

میں نے کہا، حسین جسم کے ساتھ ایک حسین روح، اور مجھے یقین ہے کہ تمھارے خاندان کا فرد ہونے کی وجہ سے اسے حسین و جمیل روح کا مالک بھی ہونا چاہیے۔

کرائیٹیاس نے اس کے جواب میں کہا۔ یقین کیجیے اس کا باطن بھی اس کے ظاہر کی طرح صاف و شفاف ہے۔

پھر تو ہمیں اس کے جسمانی حسن سے پہلے گفتگو کے ذریعے اس کے باطنی جمال کا نظارہ کر لینا

چاہیے۔اس عمر کے لوگوں کے لیے گفتگو یقیناً پسندیدہ ترین چیز ہے۔

کرائیٹیاس بولا، یقیناً،ایک اور بات سنیے وہ نہ صرف ایک فلسفی ہے بلکہ لوگوں میں وہ ایک شاعر کی حیثیت سے بھی جانا پہچانا جاتا ہے۔

میں نے کہا، ہاں میرے عزیز کرائیٹیاس۔یہ تو تمھارے خاندان کا قدیم امتیاز ہے جو تمھیں سولون(Solon) سے وراثت میں حاصل ہوا ہے۔تم اسے بلاؤ اور اس سے ہمیں متعارف کراؤ۔اگرچہ وہ باوجود اس کے کہ ایک نوجوان ہے(اسے ہمارے ساتھ بات چیت کرنے میں کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے، خصوصاً تمھاری موجودگی میں کیونکہ تم اس کے چچازاد اور سرپرست ہو۔

بہت خوب، وہ بولا۔ٹھیک ہے۔میں اسے بلا لیتا ہوں۔

اس کے ساتھ ہی اس نے خادم کو کہا کہ وہ کارمیڈس کو بلا لائے اور اسے یہ بتائے کہ میں اسے اس کی بیماری کے سلسلے میں ایک طبیب سے ملوانے کے لیے بلا رہا ہوں جس کا اس نے پرسوں ذکر کیا تھا۔پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔

وہ کئی روز سے اس بات کی شکایت کر رہا تھا کہ جب وہ صبح سو کر اٹھتا ہے تو وہ سر میں شدید درد محسوس کرتا ہے۔آپ اسے اس بات پر قائل کر لیں کہ آپ اس کے سر درد کا علاج کر سکتے ہیں۔

کیوں نہیں، میں نے جواب دیا، کیا تمھیں یقین ہے کہ وہ آ جائے گا۔

اس نے جواب دیا، ہاں وہ یقیناً آئے گا۔

وہ ہمارے بلانے پر آ گیا اور میرے اور کرائیٹیاس کے درمیان بیٹھ گیا۔اس کے ہماری جانب آنے پر وہاں قطار میں موجود ہر شخص نے اپنے قریب بیٹھے شخص کو زور سے دھکیل کر اس کے لیے اپنے پہلو میں جگہ بنانے کی کوشش کی حتیٰ کہ قطار کے دونوں کناروں پر سے ایک ایک شخص کو اٹھنا پڑا جبکہ دوسرا اس کوشش میں لڑھک گیا۔اب میں اور میرا دوست خود کو کمتر محسوس کر رہے تھے۔اس کو دیکھ کر میرا تو یہ عالم تھا کہ خوبصورت گفتگو کرنے کا میرا سارا گھمنڈ نہ جانے کہاں غائب ہو گیا اور جب کرائیٹیاس نے اس کا مجھ سے تعارف کرایا اور بتایا کہ میں ہی وہ شخص ہوں جس کے پاس اس کی بیماری کا علاج ہے تو اس نے نظر بھر کر مجھے اس انداز میں دیکھا کہ میں اپنی حالت کو الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا۔وہ مجھ سے بات کرنے ہی والا تھا کہ اس وقت اکھاڑے میں موجود تمام لوگ ہمارے آس پاس جمع ہو گئے اور جیسے ہی میری نظر اس کے لباس کے پیچھے دمکتے جسم پر پڑی تو میری نگاہوں میں ایک شعلہ سا لپکا اور میں بے خود سا ہو گیا۔اس وقت مجھے سیڈیاس(Cydias) کے درج

ذیل الفاظ یاد آ گئے جو اس نے محبت کے حوالے سے کہے تھے۔

''اگر ہرن کے بچے کو شیر کے سامنے لاؤ گے تو شیر یقیناً اسے نگل جائے گا۔''

تب میں نے اپنے وجود میں کسی درندے جیسی ہولناک کیفیت طاری ہوتی ہوئی محسوس کی۔ لیکن میں نے جلد ہی خود پر قابو پالیا۔ تاہم جب اس نے اپنی بیماری کے علاج کے سلسلے میں مجھ سے سوال کیا تو نہ جانے کیسے میں اپنے حواس کو اس کا جواب دینے کے لیے مجتمع کر پایا۔

اس نے پوچھا، میری بیماری کا علاج کیا ہے؟

میں نے یونہی بات بناتے ہوئے کہا کہ اس کا علاج ایک خاص قسم کے پتے ہیں جن کے ساتھ ایک منتر بھی پڑھنا پڑتا ہے ورنہ محض پتے ناکافی اور بے کار ثابت ہوتے ہیں۔

وہ بولا، پھر تو آپ وہ منتر مجھے لکھوا دیجیے۔

میں نے کہا، کیا تم وہ منتر میری اجازت سے استعمال کرنا چاہتے ہو یا بلا اجازت؟

یقیناً! جناب میں اس منتر کو آپ کی اجازت سے ہی استعمال کروں گا۔

بہت خوب! تمھیں میرا نام کیسے معلوم ہوا۔ میں نے پوچھا۔

وہ کہنے لگا، جناب اس میں حیرانی کی کوئی بات نہیں۔ میرے دوست احباب ہر وقت آپ ہی کا تذکرہ کرتے رہتے ہیں اور ویسے بھی میں بچپن میں اپنے چچازاد کرائٹیاس کے ساتھ آپ سے مل چکا ہوں۔

میں نے تشکر آمیز لہجے میں کہا۔ مجھے یہ سن کر خوشی ہوئی کہ تم مجھے بھولے نہیں۔

ہاں اس سے مجھے یہ بھی فائدہ ہوگا کہ اب میں تم سے زیادہ بے تکلفی سے بات کرسکوں گا اور بیماری سے متعلق منتر کی تفصیل بھی آسانی سے بیان کرسکوں گا۔ دوسری صورت میں یہ میرے لیے اتنا آسان نہ ہوتا۔ دراصل اس منتر کا سر درد کے علاج کے علاوہ بھی فائدہ ہے۔ تم نے اکثر معالجین کو یہ کہتے سنا ہوگا کہ دکھتی ہوئی آنکھوں کے علاج کے لیے پہلے سر کا علاج کرنا ضروری ہے، اور سر کا علاج کیا جائے اور پورے جسم کو نظر انداز کر دیا جائے تو یہ بات بھی احمقانہ ہے۔ اسی استدلال کی بنا پر وہ اپنا طریق علاج تمام جسم پر بروئے کار لاتے ہیں اور پورے جسمانی اعضا کا ایک ساتھ علاج کرتے ہیں۔ کیا آپ نے کبھی اس بات پر غور کیا ہے کہ جو کچھ وہ کہتے ہیں اس کا مطلب یہی ہے؟

ہاں، اس نے کہا۔

وہ بالکل درست کہتے ہیں اور تمھیں بھی ان سے متفق ہونا چاہیے۔

بالکل ٹھیک۔اس نے کہا میرے اس سے متفق ہونے یا نہ ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔

اس کے مثبت جواب نے مجھے حوصلہ دیا اور اس سے میرے لہجے میں کافی گرمجوشی آ گئی۔ میں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ کارمیڈس میرے منتر کی بھی یہی صورت ہے۔ میں نے یہ منتر تھریشیان (Thracian) سے سیکھا جو شہنشاہ زیموکسس (Zamolxis) کے ذاتی معالجین میں سے تھا۔شہنشاہ کے ذاتی معالجین اس سلسلے میں اتنے ماہر تھے کہ انسان کو زندہ جاوید اور لافانی بنا دینے کا دعویٰ کرتے تھے۔تھریشیان نے یونانی حکما سے متعلق یہ بات بتائی اور یہ بھی بتایا کہ اگرچہ یہ بات اپنی جگہ قابل اعتنا ہے مگر شہنشاہ زیموکسس جو خود بھی ایک دیوتا ہیں اس میں یوں مزید اضافے کرتے ہیں کہ:

''جس طرح تم سر کے علاج کے بغیر آنکھوں کے علاج کو مناسب نہیں سمجھتے یا جسم کے علاج کے بغیر سر کے علاج کو بے سود سمجھتے ہو،اسی طرح سمجھ لو کہ جسم کا علاج روح کے علاج کے بغیر بے فائدہ ہے۔''

اور اس نے اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا کہ اسی وجہ سے ہیلاز (Hellas) کے طبیب ''کل'' سے واقفیت کی بنا پر ابھی تک بہت سے عوارض کے علاج سے آشنا نہیں اور کوئی بھی عضو اس وقت تک صحیح نہیں ہو سکتا جب تک کہ پورا جسم روبہ صحت نہ ہو۔ کیونکہ تمام اچھائی یا برائی خواہ جسم سے متعلق ہو یا فطرت انسانی سے متعلق، روح ہی سے جنم لیتی ہے اور پھر وہ وہاں سے جسم میں داخل ہو جاتی ہے، بالکل ایسے ہی جیسے پورے جسم کی تکلیف آنکھوں سے ظاہر ہونے لگتی ہے۔ لہٰذا یہ امر طے شدہ ہے کہ سر یا جسم کے عوارض کا علاج بھی روحانی علاج میں ہی ڈھونڈنا پڑے گا جو درحقیقت علاج کا پہلا مرحلہ ہے۔

عزیز من! اس علاج کو مزید تقویت دینے کے لیے منتروں کی ضرورت پڑتی ہے جو غیر مبہم الفاظ ہیں جنھیں روح کی پاکیزگی اور کے لیے استعمال کیا جاتا ہے اور جب روح کے وظائف میں ایک بار اعتدال پیدا ہو جائے تو صحت مند ہونے کا عمل خواہ جسم سے متعلق ہو یا سر سے متعلق، جلد سے جلد تر ہونے لگتا ہے اور جس نے مجھے یہ علاج اور منتر سکھایا تھا، اس نے مجھے سختی سے یہ تاکید بھی کی تھی کہ:

خبردار۔تم کسی کے سردرد کا علاج اس وقت تک شروع نہ کرنا جب تک کہ وہ شخص اپنی روح کو منتروں کے ذریعے علاج کے لیے تمھارے حوالے نہ کر دے، کیونکہ ہمارے عہد کے طبیبوں کی یہی سب سے بڑی خامی ہے کہ وہ روح اور جسم کو الگ الگ سمجھتے ہیں۔

اور اس نے مجھ سے یہ حلف بھی لیا کہ خواہ کوئی شخص کتنا ہی معزز اور دولتمند کیوں نہ ہو تم منتر کے بغیر

ہرگز اس کا علاج نہ کرنا اور بولا میں یہ صاف اشارہ کرتا ہوں اس لیے میں تمہارا علاج اسی صورت میں کر سکتا ہوں جب تم پہلے مجھے منتر پڑھنے کی اجازت دو تاکہ پہلے روح کا علاج ہو جائے اور اس کے بعد میں بہت آسانی سے تمہارے سر کا علاج کرسکوں گا اور اگر تم نے اس کی اجازت نہ دی تو عزیزم کارمیڈس مجھے نہیں معلوم کہ میں تمہاری مدد کیسے کرسکتا ہوں؟

کرائیٹیاس نے جب یہ سنا تو پوچھا کہ:

اگر میرے نوجوان دوست کو سر درد کے بہانے اپنی ذہنی کیفیت کو بہتر بنانے کا موقع ملا ہے تو گویا سر درد بھی اس کے لیے ایک غیر متوقع نعمت ہی ہوگا اور جناب سقراط، کیا آپ کو یقین ہے کہ جیسے میرے عزیز کا جسمانی حسن میں کوئی ثانی نہیں ہے اسی طرح اس منتر کو پڑھنے کے بعد وہ خصائص اور اعتدالِ ذات کے لحاظ سے بھی منفرد ہو جائے گا؟

جی ہاں! مجھے یقین ہے۔ میں نے جواب دیا۔

میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ کارمیڈس نہ صرف اعتدالِ ذات کے اعتبار سے بلکہ دیگر انسانی خصائص کے اعتبار سے بھی اپنے ہم عمروں میں منفرد ہوگا۔

ہاں کارمیڈس یقیناً میرے خیال میں تم میں بہت سی خوبیاں ہیں اور میں بلا مبالغہ یہ کہہ سکتا ہوں کہ ایتھنز میں آپ دونوں یعنی کارمیڈس اور کرائیٹیاس کے خاندان کی شرافت کی کوئی دوسری مثال موجود نہیں۔ تمہارا خاندان ڈروپیڈاس (Dropidas) کے بیٹے کرائیٹیاس کی نسل سے ہے جس کے قصیدے مشہور یونانی شاعر اناکریون (Anacreon) کے کلام میں ملتے ہیں۔ اس کے علاوہ سولون اور دیگر کئی شعرا بھی ان کے خصائص حسنہ اور دولت و ثروت کے مداح ہیں اور اسی طرح تمہاری ماں کا خاندان بھی اتنا ہی معزز ہے۔ تمہارے ماموں پائری لیمپس (Pyrilampes) کا بھی کوئی ثانی نہیں۔ جسمانی وجاہت اور اخلاقی حسن کی بدولت اس کی شہرت نہ صرف ایران (Persia) بلکہ پورے ایشیا میں جہاں جہاں اس نے سفارت کے فرائض انجام دیئے، تھی۔ ایسے آباؤاجداد کی اولاد ہونے کے باعث تمہارے خاندان کا ہر فرد ایک سے بڑھ کر ایک ہے۔ ایسے آباؤاجداد کی اولاد کو ایسا ہی ہونا چاہیے جیسے تم ہو اور گلوکون کے عزیز بیٹے تمہاری ذات اور کردار سے تمہارے اجداد کے مرتبے کا اندازہ ہوتا ہے۔ اگر تمہارے جسمانی حسن میں تمہاری شخصیت کا اعتدال بھی شامل ہو جائے اور اگر تم واقعی ایسے ہو جیسے کہ کرائیٹیاس نے تمہارے بارے میں کہا ہے تو یقین کرو تم پر خدا کا خاص کرم ہے اور عزیزم کارمیڈس یہ اس لیے ہے کہ تم ایک باوقار خاتون کے بیٹے ہو۔ اگر تم کرائیٹیاس کے

خیال کے مطابق ظاہری حسن کے ساتھ ساتھ متوازن شخصیت کے حامل ہوتو حقیقت یہ ہے کہ واقعی تمھیں کسی منتر(Charm) کی ضرورت نہیں اور تم براہ راست سر درد کا علاج کرواسکتے ہو۔ لیکن اگر تم نے اعتدالِ ذات کا مطلوبہ معیار حاصل نہ کیا تو مناسب یہی ہے کہ دوا دینے سے پہلے مجھے منتر استعمال کرنے دو۔ براہ کرم تم کرائیٹیاس کے بیان کی خود تصدیق کرو کہ تم ضبط نفس یا اعتدالِ ذات کے حامل ہو یا نہیں؟

کارمیڈس یہ سن کر تھوڑا سا شرمایا اور حقیقتاً اس شرماہٹ نے اس کے جوان حسن کو چار چاند لگا دیئے۔ تب اس نے کہا کہ شاید وہ فوری طور پر ہاں یا نہ کہنے کی پوزیشن میں نہیں۔ اس لیے کہ اگر وہ اپنے معتدل مزاج ہونے سے انکار کرے تو کرائیٹیاس اور دوسرے مداحوں کی بات گویا جھوٹ ثابت ہوگی، جس کی وہ جسارت نہیں کرسکتا اور اگر وہ دعویٰ کرے کہ واقعی اس کی شخصیت معتدل مزاج کی حامل ہے تو یہ اپنی تعریف وتوصیف ہوگی جو کسی بھی لحاظ سے قابلِ تعریف نہیں۔ ایسے میں وہ کہے تو کیا کہے! میں نے اس کا جواب سن کر کہا۔

یہ بہت مناسب اور فطری جواب ہے۔ کارمیڈس یہ مناسب ہوگا کہ میں اور تم مل کر اس بات کا سراغ لگائیں کہ وہ خوبی جس کی میں تلاش میں ہوں کیا واقعی تم میں ہے یا نہیں۔ اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ جو کچھ تم کہنا نہیں چاہتے اس کے بیان پر مجبور نہیں ہوگے اور مجھ پر بھی سر درد کی دوا کے غلط استعمال کا الزام نہیں آئے گا۔ البتہ اگر تم خاموش ہی رہنا چاہو تو کوئی حرج نہیں، میں تمھیں بولنے پر مجبور نہیں کروں گا۔ اس میں کوئی امر ایسا نہیں جسے میں بہتر خیال کروں، اس نے کہا کہ جہاں تک میرا تعلق ہے تمھیں اسی طرح کرنا چاہیے جسے تم اپنے لیے بہتر خیال کرتے ہو۔

میں نے کہا۔ میرا خیال ہے کہ میں اپنے کام کا آغاز ایک بنیادی سوال پوچھ کر کروں اور وہ سوال تمھارے اعتدالِ ذات سے متعلق ہے کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ اگر واقعی تمھاری شخصیت میں ضبط نفس ہے تو اس کے خواص کے بارے میں تمھاری واضح رائے ہونی چاہیے اور جس کے اظہار پر تمھیں قدرت بھی حاصل ہونی چاہیے۔ کیا خیال ہے ایسا ہے یا نہیں؟

اس نے کہا ہاں! میرا خیال ہے کہ ایسا ہی ہے۔

میں نے کہا۔ کیونکہ تمھیں مقامی زبان آتی ہے اس لیے تم اس زبان میں اپنی کیفیت کے اظہار پر بھی یقیناً قادر ہوگے۔

یقیناً، اس نے جواب دیا۔

میں نے سوال کو ذرا آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ اس سے پہلے کہ میں تمھاری شخصیت میں موجود

اعتدال ذات کے بارے میں کوئی فیصلہ کروں، ذرا یہ تو بتاؤ کہ تمہارے خیال میں ضبط نفس یا اعتدال ذات کا مفہوم کیا ہے؟

وہ ذرا سا ہچکچایا اور پھر بادل نخواستہ بولا۔ میرے خیال میں اعتدال ذات وہ قوت ہے جس سے انسان خاموشی سے تمام امور بہتر طریقے سے انجام دے سکتا ہے، خواہ وہ گلیوں میں خاموشی سے گشت کرنا ہو یا گفتگو جیسے عام امور۔ اگر میں اس کا مفہوم ایک لفظ میں بیان کرنا چاہوں تو میں اسے ''خاموشی'' یا ''سکوت'' کا نام دوں گا۔

میں نے کہا، کارمیڈس تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ اس میں شک نہیں کہ خاموش لوگوں کو معتدل مزاج قرار دیا جاسکتا ہے، مگر دیکھنا یہ ہے کہ کیا ان الفاظ کا کوئی واضح مفہوم بھی ہے اور یہ کہ کیا اعتدالِ ذات کو اچھے اور معزز افراد کی لازمی خصوصیت قرار نہیں دیا جانا چاہیے؟

جی ہاں، اور اگر تم مکتوب نویسوں کی درجہ بندی کرنا چاہو تو کیا تم آہستگی سے لکھنے والے کو ترجیح دوگے یا تیز لکھنے والے کو؟

تیز لکھنے والے کو، اس نے کہا۔

اور پڑھنے میں تم تیز رفتاری کو ترجیح دوگے یا سست روی کو؟

یقیناً تیز رفتاری کو۔

اور اسی طرح بربط بجانے یا کشتی چلانے وغیرہ میں بھی تم تیزی وتندی کو یقیناً خاموشی اور سست روی سے بہتر سمجھتے ہوناں؟

جی ہاں، اس کا جواب تھا۔

اور باکسنگ اور مکا بازی کے بارے میں تمہارے خیال میں یہی درست ہے؟

یقیناً!

میں نے پوچھا، اسی طرح تمہارے خیال میں چھلانگ لگانے اور دوڑ لگانے جیسی ورزشوں میں بھی عموماً تیزی اور پھرتیلا پن سستی، کاہلی اور آہستگی کے مقابلے میں بہتر ہے؟ جی ہاں، اس نے جواب دیا۔ ایسی صورت میں اگر توازن ذات مثبت صفت ہے تو جسمانی اعتبار سے ہمیں تیزی وتندی کو سستی، کاہلی اور خاموشی سے بلند تر درجے کا توازن ذات قرار دینا پڑے گا۔

اس بارے میں تمہارا کیا خیال ہے۔ اس نے جواب دیا، یہ حقیقت ہے۔

میں نے اس سے سوال کیا۔ سیکھنے میں سہولت بہتر ہے یا مشکلات، اس نے جواب دیا، یقیناً سہولت!

اور یہ بھی حقیقت ہے کہ سہولت کی وجہ سے سیکھنے کے عمل میں سرعت آتی ہے اور مشکلات اور رکاوٹوں کے باعث نتیجہ خاموشی اور سستی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ جی ہاں! اس نے اعتراف کیا۔

پس کیا دوسرے کو سرعت اور زیادہ توانائی کے ساتھ سکھانا، پڑھانا، ست رو اور آہستہ طریقے کے مقابلے میں بہتر نہیں ہے؟ اس کا جواب بھی اس نے اثبات میں دیا۔

اور کیا گزری ہوئی یادوں کو جلدی اور سہولت سے دہرانا بہتر ہے یا خاموشی و ست روی سے ایسا کرنا اچھا ہے؟ میں نے پوچھا۔ اس نے اول الذکر خوبی کو ہی بہتر گردانا۔

اور کیا ذہانت اور فطانت درحقیقت روح کی چستی و چالاکی کا نام ہے نہ کہ سکوت و خاموشی کا؟

اس پر بھی اس کا جواب مثبت تھا۔

اور کیا تحریر کرنے والے کو تحریر یا موسیقار کی موسیقی کے مفہوم کو فوراً سمجھنا ست فہمی سے بہتر نہیں ہے؟ میں نے استفسار کیا، اس کا جواب اب بھی اثبات میں تھا۔

اور کیا تحقیق و تدقیق اور روحانی معاملات میں غور و فکر کے اعتبار سے جس شخص کا مقصد تاخیر اور دقت سے حاصل ہوتا ہے، وہ قابل ستائش ہے یا وہ فرد جو اپنے مقصد میں جلد اور آسانی سے کامیاب ہو جاتا ہے؟ میں نے پوچھا اور اس بار اس نے مؤخر الذکر کے حق میں رائے دی۔

اور روح اور جسم کے معاملے میں کیا خیال ہے، کیا ہر دو صورتوں میں سرعت اور سرگرمی کو خاموشی اور میانہ روی پر فوقیت حاصل نہیں ہے؟ میں نے دریافت کیا۔ اس کا جواب تھا، یقیناً ایسا ہی ہے۔

اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ میانہ روی خاموشی نہیں ہے نہ ہی متوازن طبع شخص کا خاموش طبع ہونا لازم ہے، خصوصاً اس نقطۂ نظر کی بنا پر جس کے مطابق اعتدالِ ذات کو ایک مثبت خصوصیت قرار دیا گیا ہو، ایسی صورت میں ان دو متضاد باتوں میں سے ایک ہی وقت میں صرف ایک صحیح ثابت ہو سکتی ہے۔ ایسا یا تو بالکل ناممکن ہے یا بہت ہی شاذ و نادر ہوتا ہے کہ خاموشی سے کیے گئے کام تیزی اور پھرتیلے پن سے انجام دیئے گئے افعال کے مقابلے میں بہتر قرار دیئے گئے ہوں۔ اس میں شک نہیں کہ بہت سے خاموش افعال کو بہتر اعمال میں شمار کیا جا سکتا ہے تاہم اس تمام بحث سے یہی منطقی نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ توازن ذات کے سلسلے میں خاموشی، آہستگی اور ست روی سے انجام دیئے گئے امور کو کسی بھی صورت میں سرگرمی، مستعدی اور تیزی سے کیے گئے افعال کے مساوی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اس ضمن میں چلنے پھرنے جیسی جسمانی حرکات کی مثال دی جائے یا گفتگو جیسے ذہنی کام کی، مستعد زندگی ہی متوازن اور معتدل قرار پائے گی۔ جیسا کہ معتدل و متوازن

خیالات وجذبات کوانسانی شخصیت کے لیے ایک بہترین خوبی سمجھا جاتا ہے اسی طرح مستعدی، ہوشیاری اور تیزی بھی پسندیدہ خوبیاں قرار پاتی ہیں۔

کارمیڈس نے کہا۔میرا خیال ہے سقراط آپ درست کہہ رہے ہیں۔

سقراط نے کہا، کارمیڈس تم اپنی پوری توجہ سے اپنے دل میں جھانک کر دیکھو کہ اس توازن اور اعتدالِ ذات نے تمھاری شخصیت پر کیا اثرات مرتب کیے ہیں؟ اور اگر وہ اثرات ہیں تو ان کی نوعیت کیا ہے؟ اس پر پوری طرح غور کرو اور پھر ایک مضبوط نوجوان کی حیثیت میں مجھے بتاؤ کہ اعتدالِ ذات کیا ہے؟

اس نے ایک لمحے کے لیے ایک بالغ نظر شخص کے انداز میں سوچا اور پھر کہا۔

سقراط، اس سوچ بچار کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اعتدالِ ذات دراصل شرم وحیا اور پاک دامنی کا دوسرا نام ہے۔

میں نے کہا، بہت خوب، کیا اس سے یہ مطلب نہیں نکلتا کہ تمھارے خیال میں بھی اعتدالِ ذات ایک مثبت اور اعلیٰ صفت ہے؟ اس نے میرے خیال سے اتفاق کیا۔

میں نے اپنے سوال کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔اس طرح معتدل مزاج لوگوں کا شمار شرفا میں ہونا چاہیے۔

جی ہاں، اس نے سادگی سے اثبات میں جواب دیا۔

میں نے پوچھا کیا اس چیز کو اچھا قرار دیا جا سکتا ہے جو دوسروں کو اچھائی کی طرف مائل نہ کر سکے؟ اس نے کہا، ہرگز نہیں۔

اور تم اس سے یقیناً اس نتیجے پر پہنچے ہو گے کہ اعتدالِ ذات شریفانہ اور مفید خصوصیت ہے۔

اس نے اتفاق کرتے ہوئے کہا، میرا خیال ایسا ہی ہے۔

کیا تم ہومر (Homer) کی اس بات سے اتفاق کرو گے کہ:

''شرم وحیا ایک ضرورت مند فرد کے لیے مفید نہیں۔''

کارمیڈس نے کہا، ہاں مجھے معلوم ہے کہ یہ ہومر کا قول ہے۔

میں نے اس سے پوچھا، ایسی صورت میں شرم وحیا غیر فائدہ مند بھی ہو سکتی ہے۔

اس نے جواب دیا، واضح ہے۔

اس کے باوجود اعتدالِ ذات انسانوں کو صرف نیک ہی بناتی ہے، انھیں برائی کی جانب راغب نہیں کرتی۔

سقراط نے کہا، جیسا کہ تم کہتے ہو میرے نزدیک بھی یہ خصوصیت ہمیشہ اچھی ہی صورت میں ظاہر نہیں ہوتی ہے۔

اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اعتدالِ ذات پاکدامنی کا مترادف نہیں، اعتدالِ ذات نیکی ہے اور پاکدامنی اور شرم وحیا کبھی ٹھیک ہے تو کبھی غلط۔

بالکل درست، سقراط! یہ بات مجھے بہت معقول نظر آتی ہے لیکن میں یہ جاننا چاہوں گا کہ تم اعتدالِ ذات کی دوسری تعریف کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہو۔ مجھے یاد آرہا ہے کہ میں نے کسی سے یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ اعتدالِ ذات اپنے کام سے کام رکھنا ہے۔ کیا یہ بات درست نہیں ہے۔

او احمق، یہی سب کچھ تمھیں کرائیٹیاس اور دوسرے فلسفیوں نے بھی بتایا ہے؟ اتنے میں کرائیٹیاس بول اٹھا کسی اور نے کہا ہوگا۔ میں نے ایسی کوئی بات نہیں کہی۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ کس نے کہا ہے۔ اہم بات تو یہ ہے کہ بات درست ہے یا غلط؟

اس نے جواب دیا، ہاں سقراط۔ آپ کی یہ بات بالکل درست ہے۔

بہرحال، میرا نہیں خیال کہ ہم اس معما کا صحیح جواب دیں پائیں گے۔ میں نے کہا۔

اس نے پوچھا، آپ ایسا کیوں سوچتے ہیں۔

اس لیے کہ میرے خیال میں کہنے والا کہنا کچھ چاہتا تھا اور اس نے الفاظ کچھ اور استعمال کیے، مثلاً جب کوئی استاد کچھ لکھ یا پڑھ رہا ہو تو یہ کہنا کہاں تک درست ہے کہ وہ کچھ نہیں کر رہا۔

میں تو یہی کہوں گا کہ وہ کچھ نہ کچھ کر رہا ہے کیونکہ لکھنا پڑھنا ایک کام ہے اور اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

اور کیا تمھارا استاد صرف تمھارے نام لکھتا یا لکھواتا ہے یا تمھارے دوستوں اور دشمنوں کے بھی نام لکھتا ہے؟

اس نے کہا، دونوں کے۔

کیا اس میں کوئی غیر متوازی بات نظر آتی ہے؟

ہرگز نہیں۔

اور اگر لکھنا اور پڑھنا کوئی کام ہے تو کیا جو کچھ تم کر رہے ہو وہ صرف تمھارا کام ہے؟ مگر یہ سب کام ہی تو ہے۔

میرے دوست، زخموں کا علاج ہو، فنِ تعمیر ہو یا بننا جو کچھ بھی فن اور آرٹ کے زمرے میں آتا ہے؟

[illegible]

یقیناً۔

تمھارا کیا خیال ہے، کیا ایسی ریاست نظم و ضبط سے چل سکتی ہے جہاں ہر شخص کو اپنے کام سے کام رکھنے کا حکم ہو اور اسے اپنی ضرورت کی ہر شے کی فراہمی کی ذمہ داری خود ہی [illegible] یعنی اسے کپڑا بننے، جوتیاں سینے اور برتن بنانے جیسے سارے کام خود [illegible] اور دوسروں سے [illegible] سے اسے سرے سے کوئی غرض ہی نہ ہو؟

اس نے جواب دیا، میرا خیال ہے ایسی ریاست ناکام ترین ہوگی۔

میں نے پوچھا، کیا ایک اعتدال پسند ریاست منظم و منضبط ریاست ہوگی؟

اس نے جواب دیا، یقیناً۔

اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اعتدال پسندی کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ اپنے کام سے کام رکھا جائے یعنی زندگی بھر تمام ضرورتوں کے لیے صرف اپنی ہی ذات پر بھروسا کیا جائے اور امداد باہمی و [illegible] جائے۔

ہرگز نہیں۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ ابھی جو مفہوم ہم نے اس شخص کے الفاظ سے اخذ کیا ہے یعنی اعتدال کا مطلب یہ ہے کہ ہر شخص اپنی ذات تک محدود ہو جائے، لیکن حقیقتاً اس کا مفہوم یہ نہ تھا اور وہ درحقیقت کچھ اور کہنا چاہتا تھا کیونکہ وہ ایسی احمقانہ سوچ نہیں رکھ سکتا، تمھارا کیا خیال ہے، کیا وہ تمھیں احمق لگا تھا۔

کارمیڈس نے جواب دیا ہرگز نہیں جناب، مجھے وہ بہت ذہین و فطین انسان لگا تھا۔

ایسی صورت میں مجھے یقین ہے کہ اس نے یہ تعریف دراصل ایک معما یا پہیلی کی صورت میں بیان کی ہوگی اور اس کا اصل مقصد اپنے کام سے کام رکھنے کے سوا کچھ اور ہوگا۔

لگتا تو ایسا ہی ہے۔

سقراط نے کہا، کیا تم مجھے بتاؤ گے کہ تم خود ان الفاظ سے کیا مطلب اخذ کرتے ہو۔

یقیناً نہیں، میں اس کا مفہوم بتا نہیں سکتا اور میں سمجھتا ہوں کہ وہ شخص خود نہ جانتا ہوگا کہ وہ جو کچھ کہنا چاہتا ہے، اس کا کیا مفہوم لیا جا سکتا ہے۔

وہ مکاری سے کرائیٹیاس کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرایا۔

کرائیٹیاس کچھ بے چین سا نظر آنے لگا کیونکہ اسے زعم تھا کہ وہ کارمیڈس اور دوسرے افراد کو ہر طرح سے مطمئن کر سکتا ہے۔ اب تک کی گفتگو میں اس نے اپنے آپ کو الگ تھلگ رکھا تھا۔ مگر اب میں محسوس کر رہا تھا کہ یہ سب کچھ اس کے لیے ناقابل برداشت ہو رہا ہے۔ اور مجھے اس بات کا بھی یقین ہو گیا تھا کہ اعتدالِ ذات کے بارے میں کارمیڈس نے جو تعریف بیان کی تھی وہ اسے کرائیٹیاس نے ہی بتائی ہوگی اور اسی وجہ سے کارمیڈس کی کوشش تھی کہ وہ کرائیٹیاس ہی کو جواب دینے پر اکسائے۔ اسی لیے وہ ادھورے جوابات دے رہا تھا۔ دوسری طرف کرائیٹیاس کی حالت اس شاعر کی سی تھی جو کسی اداکار پر اس لیے برہم ہو کہ اس نے اپنے کمزور اظہار بیان کے باعث اس کی نظم کے اصل تاثر کو مجروح کر دیا ہو۔ اس نے چبھتی ہوئی نظروں سے کارمیڈس کو دیکھتے ہوئے کہا۔

کارمیڈس، گویا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ تم اعتدالِ ذات کا مفہوم صحیح معنوں میں سمجھ نہ پائے اس کی وجہ یہ ہے کہ اس اصطلاح کی تعریف کرنے والے شخص کا علم ناقص اور ادھورا تھا۔

میں نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔

کرائیٹیاس یہ تو طے ہے کہ کارمیڈس اپنی کم عمری اور تجربے میں کمی کے باعث اس کا مفہوم صحیح طور پر سمجھ نہیں سکا، مگر چونکہ تم اس سے عمر میں بڑے، زیادہ تجربہ کار اور صاحب مطالعہ ہو لہٰذا اگر تم اس کی بیان کردہ تعریف سے اتفاق کرتے ہو تو کیوں نہ میں تمھارے ساتھ اس کی صحت یا عدم صحت کے بارے میں بحث کروں؟

کرائیٹیاس نے کہا، میں کارمیڈس کی بتائی ہوئی تعریف سے متفق ہوں اور اسے درست سمجھتا ہوں۔

بہت خوب، میں نے کہا، میں اپنے سوال کو دہراتا ہوں جیسا کہ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کیا تم اس سے متفق ہو کہ مختلف نوعیت کے کام کرنے والے کاریگر معاشرتی اور سماجی ڈھانچے کے لیے ضروری ہیں۔

کرائیٹیاس نے جواب دیا، ہاں میں یہی سمجھتا ہوں۔

تو ان کا کام اور اس کے اثرات ان کی ذات تک محدود رہتے ہیں یا معاشرے پر بھی اثرات مرتب ہوتے ہیں؟

یقیناً دوسروں پر بھی ان کے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

اب مجھے کوئی اعتراض نہیں، میں نے کہا، مگر اعتدال پسندی کی تعریف کی وجہ سے ان کے اپنے

مقاصد متاثر ہوں گے۔ ایسی صورت میں اے دوست [illegible]
مثبت انداز میں متاثر کرتی ہے یا انھیں معتدل مزاج کہلایا جاتا ہے؟

کراٹیاس نے کہا، کیوں نہیں؟

میں اس وضاحت سے مطمئن ہوں۔ مگر اس شخص کا نقطہ نظر مشکوک ہو جانے کا [illegible] یہ اعتدال ذات کا مطلب اپنے کام سے کام رکھنا ہے۔ میں نے نکتہ اٹھایا خصوصاً جب وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ وہ لوگ بھی معتدل مزاج کہلائے جا سکتے ہیں، جن کے کام ان کی ذات تک محدود نہیں رہتے۔

جی نہیں، اس نے کہا، میں نے یہ کب کہا ہے کہ جو دوسروں کے کام آتے ہیں اعتدال ذات سے حامل ہو سکتے ہیں یا ہوتے ہیں؟ میں نے ان لوگوں کے بارے میں کہا ہے جو چیزیں بناتے ہیں نہ کہ وہ تمام لوگ جو کچھ نہ کچھ کرتے رہتے ہیں۔

کیا، میں نے کہا۔ کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ چیزیں بنانا اور کچھ کام کرنا دو الگ الگ باتیں ہیں۔ اس نے کہا، میں تو فقط یہ سمجھتا ہوں کہ کرنا اور بنانا ایک ہی بات نہیں ہے اور میں نے یہ ہیزیوڈ (Hesiod) سے سیکھا ہے، جس کا قول ہے:

''کام باعث توہین نہیں ہوتا''۔

اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اگر اس نے کچھ بنانے اور کچھ کرنے سے وہی مطلب لیا ہوتا جو کہ آپ کہہ رہے ہیں تو وہ یقیناً یہ کہتا کہ ان تمام کاموں میں توہین کا پہلو نہیں نکلنا چاہیے۔ اس میں جوتے بنانا، اچار تیار کرنا، حتیٰ کہ جسم فروشی کے لیے بازار میں بیٹھنا ہی کیوں نہ شامل ہو اور جناب سقراط! ایسا تو فرض بھی نہیں کیا جا سکتا، مگر میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ انھوں نے اپنے بیان کے باوجود کچھ بنانے اور کام کرنے کو متفرق کام قرار دیا ہوگا اور اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ بعض صورتوں میں خصوصاً جب کام کی نوعیت محترم نہ ہو تو کچھ اشیا کا بنانا باعث تذلیل ہو سکتا ہے۔ اس وقت یہ تصور قوی رہتا ہے کہ کام کسی صورت میں قابل مذمت نہیں ہو سکتا کیونکہ موصوف نے اسی کارروائی کو کام کہا ہے جس کے ذریعے مفید اشیا قابل قدر طریقے سے بنائی جائیں، اور اشیا کے اس طرح بنائے جانے کے عمل کو اس نے بنانے اور کرنے کی اصطلاحات کے تحت قرار دیا ہے اور ایسی ہی اشیا کو اس نے جائز انسانی معاملات قرار دیا ہے۔ اسی حوالے سے ہیزیوڈ یا کسی بھی دوسرے حکیم نے اسی فرد کو دانا کہا ہوگا جو اپنے کام سے کام رکھے یعنی اپنے کام کو اہمیت اور اولیت دے۔

کرائٹیاس نے فوراً ردعمل ظاہر کرتے ہوئے کہا جیسے ہی تم نے کچھ کہنے کے لیے زبان کھولی تھی

میں سمجھ گیا تھا کہ تم یہی کہو گے کہ کسی انسان کے لیے جو کچھ مفید ہے اور جو کچھ اس کا اپنا ہے وہی اس کے لیے اچھا ہے اور یہی چیز اس کی بنیاد ہے۔ تم اچھی اور مفید اشیا بنانے کو افعال کہتے ہو، کیونکہ میں اس طویل بحث سے آگاہ ہوں جو پروڈیکس (Prodicus) نے مختلف اشیا کو نام دینے کے سلسلے میں کی ہے۔ لہٰذا تم مختلف اشیا اور ان کی اہمیت کو جو بھی نام دو مجھے کوئی اعتراض نہیں بشرطیکہ تم مجھے ان ناموں کے مفہوم سے آگاہ کر سکو۔ لہٰذا بات کو نئے سرے اور واضح انداز میں شروع کرتے ہوئے میں تم سے پوچھتا ہوں کہ کیا تمھارے مطابق یہ سب کچھ کرنا یا اشیا بنانا، جو کچھ تم ان اچھے افعال کو نام دو، وہ اعتدال ذات کہلائے گا۔

اس نے کہا، ہاں میں یہی سمجھتا ہوں۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ جو کوئی شخص اچھے اعمال کرے، وہ معتدل مزاج ہے اور جس سے برے افعال سرزد ہوں وہ معتدل مزاج نہیں ہے۔ میں نے تصدیق چاہی۔

اس نے کہا، ہاں اور آپ بھی یقیناً اس سے اتفاق کریں گے۔

میرے اتفاق کرنے یا نہ کرنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا، کیونکہ اس بات کی کوئی اہمیت نہیں ہے کہ میں کیا سوچتا ہوں یا سمجھتا ہوں بلکہ اس ضمن میں تمھارے خیالات غور طلب ہیں جو تم اس معاملے میں بیان کر رہے ہو کیونکہ موضوع بحث تمھارا نظریہ ہے نہ کہ میرا۔

اچھا! اس نے کہا، میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ جو برائی کرے اور اچھائی نہ کرے وہ معتدل مزاج نہیں ہے اور جو اچھائی کرے اور برائی نہ کرے وہ اعتدال ذات کا حامل ہے کیونکہ میرے نزدیک اعتدال ذات صرف اچھے کام کرنے کا نام ہے۔

تم صحیح کہہ رہے ہو گے مگر میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ کیا معتدل مزاج افراد خود اپنے اعتدال ذات سے نامحرم ہوتے ہیں۔

اس نے کہا، میں یہ خیال نہیں کرتا۔

مگر تم تو ابھی کہہ رہے تھے کہ دستکار دوسروں کے کام کے ساتھ ساتھ اپنے کام کر کے بھی معتدل مزاج ہو سکتے ہیں۔

یقیناً میں نے کہا ہے مگر آپ اس سے کیا مطلب لے رہے ہیں؟

یہ کوئی خاص مقصد نہیں مگر میں چاہتا ہوں کہ تم مجھے بتاؤ کہ ایک طبیب کسی کا علاج کرتا ہے تو کیا وہ بیک وقت اپنا اور دوسرے کا بھلا کرتا ہے؟

میرا تو یہی خیال ہے۔

اور جو ایسا کرتا ہے کیا وہ اپنا فرض ادا کرتا ہے؟

جی ہاں، اس نے کہا۔

اور جو کوئی اپنا فرض ادا کرتا ہے کیا وہ دانائی اور معتدل مزاجی کا کام نہیں کر رہا ہوتا؟

ہاں، یقیناً اس طرح کا یہ کام دانائی پر مبنی ہوگا۔

لیکن کیا یہ ضروری ہے کہ طبیب جانتا ہو کہ جو علاج وہ کرنے جا رہا ہے وہ کب موثر ہوگا اور کب اس کا اثر نہیں ہوگا؟ کیا دستکار کے لیے یہ جاننا لازم ہے کہ وہ جو کچھ بنا رہا ہے وہ اس کے لیے کس طرح مفید ہے اور کن حالات میں مضر ہوگا؟

میرے خیال میں یہ لازم نہیں ہے۔

میں نے کہا، ایسی صورت میں تو یہ ممکن ہے کہ وہ کوئی مضر کام کر رہا ہو اور اس کے نقصان سے آگاہ بھی نہ ہو۔

حالانکہ خود تمھارے بقول اس نے وہ کام اعتدال فکر یعنی دانائی سے کیا ہو۔ یہی کہا تھا ناتم نے؟

جی ہاں۔

اس سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ اچھا کام کرنے کی صورت میں اس شخص کا عمل اعتدال پسندی اور دانائی پر مبنی ہوگا لیکن خود وہ شخص اپنی دانائی یا اعتدال پسندی سے آگاہ نہیں ہوگا۔

مگر سقراط، یہ ناممکن ہے اور اگر آپ کی دلیل کے مطابق یہ میرے کسی سابقہ بیان کیے گئے نقطۂ نظر کا منطقی نتیجہ ہے تو میں خود اس نقطۂ نظر سے صرف نظر کرنے کو تیار ہوں۔ بجائے اس کے کہ میں تسلیم کرلوں کہ ایسا شخص جو معتدل یا دانا ہو مگر اپنی اس دانائی اور معتدل مزاجی سے آگاہ نہ ہو اور اگر میں کسی معاملے میں غلطی پر تھا تو اس کے اعتراف کرنے پر مجھے کوئی شرمندگی نہیں۔ کیونکہ میرے ذاتی علم کی بنیاد یقیناً حقیقی علم پر ہو سکتی ہے۔

اس سلسلے میں اس شخص سے اتفاق کرتا ہوں جس نے ڈیلفی (Delphi) کا یہ قول کندہ کیا تھا ''خود کو پہچانو''۔ کیونکہ میرے خیال میں اگر میں غلطی پر نہ ہوں تو عبادت گاہ میں داخل ہونے والے ہر نجات کے خواہشمند فرد سے دیوتا یہ الفاظ کہتا ہے۔ لہٰذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ ایک دوسرے کو سلام کرتے وقت ہیلو کہنے کے بجائے اس دعائیہ جملے سے مخاطب کرنا چاہیے کہ دیوتا تمھیں اعتدال نفس عطا کرے۔ جس کسی نے بھی مذکورہ

یہ الفاظ کندہ کیے ہیں میرے خیال میں اس کا تصور، عبادت گاہ میں داخل ہونے والے لوگوں سے
انسانوں کے خطاب کی طرح نہیں ہے بلکہ یہ وہ الفاظ ہیں جو کوئی عابد ابتدائے عبادت میں اپنے معبود سے
سنتا ہے اور اس میں یہی پیغام ہوتا ہے کہ ''اعتدالِ ذات اختیار کرو''۔ یہ بالکل کسی پیامبر کا فرمان
ہوتا ہے۔ اسی لیے میں اس کے مفہوم سے یہی سمجھتا ہوں کہ ''خود کو پہچانو'' اور اعتدالِ ذات سے
البتہ الفاظ کے استعمال سے غلط فہمی کا پیدا ہونا ممکن ہے۔ ایسی ہی کسی غلط فہمی کے نتیجے میں بعد میں
نے اس بیان میں اضافہ کیا اور کہا ''خود کو جان لو مگر حد سے زیادہ نہیں''۔ یا جیسے کہا گیا ''خود کو
مرہون کر لو تو سمجھو کہ خرابی دور نہیں''، کیونکہ وہ بزرگ سمجھے تھے کہ خود کو جان لینے کی بات، عبادت
ہونے والے کسی بندے کو معبود کا سلام نہیں بلکہ ایک کلمۂ ہدایت ہے اور اس کے اتباع میں لوگوں نے
طرف سے بھی ایسی ہی ہدایت پر مشتمل جملہ عمارت کی پیشانی پر کندہ کر دیا اور سقراط میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں
کہ میں یہ سب آپ سے کیوں کہہ رہا ہوں۔ میرا مقصد دراصل یہ ہے کہ ہم سابقہ بحث کو جس کے بارے میں
کسی نتیجے کے برآمد ہونے کی توقع کم ہے اور اس سے آپ کے اور میرے صحیح یا غلط ہونے کا اندازہ کرنا بھی
مشکل ہو رہا ہے، اس بات کو یہیں چھوڑتے ہیں اور ایک نئی بحث کا آغاز کرتے ہیں جس سے میں یہ ثابت
کر دوں گا کہ خواہ آپ اتفاق کریں یا نہ کریں اعتدالِ ذات کا اصل مفہوم فرد کی اپنی ذات سے آگاہی ہے۔

میں نے کہا، ہاں کرائیٹیاس، شاید تم میرے پاس اس لیے آئے ہو کہ میں جو سوالات تم سے پوچھ
رہا ہوں خود بھی ان کے جوابات سے بخوبی آگاہ ہوں۔ اس لیے میرا تم سے متفق ہونا آسان ہے۔ مگر اصل
بات یہ ہے کہ میں تمھارے ساتھ سوال و جواب کے ذریعے سامنے آنے والے حقائق سے آگاہ ہوں۔ یوں
میں اپنی کم علمی سے آگاہ ہوتا ہوں اور مطلوبہ معلومات حاصل کرنے کے بعد ہی یہ طے کر پاؤں گا کہ میں تم سے
متفق ہوں یا نہیں۔ تم مجھے کچھ وقت دو تا کہ میں اپنی معلومات کا تجزیہ کر سکوں۔

اس نے جواب دیا۔ ٹھیک ہے آپ تجزیہ کریں۔

میں نے کہا میں تجزیے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اعتدالِ ذات یا دانائی کو اگر مخصوص اشیا کے علم
سے عبارت سمجھا جائے تو یہ سائنس کہلائے گی یعنی کسی شے کی سائنس!

جی ہاں، اس نے کہا، بلکہ خود اپنی ذات میں علم رکھنے والی سائنس۔

میں نے پوچھا کیا طب صحت کے معاملات سے متعلق سائنس نہیں ہے۔

اس نے جواب دیا، یقیناً ہے۔

میں نے کہا، اگر تم مجھ سے پوچھو کہ ادویہ یعنی علم الصحت کے استعمال کے کیا فوائد ہیں تو میرا جواب اس کے سوا کیا ہو سکتا ہے کہ جب ادویہ انسان کو بیماری سے صحت عطا کر دیتی ہیں تو اس سے بڑھ کر ان کا اور کیا فائدہ ہو سکتا ہے۔

یہ تو طے شدہ بات ہے۔

اگر تم مجھ سے پوچھو کہ فن تعمیر کا کیا نتیجہ برآمد ہوتا ہے تو میں کہوں گا کہ اس سے عمارات تعمیر ہوتی ہیں۔ یہی حال دیگر علوم وفنون کا ہے، جن کے زندگی پر کسی نہ کسی طرح خوشگوار اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ اب کرائیٹیاس میں تم سے اعتدالِ ذات یا دانائی کے بارے میں اسی قسم کا سوال پوچھتا ہوں کیونکہ تمھارے قول کے مطابق یہ بذات خود ایک قسم کی سائنس ہے یعنی یہ کہ ان سے انسانی زندگی پر کس قسم کے خوشگوار اثرات مرتب ہوتے ہیں جن کی بنیاد پر اعتدالِ ذات اور دانائی کو فہم وفراست اور دانائی سے تعبیر کیا جا سکے۔ مجھے اس کا جواب چاہیے!

کرائیٹیاس نے کہا سقراط! تحقیق اور حصول معلومات کا یہ انداز منطقی نہیں، کیونکہ دانائی دیگر سائنسوں کی مانند نہیں ہے۔ جبکہ آپ کے سوال سے یہی بات معلوم ہوتی ہے کہ آپ کے نزدیک یہ بھی دیگر مادی سائنسوں کی طرح ہی ہے۔ اسی طرح آپ ذرا بتائیں کہ جس طرح فن تعمیر کا نتیجہ عمارات ہوتی ہیں، فن نور بافی سے کپڑا حاصل ہوتا ہے اور اسی طرح دیگر فنون سے کوئی نہ کوئی نتیجہ برآمد ہوتا ہے۔ اسی طرح حساب اور علم ہندسہ سے کیا مادی نتیجہ برآمد ہوتا ہے؟ کیا ایسا کوئی فائدہ آپ مجھے دکھا سکتے ہیں، میرے خیال میں یقیناً نہیں۔

میں نے کہا، یہ تو حقیقت ہے مگر اس طرح تو ان تمام قسم کی سائنسوں کا کوئی نہ کوئی پہلو دیگر سائنسوں سے مختلف ہوتا ہے اور میں تمھیں یہ دکھا سکتا ہوں کہ گنتی یا علم الاعداد میں جفت اور طاق اعداد کا باہمی اور بین الاقسامی تعلق یقیناً قابل توجہ اور دلچسپ نتائج کا حامل ہوتا ہے، کیوں کیا ایسا نہیں ہے؟

اس نے کہا، ہاں، ایسا ہی ہے۔

اور اعداد شماری میں جفت اور طاق اعداد کے اثرات بھی مختلف نہیں ہوتے، یقیناً ہوتے ہیں۔ یہی حال تولنے کے عمل کا بھی ہے۔ یقیناً تم یہ تو مانو گے کہ تولنے کا عمل اور اشیا کا ہلکا یا بھاری ہونا بالکل مختلف بات ہے۔

اس نے کہا، بالکل ایسا ہی ہے۔

تب میں تم سے پوچھوں گا کہ وہ کون سی شے ہے جو خود تو دانائی نہیں لیکن دانائی ہی [illegible] ہے۔

جناب سقراط! آپ پھر ایک سابقہ غلطی کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ اس نے کہا۔

پہلے آپ نے دریافت کیا کہ دانائی اور اعتدال ذات دیگر سائنسوں سے کس طرح مختلف ہیں؟

اب آپ ان کے درمیان مشترک خصائص کی نشاندہی کر رہے ہیں حالانکہ ان میں واضح ترین فرق یہ ہے۔

دوسری سائنسیں فقط دیگر اشیا کی سائنسیں ہیں نہ کہ اپنی ذات کی سائنس جبکہ دانائی وہ واحد سائنس ہے جو دیگر
شے کی سائنس ہونے کے ساتھ ساتھ اپنی ذات کی بھی سائنس ہے اور مجھے یقین ہے کہ اس سے آپ خوب
آگاہ بھی ہیں، حالانکہ آپ نے اس سے انکار کیا ہے مگر سچ یہی ہے کہ آپ بحث کی بنیاد دلائل پر رکھنے
کے بجائے فقط مجھے غلط ثابت کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔

میں نے کہا، اور اگر ایسا ہے بھی تو کیا ہوا۔ تم یہ کس بنیاد پر کہہ رہے ہو کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں وہ
درست نہیں بلکہ محض تمہارے خیالات کا ردعمل ہے؟ کیونکہ یہ محرک تو دراصل وہ خوف ہے جس کے باعث
میں اپنی مرضی کو بھی حتمیت تصور کرتا رہا ہوں اور اس موقع پر میں اپنی دلیل پر فقط اپنی ذات ہی کے لیے نہیں بلکہ
اپنے دیگر دوستوں کے مفاد کے لیے بھی زور دے رہا ہوں کیونکہ اشیا کی اصل حقیقت کو تلاش کرنے کا عمل تو
یقیناً ایک مفید عمل ہے۔

اس نے کہا، بالکل سقراط، ایسا تو ہے۔

تب پھر میں نے کہا، جناب محترم، خوش ہو جاؤ اور میرے سوال کے جواب میں اپنی حقیقی اور اصل
رائے سے مطلع کرو اور یہ بھول جاؤ کہ اس سے کرائیٹیاس کے نقطۂ نظر کی نفی ہوتی ہے یا سقراط کے۔ صرف
دلیل پر غور کرو کہ اس تردید سے کیا نتیجہ اخذ کیا جا سکے گا اور کس حقیقت پر روشنی پڑے گی۔

اس نے جواب دیا، میرا خیال ہے آپ صحیح کہتے ہیں اور میں یقیناً آپ کے کہنے پر عمل کروں گا۔

اسی صورت میں، میں چاہتا ہوں کہ تم دانائی کے بارے میں اپنا نقطۂ نظر پیش کرو۔

میرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ دانائی نہ صرف خود ایک سائنس ہے بلکہ دیگر سائنسوں کی بھی سائنس ہے۔
یقیناً اس کے دائرہ اثر میں خود دانائی کی ساخت کے علاوہ دیگر سائنسیں بھی آتی ہیں۔ مگر جو سائنس کہ
سائنس ہو وہ سائنس کے علاوہ بھی ہر شے کی سائنس ہوگی۔ کیا خیال ہے۔ بالکل درست۔

اسی صورت میں صرف متوازن اور دانا شخص ہی یہ جان سکتا ہے کہ وہ کتنا علم رکھتا ہے اور کس قدر علم
سے نابلد ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ وہ دوسروں کے بارے میں بخوبی اندازہ لگا سکتا ہے کہ ان کا علم کتنی اشیا کا تقاضا کرتا

ہے اور کہاں کہاں کس کس شے کا احاطہ کرنے سے قاصر ہے اور یہ کہ لوگ کس حد تک اپنی کم علمی سے آشنا ہیں اور ایسے لوگوں کو بھی پہچانتا ہے جو اگر چہ لاعلم ہیں مگر اپنے آپ کو بہت عالم خیال کرتے ہیں۔ کوئی دوسرا فرد ایسا نہیں کرسکتا۔ یہی دانائی اور اعتدالِ ذات ہے جسے خود آگاہی کہا جاسکتا ہے۔ یعنی فرد کی وہ صلاحیت جس کے مطابق وہ اپنے علم اور کم علمی کی حقیقت سے آگاہ ہو۔ کیا تمھاری بات کا مطلب یہی نہیں ہے؟

اس نے کہا ہاں میری بات کا یہی مطلب ہے۔

میں نے کہا۔ ایسی صورت میں، ہم بات کو تیسری اور آخری دلیل کے طور پر اس انداز میں پھر سے شروع کرتے ہیں کہ پہلی صورت میں کیا یہ ممکن ہے کہ کوئی شخص یہ جان لے کہ وہ جانتا ہے یا نہیں اور اگر ایسا ہے تو کیا وہ یہ بھی جان سکتا ہے کہ وہ کیا کچھ جانتا ہے اور کیا کچھ نہیں جانتا؟ اور دوسری بات یہ کہ اگر ایسا ہر لحاظ سے ممکن ہے تو کیا ایسے علم کا کوئی فائدہ ہے بھی یا نہیں؟

وہ بولا، یہی تو معاملہ ہے جس پر ہمیں غور کرنا ہے۔

میں نے کہا، کرائیٹیاس میں اب یہاں یہ امید کرتا ہوں کہ تم اس مشکل کو حل کرنے کے لیے کوئی راستہ نکال لوگے جو میں نے اپنے لیے دریافت کیا ہے۔ کیا میں تمھیں اپنے مسئلے کی حقیقت سے آگاہ کردوں۔

کرائیٹیاس بولا، میں ضرور مدد کروں گا اگر ممکن ہوا۔

میں نے کہا، جو کچھ تم کہہ رہے ہو، اگر یہ سچ ہے تو کیا اس کا مطلب یہ نہیں کہ کوئی ایسی سائنس وجود رکھتی ہے جو کہ خود اپنی سائنس بھی ہے اور دیگر سائنسوں کی بھی سائنس ہے اور درعین حال غیر سائنس کی بھی سائنس ہے؟

جی ہاں۔

مگر یہ تو سوچو کہ ایسا علم کس قدر ناپید کنارہ اور غیر محدود ہوگا۔ اگر ہم اس بات کو دوسری مشابہ مثالوں سے سمجھنے کی کوشش کریں تو ایسے علم کے حصول کا عدم امکان تم پر واضح ہو جائے گا۔

وہ بولا۔ کیوں اور کیسے اور کسی مخصوص موضوع کے حوالے سے تمھارا مطلب کیا ہے؟

مثلاً تم ایسی بصارت کا تصور کرسکتے ہو جو معمولی بصارت نہ ہو بلکہ اس کے دائرہ اثر میں خود بصارت کے نتائج کے علاوہ دیگر بصارتوں کے نتائج اور نقائص بھی آتے ہوں اور جو کہ رنگوں کو نہیں بلکہ صرف اپنے آپ اور دوسروں کی بصارتوں کو دیکھے۔ کیا تمھارے خیال میں ایسی بصارت کا کوئی وجود ہے؟

یقیناً نہیں۔

یا اسی طرح کیا تم ایسی سماعت کا تصور کر سکتے ہو جو خود اپنی اور دوسری سماعتوں اور ان کے نغموں کو سنے لیکن کوئی اور آواز نہ سن پائے؟

ایسی کوئی سماعت نہیں۔

اسی طرح تم کسی ایسی حس کو دائرہ تصور میں لا سکتے ہو جو خود اپنے وجود اور دیگر حسیات کے وجود کو محسوس کرتی ہو مگر ان حسیات سے متعلق اشیا کے وجود کو محسوس نہ کر پائے؟

میرا خیال ہے کہ نہیں۔

کیا کوئی ایسی احتیاج ہے جو خود اپنے (خواہش کے) اور دیگر احتیاجات کے وجود کا ادراک تو کرے مگر یہ طے نہ کر پائے کہ کیا چیز اس احتیاج کی تسکین کر سکتی ہے؟

ہرگز نہیں۔

کیا تم کسی ایسی خواہش کی نشاندہی کر سکتے ہو جو کسی مادی شے کی نہیں بلکہ خود اپنے اور دیگر خواہشات کے وجود کی خواہشات تک محدود ہو؟

میرا جواب اب بھی نفی میں ہے۔

کیا تم کسی ایسی محبت سے آگاہ ہو جو کسی طرح کے حسن سے نہیں بلکہ بطور محبت اپنے اور دیگر محبتوں کی محبت سے متعلق ہو؟

میں ایسی کسی محبت کے وجود کا قائل نہیں۔

کیا تم کسی ایسے خوف سے آگاہ ہو جو کسی خوفناک شے سے نہیں بلکہ خود اپنا اور دیگر کسی خوف کا خوف ہو؟

وہ بولا، میں نے ایسا خوف کبھی محسوس نہیں کیا۔

کیا کوئی ایسی رائے وجود رکھتی ہے جو خود اپنے وجود اور دیگر آرا کے بارے میں ہو اور جو بطور کل ان آرا پر جو کہ کسی موضوع سے متعلق ہوں کوئی رائے نہ رکھتی ہو؟

یقیناً نہیں۔

مگر ہم ایسی سائنس کے وجود پر تو متفق ہو چکے ہیں جو مخصوص میدان عمل تک محدود ہونے یا مخصوص موضوع سے تعلق رکھنے کی بجائے بطور سائنس خود اپنے وجود اور دیگر سائنسوں کی سائنس ہو۔

اس نے کہا، ہاں یہ تو طے ہے۔

مگر یہ کس قدر حیرت انگیز بات ہے۔ بشرطیکہ صحیح ہو اور ابھی تک ہم نے اس سے [illegible] شامل [illegible] رد نہیں کیا تو کیا اس موضوع پر مزید غور وفکر کیا جائے؟

میرے خیال میں یہی مناسب ہے۔

گویا جس سائنس کے وجود سے ہم بحث کر رہے ہیں وہ کسی مخصوص شے کی سائنس ہے۔ [illegible] ماہیت میں کسی شے کی سائنس ہونے کی صلاحیت باقاعدہ شامل ہے۔

جی ہاں۔

بالکل۔ یہ ایسے ہی ہے کہ کوئی شے بڑی ہے تو وہ مقابلتاً کسی اور دوسری شے سے بڑی ہوتی۔ عجیب ہے!

یقیناً۔

اور ایسے ہی جب ہم کسی شے کو چھوٹا کہتے ہیں تو اس کے مقابلے میں کوئی بڑی شے ہمارے ذہن میں ہوتی ہے۔

بالکل درست۔

اور اگر کوئی ایسی شے وجود رکھتی ہو جو اپنی ذات سے بڑی ہو اور ایسی دیگر بڑی چیزوں سے بھی بڑی ہو مگر ان اشیا سے بڑی نہ ہو جن سے مذکورہ اور مقابلتاً بڑی چیزیں بڑی ہیں تو وہ بنیادی شے خود اپنی ذات سے بڑی بھی ثابت ہوتی ہے اور چھوٹی بھی۔ یہی بات ہے نا؟

سقراط! ان شرائط کے تحت تو ایسا ہی لگتا ہے۔

اگر کوئی ایسا دگنا ممکن ہے جو نہ صرف اپنے آپ سے بلکہ دوسرے دگنوں سے بھی دگنا ہو تو دوسرے دگنے پہلے دگنے کے حوالے سے نصف ہوں گے۔ کیونکہ دگنے کا برعکس نصف ہے؟

آپ صحیح فرماتے ہیں۔

محولہ بالا حوالوں کی روشنی میں یہ ثابت ہوتا ہے کہ جو شے خود اپنے وجود سے بڑی ہے وہ بیک وقت اپنے وجود سے چھوٹی بھی ہو سکتی ہے اور جو بھاری ہے وہ ہلکی بھی ہو سکتی ہے اور جو قدیم تر ہو وہ جدید تر بھی ہو سکتی ہے۔ یہی صورت حال دوسری نسبتوں کی بھی ہے۔ گویا جو نسبت کسی کیفیت کی اپنی ذات سے ہے وہ کسی شے کے ساتھ ہونا بھی لازم ہے۔ مثلاً سماعت کے وجود کے لیے آواز کا وجود لازم ہے۔

بالکل ہے۔

گویا سماعت اگر خود کو بھی سنے تو آواز ہی فتی ہے کیونکہ سننے کی [illegible]

یقیناً!

اور میرے دوست، بصارت کے ساتھ بھی ایسا ہی ہے کہ اگر یہ اپنے وجود کو دیکھے تو [illegible] رنگ ہی دیکھتی ہے کیونکہ بے رنگ اشیا اس کو بصارت میں نہیں آتیں۔

یقیناً ایسا ہی ہے۔

کرانیٹیاس! کیا تم نے غور نہیں کیا کہ مندرجہ بالا نسبت کی مثالوں میں [illegible] ناقابلِ فہم ہو جاتا ہے، خصوصاً تعداد اور مقدار کے حوالے سے، یعنی یہ کیسے ممکن ہے [illegible] دوگنی یا نصف ہو جائے؟

آپ درست کہہ رہے ہیں۔

مگر سماعت اور بصارت کے معاملے میں یا خود اپنی حرکت کی قوت کے بارے میں [illegible] دینے کی قوت کے بارے میں لوگوں کی مختلف آرا ممکن ہیں۔ مگر شاید میرے دوست ہمیں کسی [illegible] کی ضرورت ہے جو تسلی بخش طریقے سے ہمیں اس سوال کا جواب دے سکے کہ ایسی کوئی چیز نہیں [illegible] سے ہمیں ورثہ میں ملی ہو اور جو دوسرے نہ رکھتے ہوں یا کچھ محدود تعداد میں ایسی اشیا ہیں اور [illegible] اشیا میں اعتدالِ ذات اور دانائی کا شمار بھی ہوتا ہے۔ کم از کم میں خالصتاً اپنے علم کی بنیاد پر ایسا کوئی فیصلہ کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ میں اس بات پر بھی شک کرتا ہوں کہ آیا ایسی کوئی سائنسوں کی سائنس وجود رکھتی ہے یا نہیں اور اگر ایسی کسی سائنس کا وجود ہے بھی تو میرے ذہن میں یہ واضح نہیں کہ اس سائنس کو [illegible] اعتدالِ ذات ہی سمجھا جائے جب تک کہ مجھے یقین نہ آ جائے کہ ایسی سائنس انسان کے لیے حتمی طور پر [illegible] ہے یا نہیں۔ میں اعتدالِ ذات کے مفید صلاحیت ہونے پر بجنسہٖ یقین رکھتا ہوں اور اس لیے اے ابنِ کالیسکرس (Callaeschrus)! اگر تم اعتدال اور دانائی کو واقعی سائنسی اور غیر سائنسی علوم کی سائنس سمجھتے ہو تو دو باتوں کے سلسلے میں مجھے مطمئن کرو۔ اول یہ کہ اس بیان کا امکان کیسے ثابت ہوتا ہے اور دوم یہ کہ اعتدالِ ذات اور [illegible] کس طرح اور کس حد تک مفید ہیں۔ اسی صورت میں مجھے یقین آ سکتا ہے کہ نقطۂ نظر درست ہے۔

کرانیٹیاس نے میری باتیں سنیں اور دیکھا کہ میں مشکل میں ہوں اور جیسے کوئی شخص جمائی لے تو قریب بیٹھے لوگوں کو بھی از خود جمائیاں آنے لگتی ہیں، اسی طرح وہ بھی میری الجھن سے متاثر ہو کر الجھن کا شکار ہو گیا۔ مگر وہ چونکہ اپنے حلقے میں ہر صورتِ حال سے نمٹنے کے ماہر کی حیثیت سے مشہور تھا۔ اس لیے اسے سب

کے سامنے اس امر کے اعتراف میں شرمندگی سی محسوس ہو رہی تھی کیونکہ نتائج کا اس کے پاس کوئی جواب نہیں یا وہ اس مسئلے پر کم از کم سوال ہی مرتب کرے۔ چنانچہ اس نے اپنی شرمندگی مٹانے کی ناکام ایک غیر دانشمندانہ کوشش کی۔ میں نے دلائل جاری رکھنے کی غرض سے بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

چلو کریٹیاس اسے چھوڑو آؤ فرض کر لیں ایسی کوئی سائنسوں کی سائنس بھی ہے۔ ہمارا مفروضہ درست ہے یا نہیں۔ ہم اس کا فیصلہ کسی اور موقع پر کریں گے۔ فی الحال اسے درست تسلیم کرتے ہوئے یہ بتاؤ کہ یہ سائنس ہمارے لیے اپنے دائرہ علم میں موجود اور اس سے باہر کی اشیا میں تفریق کرنے میں کیسے مدد معاون ہے؟ کیا ہم جان سکتے ہیں اور کیا نہیں جان سکتے کہ ہمارا ذاتی علم یا حکمت کیا ہے، یہی ہمارا بنیادی سوال ہے۔

جی ہاں، سقراط! اس نے جواب دیا اور کہا کہ میرا خیال ہے کہ یہی حقیقت سچ بھی ہے کیونکہ جو شخص اس سائنس یا علم کا متحمل ہوگا تو لامحالہ عالم کہلائے گا۔ ایسے ہی جیسے سرعت رفتار کا حامل سریع اور حسن کا حامل حسین کہلاتا ہے اور جو عالم ہوگا وہ جانتا بھی ہوگا اور اگر وہ وقوف ذات کا حامل ہوگا تو اپنی ذات کو جانتا اور پہچانتا بھی ہوگا۔

میں نے کہا، مجھے اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ انسان جو وقوف ذات رکھتا ہوگا تو وہ یقیناً وقوف ذات کے مرحلے سے بھی گزر چکا ہوگا مگر میں اس امر پر زور دیتا ہوں کہ آیا وہ اس سے باخبر ہوگا کہ نہیں کہ وہ کیا کچھ جانتا ہے اور کس علم سے محروم ہے؟

اس لیے سقراط کہ یہ دونوں باتیں ایک ہی کیفیت کا اظہار کرتی ہیں۔

میں نے کہا یہ ممکن ہے مگر میں ویسا ہی احمق رہا کیونکہ میں ابھی تک یہ سمجھ نہیں پایا کہ اپنے علم اور لاعلمی کی کیفیت کی تفصیلات جاننا کیا مکمل خود آگاہی کہلانے کا مستحق ہے یا نہیں؟

اس نے پوچھا، تمھارا اس بات سے کیا مطلب ہے؟

میں نے جواب دیا میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میں یہ تو مانتا ہوں کہ ایک ایسی سائنس ہے جو سائنسوں کی سائنس یا علوم کا علم کہلا سکتی ہے مگر کیا اس کے دائرہ کار میں فقط یہی ہے کہ وہ دو باتوں میں تمیز کر کے بتا سکے کہ فلاں علم یا سائنس ہے اور فلاں نہیں ہے۔

نہیں، فقط اتنا کہہ دینے سے بات نہیں بنتی۔

کیا صحت کا علم یا اس کے حصول کی خواہش یا اسی طرح انصاف کا علم اور اس کی طلب ایک ہی ہیں؟

ہرگزنہیں۔

اس لیے کہ ان میں سے ایک علم الادویہ ہے جبکہ دوسرا علم السیاست، جبکہ ہم جس علم کی نشاندہی کی کوشش کر رہے ہیں وہ خالص اور مخصوص بالذات علم ہے۔ یہی بات ہے نا؟

بالکل یہی بات ہے۔

تو اس کا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اگر ایک شخص کچھ علم رکھتا ہے اور صرف علم کا ہی علم رکھتا ہے اور اس کے علاوہ علم الصحت یا علم العدل کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تو یہ امکان تو موجود ہے کہ وہ صرف یہ جانتا ہے کہ وہ کچھ نہ کچھ جانتا ہے اور اپنے اور دوسروں کے بارے میں کچھ نہ کچھ علم رکھتا ہے۔

بالکل صحیح۔

تب یہ سائنس یا علم اسے کس طرح سکھائے گا کہ وہ اس چیز کو جانے کہ وہ کیا جانتا ہے۔ فرض کریں کہ وہ صحت کا علم رکھتا ہے مگر دانائی اور اعتدالِ ذات کے بارے میں لاعلم ہے، مگر صحت کا فن ہی اسے یہ سکھا دیتا ہے، وہ علم موسیقی سے توازن سیکھ لیتا ہے اور تعمیر کو فن تعمیر سے سیکھتا ہے مگر اس سے اعتدالِ ذات یا دانائی نہیں سیکھ پاتا اسی طرح وہ دوسری چیزیں بھی نہیں سیکھتا۔

جی ہاں، یہ تو واضح ہے، اس نے کہا۔

تب دانائی علم العلم یا سائنس کی سائنس کیسے ہوگی اور وہ انسان کو کیسے باور کرا سکتی ہے کہ وہ صحت یا فن تعمیر کے بارے میں کچھ جانتا ہے۔

یہ ناممکن ہے۔

ایسے میں جو شخص ان علوم سے بے بہرہ ہے وہ صرف یہی جانتا ہے کہ وہ کچھ جانتا ہے، البتہ یہ نہیں جانتا کہ وہ کیا جانتا ہے۔

اس نے کہا، یہ سچ ہے۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ دانائی اس بارے میں رہنمائی نہیں کرتی کہ ہم مخصوص علوم سے کیا کیا جانتے ہیں بلکہ فقط یہ بتاتی ہے کہ ہم کچھ نہیں جانتے۔

بظاہر تو اس سے یہ ہی نتیجہ نکلتا ہے۔

پس جو یہ علم رکھتا ہے، ضروری نہیں کہ وہ اس قابل ہو کہ یہ اندازہ لگا سکے کہ وہ کیا جانتا ہے یا کیا نہیں جانتا۔ بلکہ یہ کہ علم فقط یہ بتائے گا کہ وہ کسی نہ کسی علم کا کچھ نہ کچھ علم رکھتا ہے تو کیا دانائی اسے یہ بھی نہ بتا پائے گی

کہ علم ہے کیا؟

بالکل نہیں بتا پائے گی۔

یعنی ایسا شخص علم الصحت کے عالم ہونے کے دعویدار اور حقیقی فزیشن کے درمیان امتیاز نہیں کر سکے گا، نہ ہی علم کے دیگر جائز و ناجائز دعویداروں میں فرق کو جان پائے گا۔ اس صورت میں ہمیں اس معاملے کو اس طرح لینا پڑے گا کہ ایک دانا شخص حقیقی اور غیر حقیقی فزیشن میں فرق اور امتیاز کرنے کے لیے کیا طریق کار اختیار کرے گا؟ کیا وہ اس سے علم الادویہ کے بارے میں گفتگو نہیں کرے گا، کیونکہ یہی وہ موضوع ہے جس پر اس دعویدار کو دسترس ہونی چاہیے؟

بالکل درست!

دوسری جانب فزیشن سائنس (خالص علم) کو نہیں سمجھتا کیونکہ یہ دانائی کا دائرۂ عمل ہے۔

یقیناً۔

لیکن علم الادویہ چونکہ ایک سائنس ہے تو اس سے یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ وہ علم الادویہ سے بالکل ناواقف ہے۔

تو اس صورت میں دانا شخص شاید یہ تو جان لے گا کہ طبیب کسی علم کا حامل ہے لیکن جب وہ اس علم کی حقیقت جاننا چاہے گا تو یہی پوچھے گا کہ اس علم کا موضوع بحث کیا ہے؟ چونکہ علوم میں تفاوت اور جدائی اس وجہ سے نہیں کہ وہ علوم ہیں بلکہ اس وجہ سے ہے کہ ان کا موضوع کیا ہے؟ کیا یہ درست ہے؟

جی ہاں! یقیناً ہے۔

اور علم الادویہ دوسرے علوم سے اپنے موضوع یعنی موضوع صحت وعوارض کے حوالے سے ہی مختلف ہے۔

جی ہاں۔

یعنی وہ شخص جو حقیقت ادویہ سے متعلق تحقیق کرتا ہے، درحقیقت صحت اور عوارض سے متعلق ہی کھوج لگاتا ہے کسی دوسری چیز کے بارے میں نہیں۔

درست!

اور جو شخص ایک فزیشن کے علم کی حقیقت جاننا چاہے وہ انہی اشیا یعنی صحت وعوارض اور ادویہ ہی کے بارے میں فیصلہ کرے گا۔ بالکل صحیح! یعنی وہ یہی پرکھے گا کہ جو کچھ فزیشن کہہ رہا ہے یا کر رہا ہے وہ صحت اور

عوارض کے حوالے سے درست ہے۔

یقیناً۔

مگر کوئی ایسا شخص جو خود صحت وعوارض کے بارے میں معقول علم نہیں رکھتا، اس علم کے دعویدار کے دعوے کی پرکھ کیسے کرسکتا ہے؟

ہرگز نہیں۔

اور ایسا علم صرف ایک فزیشن کے پاس ہی ہوتا ہے نہ کہ محض ایک دانا کے پاس، تو گویا فزیشن کے عم کے دعویدار کے دعوے کی پرکھ کرنے والے کا بیک وقت دانا اور فزیشن ہونا ضروری ہے۔

بالکل صحیح!

تب یہ بات یقینی ہے کہ دانائی یا اعتدالِ ذات اگر فقط سائنسوں کی سائنس (بنیادی سائنس) ہے اور اس میں مخصوص فنون یعنی عملی سائنسوں میں سے کوئی شامل نہیں تو گویا یہ ایسے دو افراد میں امتیاز کی صلاحیت سے محروم ہے جن میں سے ایک واقعی فزیشن ہے جبکہ دوسرا محض فزیشن ہونے کا جھوٹا دعویٰ کرتا ہے یا کم از کم یہ کہ اسے درحقیقت علم نہیں کہ وہ علم طب کے بارے میں کچھ جانتا ہے، اسی اصول کا اطلاق دیگر شعبہ ہائے کار کے ماہرین پر بھی کیا جاسکتا ہے کیونکہ ان کی شناخت بھی وہی کرسکتا ہے جو اس فن کا ماہر ہو۔ دوسرا کوئی شخص اس پہچان سے یقیناً عاری ہوگا۔

اس نے کہا، یہ تو طے شدہ بات ہے۔

میں نے کہا، مگر اس کا فائدہ کیا ہوگا، اگر دانائی محض یہی کچھ ہے اور اس کے علاوہ کچھ نہیں۔ میرا خیال ہے کہ جیسے ہم پہلے یہ طے کرچکے ہیں کہ ایک عاقل انسان اس قابل تو یقیناً ہوتا ہے کہ وہ یہ جان سکے کہ کیا کچھ وہ جانتا ہے اور کن امور سے وہ بے بہرہ ہے بلکہ وہ دوسرے افراد میں بھی متعلقہ میدان ہائے عمل کی مہارت کا اندازہ کرسکتا ہے۔ ایسے میں اس کی دانائی اس کے لیے یقیناً مفید ہوگی کیونکہ اس طرح انسان غلطیوں سے پاک رہتے ہوئے نہ صرف خود صاف وشفاف زندگی گزار سکتا ہے بلکہ کسی نہ کسی طور پر اپنے زیرِ اثر رہنے والے افراد کی رہنمائی بھی کرسکتا ہے۔ اس طرح ہم ان کاموں میں الجھنے سے اجتناب کرتے ہیں جن کا ہمیں علم نہیں اور جو لوگ متعلقہ کام کو جانتے اور سمجھتے ہیں، ان پر مکمل طور پر بھروسا کرتے ہوئے کام ان کے سپرد کرسکتے ہیں اور اسی طرح اس سے مناسب اور حسبِ منشا نتائج حاصل کرسکتے ہیں۔ اسی طرح ہم اپنے زیرِ اثر افراد کو بھی غیر متعلقہ کاموں سے روک کر ایسے کام تفویض کرسکتے ہیں جنھیں وہ اچھی طرح جانتے اور سمجھتے ہیں۔

ایسی صورت میں گھر ہو یا ریاست، دانائی سے اس کا انتظام چلانے سے ہی مطلوبہ نظم وضبط بحال رکھا جاسکتا ہے۔ کیونکہ جب لوگ غلطیوں سے پاک ہو جائیں گے تو سچائی کا ہر طرف دور دورہ ہوگا اور لوگوں کے کام سنور جائیں گے اور بالآخر خوشی ان کا مقدر ٹھہرے گی۔ کیوں جناب یہی بات تو ہم نے بحث کے آغاز میں تسلیم کی تھی کہ دانائی کی یہ خوبی ہے کہ ہم اسی کے باعث جان پاتے ہیں کہ کیا کچھ ہمارے دائرہ اختیار میں ہے اور کیا کچھ اس سے باہر ہے۔

اس نے کہا، یہ تو سچ ہے۔

میں نے جواب دیا، اور اب تم کہہ رہے ہو کہ زندگی میں ایسی کوئی سائنس وجود نہیں رکھتی۔

اس نے کہا، ہاں میں تو اب بھی یہی سمجھتا ہوں۔

میں نے کہا کیا ہم یہ فرض کرلیں کہ دانائی اگر علم اور کم علمی یا جہالت میں تفریق ہی کا علم ہے تو یہ زیادہ مفید ہے۔ کیونکہ ایسا علم رکھنے والا فرد جو کچھ بھی سیکھنا چاہے گا اسے زیادہ بہتر انداز میں سیکھے گا اور اس کے علم میں آنے والی ہر شے زیادہ واضح طور پر اس کے دائرہ فہم میں آئے گی کیونکہ ایسے میں وہ دوسرے افراد کے علم کے ساتھ ساتھ مخصوص موضوع یا موضوعات کے بارے میں زیادہ جاننے لگتا ہے اور اسے یہ بھی علم ہو جاتا ہے کہ دوسرے افراد اس کے علم کے بارے میں کتنے آگاہ ہیں۔ جبکہ اس کے برعکس وہ شخص جو محض مخصوص علم جاننے کی کوشش کرتا ہے اس کی بصیرت میں کوئی خاص بہتری نہیں ہوتی، کیوں، ایسا ہی ہے ناں؟ اور کیا جب دانائی ہمیں کچھ جاننے پر قادر کر دیتی ہے تو اس کی مدد سے مزید جاننے کا شوق پیدا نہیں ہوتا۔

اس نے جواب دیا، یقیناً پیدا ہوتا ہے۔

میں نے کہا، تمھارے کہنے کے مطابق اس کا امکان واضح ہے اور اس کا امکان بھی واضح ہے کہ ہم بحث کو بے مقصد بنانے کے مرتکب ہوتے رہے ہیں کیونکہ مجھے یہ محسوس ہو رہا ہے کہ اگر دانائی کی حقیقت ہماری بحث سے ابھرنے والے تصور کے مطابق ہے تو اس سے عجیب وغریب نتائج برآمد ہونے کا امکان ہے۔ اگر تم اجازت دو تو ہم فرض کرلیتے ہیں جیسا کہ ہم پہلے ہی اس پر متفق ہو چکے ہیں کہ ایسی کوئی سائنسوں کی سائنس یا علم ہے جو ہمیں آگاہ کرتی ہے کہ ہم کیا جانتے ہیں اور کیا نہیں جانتے، پھر بھی میرا یہ شک دور نہیں ہو پارہا، عزیزم! کرائیٹیاس کہ دانائی ہمیں کچھ زیادہ فائدہ پہنچا سکتی ہے۔

میرے خیال میں اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم فرض کرتے وقت غلطی پر تھے کہ ایسی دانائی کے ذریعے گھر یا ریاست کے ماحول کو نظم وضبط دے کر ہم کوئی بڑا مقصد حاصل کرسکتے ہیں۔

وہ فوراً بولا یہ کیسے ممکن ہے؟

میں نے کہا، یہ ایسے ممکن ہے کہ ہم نے پہلے ہی سے ذہنی طور پر تسلیم کر لیا تھا کہ لوگ معلوم معاملات کو آسانی سرانجام دے لیتے ہیں جبکہ نامعلوم معاملات کے سلسلے میں دوسروں کی مدد حاصل کر لیتے ہیں جس سے انھیں اور معاشرے کو بہت فائدہ حاصل ہوتا ہے۔

اس نے کہا، اس یقین میں کیا خرابی ہے؟

میں نے کہا، میرے خیال میں خرابی ہے۔

مگر جناب سقراط، کیسے؟

میں نے کہا، ابوالہول کی قسم! یہاں تک تو میں تم سے اتفاق کرتا ہوں اور اس وقت جب میں نے حیران کن نتائج کے امکان کی بات کی تھی تو میرے ذہن میں یہ خیال تھا کہ شاید ہم بحث کے دوران اصل راہ سے بھٹک گئے ہیں کیونکہ اگر ہم دانائی کی مبینہ تعریف سے متفق ہوں تو بھی یہ سوال اپنی جگہ پر ہے کہ اس سے انسان کو کیا فائدہ ہوتا ہے۔

اس نے سوال کیا کہ اس سے آپ کا مطلب کیا ہے، کاش میں سمجھ سکوں کہ آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟

میں یہ کہنے کی جرأت کرتا ہوں کہ میں احمقانہ بات کر رہا ہوں۔ میں نے جواب دیا، مگر میں کیا کروں۔ انسان اپنے ذہن میں آئے ہوئے خیالات سے تو چھٹکارا نہیں پا سکتا، خواہ وہ خیال کتنا ہی احمقانہ کیوں نہ ہو۔ اسے چاہیے کہ اپنے ذہن میں پیدا ہونے والے خیال کو پرکھے اور جانچے بغیر جانے نہ دے۔

وہ بولا، یہ بات تو میں خود بھی پسند کرتا ہوں کہ ہر خیال کو اچھی طرح پرکھ لوں۔ میں نے کہا، ایسی صورت میں، میں اپنا خواب بیان نہیں کر سکتا خواہ وہ کتنا ہی حیران کن پس منظر کا حامل کیوں نہ ہو، اور وہ خواب کچھ یوں ہے کہ فرض کیجیے دانائی ایسی ہی کوئی شے ہے جیسی ہم نے اپنی گفتگو کے ذریعے تصور کی ہے اور اس کا انسانی زندگی پر مکمل کنٹرول ہے اور اس کی موجودگی میں ہر انسانی کام کسی علم یا فن کے مطابق سرانجام پاتا ہے اور اسی صورت حال کا نتیجہ ہے کہ انسان جو کچھ نہیں ہے اس کے بارے میں کسی رائے کا اظہار کر سکتا ہے نہ کوئی فتویٰ دے سکتا ہے اور اگر وہ ایسا کرنے کی کوشش کرے گا تو یقیناً ہمیں دھوکا دے رہا ہوگا۔ اس کے برعکس ہماری صحت بہتر ہوگی، ہمیں خشکی اور سمندری سفر میں تحفظ حاصل ہوگا۔ ہمارے لباس، جوتے اور دیگر ضروریات کی اشیا بہترین صورت میں حاصل ہوں گی۔ بشرطیکہ ان میدان ہائے عمل میں کارندے بہترین صلاحیتوں کے مالک ہوں۔ اس میں تو کوئی شک نہیں اور اگر تم چاہو تو یہ بھی فرض کر لو کہ فن پیشین گوئی یا الہام

مستقبل کے علم کو کہتے ہیں، لہٰذا اسے لازمی طور پر دانائی کے دائرہ عمل میں ہی ہونا چاہیے کیونکہ دانائی کے ذریعے ہی انسان جھوٹے اور حقیقی مستقبل بینوں کے درمیان امتیاز کر سکتا ہے اور حقیقی پیشین گوئیوں کو مستقبل کے حوالوں سے پرکھ سکتا ہے۔ اس لیے مجھے پختہ یقین ہے کہ جن افراد کو دانائی عطا ہوتی ہے وہ علم کی روشنی سے منور زندگی گزارتے ہیں کیونکہ دانائی انسان کو جہالت اور کم علمی کے شکنجے سے نجات دلاتی ہے مگر عزیزم کرائیٹیاس، سچ تو یہ ہے کہ ہم اب تک یہ طے نہیں کر پائے کہ آیا خالص علم واقعی ہماری زندگی کو خوشگوار اور اطمینان بخش بنا سکتا ہے یا نہیں۔

اس نے جواب دیا، میرا خیال ہے کہ اگر آپ علم کی نفی کر دیں گے تو دنیا میں اور کون سی شے آپ کو خوشی عطا کر سکتی ہے۔

میں نے کہا، آخر علم ہے کیا؟ کیا تم مجھے بظاہر اس چھوٹے سے سوال کا جواب دے سکتے ہو۔ کیا ہم جوتے بنانے کو مکمل علم کہہ سکتے ہیں؟

اس نے کہا، ہرگز نہیں۔

تو کیا پیتل کی اشیا بنانے کو۔

تو کیا اون، لکڑی یا ایسی اشیا سے مختلف چیزیں بنانے کے فن کو خالص علم کہیں گے؟

اس نے کہا، میں نہیں سمجھتا کہ ایسا ہے۔

میں نے کہا، ایسی صورت میں ہمیں اس اصول کو رد کرنا پڑے گا کہ ایک دانا شخص ہی خوش باش زندگی گزار سکتا ہے، کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو یہ سب لوگ خوش باش ہوتے کیونکہ یہ اپنے اپنے علم کے مطابق زندگی بسر کر رہے ہیں اور ہم ایسے دانا اشخاص کو اپنے آس پاس نہ پاتے جنھیں شاید ہی کبھی خوشی نصیب ہوئی ہو مگر شاید تمھارے نزدیک خوش باش لوگوں سے ان کی کوئی خاص قسم مراد ہے جو علم کی روشنی میں زندہ رہتے ہیں، کیا تم محض ایک پیشین گوئی کرنے والے شخص کو ہی خوش و خرم خیال کرتے ہو اور وہ بھی صرف اس وجہ سے کہ وہ مستقبل میں جھانک سکتا ہے۔ کیا تم ایسے ہی شخص کے بارے میں کہتے ہو یا کوئی مثال بھی تمھاری نظر میں ہے؟

ہاں میری مراد ایسے ہی لوگوں سے ہے مگر کچھ اور افراد بھی اس دائرے میں آتے ہیں۔

ہاں شاید۔ میں نے کہا، ایسے لوگ جو مستقبل کے علاوہ ماضی اور حال کا علم بھی رکھتے ہیں۔

گویا وہ کسی بات سے بھی لاعلم نہیں؟ اور اگر فرض کر لو کہ واقعی ایسا کوئی شخص ہے تو کیا تمھارے خیال میں وہ دنیا کا عاقل ترین فرد ہوگا؟

ہاں! میں اسے دنیا کا دانا ترین شخص سمجھتا ہوں۔

تب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس کے علم کا کوئی مخصوص جز وا سے خوشی عطا کرتا ہے یا علم کا ایک ایک گوشہ خوشی کا منبع ہوتا ہے؟

اس نے جواب دیا۔علم کے تمام اجزا برابر خوشی عطا نہیں کرتے۔

مگر کیا تم علم کے اس مخصوص جزو کی نشاندہی کر سکتے ہو جو ایک عالم کو سب سے زیادہ خوشی عطا کرتا ہے؟ کیا وہ جز و ماضی، حال اور مستقبل کے بارے میں آ گاہی ہو سکتا ہے یا اس سے یہ بھی اخذ کیا جا سکتا ہے کہ چوسر (draughts) کے کھیل سے مکمل طور پر واقفیت بھی اس زمرے میں آ سکتی ہے؟

اس نے کہا، ڈرائس (چوسر) کے کھیل کے سلسلے میں تو یہ ایک احمقانہ خیال ہے۔

میں نے پوچھا، گنتی یعنی حساب کتاب کے بارے میں کیا خیال ہے؟

اس نے کہا، یہ بھی اس کے زمرے میں نہیں آتا ہے۔

اور صحت یا علم الصحت؟

ہاں اس پر اس کا کچھ نہ کچھ اطلاق ہو سکتا ہے۔

اور وہ علم جو تمام فنون کے قریب ترین ہو، وہ کون سا علم ہوگا۔

یہ خیر اور شر کے درمیان امتیاز کا علم ہے۔

میں نے کہا، ارے تم مجھے ان باتوں میں الجھائے جا رہے ہو اور اصل حقیقت کے قریب بھی پھٹکنا نہیں چاہتے یا شاید مجھ سے کچھ پوشیدہ رکھنا چاہتے ہو اور میرے خیال میں حقیقت یہ ہے کہ علم کے مطابق زندگی وہ نہیں جس میں لوگ نیک اعمال کریں اور خوش رہیں۔ خواہ ایسے علم میں دنیا بھر کی سائنس ہی شامل کیوں نہ ہو بلکہ فقط ایک سائنس اس کے لیے کافی ہے بشرطیکہ انسان خیر و شر میں تمیز کرنے کے قابل ہو سکے اور جناب کرائیٹیاس! اگر اس بات کو مان لیا جائے تو ذرا سوچو! جس طرح دوا انسان کو صحت عطا کرتی ہے اور دکھ و تکلیف سے نجات دلاتی ہے، اسی طرح جوتا بنانے والے کا علم اور کپڑے تیار کرنے والے کا علم، اسے زندگی کی آسائش فراہم کرتا ہے۔ یا کیا ناخدا کی مہارت سمندر کی سطح پر اور ایک جنرل کا علم اور تجربہ میدان جنگ میں ہماری زندگی کے تحفظ کا ذمہ دار نہیں؟

اس نے کہا، یہ تو ہے۔

مگر عزیزم کرائیٹیاس! یہ تمام کام خواہ بحسن و خوبی سرانجام پا جائیں لیکن اگر ان میں خیر کا پہلو نہ ہو تو

نتائج کو مثبت کیسے کہا جاسکتا ہے؟

اس نے کہا، آپ درست فرما رہے ہیں، مگر ایسی سائنس محض دانائی یا اعتدال ذات نہیں بلا۔ یہ انسانی بہبود کی سائنس ہوسکتی ہے، نہ ہی دیگر سائنسوں کے علوم یا کم علمی کو سمجھنے پر مشتمل سائنس اس کے ذیل میں آسکتی ہے بلکہ یہ کام محض خیر و شر کے علم کا ہے اور اگر یہ سائنس زندگی کی رہنمائی کا کردار اچھے طریقے سے انجام دیتی ہے تو پھر دانائی اور اعتدالِ ذات کا کیا کام۔

اس نے پوچھا، آپ دانائی کو غیر مفید کیسے قرار دے سکتے ہیں؟ کیونکہ خواہ ہم کتنا ہی پختہ یقین رکھیں کہ دانائی سائنسوں کی سائنس اور علم العلوم ہے اور دوسری سائنسوں اور علوم پر اثر انداز بھی ہوتی ہے تو ایسی صورت میں کیا خیر کا پہلو اس سائنس کے زیر اثر نہیں ہوگا اور اس طرح دانائی کو انسانی زندگی کے لیے مفید مطلب نہیں بناتا؟

میں نے کہا تو کیا تم سمجھتے ہو کہ دانائی انسان کو صحت عطا کرسکتی ہے؟ کیا یہ کام دواؤں کا نہیں ہے؟ اور کیا محض دانائی کے ذریعے انسان دیگر فنون میں مہارت کا اظہار کرسکتا ہے؟ کیا یہ کام خود ان فنون کے نہیں ہیں؟ کیا ہم پہلے ہی اس امر پر متفق نہیں ہو چکے کہ دانائی سے انسان کو اپنی علمیت اور کم علمی کا اندازہ اور احساس ہوتا ہے اور کچھ نہیں؟

اس نے کہا، یہ امر طے شدہ ہے۔

یعنی دانائی صحت عطا کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتی؟

بالکل نہیں۔

اس صورت میں اگر دانائی سے کوئی براہ راست فائدہ نہیں تو اسے کیسے مفید کہا جاسکتا ہے؟

اس نے کہا، جناب سقراط! یہی تو سب سے بڑا اور ناقابل فہم مسئلہ ہے؟ میں نے کہا، عزیز کرائیٹیاس، میرا یہ خوف کچھ غلط نہ تھا کہ میں دانائی کے مکمل ترین تصور سے بے بہرہ ہوں بلکہ اپنی کم مائیگی کے بارے میں میرا خیال قطعی فطری تھا۔ مجھے یہ سوچ پریشان کیے ہوئے ہے کہ ایک چیز ہر لحاظ سے بہترین قرار دی جا چکی ہوتو وہ بے سود اور بے مصرف کیسے ہوسکتی ہے! اس سوال کا جواب فراہم نہ کر سکنے پر مجھے شدید احساس کم مائیگی ہوتا ہے اور اب تو جیسے میں نے مکمل طور پر شکست تسلیم کرلی ہے۔ میں سمجھ نہیں پا رہا کہ آخر وہ درحقیقت کیا ہے جسے کہنے والوں نے دانائی اور اعتدالِ ذات کا نام دیا ہے؟ ہم نے اور بھی ایسے معاملات سے اتفاق کیا تھا جن کی تصدیق نہ ہوسکی، جیسا کہ ہم نے تسلیم کیا کہ ایک شے سائنسوں کی سائنس بھی ہے، اگرچہ دلیل پوری شدت

سے اس کی نفی کرتی ہے۔ ہم نے یہ بھی فرض کر لیا تھا کہ ایسی سائنس دیگر سائنسوں کے دائرہ کار میں آنے والے علوم و فنون سے آگاہ ہے، مگر یہاں بھی دلائل نے ہمارا ساتھ نہیں دیا کیونکہ ایک دانا انسان اپنے اور اور اس کی خامیوں سے آگاہ ہوتا ہے۔ اگر چہ اس دوران ہم نے اس امکان کو مکمل طور پر نظر انداز کر دیا تھا کہ بعض اوقات لوگوں کے علم کی کیفیت کچھ ایسی ہوتی ہے کہ وہ یہ تک نہیں جانتے کہ وہ کچھ نہیں جانتے۔ کیونکہ ہم نے ایسے لوگوں کے بارے میں یہ اندازہ لگا رکھا تھا کہ انھیں معلوم ہوتا ہے کہ ان کے علم کی وسعت کہاں تک ہے اور کیا کیا معاملات ان کے دائرۂ علم سے باہر ہیں! حالانکہ اس سے زیادہ غیر حقیقی بات اور کیا ہو سکتی ہے اور اگر چہ ہم نے حقائق کی دریافت کے عمل میں تمام ذاتی خوبیوں کو استعمال کر ڈالا ہے مگر اصل حقیقت اب بھی ہماری نظروں سے پوشیدہ ہے اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ ہمیں دانائی اور اعتدال ذات جیسی خوبیوں کے کار آمد ہونے کا یقین کرنے میں بہت سی مشکلات کا سامنا ہے۔ یہ شاید اس وجہ سے ہو کہ ہم ان دو اصطلاحات کی صحیح تعریف تک نہیں پہنچ سکے اور میں نے کہا جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے مجھے زیادہ غمزدہ ہونے کی ضرورت نہیں، مگر کارمیڈس میں تمھارے لیے بہت افسردہ ہوں۔ اس لیے کہ اگر ہماری بحث کا نتیجہ یہی ہے جو بظاہر سامنے ہے تو تم اس قدر حسن ذات، دانائی اور اعتدال ذات کے مالک ہونے کے باوجود عملی زندگی میں ان خصائص سے کوئی فائدہ اٹھا نہ پاؤ گے اور اس سے بھی زیادہ دکھ مجھے اس جادو کا ہے جسے میں نے بڑی تکلیفیں جھیل کر تھریشیان سے سیکھا تھا، اس سے کوئی خاص فائدہ اٹھایا نہ جا سکے گا۔ میرا خیال ہے کہ دانائی اور اعتدالِ ذات کی حقیقت کا تعین کرنے میں مجھ سے کہیں نہ کہیں کوئی غلطی ضرور ہوئی ہے کیونکہ میں اپنے دل ہی دل میں اب بھی دانائی اور اعتدال کو خیر ہی کی ایک صورت سمجھتا ہوں اور ان خصائص کے حامل ہونے پر، عزیزم کارمیڈس تمھیں یقیناً خوش ہونا چاہیے بشرطیکہ تم درحقیقت ان کے حامل ہو۔ تاہم تمھیں اس امر کا بغور جائزہ لینا چاہیے کہ کیا واقعی تم ان کے قابل ہو اور کیا جادو کے بغیر ہی تمہارا کام چل سکتا ہے اور مجھے بے شک ایک ایسا شخص قرار دے سکتے ہو جو مدلل گفتگو کی صلاحیت سے عاری ہو اور تم اس امر پر پختہ یقین رکھو کہ تمھاری خوشی کا دار و مدار براہ راست تمھاری دانائی اور اعتدال پر ہے۔

کارمیڈس نے کہا، جناب سقراط، مجھے یقین ہے کہ میں اس عظیم نعمت یعنی دانائی اور اعتدالِ ذات کے حامل ہونے یا اس سے عاری ہونے کے بارے میں بالکل لاعلم ہوں کیونکہ جس شے کی حقیقت کی دریافت کے سلسلے میں، خود آپ کے بقول، آپ اور کرائیٹیاس جیسے افراد ناکام رہے ہیں یہ خوبی رکھنے والے یا اس سے عاری کا مجھے کیسے علم ہو سکتا ہے! (اگر چہ ضروری نہیں کہ آپ کی ہر بات پر آنکھیں بند کر کے یقین کر لوں) اور

سقراط، اگلی بات یہ ہے کہ مجھے واقعی جادو کی ضرورت ہے اور جہاں تک میرا تعلق ہے آپ روزانہ مجھ پہ جادو کرنے کے لیے وقت نکالیں، یہاں تک کہ آپ خود کہہ نہ دیں اب مزید ضرورت نہیں۔

کرائیٹیاس نے کہا، بہت خوب کارمیڈس، اگر تم ایسا کرنے لگو تو تمھارے اعتدال ذات کا ثبوت میں خود مہیا کر دوں گا۔ بشرطیکہ تم سقراط سے جادو کرواتے رہو اور اسے کبھی ترک نہ کرو۔

کارمیڈس نے فوراً کہا، آپ کو یقین ہونا چاہیے کہ انھیں ترک کرنے کی بجائے ان کا حکم بجالانا زیادہ پسند کروں گا کیونکہ آپ مجھے سرپرست کی حیثیت سے ان کے اتباع کا حکم دیں گے تو میں اس امر سے سرتابی نہ کر سکوں گا۔

اس نے کہا، میں تمھیں حکم دیتا ہوں۔

تب پھر میں آپ کے اس حکم کو بجالاؤں گا اور آج ہی سے آغاز کرنا چاہوں گا۔ میں نے کہا۔تم دونوں حضرات میرے خلاف کیا سازش کرنا چاہتے ہو۔

کارمیڈس نے کہا، ہم کوئی سازش تیار نہیں کر رہے بلکہ ہم پہلے ہی ایسا کر چکے ہیں۔

میں نے کہا تو کیا تم انصاف کی راہ اختیار کرنے کی بجائے جبر سے کام لینا چاہتے ہو؟

اس نے جواب دیا، ہاں میں تو جبر ہی کروں گا کیونکہ کرائیٹیاس نے مجھے حکم دیا ہے اور آپ پہلے ہی اس پر کافی غور و خوض کر چکے ہی۔اب مزید غور کر لیں۔

میں نے کہا، شاید غور و خوض کا وقت تو گزر چکا، کیونکہ جب تم جبر پر مائل ہو اور میں تمھارے متعلق جانتا ہوں کہ جب تم کسی بات کا تہیہ کر لو اور تم پر جبر کا موڈ طاری ہو جائے تو تمھیں کوئی نہیں روک سکتا۔

وہ بولا، تو گویا آپ احتجاج نہیں کریں گے۔

میرا جواب تھا، ہاں میں تمھارا راستہ نہیں روکوں گا۔

☆☆☆

لائیسس یا دوستی

(Lysis or Friendship)

شرکائے گفتگو

سقراط (Socrates) (جو راوی ہے): مینکس نس (Menexenus)

ہپوتھیلس (Hippothales): لائیسس (Lysis): ٹی سیپس (Ctesippus)

منظر: ایتھنز کی فصیل کی دیواروں سے باہر نو تعمیر شدہ اکھاڑا Palaestra

میں اکادمی (Academy) سے سیدھا لائیسیم (Lyceum) جا رہا تھا۔ میرا ارادہ تھا کہ میں فصیل سے [illegible] وہاں جاؤں، جب میں پینوپس (Panops) کے فوارے کے قریب شہر کے [illegible] پہنچا تو وہاں مجھے ہائرونمس (Hieronymus) کا بیٹا ہپوتھیلس اور پائینیا کا باشندہ [illegible] نوجوانوں کے ایک گروہ کے ساتھ کھڑے تھے۔ ہپوتھیلس نے جیسے ہی مجھے دیکھا تو وہ میری طرف چلا اور میرے پاس پہنچ کر پوچھنے لگا کہ میں کہاں سے آیا ہوں اور کہاں جانا چاہتا ہوں۔

میں نے کہا، میں اکادمی سے آ رہا ہوں اور سیدھا لائیسیم جا رہا ہوں۔

اس نے کہا، پس آپ سیدھے ہمارے پاس آئیں اور ہمارے پاس رہیں۔

میں نے کہا، آپ کون لوگ ہیں اور مجھے کہاں جانا ہے۔

اس نے ایک احاطے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا وہاں جانا ہے، جس کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں ہم سب جمع ہوتے ہیں اور ہماری صحبت بھی بہت اچھی ہے۔

میں نے پوچھا، یہ کیسی عمارت ہے اور آپ کے پاس اس عمارت میں تفریح کا کیا کیا سامان موجود ہے؟

اس نے جواب دیا، یہ عمارت ایک نوتعمیر شدہ اکھاڑا ہے اور ہماری تفریح کا سامان یہاں عالمانہ بحث ومباحثہ ہے اور اس میں ہم آپ کو خوش آمدید کہتے ہیں۔

میں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور پوچھا کہ وہاں کوئی استاد بھی ہے جو ان کی بحث ومباحثے میں رہتا ہے یا نہیں؟

اس نے جواب دیا، بالکل جناب، آپ کے دیرینہ دوست جناب مائیکس (Miccus) وہاں موجود ہوتے ہیں۔

بہت خوب، میں نے کہا وہ ایک بہترین اور مشہور استاد ہیں۔

وہ بولا، وہ تو ٹھیک ہے اگر آپ کے پاس وقت ہو تو میرے ساتھ آیئے تاکہ میں آپ کی ان سے ملاقات کرادوں۔ میں نے کہا، پہلے مجھے یہ بتایئے کہ آپ مجھ سے کس قسم کی شمولیت کی توقع رکھتے ہیں اور یہ بھی کہ جو لوگ اس بحث ومباحثے میں شریک ہوتے ہیں ان میں سب سے زیادہ پسندیدہ شخص کون ہے؟

اس نے جواب دیا، محترم استاد سقراط، یہ کہنا کچھ آسان نہیں کیونکہ کسی کا پسندیدہ کوئی شخص ہے تو کوئی کسی اور کو پسند کرتا ہے۔

میں نے براہ راست پوچھا آپ مجھے صحیح صحیح بتایئے کہ آپ کا پسندیدہ کون ہے؟

وہ اس اچانک جملے پر ذرا شرمایا، مگر میں نے اسے گھیرتے ہوئے کہا، ارے او ہائیرونائیمس کے بیٹے ہپوتھیلس! مجھ سے یہ نہ کہنا کہ تمھیں کسی سے محبت نہیں ہے یا تم اس سے ماورا ہو۔ کیونکہ میں تمھاری کیفیت سے بخوبی آگاہ ہوں۔ تم نہ صرف محبت کرتے ہو بلکہ اس راہ پر بہت آگے تک جا چکے ہو۔ تم بھی میری طرح کورے اور احمق ہو۔ ارے یار! مجھے دیوتاؤں کے کرم سے ایک ایسی صلاحیت میسر ہے جس کے باعث میں ایسے جذبات کو دور سے ہی پہچان لیتا ہوں۔

اس کی شرماہٹ میں مزید اضافہ ہوگیا۔

ٹیسی پس نے ہماری بات میں مداخلت کرتے ہوئے کہا، ہپوتھیلس! تم شرمائے شرمائے سے بہت اچھے لگتے ہو، مگر تم سقراط کے سامنے اپنے محبوب کا نام لیتے ہوئے کیوں شرما رہے ہو۔ ارے ہم تو اتنا جانتے ہیں کہ اگر تم تھوڑی دیر سقراط کے ساتھ رہے ہوتے تو اب تک آپ نے اپنے محبوب کی باتیں کر کے ان کا دماغ چاٹ لیا ہوتا۔

پھر وہ مجھ سے مخاطب ہو کر بولا، جناب سقراط اس شریف آدمی نے اپنے دوست لائیسس کی

ہمارے ساتھ اتنی باتیں کیں ہیں کہ ہمارے کان پک گئے ہیں اور اگر یہ نشے کی حالت میں بھی ہو تو سمجھو ہماری رات کی نیند اس کے شور کی نذر ہو گئی۔ اگر چہ وہ نثر بھی بہت خطرناک لکھتا ہے لیکن نظم میں تو۔۔۔ باتیں آتے ہے اور جب یہ مسلسل اپنی شاعری اور نثر سے ہمیں نوازتا ہے تو آپ اندازہ نہیں کر سکتے کہ ہمارا کیا حشر ہوتا ہے اور پھر اس پر مستزاد اس کا گانا۔ اے میرے خدا، اس کی آواز سخت بھدی ہے مگر کیا کریں جناب اس کا گانا سنے بغیر کوئی چارہ بھی تو نہیں۔ ذرا دیکھیے تو ہمارا دوست آپ کے سوال پر کتنا شرما رہا ہے۔

میں نے آخر پوچھ ہی لیا، بھئی آخر یہ، لائیسس کون ہے؟ میرا خیال ہے کہ وہ کافی کم عمر نوجوان ہوگا کیونکہ اس نام سے میرے ذہن میں کوئی مانوس چہرہ نہیں ابھر رہا۔

کیوں؟ وہ بولا، اس کا باپ ایک مشہور شخص ہے اور اسی لیے ہمارا نوجوان دوست (بلکہ ہمارے دوست ہپو تھیلس کا محبوب) ابھی باپ ہی کے نام سے پہچانا جاتا ہے کیونکہ لوگ ابھی اسے خود اس کے نام سے نہیں پہچانتے۔ تاہم مجھے یقین ہے کہ اگر چہ آپ اس کا نام نہیں جانتے مگر اسے دیکھتے ہی پہچان لیں گے کیونکہ اس کا چہرہ مہرہ بالکل منفرد ہے۔ میں نے بے چینی سے پوچھا، ارے بھئی یہ تو بتائیں کہ وہ ہے کون اور کس کا بیٹا ہے؟

وہ ایکسن (Aexone) کے ایک علاقے (سب ڈویژن) کے مشہور شخص ڈیموکریٹس (Democrates) کا بڑا بیٹا ہے۔

اوہ! ہپو تھیلس! میں نے کہا، آپ نے تو بہت اونچا ہاتھ مارا ہے۔ آپ کا محبوب ایتھنز کے شرفاء کے گھرانے سے تعلق رکھتا ہے۔ میری خواہش ہے کہ جس طرح آپ نے اپنے دوسرے ساتھیوں کو اس سے ملوایا ہے اسی طرح مجھے بھی اس کا دیدار کرا ہی دیجیے اور پھر میں آپ کو شاید بتا سکوں گا کہ ایک محبوب کے بارے میں ایک چاہنے والا کن الفاظ میں اس نوجوان کی محبت اور دوسروں کی اس سے محبت کے بارے میں اظہار خیال کرتا ہے۔

ہپو تھیلس نے کہا، نہیں سقراط، اس بے وقوف کی باتوں کو اہمیت نہ دیجیے!

میں نے کہا، کیا اس بات سے یہ مطلب لیا جائے کہ آپ کی جس مبینہ محبت کا ذکر کیا گیا ہے وہ حقیقت نہیں ہے؟

اس نے ذرا کمزور لہجے میں کہا، نہیں ایسی بھی کوئی بات نہیں۔ مگر مجھے اس بات سے انکار ہے کہ میں اس کے فراق میں شاعری کرتا اور گاتا پھرتا ہوں۔

سٹیسی پس نے کہا، آپ نے دیکھا یہ اس وقت بھی اس کے فراق میں اپنے آپ میں نہیں اور یہ ایسی بہکی بہکی باتیں کر رہا ہے۔ یہ تو اس کے عشق میں دیوانہ ہو جاتا ہے۔

میں نے ہپوتھیلیس سے کہا، جناب! آپ نے اپنے محبوب کی شان میں جو قصیدے کہے ہیں تو فرمت کیجیے، میں انھیں سننے کے موڈ میں نہیں ہوں۔ مگر میں ان نظموں اور گیتوں کا مضمون جاننا چاہوں گا تا کہ میں ان کے ذریعے تمھارے محبوب کے بارے میں تمھارے خیالات کا اندازہ لگا سکوں۔

وہ بولا، سٹیسی پس آپ کو بہتر بتا سکتا ہے کیونکہ جیسا کہ اس نے بتایا کہ میری باتیں سن سن کے کان پک گئے ہیں تو اس سے صاف ظاہر ہے کہ میرا کہا ہوا ہر لفظ اس کے ذہن میں محفوظ ہوگا۔

سٹیسی پس نے فوراً کہا، ہاں بالکل میں صرف دو باتوں کو اچھی طرح سے دہرا سکتا ہوں اور یہ بڑی بہت اوٹ پٹانگ سی ہے۔ اگر چہ وہ خود کو چاہنے والا کہتا ہے اور اپنی محبت کو مکمل خلوص اور جذبے سے نبھائے چلا جا رہا ہے مگر اس کے پاس اسے بتانے یا سنانے کو کچھ نہیں۔

اب دیکھیے ناں، یہ بات کتنی فضول ہے کہ یہ اپنے محبوب کے حسن کی بات کرنے کی بجائے اس کے باپ ڈیموکریٹس کی دولت جو کہ شہر کا ایک معزز ہے، لائیسس کے دادا کی بہادری، اس کے آباؤ اجداد کی پِتھیان (Pythian)، استھمس (Isthmus) اور نیمیا (Nemea) میں جادوگرانہ کھیلوں میں کارناموں، ان کی گھڑ سواری اور ایک ایک یا چار چار گھوڑوں والے ان کے آرتھوں کی بات کرے گا اور مزے کی بات یہ ہے کہ یہ اپنے ہر تازہ کلام میں ان ہی چیزوں کو دہراتا ہے اور اس سے بھی بڑی بکواس تو ابھی باقی ہے۔ پرسوں اس نے ایک قصیدہ کہا ہے جس میں ان حضرت نے ہراکلس (Heracles) کی ایک دعوت کا بیان کیا جاتا ہے جو لائیسس کے خاندان کے دور پار کے رشتہ دار کی آؤ بھگت کے ضمن میں کی گئی تھی۔ لائیسس کے اجداد کے حوالے سے جن بزرگ کا ابھی ذکر ہوا ہے، وہ زیوس (Zeus) کے پیرو تھے اور وہ بھی اس قدیم محلے کے بانی کی بیٹی کے حوالے سے اور ایسی ہی بڑی بوڑھیوں جیسی کہانیاں ہیں جن پر مشتمل گیت یہ حضرت گاتے پھرتے ہیں اور ہمیں سناتے ہیں اور ہم انھیں سننے پر مجبور ہیں!

میں نے یہ سب کچھ سن کر کہا، ارے او اوٹ پٹانگ، ہپوتھیلس! کسی بھی کامیابی کو حاصل کرنے سے پہلے آپ یہ سب خودستائی کے ترانے خود اپنی ہی ذات کے اعزاز میں کیسے کہہ لیتے ہو؟

اس نے کہا، محترم سقراط، گویا یہ گیت اور نغمے میرے اپنے اعزاز میں تو نہیں ہیں۔ اس نے کہا۔

میں نے جواب دیا، آپ کا خیال ہے کہ نہیں ہیں۔

وہ بولا، نہیں، مگر آپ کیا سمجھتے ہیں؟

میں نے کہا، مجھے یقین ہے کہ یہ تمام گیت اور نغمے خود آپ کے اپنے اعزاز میں ہیں۔ لہٰذا جب ان نغموں کے ذریعے آپ اپنے محبوب کی محبت حاصل کریں گے تو یہ آپ کی ہی کامیابی شمار ہوگی اور جب لوگ یہ کہیں کہ یہ سب گیت فلاں شخص کی شان میں ہیں جس نے ایسے انوکھے محبوب کی محبت جیتی ہے اور بدقسمتی سے وہ محبوب آپ کے ہاتھ سے نکل جائے تو آپ نے اس کی تعریف میں جس قدر زمین و آسمان کے قلابے ملائے ہوں گے اتنا ہی زیادہ آپ کو احساس زیاں بھی ہوگا۔ اس لیے سمجھ دار عاشق کبھی بھی اپنے محبوب کی تعریف میں لب نہیں کھولتا جب تک کہ وہ اس کا التفات حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہو جائے کیونکہ دوسری صورت میں حادثات رونما ہوتے رہتے ہیں۔ اس صورت حال میں اور بھی نقصان ہوتا ہے وہ یہ کہ جب کسی کم عمر اور ناتجربہ کار محبوب کی زیادہ تعریف کر دی جائے تو وہ بہت زیادہ مغرور ہو جاتا ہے۔ کیا آپ کو میری ان باتوں سے اختلاف ہے؟

وہ بولا، ہرگز نہیں۔

اور ایسے نوعمر محبوبوں کی زیادہ تعریف کے باعث جتنی زیادہ شہرت ہوگی اتنا ہی ان کا حصول عاشق کے لیے مشکل ہوتا جائے گا۔

اس نے کہا، مجھے آپ کی بات کا یقین ہے۔

آپ ایسے شکاری کے بارے میں کیا کہیں گے جو اپنے شکار کو ڈرا کر ان پر گرفت کو مزید مشکل بنا دیتے ہیں۔

اس نے کہا، یقیناً وہ نہایت ناکام شکاری ہوگا۔

بالکل درست! اسی مثال کو سامنے رکھتے ہوئے اگر کوئی اپنے محبوب کو اپنی باتوں سے خوش کرنے کی بجائے انھیں اپنی تلخ و ترش باتوں سے ناراض کر دے تو اس عاشق کی حماقت میں بھی کوئی کلام نہیں ہونا چاہیے! آپ کا اس بارے میں کیا خیال ہے؟

میں آپ سے متفق ہوں۔

اور ہپوتھیلس! ذرا یاد کر کے بتائیے کہ کیا شاعری کی وجہ سے آپ نے غلطی نہیں کی؟ کیونکہ میرے خیال کے مطابق آپ کسی ایسے شاعر کو عقل مند نہیں کہہ سکتے جو اپنی شاعری کے نشتر سے خود کو ہی زخمی کر ڈالے؟

اس نے کہا یقیناً! ایسا شاعر یقیناً بے وقوف کہلانے کا اور محترم سقراط! [illegible] آپ کو اپنا رہبر بنانا چاہتا ہوں اور اگر اس سلسلے میں آپ میری مزید رہنمائی کریں گے تو میں تہہ دل سے آپ کا شکر گزار ہوں گا۔ کیا آپ مجھے بتا سکتے ہیں کہ میں کن باتوں اور کن کاموں سے زیادہ جرأت کے ساتھ اپنے محبوب کا التفات حاصل کر سکتا ہوں؟

میں نے جواب دیا، یہ بتانا آسان نہیں۔ البتہ اگر آپ اپنے محبوب سے میری ملاقات کروا دیں تو میں اس سے گفتگو کر کے آپ کو عملی طور پر بتا سکتا ہوں کہ یہ بیکار کی شاعری کرنے کی بجائے آپ محض قوت گفتار سے کیسے اپنے محبوب کو رام کر سکتے ہیں۔

اس نے کہا، اسے آپ کے پاس لانا کوئی مشکل بات نہیں۔ آپ بس اتنا کیجیے کہ سٹیسی پس کے ساتھ اکھاڑے میں چل کر بیٹھیے اور اپنی بحث وتمحیص کا آغاز کریں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ خود ہی آپ کی محفل میں چلا آئے گا، کیونکہ اسے عامانہ گفتگو سننے کا دیوانگی کی حد تک شوق ہے اور محترم سقراط، چونکہ آج کل ہرمیا (Hermaea) کا تہوار جاری ہے اس لیے نوجوان مرد اور لڑکے سب وہاں موجود ہیں اور اس اجتماع پر کوئی پابندی بھی نہیں۔ وہ یقیناً آئے گا اور اگر فرض کریں کہ وہ نہ آئے تو سٹیسی پس سے کہو کہ اسے بلا لائے کیونکہ وہ اسے اچھی طرح جانتا ہے اور سٹیسی پس کا چچازاد مینکس نس بھی لائیسس کا گہرا دوست ہے۔

میں نے کہا، ٹھیک ہے اور میں سٹیسی پس کو ساتھ لے کر اکھاڑے میں داخل ہو گیا باقی لوگ بھی پیچھے پیچھے آ گئے۔

جب ہم اکھاڑے میں داخل ہوئے تو ہم نے دیکھا کہ لڑکے، دعا اور قربانی کرنے میں مصروف ہیں اور جیسا کہ قربانی کی رسم اختتام پذیر ہونے والی تھی، وہ سب سفید لباس میں تھے اور پانسوں پر ان کے کھیل جاری تھے۔ ان میں سے اکثر بیرونی صحن میں کھیل کود میں مصروف تھے جبکہ کچھ اکھاڑے کے ایک کونے میں اکٹھے ہو کر پانسوں کے نمبروں کی مدد سے جفت طاق کھیل رہے تھے۔ انھوں نے پانسوں کو بید کی باسکٹ سے نکال لیا تھا، ان کے آس پاس تماش بینوں کی بھیڑ لگی ہوئی تھی، ان میں لائیسس بھی تھا۔ وہ دوسرے نوجوانوں کے ساتھ وہاں کھڑا تھا۔ اس کے سر پر ایک خوبصورت سا تاج تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ خوبصورتی اور شرافت اس کے تمام وجود اور چہرے پر جھلک رہی تھی۔ ہم انھیں چھوڑ کر کمرے کے دوسرے کونے میں جا کر بیٹھ گئے جہاں ذرا سکون اور خاموشی تھی۔ وہاں ہم نے اپنی بحث کا آغاز کیا۔

میں نے دیکھا، لائیسس ہماری جانب متوجہ ہے اور بار بار مڑ کر ہماری گفتگو سن رہا ہے، ظاہر تھا کہ

وہ ہماری صحبت میں آ کر بیٹھنے اور بحث سے لطف اندوز ہونے کے لیے بے قرار ہے۔ وہ کچھ دیر جھجکتا رہا جیسے ہماری محفل میں اکیلے آتے ہوئے گھبرا رہا ہو۔ جیسے ہی اس کا دوست مینکس نس اکھاڑے میں داخل ہوا، اس نے مجھے اور سٹیسی پس کو ایک کونے میں بیٹھے دیکھا تو ہماری طرف چلا آیا اور ہمارے قریب ہی نشست سنبھال لی۔ لائیسس بھی اس کے پیچھے پیچھے چلا آیا اور اس کے پہلو میں بیٹھ گیا۔ دوسرے لڑکے بھی ان میں شامل ہو گئے۔ میں دیکھ رہا تھا کہ ہپوتھیلس نے جب ہمارا مجمع دیکھا تو اس کے پیچھے چھپ گیا، شاید وہ لائیسس کی نگاہوں سے اوجھل رہنا چاہتا تھا، اس ڈر سے کہ وہ ناراض نہ ہو جائے۔ بس وہ لوگوں کے پیچھے کھڑا ہو کر ہماری گفتگو سننے میں محو ہو گیا۔

میں نے مینکس نس کی جانب توجہ کرتے ہوئے پوچھا، بیٹے تم دونوں جوانوں میں سے بڑا کون ہے؟

وہ بولا، یہ ہمارے لیے ایک حل طلب سوال ہے۔

میں نے پوچھا کیا یہ بھی طے ہونا باقی ہے کہ تم میں سے کون زیادہ باوقار ہے۔

اس نے کہا، بالکل۔

میں نے کہا، ایک تنازع اور بھی ہو سکتا ہے اور وہ یہ کہ تم دونوں میں سے زیادہ خوبصورت کون ہے۔

یہ سن کر دونوں لڑکے ہنس پڑے۔

میں نے کہا، میں یہ نہیں پوچھوں گا کہ تم میں سے زیادہ دولتمند کون ہے کیونکہ آپ دونوں ایک دوسرے کے دوست ہیں، یہی ہے ناں؟

دونوں کا ایک متفقہ جواب تھا، یقیناً ایسا ہی ہے۔

میں نے کہا، ظاہر ہے دوستوں کی ہر شے مشترک ہوتی ہے، اس لیے آپ دونوں میں سے کوئی بھی امیر تر ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ بشرطیکہ آپ ایک دوسرے کے سچے دوست ہوں۔

انھوں نے میری بات کو تسلیم کیا۔ ابھی میں ان سے یہ پوچھنا ہی چاہتا تھا کہ ان میں سے کون زیادہ منصف مزاج ہے اور کون دوسرے کے مقابلے میں زیادہ عقلمند ہے کہ اسی اثنا میں کسی نے باہر سے آ کر کہا کہ مینکس نس کو کسی نے آواز دی کہ جمناسٹک ماسٹر اس کو بلا رہے ہیں۔ میں نے فرض کر لیا کہ اسے ابھی قربانی کرنا ہوگی۔ اس کے باہر جانے کے بعد میں لائیسس سے مخاطب ہوا اور اس سے مزید سوالات پوچھے۔ مثلاً میں نے کہا، لائیسس میرے خیال میں آپ کے ماں باپ آپ کو بہت پیار کرتے ہوں گے؟

اس نے جواب دیا، بے شک کرتے ہیں۔

میں نے کہا، اور وہ یہ بھی چاہتے ہوں گے کہ آپ ہر وقت خوش وخرم رہیں۔

جی ہاں۔

مگر کیا آپ سمجھتے ہیں کہ ایک ایسا شخص جو غلام ہو یعنی اپنی مرضی سے نہ کچھ کرسکتا ہو، نہ کہیں آ جا سکتا ہو، وہ خوش رہ سکتا ہے؟

اس نے وثوق سے کہا۔ میرا خیال ہے وہ خوش نہیں رہ سکتا۔

میں نے کہا۔ اور اگر آپ کے والدین آپ سے محبت کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ آپ خوش رہیں تو اس میں تو شک نہیں ہونا چاہیے کہ وہ آپ کو خوشی کا ہر ممکن موقع فراہم کرتے ہوں گے۔

وہ بولا۔ بالکل کرتے ہیں۔

تو کیا وہ آپ کو سب کچھ آپ کی اپنی مرضی کے مطابق کرنے کی اجازت دیتے ہیں اور جو کچھ بھی آپ کرنا چاہیں اس میں نہ رکاوٹ ڈالتے ہیں نہ ناراضگی کا اظہار کرتے ہیں؟

بظاہر تو یہ صحیح ہے جناب سقراط! مگر فی الحقیقت بہت سی چیزیں ایسی ہیں جن پر وہ مجھے عمل کرنے سے منع کرتے رہتے ہیں۔

میں نے کہا۔ کیا مطلب؟ یعنی وہ آپ کو خوش بھی دیکھنا چاہتے ہیں اور آپ کو اپنی مرضی سے کچھ کرنے بھی نہیں دیتے؟ مثلاً یہ کہ اگر آپ اپنے والد کی کسی پر سوار ہو جائیں اور اس کی باگیں اپنے ہاتھ میں لے کر اسے اپنی مرضی سے چلانا چاہیں تو وہ آپ کو اس کی اجازت نہیں دیں گے۔ گویا وہ چاہیں گے کہ آپ ایسا نہ کر پائیں۔

وہ بولا۔ یقیناً! وہ مجھے ہرگز ایسا نہیں کرنے دیں گے۔

میں نے کہا۔ ایسی صورت میں وہ کس کو اجازت دیں گے؟

اس نے کہا۔ ہمارا باقاعدہ ایک رتھ بان ہے جسے میرے والد تنخواہ دیتے ہیں۔

اس پر میں نے کہا۔ گویا وہ ایک عام آدمی کو رتھ چلانے کی اجازت دے دیں گے مگر آپ کو نہیں دیں گے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ اس پر آپ کے مقابلے میں زیادہ بھروسا کرتے ہیں؟ اور یہ کہ وہ گھوڑوں کے ساتھ جو چاہے سلوک کرے اس کو اس کی اجازت ہوگی اور اس کے لیے وہ اسے باقاعدہ تنخواہ بھی دیتے ہیں؟

اس نے کہا۔ بالکل دیتے ہیں!

میں نے کہا۔ اور فرض کیجیے آپ خچر گاڑی کو کوڑے کی مدد سے ہانکنا چاہیں تو [illegible] اجازت دی جائے گی؟"

وہ بولا۔ میرا نہیں خیال کہ وہ ایسا کریں گے۔

تو کیا اس سے یہ مطلب لیا جائے کہ وہ چاہتے ہیں کہ خچروں کے لیے کوئی بھی [illegible] صرف ایک شخص یعنی خچر گاڑی کا گاڑی بان۔

کیا وہ کوئی غلام ہے یا آزاد؟

وہ ایک غلام ہے۔

تو کیا وہ ایک غلام کو آپ پر، جو ان کا اپنا بیٹا ہے، اولیت دیتے اور اس کا زیادہ خیال رکھتے ہیں [illegible] کیا وہ اپنی جائیداد کے بارے میں بھی اس پر تمھارے مقابلے میں زیادہ بھروسا کرتے ہیں کیونکہ اسے تو جو وہ چاہتا ہے اس کی اجازت ہوتی ہے جبکہ آپ پر وہ پابندی لگاتے ہیں۔ مجھے ابھی جواب دیجیے کہ کیا آپ اپنی مرضی کے خود مالک ہیں۔

نہیں۔ اس نے کہا، وہ مجھے اس کی اجازت بھی نہیں دیتے۔

آپ کا کوئی ماسٹر ہے؟

ہاں مجھے ایک ٹیوٹر کی مدد حاصل ہے۔ یہ رہے میرے!

کیا یہ بھی ایک غلام ہے؟

اس نے جواب دیا۔ یقیناً یہ ہمارا غلام ہی ہے۔

میں نے کہا۔ کیا آپ یہ یقین کے ساتھ کہہ رہے ہیں؟" گویا یہ کس قدر انوکھی بات ہے کہ ایک غلام ایک آقا پر حاکم ہے۔ آپ کے حوالے سے اس کے کیا فرائض ہیں؟

انھی کی نگرانی میں میں اپنے اساتذہ کے پاس جاتا ہوں۔

کیا آپ کو اندازہ ہے کہ آپ کے اساتذہ بھی آپ پر حکومت کرتے ہیں؟

جی ہاں یقیناً کرتے ہیں۔

اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ آپ کا باپ آپ پر ہر طرح کے نگران مقرر کرنا پسند کرتا ہے مگر جب آپ گھر پہنچتے ہیں تو آپ کی ماں آپ کو ہر طرح کی آزادی دیتی ہے اور کسی طرح کی پابندی لگانا پسند نہیں کرتی

کہ آپ کو ہر طرح سے خوشی اور اطمینان حاصل رہے۔ یہاں تک کہ ان کی اولاد بننے سے پہلے وہ بیش معمولی معمولی اشیا بھی آپ کی دسترس میں رہتی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ آپ کو لکڑی کی پوشاک، اپنی کنگھی اور بدن کی دیگر اشیا کو چھونے کی اجازت بھی دیتی ہوں گی۔

نہیں سقراط! اس نے ہنستے ہوئے کہا، نہ صرف یہ کہ وہ مجھے ان چیزوں کو چھونے کی اجازت نہیں دیتیں بلکہ یہ کہ اگر میں چھولوں تو مجھے مارتی بھی ہیں۔

خوب! میں نے کہا، یہ تو بڑی حیرت انگیز بات ہے۔ کیا آپ نے کبھی اپنی ماں کے ساتھ کسی قسم کی بدسلوکی یا گستاخی کی ہے؟

کبھی بھی نہیں! اس کا جواب تھا۔

میں نے کہا۔ تب پھر وہ آپ کو ہر طرح کی خوشی سے محروم رکھنے کے لیے اتنے شد و مد سے اہتمام کیوں کرتے رہتے ہیں؟ اور آپ کو خود اپنی مرضی کے مطابق کچھ کرنے نہیں دیتے؟ حالت یہ ہے کہ وہ چوبیس گھنٹے آپ کو کسی نہ کسی شخص کی نگرانی میں رکھتے ہیں اور یوں گویا آپ کی خواہشات کا گلا گھونٹتے رہتے ہیں۔ ان کی خواہش ہے کہ ان کی بے پناہ دولت سے آپ کو کوئی آسایش نہ پہنچنے پائے۔ کیونکہ جو کچھ ان کی ملکیت ہے اس کے سلسلے میں ایرے غیرے پر تو بھروسا کر سکتے ہیں مگر آپ پر نہیں کر سکتے۔ حالانکہ آپ کا جو یہ خوبصورت وجود ہے اسے آسایش پہنچانے کے لیے آپ کو ان کی دولت کی ضرورت ہے وہ آپ کے وجود کی دیکھ بھال کے لیے دوسروں کو مقرر کر دیتے ہیں جبکہ آپ کے تصرف میں کچھ بھی نہیں۔ یہاں تک کہ آپ کا اپنا آپ بھی نہیں۔

وہ بولا۔ وہ تو ٹھیک ہے جناب سقراط۔ مگر اس کی وجہ میری کم عمری ہے۔

میں نے جواب دیا۔ مجھے شک ہے کہ اس کی اصل وجہ آپ کی کم عمری ہے۔ کیونکہ میں دیکھتا ہوں کہ آپ کے ماں باپ نے آپ کو پہلے ہی بہت سی باتوں میں آزادی دے رکھی ہے اور اس کے لیے انھوں نے کسی خاص حد عمر کا انتظار نہیں کیا، مثلاً مجھے اندازہ ہے کہ جب کبھی کچھ لکھنے یا پڑھنے کی گھر میں ضرورت پیش آتی ہوگی تو وہ آپ ہی کو بلاتے ہوں گے۔

اس نے کہا۔ اس میں تو کوئی شک نہیں۔

میں نے کہا۔ اور یہ بھی کہ جب آپ کسی کو خط لکھتے ہوں گے تو مکتوب الیہ یا الفاظ کے انتخاب پر انھیں کوئی اعتراض نہیں ہوتا ہوگا اور اگر آپ کچھ گانا چاہیں یا کوئی ساز بجانا چاہیں تو اس کے طور طریقوں سے

متعلق بھی انھیں کوئی اعتراض نہیں ہوتا ہوگا یعنی نہ تمھاری ماں کو اور نہ باپ کو۔

یہ بھی سچ ہے۔ اس نے جواب دیا۔

میں نے کہا۔ لائیسس پھر کیا وجہ ہے کہ وہ آپ کو کچھ چیزوں کی اجازت دے کر، کچھ دوسری
چیزوں پر پابندی کیوں لگا دیتے ہیں؟

اس نے کہا۔ میرے خیال میں اس کی وجہ یہ ہے کہ میں بعض باتوں کو اچھی طرح سمجھتا ہوں مگر بعض
دوسری میری سمجھ سے بالاتر رہتی ہیں۔

میں نے فوراً کہا۔ یہی بات ہے۔ میرے دوست لائیسس! میں بھی یہی کہنا چاہتا ہوں کہ یہ عمر کی
بات نہیں ہے۔ بلکہ یہ علم کی بات ہے۔ جس روز بھی آپ کے والد کو یہ یقین آ جائے گا کہ آپ علم اور ذہانت
میں ان سے آگے بڑھ گئے ہو وہ سب کچھ پورے اعتماد سے آپ کے حوالے کر دیں گے۔

وہ بولا۔ میں بھی یہی سمجھتا ہوں۔

میں نے کہا۔ ہاں! اور اپنے پڑوسی کے بارے میں کیا خیال ہے۔ کیا اس پر بھی اسی اصول کا اطلاق
نہیں ہوتا؟ میں سمجھتا ہوں کہ جس روز اسے آپ کے علم اور عقل و خرد پر یقین آئے گا وہ تمام معاملات آپ کے
سپرد کرنے پر راضی ہو جائیں گے۔

میرا خیال ہے کہ وہ (ایسی صورت میں) سب کچھ میرے سپرد کر دیں گے۔

کیا جب ایتھنز کے لوگ یہ سمجھیں گے کہ آپ علم، ذہانت اور فطانت میں اتنے طاق ہیں کہ ان کی
سیاسی اور سماجی زندگی کے معاملات کو سنبھال سکتے ہیں تو وہ بلا خوف اپنے معاملات آپ کے حوالے کر دیں
گے۔ کیا خیال ہے؟

اس نے کہا۔ آپ کا خیال درست ہے۔

میں بولا۔ ایک اور معاملہ میں آپ کے سامنے رکھنا چاہتا ہوں: ایک عظیم شہنشاہ ہے، جس کا ایک بڑا
بیٹا ہے جو ایشیا کا شہزادہ کہلاتا ہے۔ فرض کیجیے کہ میں اور آپ اس بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہو کر یہ ثابت کر
دیں کہ ہم لاجواب باورچی ہیں۔ تو کیا وہ مختلف پکوان پکانے اور انھیں خود اپنی دانست کے مطابق مناسب
برتنوں میں ڈالنے کے ضمن میں اپنے بیٹے یعنی ایشیا کے شہزادے سے کہیں زیادہ ہم پر بھروسا کرے گا؟

وہ بولا۔ یقیناً کرے گا!

ہم مٹھی بھر نمک کھانے میں ڈالنا چاہیں تو ہمیں کوئی نہیں روکے گا اور وہ اگر چٹکی بھر بھی ڈالنا چاہے گا

تو کوئی اجازت نہیں دے گا۔ ہیں ناں!

بے شک۔

اسی طرح فرض کر لیجیے شہزادے کی آنکھیں دکھنی آ جائیں تو کیا وہ شہزادے کو اجازت دے گا کہ وہ نہیں چھو بھی سکے جبکہ اسے معلوم ہو کہ شہزادہ طب کی الف ب سے بھی واقف نہیں؟

وہ اسے اجازت نہیں دے گا۔

اس کے برعکس اگر وہ ہمارے بارے میں یقین رکھتا ہو کہ ہم طب میں ماہر ہیں تو کیا وہ ہمیں اجازت نہیں دے گا کہ ہم اس کے ساتھ جو چاہے سو کریں؟ یہاں تک کہ ہم چاہے اس کی آنکھیں کھول کر ان میں راکھ ہی کیوں نہ ڈال دیں؟ کیونکہ وہ تو یہی سمجھتا ہوگا کہ جو کچھ ہم کرنے جا رہے ہیں وہی اس کے لیے بہترین اور مفید ترین ہے۔

یہ تو سچ ہے۔

اور وہ ہر معاملہ ہمارے سپرد کرنے پر تیار ہو جائے گا جس کے بارے میں اسے یقین ہو کہ ہم اس معاملہ میں اس کے یا شہزادے کے مقابلے میں زیادہ صاحب علم اور باصلاحیت ہیں؟

بالکل درست، سقراط! آپ درست کہہ رہے ہیں۔ اس نے جواب دیا۔

سو میرے عزیز لائیسس! میں نے کہا۔ آپ نے جان لیا کہ ہر اس معاملے میں لوگ ہم پر بھروسا کریں گے جس کے بارے میں ہمیں باصلاحیت سمجھتے ہوں گے اور لوگوں میں یونانی اور غیر یونانی (Hellenes and Barbarians) ہونے یا عورت اور مرد کی بھی تخصیص نہیں اور وہ ہمیں کھلی چھٹی دے دیں گے کہ ہم جو چاہیں ان کے ساتھ سلوک کریں۔ کوئی ہمارے کام میں مداخلت کا بھی نہیں سوچے گا۔ گویا ہم آزاد اور ان سب کے مالک ہوں گے اور اسی حوالے سے ان کی تمام متعلقہ اشیا بھی ہماری ہی سمجھی جائیں گی۔ کیونکہ ہم جیسے چاہیں گے انھیں اپنے کام میں استعمال کر سکیں گے۔

یقیناً اس نے کہا۔ آپ اس سے متفق ہیں؟

اور کیا ان حالات میں ہم ان لوگوں کی دوستی اور محبت حاصل کر پائیں گے جن کے لیے ہم بے سود ثابت ہوں؟

ہرگز نہیں!

گویا آپ کے ماں باپ آپ سے یا دوسرے لوگوں کے والدین ان سے ہرگز محبت نہ کریں اگر وہ

انھیں اپنے لیے بے سود پائیں؟

جی ہاں! نہیں کریں گے۔

سو میرے دوست! اگر آپ عالم اور صاحب فہم ہیں تو ہر کوئی آپ سے محبت کرے گا اور آپ کی خوشی چاہے گا۔ کیونکہ آپ اپنے علم اور عقل و خرد کے باعث ان کے لیے مفید ثابت ہو سکتے ہیں اور اگر آپ جاہل اور بے عقل ہوں گے تو دوست اور رشتہ دار تو کیا والدین بھی آپ سے محبت نہیں کریں گے اور نہ ہی آپ کے دوست ثابت ہوں گے اور اگر آپ کسی معاملے میں علم نہ رکھتے ہوں تو کیا اس سے متعلق علم پر فخر کرنے میں حق بجانب ہوں گے۔

یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ اس نے کہا۔

اور عزیزم لائیسس! اگر آپ کو استاد کی ضرورت ہے تو اس کا مطلب ہے کہ ابھی آپ دانائی کی مطلوبہ سطح تک نہیں پہنچ پائے؟

بالکل صحیح۔

اور اس لیے آپ پر کوئی فخر نہیں کرتا کیونکہ آپ کے دامن علم میں ایسی کوئی بات نہیں جس پر فخر کیا جا سکے۔

بالکل نہیں ہے! آپ نے یہ بھی درست کہا۔

جب میں نے اس کی یہ بات سنی تو ہپوتھیلیس کی طرف پلٹا، مجھ سے ایک بہت بڑی غلطی یا حماقت ہوتے ہوتے رہ گئی کیونکہ میں اس سے کہنے ہی والا تھا کہ "ہپوتھیلیس یہ ہے محبوب سے باتیں کرنے کا طریقہ۔ اسے نرم کرنے اور بلندی سے نیچے لانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ تمھاری طرح نہیں کہ تم اسے اتنی ہوا دے دیتے ہو کہ خواہ مخواہ اس کا دماغ آسمان پر پہنچ جاتا ہے۔ مگر میں نے دیکھا کہ یہ سب باتیں سن کا اس کا ذہن سخت پراگندہ ہو رہا تھا اور اس کے جوش و خروش کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا اور معاً مجھے احساس ہوا کہ وہ قریب موجود ہونے کے باوجود لائیسس کی نگاہوں سے پوشیدہ رہنے کی کوشش کر رہا تھا۔ لہٰذا فوراً ہی میں نے اپنے جملوں کا گلا گھونٹ دیا۔

اسی اثنا میں مینکس نس واپس آ کر لائیسس کے پہلو میں بیٹھ گیا اور لائیسس نے بڑے معصوم اور بچگانہ انداز میں میرے کانوں میں سرگوشی کرتے ہوئے کہا، جناب سقراط! آپ جو کچھ مجھے کہتے رہے ہیں مینکس نس سے بھی کہیے!

اور اگر آپ خود ہی اس سے یہ سب کچھ کہہ دیں، تو کیسا رہے؟ اور آپ کہہ بھی سکتے ہیں کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ آپ نے میرا ایک ایک لفظ انتہائی توجہ سے سنا اور سمجھا ہے۔

ہاں ایسا تو ہے اس کا جواب تھا۔

سو ایسا کیجیے کہ جو الفاظ جیسے آپ نے سنے ہیں انھیں من وعن یاد کر کے اس کے سامنے دہرانے کی کوشش کیجیے گا اور اگر اس میں سے کچھ آپ بھول گئے ہوں تو آئندہ ملاقات میں آپ مجھ سے پوچھ لیجیے گا۔

چلیں یہی سہی (یہ میں اسے بعد میں بتاتا رہوں گا) آپ فی الوقت اس سے کسی دوسرے موضوع پر یا اسی موضوع پر مزید باتیں کیجیے اور جب تک مجھے یہاں رہنے کی اجازت ہے مجھے بھی ساتھ بیٹھ کر سننے کا موقع اور اجازت دیجیے۔

آپ مجھ سے فرمائش کریں گے، میں نے کہا، تو میں انکار تو نہیں کر سکوں گا۔ مگر جیسا آپ کو معلوم ہے۔

مینکس نس بہت ہی جھگڑالو ہے لہٰذا جب یہ مجھے پریشان کرنے لگے تو میری مدد کیجیے گا۔

مجھے معلوم ہے کہ وہ سخت جھگڑالو ہے۔ اسی لیے تو میں چاہتا ہوں کہ آپ میرے سامنے اسے اپنے دلائل سے قائل کریں۔

آپ چاہتے ہیں کہ میں خود کو بے وقوف بناؤں؟

ہرگز نہیں۔ اس نے کہا، مگر میں یہ ضرور چاہتا ہوں کہ اسے ضرور نیچا دکھائیں۔

یہ کوئی آسان کام تو ہے نہیں۔ میں نے جواب دیا کیونکہ وہ بھی بڑی چیز ہے۔ کم از کم سٹیسی پس کا شاگرد ہے اور وہ دیکھیے سٹیسی پس خود بھی موجود ہے، شاید آپ نے اسے دیکھا نہیں؟

آپ پروا مت کیجیے۔ بس اس کے ساتھ استدلال کیجیے!

میرا خیال ہے کہ مجھے ایسا کرنا ہی پڑے گا۔ میں نے اسے جواب دیتے ہوئے کہا۔

اسی دوران سٹیسی پس نے اعتراض کرتے ہوئے کہا کہ ہم کیا کھسر پھسر کر رہے ہیں اور یہ کہ ان سے چھپا کر کیا باتیں ہو رہی ہیں؟

میں نے اسے جواب دیا۔ مجھے خوشی ہوگی۔ کہ اگر آپ ہماری گفتگو میں حصہ لیں۔ یہ لائیسس جس کی سمجھ میں میری کچھ باتیں نہیں آئیں اور اب وہ یہ چاہتا ہے کہ میں جو کچھ اس کی وضاحت میں کہوں اس میں میرا تخاطب مینکس نس سے بھی برابر ہونا چاہیے کیونکہ وہ بھی ان باتوں کو جاننے کا یقیناً خواہش مند ہوگا۔

یہ آپ اس مینکس نس ہی سے کیوں نہیں پوچھتے؟ اس نے لقمہ دیا۔

بہت اچھا جناب میں نے کہا، میں اب پوچھے لیتا ہوں! کیوں عزیزم مینکس نس جواب دیجے گا یا مجھ بیچے گا کہ میں بچپن سے خود کو ایسی باتوں کا عادی بنانے کی کوشش کرتا آیا ہوں۔ ہر شخص کی خواہشات ہوتی ہیں بعض گھوڑوں پر مرتے ہیں، بعض کتوں پر جان دیتے ہیں۔ بعض کی خواہشات سونے چاندی کے گرد گھومتی ہیں اور بعض عزت و وقار کے خواہاں ہوتے ہیں۔ اب میرا حال یہ ہے کہ ایسی اشیا تو میرے دائرہ خواہشات میں آتی نہیں۔ سو میں دوستوں کا دیوانہ ہوں۔ مجھے کوئی مرغ یا کوئل نہیں چاہیے۔ بس مجھے دوست چاہئیں۔ بہت قیمتی گھوڑوں اور شکاری کتوں پر بھی میں دوست ہی کو ترجیح دیتا ہوں۔ جی ہاں ابوالہول مصر کے مجری کتے کی قسم! میں ایک دوست پر ڈیریئس (Darius) کا تمام سونا بلکہ خود ڈیریئس کو بھی قربان کر سکتا ہوں۔ ایسے (لائیسس جیسے) دوستوں کا میں کچھ ایسا ہی دیوانہ ہوں اور جب میں آپ اور لائیسس کو اس عنفوانِ شباب کے عالم میں بے شمار خصائص سے متصف دیکھتا ہوں تو میری خوشی کا ٹھکانا نہیں رہتا۔ مجھے آپ دونوں کا ایک دوسرے کے ساتھ التفات خصوصاً اچھا لگتا ہے۔ اگرچہ میں اب عمر کے اس حصے میں ہوں کہ ایسی دوستیوں کا متحمل نہیں ہو سکتا؛ اور سچ تو یہ ہے کہ مجھے معلوم ہی نہیں کہ لوگوں کی دوستی کیسے حاصل کی جاتی ہے مگر کم از کم مجھے ایک سوال پوچھنے کی اجازت ضرور دیجیے کہ جب کوئی دوسرے سے محبت کرتا ہے تو کیا محبت کرنے والا دوست ہوتا ہے یا وہ جس سے محبت کی جائے یا پھر دونوں پر دوستی کا اطلاق ہو سکتا ہے؟

آپ کا مطلب یہ ہے۔ میں نے کہا کہ اگر دو میں سے ایک بھی دوسرے سے محبت کرے تو گویا دونوں میں دوستی کا رشتہ قائم ہو جاتا ہے۔

جی ہاں، میں تو یہی سمجھتا ہوں۔

مگر اس وقت کیا ہوگا جب ایک شخص تو محبت کرے مگر فریق ثانی اس کی محبت کو قبول ہی نہ کرے؟ کیونکہ اس کا امکان ہو سکتا ہے۔

ممکن تو ہے!

اور صرف یہی نہیں کہ محبت قبول نہ ہو بلکہ بعض اوقات تو محبت کے جواب میں نفرت ہی ملتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ بعض اوقات محبت کرنے والا اپنے محبوب کے احترام میں اس کی نفرت کو بھی قبول کر لیتا ہے۔ کیونکہ ان کی نظر میں کوئی جذبہ اس کی محبت سے قوی تر نہیں ہو سکتا۔ اسی لیے اسے اس کی بھی پروا نہیں ہوتی کہ اسے محبت کے بدلے محبت ملتی ہے یا نفرت۔ کیا یہ سچ نہیں ہے؟

وہ بولا۔ جی ہاں، بالکل ٹھیک ہے

گویا اس صورت میں ایک کی حیثیت عاشق کی ہوتی ہے اور دوسرے کی [illegible]

جی ہاں!

ایسی صورت میں آپ کس کو کس کا دوست کہیں گے؟ [illegible]

[illegible] بھی، اپنی نفرت کے باوجود دوست ہوگا؟ یا یہ کہ دونوں میں سے محبت اور دوستی [illegible]

دونوں کے دل میں محبت موجزن نہ ہو؟

میرا تو خیال ہے کہ ایسی صورت میں محبت سرے سے ہوگی ہی نہیں۔

ایسی صورت میں ہمارا بیان ہمارے سابقہ بیان سے متصادم ہے۔ کیونکہ سابقہ بیان میں ہم نے یہ کہا کہ خواہ ان میں سے کوئی ایک ہی محبت کرے تو دوستی کا رشتہ قائم ہو جائے گا۔ جبکہ اب ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ جب تک دونوں کے سینوں میں جذبۂ محبت موجزن نہ ہو ان کے درمیان دوستی کے رشتے کا وجود تسلیم کرنا ممکن نہیں۔

آپ کی یہ بات بھی سچ ہی لگتی ہے۔

گویا جب تک محبت کا جواب محبت میں نہ ملے کوئی محبوب نہیں کہلا سکتا۔ کیوں ہے نا یہ بات؟

میرا بھی یہی خیال ہے کہ نہیں کہلا سکتا۔

پھر ان لوگوں کو جو گھوڑوں کو پسند کرتے ہیں انھیں عاشق (Lovers of Loves) کہنا کہاں تک مناسب ہے کیونکہ گھوڑے تو ان کی محبت کا جواب دینے سے قاصر ہی ہوتے ہیں؟ یہی حال دوسری اشیا یعنی خوش آواز پرندوں، شکاری کتوں، شرابوں اور جمناسٹک مشقوں کا ہے کہ انھیں ہم چاہے جس قدر چاہیں ان کی طرف سے مثبت یا منفی ردعمل کی توقع نہیں کر سکتے۔ اسی طرح جو لوگ دانائی سے محبت کرتے ہیں وہ بھی اس وقت تک دانائی کے عاشق نہیں کہلا سکتے جب تک دانائی ان سے محبت نہ کرے۔ البتہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ لوگ ان اشیا سے محبت کرتے ہیں اگرچہ وہ جواب میں محبت کرنے سے قاصر رہتی ہیں۔ اس لحاظ سے وہ شاعر بھی راہِ راست پر نہیں ہے جو گایا کرتا تھا کہ:

> ''وہ شخص کتنا خوش قسمت ہے جسے اپنے بچوں سے پیار ہے۔ وہ بھی خوش نصیب ہے جسے اس کے یک سُم گھوڑوں، اعلیٰ نسل کے شکاری کتوں اور دور دیس سے آنے والے پردیسیوں سے محبت ہو۔''

میں تو اس شخص کو غلط نہیں سمجھتا۔

تو کیا آپ کے خیال میں اس نے درست کہا۔

جی ہاں۔

تو جناب مینکس نس اس سے یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ جس شے سے محبت کی جائے چاہے وہ محبت کا جواب محبت سے دے یا نفرت سے بہر حال وہ ہمیں دل سے عزیز ہو گی۔ بہت چھوٹی عمر کے بچے [illegible] جو محبت کا مطلب نہیں سمجھتے، اس کا مفہوم نہیں جانتے بلکہ جب کبھی غلطیوں پر انہیں ماں باپ سے [illegible] دونوں سے نفرت بھی کرنے لگتے ہیں مگر کیا اس سے والدین کی محبت میں کوئی کمی آ سکتی ہے؟

آپ کی باتوں پر ایمان لانے کو جی چاہتا ہے۔

اور اس طرح چاہنے والا نہیں بلکہ چاہے جانے والا شخص دوست یا محبوب کہلائے گا کیونکہ وہ چاہنے والے کو بے حد عزیز ہوتا ہے۔

آپ صحیح فرما رہے ہیں۔

اور جو نفرت کرے وہ نہیں بلکہ جس سے نفرت کی جائے وہی دشمن ٹھہرے گا؟

ظاہر ہے!

اس کا تو یہ مطلب ہوا کہ بہت سے لوگوں کو ان کے دشمن چاہتے ہیں اور دوست ان سے نفرت کرتے ہیں یعنی وہ اپنے دشمنوں کے دوست ہوتے ہیں اور دوستوں کے دشمن۔ پھر بھی، میرے دوست یہ خلاف عقل نظریہ ہے کہ کوئی دوست کا دشمن اور دشمن کا دوست ہو، یہ کس قدر انوکھا اور نا قابل فہم لگتا ہے؟

اگر پہلی صورت نا قابل قبول ہو تو چاہنے والا اپنے محبوب کا دوست ہو گا۔

درست!

اور نفرت کرنے والا اس کا دشمن ہو گا جس سے نفرت کرے؟

یقیناً!

پھر بھی گزشتہ مثال کی طرح یہاں بھی ہمیں تسلیم کرنا پڑے گا کہ ایک شخص کسی ایسے شخص کا دوست ہو سکتا ہے جو اس سے محبت نہ کرتا ہو بلکہ چاہے اسے اس سے نفرت ہی کیوں نہ ہو۔ کیونکہ یہ ممکن ہے کہ وہ ایک اشیاء سے محبت کرے جو اس کی محبت کا مثبت جواب دینے سے قاصر ہوں اور وہ ایسے شخص کا دشمن بھی ہو سکتا؟ جو دراصل اس کا دشمن نہ ہو بلکہ شاید وہ دوست ہی ہو۔ کیونکہ ایسی مثالیں ممکن ہیں کہ کوئی ایسی اشیا یا افراد سے

اور کیا آپ کا سابقہ فلسفیوں کے مقالات سے نہیں پڑا جن میں کہا گیا ہے کہ ہم [illegible] "اپنے ہم خیال لوگوں سے ضرور محبت کرنی چاہیے۔ یہ وہی فلسفی ہی ہیں جنھوں نے انسانی فطرت اور کائنات کے تعلق پر بے تحاشا لکھا اور کہا ہے۔

بالکل درست! اس نے کہا۔

کیا خیال ہے ان کا یہ کہنا درست ہے؟

شاید!

شاید۔ میں نے کہا، اس کا آدھا یا شاید سارا سو فیصد سچ ہی ہے بشرطیکہ ہم تک پہنچے [illegible] الفاظ کو ہم ان کے صحیح مفاہیم اور پس منظر میں سمجھ پائیں۔ کیونکہ کوئی برا آدمی دوسرے [illegible] آدمی سے جو جس قدر برا سلوک کرے اور پھر اس کے، اتفاقاً، اتنا ہی قریب آ جائے تو وہ اس سے اسی قدر نفرت [illegible] کیونکہ اس سے اسے زخم ہی ملے ہوں گے اور ظاہر ہے کہ زخم کھانے والا اور زخم دینے والا باہم دوست نہیں ہو سکتے۔

کیا یہ سچ نہیں ہے؟

جی ہاں! ہے! اس نے کہا۔

سو اگر برے لوگ باہم ایک جیسے ہوتے ہیں تو گویا ہمارے پورے بیان کا نصف تو غلط ثابت ہو گیا؟

یہ بھی سچ ہے۔

مگر جہاں تک میں سمجھتا ہوں اس روایت کا اصل مفہوم یہ ہے کہ اچھے لوگ ایک دوسرے سے متماثل اور اس لیے باہمی کشش رکھتے ہیں اور اسی لیے ان کے مابین خود بخود دوستی کا رشتہ استوار ہو جاتا ہے۔ برے لوگ، جن کے بارے میں اکثر کہا جاتا ہے، ایک دوسرے سے میل نہیں کھاتے، اس لیے کہ وہ جذباتی اور سیماب صفت ہوتے ہیں اور ظاہر ہے کہ جو شے خود اپنے آپ سے غیر متفق بلکہ اپنی ذات کی مخالف ہو اس کا دوسری اشیا سے اتصال کیونکر ممکن ہو سکتا ہے۔ آپ اس سے متفق ہیں یا نہیں؟

جی، میں مکمل طور پر متفق ہوں۔

ایسی صورت میں وہ لوگ جو اس امر کے حامی ہیں کہ ایک جیسے مزاج کے حامل لوگ باہم دوست ہوتے ہیں، میرے خیال میں یہ کہنا چاہتے ہیں کہ صرف اچھا شخص ہی اچھے اور صرف اچھے انسان کا دوست

ہوسکتے ہے۔ اور جہاں تک برے شخص کا تعلق ہے وہ جذبہ [illegible]

اچھے آدمی سے ہو یا برے آدمی سے، آپ کا کیا خیال ہے؟

اس نے ہاں میں سر ہلا دیا۔

اب گویا ہم اس اہم سوال کا جواب فراہم کرنے کے قابل ہو جاتے ہیں کہ دوست [illegible]

ہوتے ہیں؛ کیونکہ ہماری موجودہ دلیل سے یہی اصول برآمد ہوتا ہے کہ صرف اچھے لوگ ہی ایک [illegible]

دوست ہوسکتے ہیں۔

وہ کہنے لگا۔ یہ تو حقیقت ہے۔

میں نے کہا۔ ہاں۔ مگر میں اس جواب سے بھی پوری طرح مطمئن نہیں ہوں۔ قسم سے، میں آپ کو اپنے شک کی وجہ بتانا چاہتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ فرض کر لیں کہ ایک ایسا آدمی جو کسی سے طبعاً مشابہ ہے تو اس کے ساتھ دوستی کے رشتے سے منسلک ہوگا اور ظاہر ہے کہ اس کے لیے مفید بھی ہوگا بلکہ مجھے اس مثال کو ایک اور زاویے سے پیش کرنے کی کوشش کرنی چاہیے؛ کیا طبعاً مشابہ شخص اس بات کے پیش نظر کہ وہ ہر لحاظ سے مشابہ ہیں اپنے مشابہ فرد کے ساتھ کوئی ایسی برائی یا بھلائی کر سکتا ہے جو وہ خود اپنے ساتھ نہ کر پائے؟ یا اسے کسی ایسی کیفیت میں مبتلا کر سکتا ہے جس میں خود مبتلا نہ ہونا چاہے اور یہ کہ اگر وہ دوسرے کے لیے مفید نہیں ہوسکتا تو ان دونوں کے درمیان دوستی کے جذبے کے پنپنے کا کیا امکان ہوسکتا ہے؟ کیا یہ ممکن ہے؟

نہیں۔

اور وہ شخص جسے کسی کی چاہت میسر ہی نہیں، دوست ہوسکتا ہے؟

ہرگز نہیں۔

لیکن اگر ہم یہ کہیں کہ طبعاً مشابہ شخص کا مشابہ شخص سے محبت یا دوستی رکھنے کے امکان کی نفی کرنے کے باوجود یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اچھا فرد اچھے فرد سے ضرور دوستی اور محبت کے تعلق سے منسلک ہوگا جہاں تک کہ اس کی اچھائی کا تعلق ہوگا، تو یہ کہاں تک درست ہوگا؟

یہ قطعی درست ہے۔

ایسی صورت میں ایک اچھا فرد، جہاں تک اس کی اچھائی کا تعلق ہے، خود اپنے لیے کافی ہوگا؟ اور یقیناً ہوگا، تو جو پہلے ہی کافی ہو اسے مزید کسی شے کی ضرورت نہیں ہونی چاہیے کیونکہ لفظ کافی میں یہ کیفیت مضمر ہے۔

تو اس صورت میں تو وہ بے نیازی ہونا چاہیے۔

اور جسے یہ چاہیے نہیں ہوگا اسے کسی شے کی طلب بھی نہیں ہوگی؟

بالکل نہیں ہوگی۔

تو گویا وہ محبت بھی نہیں کرے گا کیونکہ اسے محبت کی طلب نہیں ہوگی۔

بظاہر تو یہی مطلب نکلتا ہے۔

جب صورت حال یہ ہو کہ محبت کی غیر موجودگی میں اچھے لوگوں کو کوئی کمی محسوس نہیں ہوتی۔ نہ ہی ایک دوسرے کی ضرورت نہیں رہتی، کیونکہ تنہائی میں بھی وہ اپنے لیے کافی ہوتے ہیں اور اگر ضرورت ہو تو ان کے لیے خاص مفید ثابت نہیں ہوتی کیونکہ خود کفیل ہونے کے باعث وہ ایسے کسی مفاد کے متمنی اور حاجت مند نہیں ہوتے تو آپ محبت کو کہاں رکھیں گے؟ اور ایسے لوگ ایک دوسرے کے لیے اہمیت کیسے حاصل کر پائیں گے؟

جی ہاں! ان کی افادیت ختم ہو جاتی ہے۔

اور جب تک وہ ایک دوسرے کو اہمیت نہ دیں، ان میں دوستی کا تصور محال ہے۔

یہ بھی سچ ہے۔

دیکھیے عزیزم لائیسس، اس ساری صورت حال میں ہم کہیں ایک دفعہ پھر دھوکے اور اندھیرے میں تو نہیں؟ اور کیا ہم قطعی طور پر (بحث کے) غلط راستے پر تو نہیں جا رہے؟

وہ کیسے؟ اس نے جواب دیا۔

میں نے کسی کی زبانی یہ سنا ہے اور اس کے الفاظ من وعن مجھے یاد آ رہے ہیں کہ مشابہ فرد اپنے مشابہ فرد کا اور اچھا آدمی اچھے آدمی کا دشمن ہوتا ہے اور یہ بات اس نے ہیزیوڈ کے حوالے سے کہی ہے جس کے الفاظ یہ ہیں:

''کمہار، کمہار سے لڑتا ہے، شاعر، شاعر سے اور بھکاری، بھکاری سے جھگڑتا ہے۔''

اور دیگر اشیا کے بارے میں بھی یہی اصول کارفرما ہے یعنی یہ حالات کی ضرورت ہے کہ ایک جیسے لوگ ایک دوسرے کے لیے مخالف، متنفر اور رقابت سے پر ہوتے ہیں جبکہ مختلف خاصیتوں کے حامل لوگ ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں کیونکہ وقت کا تقاضا ہے کہ غریب امیر سے دوستی کا خواہشمند ہو، کمزور طاقتور کی مدد چاہے، مریض کو طبیب کی اعانت درکار ہوگی اور جاہل، عالم کی رہنمائی کا محتاج ہوتا ہے، وہ شخص اسی طرح

ڈرامائی زبان میں ایسی مثالیں پیش کرتا گیا، گویا ایک حقیقت لوگوں سے مانگی دوستی کا [illegible]
بلکہ یہ بات زیادہ قرین از امکان نظر آنے لگی کہ جو جس قدر مختلف الخواص ہوں گے ان میں اسی قدر دوستی
مضبوط ہوگی۔ کیونکہ ہر شخص کو اسی چیز کی خواہش ہوتی ہے جو اس کی ذات میں نہ ہو۔ اشیا سے باہمی تعلق میں
بھی یہی اصول کارفرما ہے مثلاً خشک اشیا کو تری کی طلب ہوتی ہے، ٹھنڈی اشیا کو حدت کی، [illegible]
تیزی کو سست روی، خالی پن کو بھرا پن اور بھرے پن کو خالی کی طلب ہونا بڑی قدرتی بات ہے کیونکہ ہر شے اپنے
مخالف کی خوراک کی سی اہمیت رکھتی ہے (کیونکہ اس سے اس کی تکمیل کا امکان ہوتا ہے) جبکہ مشابہ اشیا سے
پاس ایک دوسرے کی تکمیل کے لیے کچھ نہیں ہوتا۔ سو مجھے اس شخص کی باتوں میں ایک خاص کشش محسوس
ہوئی۔ آپ سب لوگ اس ضمن میں کیا کہتے ہیں؟

میں آپ کی باتیں سنتے ہی یہ کہہ سکتا ہوں کہ اس نے بڑی کھری باتیں کی ہیں۔ مینکس نس بولا۔

یعنی ہمیں تسلیم کرنا پڑے گا کہ مضبوط ترین دوستی مختلف الخصائص افراد میں ہوگی؟

بے شک!

درست! مگر مینکس نس! یہ بڑا غیر معمولی جواب ہوگا اور ظاہر ہے کہ کوئی عقلمند مگر مختلف الخیال ہمیں حیرت اور تنفر کی نظر سے دیکھ کر پوچھ سکتا ہے کہ کیا محبت نفرت سے واضح طور پر برعکس نہیں ہے۔ سو ہم اس کے جواب میں کیا کہہ سکیں گے، کیا ہمیں اس کی بات کو سچ تسلیم نہیں کرنا پڑے گا؟

جی ہاں! ہم مجبور ہوں گے کہ تسلیم کریں۔

وہ ہم سے مزید سوالات کر سکتا ہے کہ کیا دشمن، دوست کا دوست ہوگا یا دوست کے دوست کا دشمن ہوگا۔

ان میں سے کسی حیثیت کا حامل بھی نہ ہوگا۔ اس نے کہا۔

اسی طرح ایک منصف مزاج شخص کسی ظالم اور غیر منصف مزاج شخص کا دوست ہو سکتا ہے؟ کیا معتدل مزاج شخص کی دوستی تلون مزاج شخص سے ممکن ہے یا کوئی اچھا انسان کسی برے شخص سے دوستی کا متحمل ہو سکتا ہے۔ مجھے تو اس کا کوئی امکان نظر نہیں آتا۔

تو پھر اگر دوستی متناقص اور مخالف چیزوں کے درمیان ہوتی ہے تو پھر مختلف مزاج کے افراد آپس میں یقیناً دوست ہوں گے؟

ہونا تو یہی چاہیے!

گویا مشابہ اپنے مشابہ کا اور مختلف اپنے مختلف کا دوست نہیں ہو سکتا؟

میرا خیال ہے نہیں ہو سکتا۔

ایک نکتہ اور بھی ہے جسے ملحوظ رکھنے کی ضرورت ہے اور وہ یہ ہے کہ اگر یہ تمام مفروضے ... ہوں تب بھی یہ امکان باقی رہتا ہے یعنی وہ لوگ جو واضح طور پر نہ اچھے ہیں اور نہ برے ... لوگوں کی محبت میں گرفتار ہو سکتے ہیں اور ان سے ان کی دوستی کا امکان اپنی جگہ پر ہے۔

اس نے پوچھا۔ یہ نتیجہ آپ نے کیسے نکالا؟

میں بتاتا ہوں کیوں؟ میں نے جواب دیا۔ سچ تو یہ ہے کہ میں خود بھی نہیں جانتا کہ کیوں؟ چونکہ میرا سر اس گھمبیر بحث کے باعث چکرا رہا ہے اس لیے میں اس نکتے پر اکتفا کرتا ہوں اور حالات سے اتفاق کے خطرے سے گزرتا ہوں کہ ''خوبصورت فرد لازماً دوست ہوتا ہے''۔ اسی موضوع پر ایک قدیم کہاوت ہے، ''حسن لامحالہ ایک نرم، ہموار اور پھسلوان شے ہے۔ اس لیے وہ کوئی کھردرا تاثر دیے بغیر پھسل کر ہماری روحوں میں سما جاتی ہے''۔ اسی لیے میں نیکی کو بھی حسن ہی کہتا ہوں اور آپ بھی یقیناً اس سے متفق ہوں گے ہیں ناں؟

جی ہاں۔

میرا اس سلسلے میں نقطۂ نظر یہ ہے کہ حسن اور نیکی کے دوستوں میں نہ برائی شامل ہے نہ نیکی اور اس کی طرف میرا میلان اس وجہ سے ہوا ہے کہ اشیا دو طرح کی نہیں (اچھی یا بری) بلکہ تین طرح کی ہوسکتی ہیں یعنی ایک اچھی، ایک بری اور ایک وہ جس پر نہ اچھائی کا اطلاق ہوتا ہے نہ برائی کا۔ آپ اس سے اتفاق کرتے ہیں؟

جی ہاں! میں متفق ہوں۔

میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ اچھائی نہ اچھائی کی دوست ہے نہ برائی کی۔ اور نہ برائی، برائی کی دوست ہو سکتی ہے۔ نہ اچھائی برائی کی دوستی ممکن ہے۔ اس مفروضے پر ہم گزشتہ بحث میں ضرورت سے زیادہ روشنی ڈال چکے ہیں۔ بہرصورت اگر دنیا میں دوستی یا محبت نام کی کوئی شے ممکن ہے تو ہم اسی نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ جس شے پر نہ اچھائی کا اطلاق ممکن ہو نہ برائی کا یعنی وہ معتدل ہو تو اس کی دوستی یا تو اچھائی سے ممکن ہے یا پھر ایسی شے سے جو اچھائی برائی کی تقسیم سے بلند ہو کیونکہ یہ تو طے ہے کہ برائی کے ساتھ دوستی کو بہر طور منسوب نہیں کیا جا سکتا۔

بالکل درست!

اور یہ تو ہم پہلے ہی طے کر چکے ہیں کہ ایک جیسے افراد کے درمیان دوستی ممکن نہیں۔

ہاں یہ تو طے ہو چکا ہے۔

سو اگر کوئی شے اچھائی اور برائی کے حوالے سے غیر جانبدار ہے تو وہ غیر جانبدار سے دوستی نہیں کر سکتی۔

بالکل نہیں کر سکتی۔

البتہ اچھائی یا اچھا فرد کسی غیر جانبدار یا فرد کا دوست بہر حال ہو سکتا ہے۔

ہاں یہ بات حقیقت لگتی ہے۔

اور اسی نکتے سے ہماری بحث راہ راست پر نہیں آ جاتی؟ مثلاً جو جسم صحت مند ہوگا اسے کسی بھی دوسری نوعیت کی مدد کی ضرورت نہیں پڑ سکتی۔ کیونکہ وہ حسب ضرورت صحت مند ہوگا۔ لہٰذا یہ طے ہے کہ صحت مند کو طبیب سے کوئی محبت نہ ہوگی کیونکہ وہ صحت مندی کے باعث طبیب کی مدد کا محتاج نہیں۔

ہاں! ایسی محبت کی اسے کوئی ضرورت نہیں۔

مگر بیمار شخص کو اپنی بیماری کے باعث، طبیب سے محبت ہوگی؟

یقیناً ہوگی!

جبکہ بیماری ایک برائی ہے اور فن طبابت بہر طور ایک اچھائی ہے؟ کیونکہ مفید ہے؟

جی ہاں۔

مگر انسانی جسم نہ فی الواقع اچھائی کی ذیل میں آتا ہے نہ برائی کے؟

یہ بھی سچ ہے۔

جی ہاں۔ لازماً۔

گویا جو شے نہ اچھی ہے نہ بری (مثلاً جسم) محض برائی (یعنی بیماری) کی بدولت اچھائی (طبابت) سے دوستی پر مائل ہوتی ہے؟

اس بحث سے تو کم از کم یہی نتیجہ نکلتا ہے!

اس کا مطلب یہ ہوا کہ اسی وجہ سے کوئی غیر جانبدار شے (نیکی اور برائی کے حوالے سے) برائی کے منسے برائی میں ملوث ہو جاتی ہے؟ اور اگر یہ اس کے غیر جانبدار شے باعث خود برائی کا روپ دھار جائے تو

اسے نیکی سے نہ محبت رہے گی نہ اس کی خواہش۔ کیونکہ یہ ہم پہلے ہی طے کر چکے ہیں کہ برائی اچھائی نہ ... ت
ہرگز نہیں ہوسکتی۔

جی ہاں ایسا ناممکن ہے۔

مزید برآں ہم نے مشاہدہ کیا ہے کہ بعض کیمیائی مادے، دوسرے مادوں کی موجودگی ہی میں
یک جان ہوجاتے ہیں جبکہ بعض ایسی صورت میں یک جان نہیں ہوتے۔ کسی مرہم یا رنگ کی مثال لیجیے۔ ان
کی موجودگی میں دیگر اشیا کو خاص شکل حاصل ہوتی ہے۔

خوب۔

تو کیا اسی صورت میں وہ شے رنگ یا مرہم کا روپ دھار لیتی ہے۔

کیا مطلب؟

مطلب یہ ہے کہ فرض کیجیے میں آپ کی زردی مائل جرابوں پر سفید سیسے سے پینٹ کردوں تو کیا وہ
حقیقتاً سفید ہوجائیں گے یا محض سفید ظاہر ہوں گے؟

وہ صرف سفید ظاہر ہوں گے۔ اس نے جواب دیا۔

پھر بھی ان میں سفیدی تو ہوگی؟

ہاں!

مگر وہ سفیدی ان کی اصل سفیدی میں اضافہ نہ کرسکے گی۔ سفیدی، ان میں موجود ہونے کے
باوجود ان کے سیاہ عنصر سے زیادہ مؤثر ہوسکے گی؟

نہیں۔

مگر جب کافی عرصہ گزرنے کے بعد سفید رنگ باقاعدہ ان میں نفوذ کر جائے تو ان کے وجود میں
تبدیلی آئے گی اور سفیدی کے باعث سفید کہلائیں گے۔ ہیں ناں؟

یقیناً!

آپ مجھے یہ بتائیے کہ ہر صورت میں اشیا کو مماثل کرنے کے لیے دیگر اشیا کی ضرورت پڑتی ہے یا
یہ موجودگی مخصوص نوعیتوں یا صورت حال کی محتاج ہے؟

مؤخر الذکر صورت درست ہے۔

تو گویا جو شے نہ اچھی ہے نہ بری، بری شے یا برائی کی موجودگی میں بھی ایسی ہی رہے گی (اور بری

نہیں کہلائے گی) کیونکہ ہم یہی ثابت کیے بیٹھے ہیں؟

جی ہاں۔

اور اگر چہ کوئی شے برائی کی موجودگی کے بغیر بری ہونے سے محفوظ رہ سکتی ہے مگر اچھائی کا وجود ہر شے میں اچھائی کے عنصر کو ابھارتا ہے۔ مگر برائی کا وجود، جس سے اشیا اور افراد برے ہوتے ہیں، لوگوں کے دلوں سے اچھائی کی محبت چھین لیتی ہے اور اس طرح وہ شے جس میں کبھی اچھائی اور کبھی برائی دونوں کے امکانات موجود تھے، اب صرف برائی کی صورت میں باقی رہ جاتی ہے اور یہ تو طے ہی ہے کہ اچھائی کے ہاں برائی کی دوستی کا کوئی امکان ہی نہیں ہوتا۔

آپ کی بات سو فی صد درست ہے۔

اور اسی لیے ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ جو بھی پہلے سے حکمت کے منصب پر فائز ہے (وہ انسان ہو یا دیوتا) وہ دانائی کے عشق میں مبتلا نہیں رہتے اور برا شخص یا جاہل فرد حکمت کے پرستاروں میں شامل نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ برا شخص اور دانائی کے وجود سے لاعلم شخص، دانائی کا عاشق نہیں ہوسکتا۔ اب وہ لوگ رہ جاتے ہیں جو علم سے بے بہرہ ہیں، مگر خوش قسمتی سے ان کی جہالت ابھی پختہ نہیں ہوئی اور ابھی ان کے ذہن میں یہ خناس نہیں بھرا کہ وہ سب کچھ جانتے ہیں حالانکہ وہ کچھ بھی نہیں جانتے، سو ان میں اگر کچھ دانائی کے آثار نظر آتے ہیں تو فقط اس وجہ سے کہ ابھی ان پر اچھے یا برے ہونے کا حتمی لیبل نہیں لگ پایا اور یہ تو ہو ہی نہیں سکتا کہ برے لوگ اچھوں سے بھی زیادہ دانائی کے پرستار ہوں۔ جیسا کہ ہم نے پہلے ہی طے کر چکے ہیں کہ نہ ہی کوئی فرد اپنے سے قطعی مختلف فرد کا دوست ہوسکتا ہے، نہ مکمل طور پر ایک جیسے فرد کا۔ کیا آپ کو وہ بحث یاد نہیں ہے؟

ہاں ہمیں یاد ہے۔ دونوں بول پڑے۔

لہٰذا عزیز لائیسس اور مینکس نس ہم نے گویا دوستی کی اصلیت کا سراغ لگا لیا ہے۔ اس میں اب شک نہیں رہا کہ دوستی ایسی شے یا کیفیت ہے جو بدی کی موجودگی میں کوئی اچھا یا برا شخص بھلائی کے لیے محسوس نہیں کرسکتا۔ اس کا اطلاق جسمانی اچھائی پر بھی ہوتا ہے اور روحانی کیفیت پر بھی۔ بلکہ ہر صورت میں اس کا یہی اطلاق ممکن ہے۔

ان دونوں نے نہ صرف اس بات سے مکمل اتفاق کیا بلکہ اپنے اتفاق رائے پر زور دیا اور ایک لمحے کے لیے مجھے یوں خوشی ہوئی جیسے کسی شکاری کو اس کی توقع سے کہیں زیادہ آسانی سے اور جلدی اس کا شکار ہاتھ آ گیا ہو، مگر اگلے ہی لمحے مجھے ایک عجیب سے شک نے آ گھیرا اور مجھے محسوس ہوا کہ ہم پھر غلط نتیجے پر پہنچے

ہیں۔ مجھے دکھ پہنچا اور میں نے کہا افسوس لائیسس اور مینکس نس! لگتا ہے، ہم محض سراب کے پیچھے بھاگتے رہے ہیں۔

آخر آپ ایسا کیوں سوچتے ہیں؟ مینکس نس نے کہا۔

مجھے ڈر ہے کہ محبت کے بارے میں ہمیں جتنے دلائل دستیاب ہو سکے ہیں، سب غلط ہیں اور آپ کو شاید معلوم ہو، دلائل بھی انسانوں کی طرح باہر سے کچھ نظر آتے ہیں اور اندر سے کچھ اور ہوتے ہیں۔

اس نے استفسار کیا۔ آپ یہ کیسے کہہ سکتے ہیں؟

میں نے کہا۔ بھئی اسی مسئلے ہی کو دیکھ لیجیے! یعنی کوئی بھی فرد کسی دوسرے فرد کا دوست ہو سکتا ہے کہ نہیں؟

یقیناً ہو سکتا ہے۔

تو کیا اس کی دوستی کا کوئی خاص مقصد یا محرک ہوتا ہے یا نہیں؟

میرا خیال ہے محبت کا کوئی مقصد اور محرک ہوتا ہے۔ وہ بھی اس عشق سے عاری رہتے ہیں جنھیں یہی معلوم نہ ہو کہ حکمت سے دوری انھیں برائی میں مبتلا کر سکتی ہے۔ کیونکہ یہ بھی طے ہے کہ کوئی ''مقصد محبوب کو عزیز تر بنا دیتا ہے یا اس کی محبت یا نفرت کا اس سے کوئی تعلق نہیں؟''

تو کیا وہ مقصد جو محبوب کو عزیز تر بنا دیتا ہے اس کی محبت یا نفرت کا اس سے کوئی تعلق نہیں؟

میں سمجھا نہیں، آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟ اس نے استفسار کیا۔

مجھے اس پر حیرت نہیں (کہ آپ نہیں سمجھے) لیکن شاید اگر میں اس مسئلے کو ایک اور زاویے سے پیش کروں تو آپ اسے آسانی سے سمجھ لیں گے اور شاید میں خود بھی اپنا مفہوم بہتر طور پر سمجھ پاؤں گا۔ مثلاً ایک بیمار آدمی طبیب سے محبت کرے گا۔ کیا خیال ہے؟

بالکل درست!

اور وہ بیماری ہی کی بدولت طبیب کا دوست ہے اور اس لیے کہ وہ صحت چاہتا ہے؟

جی ہاں۔

اور یہ کہ بیماری ایک برائی ہے؟

یقیناً۔

اور صحت کے بارے میں کیا خیال ہے؟ میں نے کہا۔ کیا وہ اچھائی یا برائی یا ان میں سے کچھ بھی

نہیں۔

اچھائی ہے! اس نے جواب دیا۔

اور ہم ابھی کہہ رہے تھے، جیسا کہ مجھے یقین ہے، کہ جسم پر اگرچہ اچھائی یا برائی میں سے کسی کیفیت کا اطلاق نہیں ہوتا، فقط بیماری یا دوسرے لفظوں میں برائی کی بدولت دوا سے دوستی کرتا ہے اور دوا بہر طور اچھائی ہے۔ سو دوا اس دوستی میں صحت کی غرض سے در آئی ہے اور صحت بھی بہر طور اچھائی ہے۔

یہ سچ ہے۔

تو کیا صحت دوست ہے یا نہیں؟

دوست ہی ہے۔

سو بیماری ایک دشمن ہے۔

یقیناً ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک ایسی شے جو نہ اچھی ہے نہ بری (یعنی جسم) وہ ایک اچھائی کی دوست تو ہے مگر برائی اور کسی قابل نفرت شے کے وسیلے سے۔ مگر اس کا مقصد اچھائی اور دوستی ہوتا ہے۔

صاف ظاہر ہے۔

گویا کوئی شخص دوست تو دوستی اور بھلائی کی خواہش کے قصد سے ہے اگرچہ اس کا وسیلہ برائی یا دشمنی ہے؟

بظاہر تو یہی نتیجہ نکلتا ہے۔

تب پھر اس مرحلے پر میرے دوست! ہمیں سخت محتاط ہو کر ہر قسم کے دھوکے سے بچنا ہے۔ اب میں اس پر مزید بحث نہیں کرنا چاہتا کہ دوست کا دوست ہی دوست ہے یا ایک جیسے لوگ باہم دوست ہوتے ہیں۔ اسے ہم پہلے ہی ناممکنات میں شمار کر چکے ہیں اور اس نئے بیان سے کسی قسم کی الجھن کا سامنا کرنے سے بچنے کے لیے ہمیں ایک بالکل نئے نکتے کا جائزہ لینا چاہیے۔ میں اس کی مزید وضاحت یوں کروں گا کہ دوائی، جیسا کہ میں نے پہلے کہا، ہمیں اپنی صحت کی وجہ سے عزیز ہوتی ہے۔

جی ہاں۔

یقیناً۔

اور اگر عزیز ہے تو کسی شے کی وجہ سے ہے؟

جی ہاں!

سو ہمارے گزشتہ اصول کے مطابق، جس شے کے باعث صحت عزیز ہے، وہ بھی عزیز ہی ہونی چاہیے؟

جی ہاں یہ بھی درست ہے!

میری پریشانی یہ ہے کہ وہ تمام اشیا جو کسی اور شے یا اشیا کے بغیر ہمیں عزیز ہیں محض ایک دھوکا اور فریب ہیں۔ جبکہ ہمارے اولین اصوں نے طے کیا ہوا ہے کہ دوستی کا کوئی حقیقی آئیڈیل ہونا چاہیے۔ اس مسئلے کو ایک اور زاویے سے پیش کرتا ہوں! ایک بہت بڑے خزانے کی مثال لیجیے! (یہ ایک بیٹا بھی ہوسکتا ہے جو اس کے باپ کو اپنے تمام خزانوں سے زیادہ عزیز ہے) کیا باپ، کہ اگرچہ اس کے بیٹے کی قدر و قیمت اس کے تمام مال و متاع سے زیادہ ہے، اپنے اس مال و متاع سے بھی جو کہ اس کے بیٹے کی بھلائی کے لیے ضروری ہے، محبت نہیں کرتا؟ مثلاً اگر وہ دیکھے کہ اس کا بیٹا ہملاک (شراب کی قسم) پی گیا ہے اور اب اس کا باپ یہ سوچے کہ اسے شراب ہی بچا سکتی ہے تو کیا وہ شراب کو اہمیت نہیں دے گا؟

یقیناً دے گا!

اور وہ برتن بھی جس میں شراب ہوگی؟ (بیٹے کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھے گی؟)

یقیناً!

لیکن کیا وہ تین صراحی شراب (صراحیوں سمیت) کو بچے کے برابر قرار دے رہا ہوگا؟ کیا بظاہر یہی نظر نہیں آتا؟ یعنی اس کی بے چینی ان اسباب کی بدولت نہیں ہوگی جو کسی مخصوص مقصد کے لیے مہیا کیے گئے ہیں بلکہ وہ درحقیقت اس مقصد کے لیے بے چین ہوگا جس کے لیے وسائل بہم پہنچا رہا ہے۔ سو چاہے ہم لاکھ کہیں کہ سونا چاندی ہمارے لیے بہت قیمتی ہے مگر حقیقت اس کے برعکس ہے اور درحقیقت وہ مقصد کچھ اور ہے (وہ کچھ بھی ہوسکتا ہے) جسے ہم تمام مال و متاع سے عزیز گردانتے ہیں اور اسی کی بقا اور تحفظ کے لیے اور آسایش کے لیے ہم باقی دولت اور مال و متاع کی خواہش رکھتے ہیں۔ کیا میں نے ٹھیک کہا؟

جی ہاں۔ آپ کی باتیں سچائی پر مبنی ہیں۔

اور کیا یہی سب کچھ دوست کے بارے میں نہیں کہا جاسکتا؟ کہ اگر وہ ہمیں کسی دیگر شے کی وجہ سے عزیز ہے تو ہم خود اس کے لیے لفظ عزیز کیوں استعمال کرتے ہیں۔ اصل میں عزیز وہ شے ہے جس کے لیے یہ تمام دوستیاں قربان کی جاسکتی ہیں؟

بظاہر تو آپ کی یہ بات بھی درست ہی لگتی ہے۔

اور آیا حقیقی طور پر عزیز شے یا حتمی اصول دوستی کسی دیگر عزیز شے کی بدولت نہیں ہونی چاہیے۔

درست ہے!

یعنی ہمارا وہ نظریہ ختم ہوا کہ دوستی کا کوئی اضافی مقصد ہوتا ہے؟ گویا ہم یہی سمجھیں کہ اچھائی ہی اصل دوست ہے؟

شاید آپ ٹھیک کہتے ہیں۔

اور یہ بھی کہ اچھائی کو ہم کسی برائی کی بدولت پسند کرتے ہیں یا اگر یوں کہا جائے کہ اس ضمن میں تین اصول تسلیم کیے جا سکتے ہیں یعنی اچھائی، برائی اور اچھائی یا برائی کے حوالے سے غیر جانبدار یا ماورا شے۔ اس لحاظ سے دو ہی کیفیتیں باقی رہ جاتی ہیں یعنی بھلائی اور غیر جانبدار کیفیت کیونکہ برائی تو ذہن پر کوئی بھی خوشگوار اثر نہیں ڈالتی نہ ہی اس کا جسم پر کوئی خوشگوار اثر مرتب ہو سکتا ہے اور برائی کا غیر جانبدار اشیا پر بھی کوئی مثبت اثر مرتب نہیں ہوتا۔ تو کیا اچھائی ہمارے لیے مفید ہو سکتی ہے اور اگر ہمیں نقصان پہنچانے یا تکلیف دینے والا کوئی عنصر ہمارے وجود میں در نہیں آتا تو گویا ہمیں کسی طرح کی اضافی اچھائی کی ضرورت نہیں پڑ سکتی۔ تو کیا یہی صورت اس سے ظاہر ہو سکتی ہے کہ ہم اچھائی سے محبت اور اس کی خواہش بھی فقط برائی کے وسیلے سے کرتے ہیں (کہ اس سے چھٹکارا پانے کی خواہش رکھتے ہیں) یعنی بیماری کی بدولت۔ اگر بیماری نہ ہوتی تو ہمیں اس کے علاج کی ضرورت ہی نہ پڑتی۔ کیا اچھائی کی حقیقت یہی نہیں ہے؟ اور کیا اسی وجہ سے ہم اسے پسند نہیں کرتے کہ ہم ان ہی دونوں کیفیتوں کے درمیان رکھے گئے ہیں اور اس کی وجہ بھی برائی ہی ہے۔ تاہم نیکی کا خود اس کے اپنے وجود کے علاوہ اور کوئی مصرف نہیں۔

میرا خیال بھی یہی ہے کہ کوئی مصرف نہیں۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ دوستی کا اصل مفہوم یہ ہے کہ اس میں دیگر اقسام کی دوستیاں، جو کسی حوالے سے عزیز ہوں یا جن کا مقصد حقیقی کچھ اور ہو، ضم ہو جاتی ہیں، یہ ایک بالکل الگ اور مختلف نوعیت کا اصول ہے۔ کیونکہ دیگر اشیا اس لیے عزیز رکھی جاتی ہیں کہ یہ کسی دیگر مقصود یا دوست کو عزیز یا اس کے لیے مفید ہوتی ہیں۔ مگر سچے دوست اور حقیقی معنوں میں عزیز شے کا معاملہ اس کے برعکس ہے۔ یہ بات ہم ثابت کر چکے ہیں کہ وہ ہمیں کسی قابل نفرت شے کی بدولت عزیز ہوتے ہیں اور اگر وہ قابل نفرت شے درمیان میں سے ہٹ جائے تو یہ ہمیں بالکل عزیز اور پیارے نہیں رہیں گے۔

بالکل۔اس نے کہا، اگر ہمارا سابقہ ضابطہ درست قرار پاتا ہے تو وہ واقعی عزیز نہیں رہیں گے۔

مگر کیا آپ مجھے بتا سکیں گے۔میں نے کہا۔کہ اگر برائی (منفی کیفیت) کو ختم ہی ہونا ہوتا ہے تو پھر بھلا ہمیں اب بھی پیاس کیوں لگتی ہے، ہم بھوک کیوں محسوس کرتے ہیں اور ایسی دیگر خواہشات کیوں ابھی باقی ہیں؟ یا پھر اس سے یہ مفہوم لیا جائے کہ جب تک انسان زندہ ہے بھوک تو رہے گی مگر وہ ہمیشہ کی طرح تکلیف دہ نہ ہوگی اور یہی صورت پیاس اور دیگر خواہشات کی ہوگی وہ خواہشات تو رہیں گی مگر ان کا برا عنصر ختم ہو چکا ہوگا؟ یا پھر کیا مجھے یہ کہنا چاہیے کہ ایسے عالم میں یہ پوچھنا احمقانہ بات ہوگی کہ ان مذکورہ کیفیات میں سے کیا ہوگا اور کیا نہیں ہوگا؟ کیونکہ یہ سب کچھ کوئی نہیں جانتا۔البتہ ہم یہ جانتے ہیں کہ بھوک ہمارے لیے تکلیف دہ بھی ہے اور مفید بھی۔کیا یہ درست نہیں ہے۔

یقیناً درست ہے۔

اور اسی طرح پیاس اور دیگر خواہشات کے بارے میں بھی یہ ہے کہ یہ کبھی مفید ہوں گی اور کبھی مضر بری اور کبھی ان دونوں کیفیتوں کے بین بین۔

یہ بھی درست ہے۔

مگر کیا کسی وجہ سے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ چونکہ برائی ختم ہو جاتی ہے تو کسی حوالے سے اچھائی بھی اس کے ساتھ ہی ختم ہو جاتی ہے۔

نہیں۔ایسا نہیں ہے۔

یعنی اگر برائی ختم بھی ہو جائے تو خواہشات جو فطرتاً غیر جانبدار ہیں، باقی رہیں گی؟

یقیناً باقی رہیں گی۔

تو کیا انسان اس سے محبت نہیں کرے گا جس کی قربت چاہتا ہو یا جس سے متاثر ہو چکا ہو؟

یقیناً کرے گا۔

یہ بھی صحیح ہے کہ برائی کے ختم ہونے کے بعد محبت اور دوستی کے کچھ عناصر باقی رہیں گے؟

جی ہاں!

مگر جب دوستی کا سبب برائی ہو تو برائی کے خاتمے کے بعد دوستی کیا رہے گی کیونکہ اس کی علت ہی ختم ہی ہو گئی اور ظاہر ہے جب عست ختم ہو جائے تو معلول بھی ختم ہو جائے گا۔

یہ بھی آپ نے درست ہی کہا۔

اور یہ تو ہم پہلے ہی طے کر چکے ہیں کہ دوست بھی جب کسی دوست کو چاہتا ہے تو اس کا کچھ سبب ہوتا ہے اور جب ہم نے یہ اصول طے کیا تھا تو ہماری رائے میں غیر جانبدار اشیا کے اچھائی سے محبت کرنے کا سبب بھی برائی ہے۔ (جیسے بیماری کی بدولت دوا سے محبت)

یہ بھی سچ ہے۔

مگر اب ہمارا نقطۂ نظر بدل گیا ہے اور ہم یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے ہیں کہ دوستی کی کچھ اور وجہ بھی ہو سکتی ہے۔

میں بھی یہی سمجھتا ہوں۔

ہو سکتا ہے کہ سچ یہی ہو جس کا ابھی ہم نے تذکرہ کیا ہے۔ یعنی دوسری وجہ خواہش ہے خواہش کرنے والے فرد یا شے کو وہ شے عزیز ہوتی ہے جس کی خواہش کی جائے۔ لگتا یہی ہے کہ اس کے علاوہ ہر نظریہ ایسی طویل کہانی ہے جس کا کوئی مرکزی خیال نہ ہو اور نہ کوئی نتیجہ برآمد ہو۔

ہاں! ایسا ہی لگتا ہے۔

اور یہ امر یقینی ہے۔ میں نے کہا، کہ خواہش اسی شے کی کی جاتی ہے جس کی کمی ہو۔

جی ہاں!

اور فطرتاً انسان کے پاس جس شے کی کمی ہو وہی اسے زیادہ پیاری ہوتی ہے۔

درست!

اور اس کے پاس کمی اسی شے کی ہو گی جس کے حصول کے لیے اس کے پاس وسائل نہ ہوں۔

یقیناً۔

تب پھر عزیزم لائیسس اور مینکس نس اس پوری بحث سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ محبت، خواہش اور دوستی بڑی فطری چیزیں ہیں۔

دونوں نے اس سے بھرپور اتفاق کیا۔

سو اگر آپ باہم دوست ہیں تو آپ دونوں کی فطرتوں میں قدرتی ہم آہنگی موجود ہو گی۔

یقیناً۔ ان دونوں نے بیک زبان ہو کر کہا۔

اور میرے نوجوان دوستو! میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اگر کوئی فرد کسی دوسرے فرد کے ساتھ روحانی طور پر، کردار کے اعتبار سے، آداب و اخلاق کے حوالے سے یا کسی بھی اعتبار سے ہم آہنگی نہیں رکھتا ہو گا تو وہ گویا

اس سے تو محبت ہی [illegible] ہوگا اور نہ ہی [illegible] میں [illegible] ہے۔

جی ہاں! جی ہاں! مینکس نس نے کہا مگر [illegible] خاموش رہا۔ [illegible] میں نے [illegible] کہ اگر دو طبائع کے درمیان ہم آہنگی ہو تو ان کے درمیان محبت قدرتی امر ہے۔

ہاں ایسا ہی ہے! اس نے کہا۔

اور اگر کوئی محبت کرنے والا سچا ہو اور اس کے عمل میں ریاکاری نہ ہو تو اسے محبوب کی محبت ضرور حاصل ہوگی۔

لائیسس اور مینکس نس نے اس امر کے ساتھ کمزور سا اظہار کیا جبکہ خوشی کے رنگ ہپوتھیلس کے چہرے پر امڈے پڑ رہے تھے۔

اس مرحلے پر اپنی دلیل کو دہراتے ہوئے میں نے کہا۔ کیا ہم "موافق" اور "یکساں" میں فرق واضح نہ کرلیں؟ کیونکہ میرے خیال میں اگر فرق واضح ہو جائے تو لائیسس اور مینکس نس آپ بھی نوٹ کریں گے کہ دوستی کے بارے میں ہمارے دلائل میں کافی وزن ہے اور اگر موافق کا مطلب بھی یکساں ہی ہے تو پھر ہم دوبارہ اسی بحث میں الجھ جائیں گے کہ یکساں اور یکساں کے مابین محبت اور دوستی ممکن نہیں؟ کیونکہ کسی بے مصرف شے کو عزیز قرار دینا بڑا احمقانہ خیال ہوگا۔ سو ہمیں موافق اور یکساں کو دو مختلف کیفیتیں قرار دینا ہوگا آپ کا مذکورہ خطرناک دلیل کے زہر سے بچنے کے لیے اس نئے نظریے سے اتفاق ضروری ہے۔

آپ نے بالکل درست کہا۔

اور کیا ہم بات کو اس طرح سے آگے بڑھا سکتے ہیں کہ اچھائی ہر کسی کے لیے موافق ہے اور برائی کسی بھی شخص یا شے کے لیے موافق نہیں؟ یا یہ کہ برائی فقط برائی کے لیے موافق ہے اور اچھائی صرف اچھائی کے لیے اور وہ افراد یا اشیا جن کا نہ اچھائی کے گروہ سے تعلق ہے نہ برائی سے، ان کے لیے ان دونوں (اچھائی اور برائی) میں سے کچھ بھی موافق نہیں؟

میرے دوستو! اس طرح ہم پھر اسی رد شدہ غلطی میں مبتلا ہو گئے ہیں کیونکہ اس طرح یہ ثابت ہوتا ہے کہ غیر منصف، غیر منصف کا، برا، برے کا اور اچھا، اچھے کا دوست ہو سکے گا۔

یہ تو ہے!

اگر موافق بھی اچھا یا اچھائی کا مترادف ٹھہرے تو پھر ہمیں یہی کہنا پڑے گا کہ اچھا صرف اچھے کا دوست ہو سکتا ہے۔

یہ سچ ہے۔

مگر آپ کو یاد ہو گا کہ ہم خود ہی اپنے اس تصور کی نفی (دلائل کے ذریعے) کر چکے ہیں؟

جی ہاں ہمیں یاد ہے۔

تب پھر کیا کیا جائے؟ بلکہ یہ زیادہ بہتر اور موزوں سوال ہے کہ کچھ کرنا یا کہنا ممکن بھی رہا ہے یا نہیں؟ میں کورٹ میں وکالت کے دوران دلائل دینے والے افراد کی طرح اپنی بات کا خلاصہ پیش کرنا چاہتا ہوں۔ یعنی اگر محبت کرنے والا یا محبوب؛ ہم مزاج، یا مختلف المزاج، اچھے یا برے اور (یا جتنے بے شمار لوگوں کا ہم اپنی بحث میں تذکرہ کر چکے ہیں) اگر ان میں سے کسی پر بھی دوستی کا اطلاق نہیں ہو سکتا، تو میں نہیں سمجھتا کہ اس سلسلے میں ابھی کچھ کہنے کی گنجائش باقی ہے۔

میں یہاں کچھ زیادہ عمر کے اور تجربہ کار لوگوں کی رائے لینے کا ارادہ کر رہا تھا کہ اچانک لائیسس اور مینکس نس کے ٹیوٹر نے مداخلت کی۔ وہ ان کے بھائیوں کے ہمراہ یوں ہم پر اچانک نازل ہو گیا تھا جیسے برا وقت بتائے بغیر آ جاتا ہے؛ اور اس نے فوراً ان دونوں نوجوانوں کو ہدایت کی کہ چونکہ وقت بہت ہو چکا ہے سو انھیں فوراً گھر چلے جانا چاہیے! پہلے تو ہم نے اور قریب کھڑے لوگوں نے ٹیوٹر اور دونوں نوجوانوں کے بھائیوں کو پرے دھکیلا، مگر آخر کار انھوں نے دھکیلے جانے کی پروا نہ کرتے ہوئے، چیختے چلاتے اور لڑکوں کو برا بھلا کہتے ہوئے چلے گئے۔ ان کی حالت ایسے لگ رہی تھی جیسے وہ دیوتا ہرمیا (Hermaea) کی یادگاری عمارت میں ضرورت سے زیادہ پی گئے ہوں۔ انھیں اپنے آپ پر بھی قابو رکھنے میں دقت ہو رہی تھی۔ بہر طور ہم نے انھیں جانے دیا اور اپنی نشست بھی ختم کر دی۔

البتہ ان دونوں لڑکوں کو جاتے وقت میں نے اتنا ضرور کہا۔ اے مینکس نس اور لائیسس اس غیر معقول صورت حال میں آپ دونوں، میں اور ہمارا ایک پرانا دوست جو آپ دونوں میں سے ایک پر مرتا ہے، کیسے اپنے آپ کو ایک دوسرے کا دوست کہہ سکیں گے؟ اور یہ لوگ جو ہمارے اردگرد کھڑے ہیں، یہ بھی عجیب ناگوار سا تاثر لے کر یہاں سے جائیں گے اور پھر ابھی تو ہم فی الحقیقت یہ دریافت ہی نہیں کر پائے کہ دوستی حقیقتاً ہوتی کیا ہے؟

☆☆☆

لیشس یا جرأت

(Laches or Courage)

شرکائے گفتگو:

ارسٹیڈس(Aristedes) کا بیٹا لائسی میکس(Lysimachus)؛

تھیوسائیڈیڈس (Thucydides) کا بیٹا ملیسیاس(Melesias)اور

ان کے دو بیٹے نکیاس(Nicias)اور لیشس (Laches) اور سقراط

-(Socrates)

نکیاس اور لیشس! آپ زرہ بکتر پہنے آدمی کو مصنوعی جنگ کا مظاہرہ کرتا دیکھ چکے ہیں۔ مگر ہم نے آپ کو یہ نہیں بتایا کہ میرے دوست ملیسیاس اور میں نے یہ کیوں چاہا کہ آپ ہمارے ساتھ آئیں اور یہ مظاہرہ دیکھیں۔ مجھے یہ بھی اعتراف کرنا ہے کہ ہم نے یہ سب آپ کے ساتھ اس لیے کیا ہے کہ ہم آپ سے کچھ چھپانا نہیں چاہتے تھے۔ اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ ہم بعض معاملات میں آپ سے مشورہ لینا چاہتے تھے۔ آپ جانتے ہیں کہ کچھ لوگ تو دوسروں کو مشورہ دینے کے تصور ہی پر ہنس دیتے ہیں اور اگر ان سے کچھ پوچھا جائے تو یہ تک نہیں بتا سکتے کہ وہ کیا سوچتے ہیں۔ وہ سوال پوچھنے یا مشورہ مانگنے والے کے مزاج اور نقطۂ نظر کو دیکھتے ہوئے اگر رائے دے بھی دیں تو یہ ان کی اپنی بے لاگ رائے نہیں ہوتی بلکہ وہ پوچھنے والے کے مزاج کے مطابق مشورہ دیتے ہیں۔ لیکن آپ کے بارے میں ہمیں معلوم ہے کہ آپ کافی حد تک صاحب الرائے ہیں لہٰذا ہمیں امید ہے کہ آپ اپنی فہم و فراست کے مطابق ہمیں مشورہ دیں گے۔ ہم نے آپ کو اپنے مشیروں میں شامل کر لیا ہے۔ جس سلسلے میں میں یہ لمبی چوڑی تمہید باندھ رہا ہوں وہ یہ ہے کہ ملیسیاس اور میرا ایک ایک بیٹا ہے۔ وہ سامنے اس کا بیٹا ہے جس کا نام اس کے دادا کے نام پر تھیوسائیڈیڈس رکھا گیا ہے۔ اور یہ میرا بیٹا ہے اس کا نام بھی اس کے دادا کے نام پر ارسٹیڈس رکھا گیا ہے۔ اب ہم نے طے کیا ہے کہ ہم ان دونوں

نوجوانوں کا خاص خیال رکھیں اور ان کو ان کی مرضی سے آوارہ گردی نہ کرنے دیں کیونکہ آج کل جوانوں کا یہی عمومی رویہ ہے۔ حالانکہ اب وہ بچے نہیں رہے۔ ہم اپنی کوششیں (ان کو سنوارنے کے لیے) فوری طور پر شروع کرنا چاہتے ہیں اور نہیں چاہتے کہ اس میں کوئی دقیقہ فروگزاشت ہونے پائے۔ سو یہ جانتے ہوئے کہ آپ کے بھی بیٹے ہیں اور آپ نے ان کی تربیت اور بہتری کا ضرور کوئی عمدہ اہتمام کیا ہوگا اور اگر اتفاقاً نہیں کر پائے تو ہم نے سوچا کہ آپ لوگوں کو آگاہ کریں کہ آپ کو یہ اہم فریضہ ادا کرنا ہے، سو مناسب یہی ہے کہ اس مشترک فریضے کی ادائیگی کے لیے آپ ہمارے ساتھ شریک ہوں۔ نکیاس اور لیشس میں آپ کو بتاؤں کہ اس کام کو مشکل سمجھنے کے باوجود آخر ہم نے اس کا بیڑا کیوں اٹھایا۔ دراصل ملیسیاس اور میں اکٹھے رہتے ہیں اور ہمارے بیٹے بھی ہمارے ساتھ ہیں اور جیسا کہ میں نے ابھی ابھی کہا، ہم آپ کے سامنے اعتراف کرنا چاہتے ہیں۔ ہم دونوں اپنے بچوں کو ان شریفانہ سرگرمیوں کے بارے میں، جو ہمارے والدین نے جنگ اور امن دونوں صورتوں میں، متعلقہ معاملات کے انتظام اور شہر کے نظم و نسق کو چلانے کے سلسلے میں سرانجام دیں، وقتاً فوقتاً ذکر کرتے رہتے ہیں۔ مگر بدقسمتی سے ہم دونوں میں سے کسی نے بھی کوئی ایسا کارنامہ انجام نہیں دیا جو ہم فخر و انبساط سے ان کے سامنے بیان کر سکیں۔ سچ تو یہ ہے کہ ہم اپنی کم مائیگی پر شرمندہ ہیں اور اس کے لیے ہم اپنے والدین کو ذمہ دار ٹھہراتے ہیں جنھوں نے اپنی ذاتی اور منصبی مصروفیات کی وجہ سے ہمیں کھلا چھوڑ کر ہمیں بگاڑنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ یہی شے ہم اپنے بچوں کو باور کرانا چاہتے ہیں کہ اگر انھوں نے پنا باغیانہ رویہ نہ بدلا اور اپنے آپ کو سنوارنے کے لیے محنت نہ کی تو زندگی میں کوئی قابل قدر مقام حاصل نہیں کر پائیں گے۔ ہاں البتہ اگر وہ اب بھی محنت پر کمربستہ ہو جائیں تو شاید اپنے اپنے دادا کے اختیار کیے ہوئے ناموں کی لاج رکھنے کے قابل ہو ہی جائیں۔ اگرچہ انھوں نے ہماری خواہشات کا احترام کرنے کی حامی بھر لی ہے اور ہم اسی مقصد کے لیے اس تحقیق و تدقیق میں مصروف ہیں کہ ان کے لیے کس قسم کی تعلیم و تربیت اور پروگرام مناسب رہیں گے۔ کسی نے ہمیں مشورہ دیا تھا کہ زرہ میں ملبوس ہو کر تلوار بازی کے جوہر دکھانے کی تربیت بہت مفید ثابت ہوگی۔ خصوصاً نوعمر افراد کے لیے یہ تربیت کا بڑا زبردست ذریعہ ہے۔ انھوں نے ایسی تربیت دینے کے لیے ان صاحب کی سفارش کی تھی جن کی تلوار بازی کا مظاہرہ ابھی ابھی آپ نے دیکھا ہے۔ اب جبکہ ہم ان صاحب سے ملنے کے خواہشمند ہیں تو چاہتے ہیں کہ آپ بھی ہمارے ساتھ چلیں۔ اور ساتھ ہی ساتھ ہماری یہ خواہش بھی ہے کہ اگر آپ کو ناگوار خاطر نہ ہو تو ہم اپنے بچوں کی تعلیم کے لیے آپ سے مشاورت کریں۔ یہی وہ موضوع ہے جس پر ہم آپ سے گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔

ہمیں امید ہے کہ آپ نہ صرف اس فنِ حرب کے بارے میں اپنی رائے سے نوازیں گے بلکہ اس ضمن میں بھی ہماری رہنمائی کریں گے کہ ایک نوجوان کی عمومی تعلیم اور تربیت کے لیے کیا کیا باتیں مفید ہوسکتی ہیں اور کیا کیا مضر۔ براہِ کرم فرمائیے کیا آپ ہماری تجویز سے اتفاق کرتے ہیں۔

نکیاس: جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے تو لائسی میکس اور ملیسیاس، میں نہ صرف آپ کے جذبے کی قدر کرتا ہوں بلکہ اپنے بھرپور تعاون کی یقین دہانی بھی کراتا ہوں اور لیشس مجھے یقین ہے کہ آپ بھی اس ضمن میں اپنا دستِ تعاون دراز کریں گے۔

لیشس: یقیناً جناب! نکیاس اور میں جناب لائسی میکس کے اس بیان کی بھرپور تائید کرتے ہیں جو انھوں نے اپنے اور ملیسیاس کے والدین کے کارناموں کے بارے میں دیا ہے۔ ان کارناموں کا اطلاق نہ صرف ان دونوں کی زندگی پر ہوتا ہے بلکہ ہماری ان تمام لوگوں کی زندگیوں پر بھی برابر برابر ہوتا ہے جنھیں کسی نہ کسی لحاظ سے عوامی معاملات کے ضمن میں اپنے فرائض ادا کرنے ہوتے ہیں۔ جیسا کہ انھوں نے کہا، اس میں شک نہیں کہ ان کے والد جیسے لوگ اپنی خصوصی اور اہم مصروفیات کے باعث اپنے بہت سے ذاتی فرائض کی ادائیگی میں غفلت کے مرتکب ہوجاتے ہیں۔ جناب لائسی میکس آپ کی بات میں بڑا وزن ہے اور یہ حقیقت کی عکاس بھی ہے مگر نوجوانوں کی تعیم کے ضمن میں آپ ہماری مشاورت حاصل کرنے کی بجائے ہمارے دوست جناب سقراط کی خدمات کیوں نہیں حاصل کرلیتے۔ ایک تو ان کا تعلق بھی آپ ہی کے علاقے سے ہے علاوہ ازیں وہ اکثر ایسے مقامات پر موجود رہتے ہیں جہاں نوجوان شریفانہ اور مثبت انداز میں تعلیم و تربیت میں مشغول رہتے ہیں۔ خصوصاً ایسی تربیت جس میں آپ نے دلچسپی ظاہر کی ہے۔

لائسی میکس: کیوں! لیشس، کیا سقراط نے پہلے کبھی ایسے معاملات یا ایسی ذمہ داریاں ادا کی ہیں؟

لیشس: یقیناً جناب لائسی میکس!

نکیاس: میں بھی لیشس کی طرح اس بات سے بخوبی آگاہ ہوں۔ ابھی کچھ ہی عرصہ پہلے انھوں نے میرے بیٹوں کے لیے موسیقی کے استاد کا اہتمام کیا۔ ان کا نام ڈیمون (Damon) ہے اور وہ خود اگاتھوکلس (Agathocles) کا شاگرد ہے جو ویسے تو ہر لحاظ سے بہت مشہور اور مقبول آدمی ہے مگر بالخصوص موسیقی اور نوجوانوں کی عمر کے اس اہم حصے کے مسائل اور ان کے حل کی صلاحیت کے ضمن میں تو اس کا کوئی ثانی نہیں۔

لائسی میکس: جو لوگ میری عمر کو پہنچ جاتے ہیں، محترم سقراط، ںکیاس اور لیشس، وہ دراصل اپنے خانوادے کی نئی نسل سے ایک لحاظ سے دور ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ ان کا زیادہ تر وقت ان کی عمر کے بڑے بوڑھوں کے ساتھ گھر کی چار دیواری کے اندر گزرتا ہے۔ مگر اے سوفرونیکس (Sophroniscus) کے بیٹے آپ کا یہ اخلاقی فرض ہے کہ اپنے علاقے کے لوگوں اور نوجوانوں کو جس قدر ہدایت آپ سے بن پڑے آپ مہیا کریں۔ بلکہ میرا تو آپ کے والد کے پرانے دوست ہونے کی حیثیت سے آپ پر دوہرا حق ہے کیونکہ وہ اور میں ہمیشہ ساتھی اور دوست تھے اور اس کی موت کے لمحے تک کوئی ایسا ناخوشگوار مرحلہ نہیں آیا جہاں ہمارے مابین کوئی اختلاف ہوا ہو اور اب جبکہ آپ کا نام میرے سامنے آیا ہے تو مجھے یاد آتا ہے کہ ہمارے بچے اکثر اپنے گھر میں سقراط کا نام بڑی عزت واحترام سے اور بڑی کثرت سے لیتے ہیں۔ مگر میں کبھی ان سے پوچھ نہیں پایا کہ وہ جس شخص کا نام لیتے ہیں وہ یہی سوفرونیکس کا بیٹا ہے۔ بیٹو! ذرا بتانا تو کہ کیا تم لوگ انھی سقراط کا ذکر خیر کیا کرتے ہو؟

بیٹا: ہاں ابا جان، یہی وہ سقراط ہیں۔

لائسی میکس: مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی ہے سقراط کہ آپ نے اپنے والد کا نام روشن کیا ہے۔ وہ خود بھی واقعی بڑا شاندار آدمی تھا اور مجھے اس بات پر اور بھی زیادہ خوشی ہے کہ اس مرحلے کے بعد ہمارے خاندانی مراسم پھر سے بحال ہو جائیں گے۔

لیشس: فی الحقیقت جناب لائسی میکس، مناسب یہی ہے کہ آپ سقراط کو ہاتھ سے جانے نہ دیں۔ کیونکہ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں نے اسے نہ صرف اپنے والد کا بلکہ اپنے وطن کا نام روشن کرتے ہوئے بھی دیکھا ہے۔ دراصل ڈیلیئم (Delium) سے پسپائی پر یہ میرے ساتھ ہی تھا اور میں آپ کو باور کروانا چاہتا ہوں کہ اس وقت پوری فوج میں سے صرف چند مزید لوگوں نے سقراط جیسی بہادری اور دانائی کا مظاہرہ کیا ہوتا تو ہمیں ایسی ذلت کا سامنا ہرگز نہ کرنا پڑتا۔

سقراط: یہ تو بہت زیادہ تعریف ہے۔ ایک تو یہ وفادار ساتھیوں کا ہم زبان ہے اور دوسرے ان کارناموں کی مناسبت سے جو ان لوگوں کی گواہی کے مطابق آپ (سقراط) سے سرزد ہوئے ہیں۔ آپ اندازہ نہیں لگا سکتے کہ آپ کی شہرت سن کر مجھے کس قدر طمانیت ہوئی ہے۔ مجھے امید ہے آپ مجھے اپنے مخلص ترین دوستوں میں شمار کریں گے۔ آپ کو بہت پہلے ہمارے ساتھ ملاقات کر کے اور ہمارے ساتھ گھل مل کر رہنا چاہیے تھا۔ تاہم اب جبکہ ہم نے ایک دوسرے کو پھر سے پا لیا ہے تو کیا

میں درخواست کرتا ہوں کہ آپ بچے اور میرے دونوں نوجوانوں کے ساتھ بے تکلفی اور جان پہچان پیدا
کیجیے ورنہ میں آپ کے والد کی طرح آپ کے ساتھ بھی پائیدار دوستی کا خواستگار رہوں۔ تو کیا میں یہ
توقع رکھوں کہ آپ ایسا کریں گے اور آئندہ اسی طرح اپنے فرض کی طرف بھی متوجہ ہوں گے؟ مگر
پہلے یہ بتایئے کہ اس گفتگو کے آغاز میں جو ہم نے فن حرب یعنی زرہ بکتر کے ساتھ جنگی مہارت
کے مظاہرے کے بارے میں بات کی ہے آپ کا اس سلسلے میں کیا خیال ہے؟ کیا اس طریقے سے
نوعمر لڑکوں کو مفید طور پر تربیت دی جا سکتی ہے؟

سقراط: لسی میکس! جہاں تک مجھ سے بن پڑا میں آپ کو اس ضمن میں مناسب مشورہ دوں گا۔ اس کے
علاوہ بھی ہر لحاظ سے آپ کی ہدایت اور فرمائش پر عمل پیرا ہونے کی کوشش کروں گا مگر چونکہ میں ان
دوستوں سے عمر اور تجربے میں کم ہوں اس لیے مناسب ہوگا کہ پہلے میں اس موضوع پر ان بزرگوں
کی باتیں سنوں اور اس سے سیکھوں۔ البتہ اس گفتگو میں مجھے اپنی طرف سے (اضافی طور پر) کچھ
کہنے کی ضرورت محسوس ہوئی تو میں حاضر ہوں۔ ان کی گفتگو کے بعد ہی میں ان کی اور آپ کی
خدمت میں اپنی معروضات پیش کروں گا۔ لہٰذا نکیاس آپ یا آپ کے ساتھی کے خیالات سے
شروع کرتے ہیں۔

نیسیاس: سقراط! محترم مجھے تو گفتگو شروع کرنے پر کوئی اعتراض نہیں اور اس فن کو حاصل کرنے کے بارے
میں میرا خیال ہے کہ یہ نوجوانوں کے لیے کئی جہتوں سے بہت مفید ثابت ہوتا ہے۔ ایک فائدہ تو
یہی ہے کہ یہ ان کی وقت گزاری کے علاوہ تفریح کا مثبت ذریعہ تو ہے ہی مگر یہ بے حد صحت مند
ذریعہ بھی ہے کیونکہ اس سے جسمانی صحت کے تحفظ کا بڑا موقع ملتا ہے۔ یہاں تک کہ جمناسٹک بھی
اس سے زیادہ سخت جسمانی ورزش فراہم نہیں کرتی اور ایک آزاد (جو غلام نہیں) فرد کے لیے یہ
ورزش اگر گھڑ سواری کے ساتھ ہو تو بے مثال جواب ثابت ہوتی ہے کیونکہ اسی طریق تربیت سے گزر کر
آنے والے نوجوان فوجی ملازمت میں مخالف کے حربوں کا بھرپور جواب دینے کے قابل ہو سکتے
ہیں۔ اس کے علاوہ اس ورزش کا معمولی سا فائدہ اس وقت ہوتا ہے جب حقیقی جنگ کی صورت
میں جہاں آپ کو دیگر لوگوں کے ساتھ ایک صف میں لڑنا ہوتا ہے۔ تاہم جب صفوں کے الٹ
جانے پر جنگ میں مغلوب ہونے کا خدشہ ہو تو وہاں یہ مہارت آپ کے بے حد کام آتی ہے اور
اس کا فائدہ آپ کے تنظیمی صورت میں تو پہنچتا ہی ہے لیکن اس کا فائدہ اس وقت اور زیادہ واضح

طور پر حاصل ہوتا ہے جب آپ کو کسی وجہ سے پیچھے ہٹنا پڑے اور آپ کو شدید حملے کا سامنا ہو۔ اس وقت اس فن کے ماہر کو ایک تو کیا کئی حملہ آوروں سے بیک وقت نمٹنے کی صلاحیت حاصل ہو جاتی ہے۔ بہر طور وہ ہر صورت میں فائدے ہی میں رہتا ہے۔ اس کے علاوہ اس صلاحیت سے فرد کو بعض دیگر عمدہ سبق بھی حاصل ہوتے ہیں کیونکہ جو شخص زرہ بکتر میں لڑنے کی تربیت حاصل کر لیتا ہے اسے فوجوں کو حسبِ ضرورت تربیت دینے کا سلیقہ بھی حاصل ہو جاتا ہے کیونکہ یہ متعلقہ سبق کا منطقی نتیجہ ہوتا ہے اور یہ وہ مرحلہ ہے جس سے کامیابی سے گزرنے کے بعد اسے جرنیل تک ترقی کرنے میں بے حد آسانی ہوتی ہے۔ یہ بات بآسانی سمجھ میں آ جاتی ہے کہ فنِ حرب و ضرب کے دوسرے اسباق اور دیگر اقسام کی تربیتیں انسان کو قابلِ فخر مقام عطا کرتی ہیں اور ظاہر ہے کہ یہ فن جس کا ہم تذکرہ کر رہے ہیں دیگر فنون کی بنیاد ثابت ہوتا ہے۔ میں ایک اور فائدہ بھی گنوانا چاہتا ہوں اور وہ بھی دیگر فوائد سے کسی طور کم نہیں اور وہ ہے کہ یہ سائنس انسان کو خود تربیتی طریقوں کے مقابلے میں میدانِ جنگ میں زیادہ مضبوط، خود اعتماد اور بہادر بناتی ہے۔ میں یہ ذکر کیے بغیر بھی نہیں رہ سکتا، اگرچہ بعض لوگوں کی نظر میں شاید یہ کوئی معمولی بات ہو، کہ ایسا شخص جب دشمن کے سامنے آتا ہے تو اس کی آمد دشمن کے لیے زیادہ متاثر کن ہوتی ہے۔ یوں دشمن پر پہلے ہی اس کی دہشت طاری ہو جاتی ہے۔ لائسی میکس میری رائے تو یہ ہے کہ لڑکوں کو اس فن کی تربیت لازمی دلانا چاہیے اور اس کی وجہ وہی ہے جسے میں پہلے بیان کر چکا ہوں۔ مگر ہو سکتا ہے کہ لیشس کا نقطۂ نظر ذرا مختلف ہو سو میں اس کی رائے معلوم کرنے کے لیے بے چین ہوں۔

لیشس: میں نکیاس کے اس نقطۂ نظر سے ضرور اختلاف کروں گا کہ کسی طرح کا علم و فن انسان کے لیے نقصان دہ بھی ہو سکتا ہے کیونکہ علم کی مجموعی حیثیت اچھائی ہی کی ہے اور اگر نکیاس اور اس فن کے دیگر اساتذہ کی رائے میں ہتھیار کا استعمال باقاعدہ علم کی حیثیت رکھتا ہے تو اسے یقیناً سیکھنا چاہیے لیکن اگر اس کا شمار علم کی کسی نوعیت کی ذیل میں نہیں آتا بلکہ اس کی وکالت کرنے والوں کو دھوکا دینا ہے یا پھر بعض لوگوں کے خیال کے مطابق یہ علم تو ہے مگر کم تر درجے کا، تو ایسی صورت میں اس کے حصول کا کیا فائدہ؟ یہ رائے میں نے اس لیے دی ہے کہ اگر یہ علم واقعی کسی اہمیت کا حامل ہوتا تو لیسی ڈیمون کے لوگوں، جن کی تمام زندگی ایسے علوم کی جستجو اور ان پر عمل کرنے میں صرف ہوتی ہے جو انھیں جنگ میں دیگر اقوام میں ممتاز مقام دلا سکے، اسے نظر انداز نہ کرتے بلکہ وہ اسے یقیناً

دریافت کر چکے ہوتے اور اگر ان سے صرف نظر ہو گیا تھا تو اس فن کے دانشور یقیناً اس امر کا سراغ لگانے میں ناکام ہوتے کہ تمام ہیلینا (Hellenes) اور لیسی ڈیمون کے لوگ جن کو ان معاملات میں غضب کی دلچسپی ہوتی ہے، اور ان میں جس طرح دیگر فنون کے ماہرین کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اس فن کے ماہرین بھی ان کے ہاں بلند مرتبہ پاتے، بالکل ایسے ہی جیسے ہمارے ہاں المیہ شعرا کو سر آنکھوں پر بٹھایا جاتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ جسے ذرا بھی اعتماد ہو کہ وہ المیہ شاعری میں طاق ہے وہ ادھر ادھر قسمت آزمانے کی بجائے سیدھا یہاں ایتھنز پہنچ جاتا ہے اور یہاں اس کی کامیابی فطری بات ہے۔ اس کے برعکس یہ ہتھیار بند لڑاکا لڑکے لیسی ڈیمون (Lacedaemon) کو ایک ایسی مقدس سرزمین سمجھتے ہیں جس کی سرحدوں کی توہین ان کے ہاں ناقابل معافی گناہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ چاروں طرف کی ریاستوں کے چکر لگاتے ہیں مگر سپارٹا کے لوگوں کے علاوہ کسی کو داخل نہیں ہونے دیتے بالخصوص وہ لوگ جو فن حرب وضرب میں ذرا بھی اپنے آپ کو قابل ذکر سمجھتے ہیں اس اصول کی بڑی سختی سے پاسداری کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ محترم لائسی میکس، میرا ایسے بہت سے شرفا سے سابقہ پڑا ہے اور میں نے انھیں آزمایا بھی ہے خصوصاً عملی زندگی میں اور ان کے بارے میں اپنے تاثرات آپ کو بتائے دیتا ہوں۔ ایسے لوگوں میں سے کسی کو جنگ میں ہمیشہ زیادہ جانی نقصان کا سامنا رہا ہے۔ اس کے علاوہ جتنے فنون ہیں ان کے ماہرین کی شہرت ان کی فن میں مشق اور ریاضت سے راست متناسب ہوتی ہے مگر یہ گروہ خصوصاً بہت بدقسمت ثابت ہوتا ہے، مثلاً سٹیسی لاس (stesilaus) ہی کو دیکھ لیجیے جو ابھی یہاں ہتھیار بند جنگ کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ یہاں وہ واقعی اپنی قوت کا شاندار مظاہرہ کر کے مجمع کو متاثر کر رہا تھا۔ میں نے اسے ایک اور موقع پر دیکھا ہے جب اسے عملی زندگی کی ایک صورت حال کا سامنا تھا اور وہاں اس کا مظاہرہ اس سے بالکل مختلف اور دیکھنے کے قابل تھا۔ اس وقت یہ بحری فوج میں تھا اور ایک ایسے جہاز میں موجود تھا جس کا ٹکراؤ ایک مسافر بردار جہاز سے ہو گیا تھا۔ اس وقت اس کے ہاتھ میں ایک ایسا ہتھیار تھا جو آدھا نیزہ اور آدھا درانتی کی صورت میں تھا۔ بظاہر وہ منفرد ہتھیار اس منفرد آدمی کے وجود کے ساتھ میل کھا رہا تھا۔ میں بات کو مختصر کرتے ہوئے یہ بتاتا ہوں کہ اس انوکھے ہتھیار یعنی درانتی نما نیزے کے ساتھ ہوا کیا۔ اس کی لڑائی کے دوران اس کا ہتھیار دوسرے جہاز کے رسوں میں پھنس گیا اور پھنسا بھی بری طرح۔ اگرچہ اس نے بہت زور لگایا مگر نیزے کو کھینچنے

میں کامیاب نہ ہوا۔ دونوں جہاز ایک دوسرے کے قریب سے (مخالف سمت میں) گزر رہے تھے
۔ کچھ دیر تو وہ اپنے جہاز کے کنارے پر دوسرے جہاز کے ساتھ ساتھ بھاگا مگر جیسے وہ ذرا دور ہوا
اس نے نیزے کو جانے دیا اور بس اس کے ہینڈل کا سرا اس کے ہاتھ میں رہ گیا۔ مسافر بردار جہاز
کے سوار اس کی اس حالت کو دیکھ کر قہقہے لگانے لگے اور ان میں سے کسی نے ایک پتھر اس کے
قدموں کے قریب عرشے پر پھینکا اس کی آواز سے یہ یوں بدکا کہ نیزہ بالکل ہی ہاتھ سے نکل
گیا۔ اس پر خود اس کے جہاز والوں نے بھی اس کی ہنسی اڑائی کیونکہ انھوں نے ٹرانسپورٹ شپ
کے ساتھ لٹکے رہ جانے والے نیزے کو پکڑ کر کھینچ لیا تھا۔ میں نکیاس کی بات کی بالکل نفی تو ہرگز نہیں
کرنا چاہتا۔ اس کے بیان کے مطابق اس فن کا کوئی فائدہ تو یقیناً ہوگا اگرچہ (میری پہلی گزارش
کے مطابق) بالکل معمولی ہی کیوں نہ ہو۔ ہوسکتا ہے یہ سرے سے فن ہی قرار نہ پایا جاسکے بلکہ محض
ایک دکھاوا ہو۔ دونوں صورتوں میں یہ کوئی اتنی بڑی صلاحیت نہیں جس کا حصول انسان کی ضرورت
قرار دیا جاسکے۔ لہٰذا میری رائے میں اگر اس فن کا ماہر فطرتاً بزدل ہو تو اس کے غضبناک ہوجانے کا
واضح امکان موجود رہے گا جو اس کے کردار کے برے رخ ہی کی نمائش کا سبب بنے گا اور اگر ایسا
بہادر ثابت ہوا اور شاذ و نادر ہی اس نے ناکامی کا منہ دیکھا تو بھی لوگ جو اس کے کمال کا مشاہدہ کر
رہے ہوں گے اس میں کیڑے ہی نکالیں گے۔ کیونکہ ایسے ظاہر داروں کے ہاں حسد بے تحاشا ہوتا
ہے۔ ایسے کارناموں کو سراہنے کے لیے حقیقی دلیری درکار ہوتی ہے۔ وہ بھی اس صورت میں جب
وہ خود اس فن میں مہارت کا دعوٰی کرتا ہو۔ لائسی میکس اس فن کے بارے میں میری تو یہ رائے ہے
مگر جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے سقراط سے اس کی رائے ضرور پوچھیے اور جب تک وہ اس موضوع
پر اظہار خیال نہ کرلیں، انھیں ہرگز جانے نہ دیجیے!

لائسی میکس: ہاں تو سقراط، میں اس سلسلے میں اظہار خیال کی درخواست کرتا ہوں۔ یہ اس لیے بھی ضروری ہے
کہ دونوں مشیروں نے ایک دوسرے کے بالکل برعکس رائے دی ہے لہٰذا جب تک کوئی تیسرا فریق
اس ضمن میں اپنی حتمی رائے نہ دے لے کسی نتیجے پر پہنچنا مشکل ہوگا۔ اگر دونوں نے اس ضمن میں
کسی ایک رائے پر مکمل اتفاق کیا ہوتا تو پھر کسی تیسری رائے کی ضرورت نہ پڑتی۔ مگر اب صورت
حال یہ ہے کہ لیشس کی ایک رائے ہے تو نکیاس کی دوسری۔ میں سننا چاہتا ہوں کہ ان دونوں
دوستوں میں سے آپ کس کے ساتھ متفق ہیں؟

سقراط: لائسی میکس ایسی صورت میں آپ کے لیے قابل قبول کیا ہوگا۔ کیا آپ کثرتِ رائے کا احترام کریں گے؟

ملیسیاس: ہاں، آخر کیوں نہیں اس کے علاوہ اور راستہ ہی کون سا ہے؟

سقراط: اور ملیسیاس! کیا آپ بھی یہی کچھ کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں؟ اگر آپ اپنے بچوں کے لیے جمناسٹک کی تربیت کا منصوبہ رکھتے تو اس ضمن میں کیا آپ اکثریت کی رائے کو اہمیت دیتے یا اس شخص کی رائے کو جس نے کسی ماہر سے تربیت حاصل کر کے اس فن کمال کا مظاہرہ بھی کیا ہو۔

ملیسیاس: سقراط! ہم نے لامحالہ موخرالذکر صورت کو اہمیت دی ہوتی ہے کیونکہ اس کی معقولیت میں کلام نہیں۔

سقراط: میرے خیال میں ایسے ایک ماہر کی رائے کو ہم چاروں کی رائے پر فوقیت حاصل ہونی چاہیے۔

ملیسیاس: یقیناً!

سقراط: اسی لیے میں اس ضمن میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ صحیح فیصلہ معیارِ علم کی بنیاد پر ہوتا ہے نہ کہ کثرت کی رائے پر۔

ملیسیاس: بے شک ایسا ہی ہے۔

سقراط: ایسی صورت میں کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ پہلے ہم یہ دریافت کریں کہ ہم میں سے کوئی اس موضوع پر مہارت رکھتا ہے، جس میں ہمیں فیصلہ کرنا مطلوب ہے؟

اگر کوئی ایسا فرد موجود ہو تو پہلے اسی کی رائے لی جانی چاہیے خواہ وہ اپنی رائے کا اکیلا آدمی ہی کیوں نہ ہو اور اس کی رائے تمام لوگوں کی رائے کے خلاف ہی کیوں نہ ہو اور اگر ایسا کوئی فرد موجود نہیں ہے تو پھر ہمیں مزید مشاورت کی ضرورت پڑے گی۔ کیا لائسی میکس اور آپ سمجھتے ہیں کہ یہ کوئی معمولی مسئلہ ہے؟ کیا آپ اس طرح اپنی زندگیوں کی قیمتی ترین متاع کو داؤ پر لگانے کی بات نہیں کر رہے؟ کیونکہ آپ کے بچے ہی دراصل آپ کی حقیقی دولت ہیں اور تربیتی پروگرام کے ذریعے عملی زندگی میں کامیابی یا ناکامی پر ہی ان کے والدین کے گھر کی شہرت یا بدنامی کا دارومدار ہے۔

ملیسیاس: یقیناً یہی بات ہے!

سقراط: فرض کیجیے، میرے سابقہ قول کے مطابق، ہم یہ طے کرنے جا رہے ہیں کہ ہمارے بچوں کی تربیت کا فریضہ سرانجام دینے کے لیے کون مناسب رہے گا؟ تو کیا ایسے شخص کا انتخاب نہیں ہونا چاہیے جو

نہ صرف مطلوبہ فن میں کمال مہارت رکھتا ہو بلکہ اس فن کے استعمال کا تسلی بخش تجربہ بھی رکھتا ہو اور اس فن کی تدریس میں بھی اسے کمال حاصل ہو؟

ملیپاس: میرا بھی یہی خیال ہے کہ ہمیں ایسے ہی فرد کا انتخاب کرنا چاہیے۔

سقراط: مگر کیا اس فیصلے سے پہلے ایک اور بنیادی سوال پر توجہ دینا ضروری نہ ہوگا؟ یہ سوال اس مخصوص فن کی نوعیت سے متعلق ہے جس میں ہمیں اپنے بچوں کی تربیت مطلوب ہے۔

ملیپاس: میں آپ کی بات سمجھ نہیں پایا!

سقراط: میں کوشش کرتا ہوں کہ اپنی بات سادہ ترین لفظوں میں بیان کروں۔ یعنی ہم جب ایک دوسرے سے یہ پوچھ رہے ہیں کہ ہم میں سے کون ہے جس کو اس فن میں مکمل دسترس حاصل ہے اور اس فن کی تدریس کا تجربہ اور صلاحیت بھی رکھتا ہے تو ہم نے ابھی یہ تو طے ہی نہیں کیا کہ ہم کس فن کی مہارت کی بات کر رہے ہیں۔

نکیاس: کیوں نہیں سقراط! کیا یہی بنیادی سوال نہیں ہے کہ کیا نوجوانوں کو زرہ بکتر کے ساتھ فنون حرب کی مہارت کے لیے تربیت حاصل کرنی چاہیے یا نہیں؟

سقراط: وہ تو ٹھیک ہے نکیاس، مگر اس سے پہلے ایک سوال پیدا ہوتا ہے، جسے میں کچھ اس طرح واضح کر سکتا ہوں: مثلاً جب کوئی آنکھوں میں دوائی ڈالنے کے ضمن میں کسی سے مشورہ چاہے تو اس سے کیا مراد ہوتی ہے؟ یعنی وہ مشورہ دوائی سے متعلق ہوتا ہے یا آنکھوں سے متعلق؟

نکیاس: آنکھوں سے متعلق۔

سقراط: اور جب کوئی گھوڑے پر زین رکھنے کے وقت کے بارے میں سوچ رہا ہو تو اس کی نگاہوں میں اہمیت گھوڑے کی ہوگی، زین کی نہیں۔ کیا خیال ہے؟

نکیاس: یقیناً۔

سقراط: مختصر یہ کہ کوئی فرد جب کوئی امر ملحوظ رکھتا ہے مگر کسی امر شے کے لیے اس کی نظر میں نتیجہ ہوتا ہے نہ کہ ذرائع؟

نکیاس: یقیناً وہ نتیجے پر نظر رکھتا ہے۔

سقراط: اور جب آپ کسی مشیر کی خدمات حاصل کرنا چاہتے ہیں تو آپ کی نگاہیں بھی اس حقیقت پر لگی ہوتی ہیں کہ وہ مشیر آپ کے پیش نظر مقصد حاصل کرنے سے متعلق ضروری طریق کار سے آگاہ اور

کام میں ماہر ہے؟

نکیاس: بالکل درست!

سقراط: اور اس وقت ہمارے پیش نظر ایسا علم ہے جس کا اصل مقصد بعض نوجوانوں کی روحانی نشوونما ہے؟

نکیاس: جی ہاں!

سقراط: اور اب یعنی اس وقت ہم کسی ایسے فرد کی تلاش میں ہیں جس کو روحانی عوارض کے علاج کا مکمل علم اور تجربہ حاصل ہو اور یہ بھی کہ خود اسے ماہر فن اساتذہ سے تربیت میسر آئی ہو۔

لیشس: مگر سقراط! کیا آپ کی نظر سے ایسے لوگ نہیں گزرے کہ انھیں کبھی اچھے اساتذہ دستیاب نہیں ہوئے مگر اپنے فن میں ان لوگوں سے بدرجہا بہتر ہیں جنھیں بعض معاملات میں اساتذہ میسر آئے ہیں۔

سقراط: ہاں لیشس! مگر آپ ایسے لوگوں پر، چاہے وہ لاکھ ماہر فن ہونے کا دعویٰ رکھتے ہوں، کبھی بھروسا نہیں کر سکتے جب تک کہ وہ خود عملاً ایک یا زیادہ معاملات میں اپنی مہارت کا عملی ثبوت فراہم نہیں کر دیتے۔

لیشس: یہ تو سچ ہے!

سقراط: اور اس لیے نکیاس اور لیشس، ہمیں معلوم ہے کہ لائسی میکس اور ملیسیاس اپنے نوجوان لڑکوں کی ذہنی پختگی کے لیے بے چین ہیں اور اسی ضمن میں ہماری مشاورت کے خواستگار ہیں تو ہمارا فرض ہے کہ پہلے ہم انھیں یہ بتائیں کہ ہمارے اساتذہ کون تھے؟ یا یہ کہ آیا ہمارے واقعتاً اساتذہ تھے اور انھوں نے اپنی مہارت کی بدولت اساتذہ میں، خصوصاً نوجوانوں کی ذہنی اور روحانی نشوونما کے حوالے سے ایک بلند مقام حاصل کیا تھا اور ہماری شخصیتوں میں بھی ان کی مہارت کا کافی عمل دخل ہے یا پھر ہم میں سے کوئی یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ اگرچہ اسے کبھی کوئی استاد میسر نہیں آیا مگر اس کے ریکارڈ پر کچھ کارنامے ہیں اور پھر وہ ان کارناموں کا ثبوت پیش کرے گا تا کہ وہ ثابت کر سکے کہ اس کی کوششوں سے بعض لوگ خواہ وہ ایتھنز ہی کے تھے یا غیر ملکی اور وہ ملازم تھے یا آزاد اپنی شخصیت میں مثبت تبدیلی لانے میں کامیاب ہوئے ہیں اور اگر وہ نہ تو اساتذہ ہی کی نشاندہی کر سکے اور نہ ہی اپنے کارناموں کی بنیاد پر کوئی دعویٰ کر سکے تو اسے یہ معاملہ دوسروں کے حوالے کر دینا چاہیے تاکہ اس پر دوستوں کے بچوں کو بگاڑنے کا الزام نہ آنے پائے اور نہ ہی کبھی انھیں اپنے

ہم چشموں میں خفیف ہونا پڑے۔ سو جناب لائسی میکس اور محترم ملیسیاس سب سے پہلے تو میں اپنے بارے میں اعتراف کرنا چاہتا ہوں کہ مجھے خصوصاً کردار سازی کے حوالے سے کبھی کوئی استاد میسر نہیں آیا۔ اگر چہ میری بچپن ہی سے یہ خواہش رہی ہے کہ کاش مجھے بہترین اساتذہ سے سیکھنے کا موقع ملتا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ میں سوفسطائیوں کو مناسب فیس مہیا کرنے کے قابل کبھی نہیں ہوا۔ ظاہر ہے کہ روحانی نشوونما کے لیے تو انھی کی رہنمائی کی ضرورت پڑتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں آج تک فن کو خود اپنے ذرائع سے دریافت کرنے کی حالت میں کبھی نہیں ہوا۔ ہاں البتہ اس میں حیرانی کی کوئی بات نہ ہوگی اگر لیشس اور نکیاس یہ دعویٰ کریں کہ انھوں نے اس فن کو دریافت کیا ہے اور اسے حاصل بھی کیا ہے چونکہ یہ مالی اعتبار سے مجھ سے بدرجہا بہتر ہیں لہٰذا انھیں دوسروں سے سیکھنے کے بہترین مواقع میسر آئے ہوں گے۔ علاوہ ازیں وہ مجھ سے عمر میں بھی بڑے ہیں۔ لہٰذا انھیں یقیناً حصول علم کے لیے زیادہ وقت میسر آیا ہوگا۔ اس لیے مجھے یقین ہے کہ کسی انسان کو تربیت دینے کے لیے یہ بہترین استاد ثابت ہوں گے کیونکہ اگر انھیں اس میدان میں مناسب اعتماد حاصل نہ ہوتا تو وہ اتنے اعتماد سے ان معاملات پر روشنی نہ ڈال سکتے کہ ان میں سے کون کون سے نوجوانوں کے لیے مفید ثابت ہو سکتے ہیں اور کون سے مضر! مجھے دونوں کی صلاحیتوں پر پورا اعتماد ہے مگر مجھے حیرت اس بات پر ہے کہ یہ ایک دوسرے سے شدید اختلاف رائے رکھتے ہیں اور اسی لیے جناب لائسی میکس آپ لیشس کی فرمائش کے مطابق واقعی مجھے اس وقت تک جانے نہ دیں جب تک میں مکمل اور تسلی بخش جواب مہیا نہ کر دوں مگر میں جواباً یہ فرمائش بلکہ درخواست کروں گا کہ آپ لیشس اور نکیاس کو بھی جانے نہ دیں اور ان سے بھی بھرپور سوالات کریں یعنی ان سے پہلے سوال تو یہی ہونا چاہیے کہ "جیسے سقراط نے اعتراف کیا ہے کہ وہ اس خصوصی مسئلے سے متعلق علم نہیں رکھتا۔ وہ یہ فیصلہ کرنے سے بھی قاصر ہے کہ تم دونوں نے جو کچھ کہا ہے اس میں سے کیا درست ہے اور کیا غلط، نہ ہی اس نے کبھی خود سے کچھ دریافت کیا ہے نہ اس فن کے کسی ماہر استاد کی خدمات حاصل کر پایا ہے۔ لہٰذا نکیاس اور لیشس اب آپ بتائیے کہ آپ کی نظر میں زیر بحث فن کے حوالے سے وہ بہترین تربیت کار کون ہو سکتا ہے جس کی خدمات ہم حاصل کر سکیں اور یہ بھی کہ کیا آپ دونوں نے کبھی کوئی فن تخلیق کیا ہے یا دوسرے کسی فرد یا افراد سے سیکھا ہے اور اگر سیکھا ہے تو وہ قابل ذکر اساتذہ کون تھے اور انھیں کون کون سے رفقائے کار کی

معاونت حاصل تھی؟اور اگر آپ دونوں اپنے اپنے سیاسی معاملات میں اس قدر الجھے ہوئے ہیں کہ وقت نہیں نکال سکتے تو ہمارا ساتھ دیں تاکہ آپ کے ان ہی اساتذہ سے درخواست کی جائے کہ وہ نہ صرف ہمارے بلکہ آپ کے بچوں کی بھی روحانی تربیت کے ضمن میں ہماری مدد کریں۔صرف یہی صورت ہے کہ ان کی تربیت خامیوں سے مبرا ہوسکتی ہے اور وہ اپنے اجداد کے لیے باعث ننگ و عار نہ رہیں اور اگر آپ کا دعویٰ ہے کہ آپ کو اس فن میں بعض قابل ذکر دریافتوں کا اعزاز حاصل ہے تو براہ کرم اس کا کوئی قابل اعتبار ثبوت پیش کریں۔وہ ثبوت مثلاً ایسے لوگ ہوسکتے ہیں جو ویسے بڑے معمولی لوگ تھے مگر آپ کی تعلیم وتربیت نے انھیں قابل فخر مقام دلا دیا اور وہ اچھے اور معزز لوگوں میں شمار ہونے لگے۔کیونکہ اگر آپ موجودہ ذمہ داری کو اولین تجربے کے طور پر لینا چاہتے ہیں تو اس کا تو یہ مطلب ہوگا کہ آپ (Vile corpus' of a Carian slave) پر تجربے کرنے کی بجائے خود اپنے بچوں کو تجربے کی نذر کردینا چاہتے ہیں اور یہ تو قدیم کہاوت کے مطابق چھوٹے چھوٹے برتن بنانے کے لیے بڑا برتن توڑ ڈالنے والی بات ہوگی۔لہٰذا ہمیں واضح طور پر بتائیے کہ آپ کن صلاحیتوں کا دعویٰ کرتے ہیں اور کن کا نہیں۔لائسی میکس انھیں اس طویل سوال کا جواب دینے پر مجبور کیجیے اور اس سے پہلے انھیں ہرگز نہ جانے دیجیے۔

لائسی میکس:دوستو!میں سقراط کی الفاظ کی بھرپور تائید کرتا ہوں۔مگر نکیاس اور لیشس، پہلے آپ بتائیے کہ آپ اس سوال کے جواب میں تفصیلی وضاحت پیش کرنا پسند کریں گے؟یقیناً میں اور ملیسیاس سقراط کے اٹھائے گئے سوال کا آپ کی طرف سے جواب پاکر بے حد خوش ہوں گے بشرطیکہ آپ جواب دینا چاہیں کیونکہ یہ تو میں نے آغاز گفتگو ہی میں کہہ دیا تھا کہ ہماری آپ کو اپنے مشیر قرار دینے کی اولین وجہ یہ توقع تھی کہ آپ نے خود بھی اس معاملے پر مناسب غور وخوض کیا ہوگا کیونکہ آپ دونوں کے بچے بھی ہمارے بچوں ہی کی عمر کے ہیں جنھیں اس مرحلے پر تربیت کی سخت ضرورت ہے۔
سو اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو آپ سقراط کو بھی اس بحث میں شامل کرسکتے ہیں جیسا کہ انھوں نے خود دعوت دی ہے۔وجہ یہ ہے کہ ہم فی الواقع ایک اہم مسئلے پر بحث کے ذریعے کسی مناسب نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کر رہے ہیں۔لہٰذا آپ کا ایک دوسرے کے سوالوں کا جواب دینا اس امر میں نہایت مفید ثابت ہوگا۔مجھے امید ہے آپ ہماری درخواست کو درخور اعتنا سمجھیں گے۔

لائسی میکس: جناب نکیاس مجھے اندازہ ہے کہ آپ نے صرف سقراط کے والد کو دیکھا ہے۔ اس لیے خود سقراط کی صلاحیتوں اور کارناموں سے آگاہ نہیں۔ آپ نے تو شاید اسے ایک بچے ہی کی عمر میں دیکھا ہوگا اور شاید سقراط کو انفرادی طور پر نہیں بلکہ قربانی کے کسی موقع یا ایسی ہی کسی تقریب میں اس کے باپ یا دیگر متعلقین کے ساتھ دیکھا ہوگا۔ آپ کی باتوں سے ظاہر ہے کہ آج سے پہلے آپ نے اسے ایک معقول عمر کے فرد کی عمر میں نہیں دیکھا ہوگا۔

لائسی میکس: نکیاس، میں آپ کے ان الفاظ کا اصل مقصد جاننے کے لیے بے قرار ہوں۔

نکیاس: کیونکہ شاید آپ کو اس امر کا اندازہ نہیں کہ جب سقراط کے ساتھ کسی کو فکر یا اعتبار سے قربت حاصل ہو جائے اور وہ ایک بار بحث میں شامل ہو جائے تو بس سمجھو وہ اس کے دلائل کے جال میں پھنس گیا۔ پس پھر وہ جو بھی موضوع منتخب کرے تو یہ اسے مسلسل اسی موضوع میں ایسی ایسی پٹخنیاں دے گا کہ وہ بے اختیار اپنی موجودہ اور ماضی کی زندگی کی تفصیلات تک اگل کر رکھ دے گا اور جب وہ شخص ایک بار اس میں الجھا تو سقراط اسے اس وقت تک چھٹکارا حاصل نہیں کرنے دے گا جب تک کہ اس کے ذہن کو کھنگال کر نہ رکھ دے۔ اب میں تو اس کے طریق کار کا عادی ہو چکا ہوں اور مجھے یقین ہے کہ اس بحث میں بھی وہ وہی طریقہ اختیار کرے گا جس کی میں پہلے ہی وضاحت کر چکا ہوں اور پھر نقصان تو میرا ہی ہوگا کیونکہ یہ تو میں بتا ہی چکا ہوں کہ میں اس کی بحث کا شیدائی ہوں اور جناب لائسی میکس، اگر ہماری کسی موجودہ یا گزشتہ غلطی کی نشاندہی ہو جائے تو اس میں کوئی قباحت نہیں کیونکہ سولون (Solon) کے الفاظ میں، ''جو شخص مناسب غور و فکر کے ساتھ کام کا آغاز نہیں کرتا اسے آخر کار سخت مشقت جھیلنا پڑتی ہے''۔ جہاں تک اس (سقراط) کے سیکھنے کی خواہش کا تعلق ہے یہ تو اس کی زندگی کے ساتھ ہی جائے گی۔ اسے شاید ہی یہ خیال کبھی آئے کہ بڑھاپا بھی ایک خاص قسم کی دانائی ساتھ لاتا ہے۔ میری ذات کے لیے سقراط کی یہ کج بحثی/سخت بحث، معمول کی بات ہے نہ یہ میرے لیے ناخوشگوار ہو سکی ہے۔ دراصل مجھے اندازہ تھا کہ سقراط کی گفتگو کے نتیجے میں گفتگو ہمارے بچوں کی ذات سے آگے بڑھ کے خود ہماری ذات کو احاطے میں لے لے گی۔ اس لیے جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے میں سقراط کے ساتھ اسی کے رنگ میں بحث کرنے کو تیار ہوں مگر پہلے ہمارے دوست لیشس سے تو پوچھ لیجیے کہ اس کے احساسات کیا ہیں۔

لیشس: نکیاس میرا تو فقط ایک ہی احساس ہے (بالخصوص بحث کے حوالے سے) کچھ لوگوں کی نظروں

میں، میں بحث کا شیدائی ہوں جبکہ کچھ لوگ مجھے اس سے نفرت کرنے والے فرد کی حیثیت سے پہچانتے ہوں گے کیونکہ بحث یا تقریر میں مصروف انسان راست گو اور حقیقت پسند ہو اور اسے اپنے موضوع اور متعلقہ مواد پر پوری پوری دسترس حاصل ہو تو میں ایسی بحث یا تقریر سے بے پناہ خوشی محسوس کرتا ہوں کیونکہ میں انسان کو اس کے لفظوں سے یا اس کے بیان کو اس کی شخصیت کے پیمانے سے پرکھتا ہوں اور دونوں میں ہم آہنگی اور مطابقت تلاش کرنے کا متمنی رہتا ہوں۔ایسے میں میری حیثیت اس سچے موسیقار کی سی ہوتی ہے جس کی نظر گیت کے لفظوں کی بجائے اس کی دھن میں موجود ہم آہنگی یا بہترین آلہ موسیقی پر ہوتی ہے۔اس لیے کہ اس کی اپنی زندگی میں زبردست ہم آہنگی پائی جاتی ہے، جس کی بنیاد اس کے اقوال اور کارناموں پر ہوتی ہے جو موسیقی کی دھنوں کی طرح ترتیب وار ہوتے ہیں اور موسیقی بھی نہ ''یون'' کی (Ionian) نہ ''فرائجی'' (Phrygian) اور نہ لیڈی (Lydian) بلکہ خالص اور خالص ہیلینائی (Hellanic) طرز میں ہو جو خالصتاً ''ڈوری'' کا (Dorian) ہوتا ہے۔ایسے بولنے والے شخص کی آواز مجھے سحر میں مبتلا کر دیتی ہے اور یہی نہیں اس کی آواز کے سحر میں، میں خود کو تقریر یا بحث کا شیدائی محسوس کرنے لگتا ہوں اور اس کے الفاظ سے مجھ پر ایک عجیب نشے کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔

مگر اس کے برعکس جب میں کسی ایسے شخص کی گفتگو سنتا ہوں جس کے قول اور فعل میں تضاد ہو تو ایک خاص ناگواری مجھے گھیر لیتی ہے۔بلکہ ایسا شخص جتنا اچھا بولے اتنا ہی میرے لیے غیر پسندیدہ ہوتا جاتا ہے اور ایسی صورت حال میں مجھے تقریر کے فن سے نفرت محسوس ہونے لگتی ہے۔جہاں تک سقراط کا تعلق ہے میں اس کے الفاظ یا کلام کو تو زیادہ نہیں جانتا مگر اتنا ضرور ہے کہ اس کے اعمال و افعال سے میں ایک مدت سے واقف ہوں اور اس کے کردار سے مجھے اندازہ ہوتا ہے کہ ایک شریف اور آزاد انسان کا کردار اس کی سرشت میں شامل ہے اور اگر اس کے الفاظ بھی اسی مطابقت سے ہیں تو سمجھ لیجیے کہ میں اس کے ساتھ سو فیصد متفق ہوں اور ایسے شخص کے ساتھ تفتیش میں ملوث ہونے میں خوشی اور فخر محسوس کروں گا بلکہ اس سے سیکھ کر مجھے اطمینان حاصل ہوگا۔کیونکہ میں بھی سولون کی اس بات کا قائل ہوں کہ ''مجھے سیکھتے ہی سیکھتے عمر کے انجام تک پہنچنا چاہیے!'' مگر میں اس کہاوت میں ''اچھی باتیں'' کا اضافہ کرنا چاہوں گا۔ممکن ہے سقراط مجھے یہ کہنے کی اجازت دے کہ وہ اچھا استاد ہے اور شاید میں سست اور کند ذہن ہوں۔بہر طور میرے لیے اس

میں کوئی قباحت کا پہلو نہیں نکلتا کہ استاد شاگرد کے مقابلے میں کم عمر، کم تجربہ کار اور غیر معروف رہا ہو۔ لہٰذا سقراط میں آپ کو اس خیال سے آگاہ کرنا چاہتا ہوں کہ آپ جب تک پسند کریں مجھے سکھائیں، پڑھائیں اور جن معاملات میں میرا علم آپ کے علم سے زیادہ ہوگا میں ہر ممکن طور پر آپ کو پڑھاتا رہوں گا۔ جب سے آپ خطرات میں میرے ساتھی رہے ہیں آپ کے بارے میں میری رائے بہت ہی بلند ہے کیونکہ میں نے ان خطرناک لمحوں میں بھی آپ کی دانائی اور بہادری و جوانمردی کے جوہر دیکھے ہیں جنھوں نے آپ کو میری نظروں میں بلند تر درجہ عطا کر دیا ہے سو جو کچھ مناسب سمجھیں کہہ دیں اور عمروں کے فرق کو بالکل خاطر میں نہ لائیں۔

سقراط: میں سمجھتا ہوں کہ آپ دونوں کو اس مشاورت میں میرا ساتھ دینے پر کوئی اعتراض نہ ہوگا۔

لائسی میکس: مگر یہی تو ہمارا اہم ترین مسئلہ ہے جو یقیناً آپ کا اور ہمارا مشترک مسئلہ ہے کیونکہ میں آپ کو بھی اپنی ہی صفوں میں شمار کرتا ہوں۔ لہٰذا آپ دونوں گفتگو کے دوران میری نمائندگی کیجیے اور ان سے دریافت کیجیے کہ اپنے بچوں کی تربیت کے مسئلے سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ہمیں کس قسم کی معلومات حاصل ہونی چاہئیں۔ مجھے چونکہ نہ وہ سوال یاد رہے ہیں جو مجھے ان سے پوچھنے چاہئیں اور نہ ہی ان ممکن سوالوں کے جواب دینا میرے لیے آسان ہوگا۔ مجھے اگر ان کی گفتگو میں مداخلت کرنا پڑی تو میں اس سے قاصر رہوں گا۔ اس لیے میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ بحث کو جاری رکھیے میں اور ملیسیاس فقط آپ کی باتیں سنیں گے اور آپ کے مشوروں پر عمل کرنے کے پابند رہیں گے۔

سقراط: نکیاس اور لیشس! ہمیں معزز لائسی میکس اور ملیسیاس کی فرمائش پوری کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ آئیے پہلے اپنے آپ سے وہی سوال پوچھتے ہیں جو بحث کے آغاز میں ہم نے طے کیا تھا۔ یعنی یہ کہ ''اس نوعیت کی تربیت کے سلسلے میں خود ہمارے تربیت کار کون تھے؟ اور ان میں سے سب سے زیادہ ہماری شخصیتوں پر کس کا اثر مرتب ہوا؟'' دوسری نوعیت کی تحقیق بھی ویسے ہمیں اسی نکتے ہی طرف لائے گی اور پہلے اصول سے شروع کرنے کا وہی بہترین اور مناسب ترین انداز ہوگا کیونکہ اگر ہمیں اندازہ ہو کہ کچھ اضافی عوامل کی شمولیت سے موجود چیز کی افادیت بڑھ سکتی ہے اور ہم ایسے کسی اضافے پر قادر بھی ہوں تو بھی ہمارے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ جس اضافے کی تجویز ہمارے ذہن میں ہے اسے کس طرح مؤثر انداز میں قابل عمل بنایا جاسکتا ہے۔

شاید آپ میری بات پوری طرح نہیں سمجھے۔ میں اپنی بات کو دوبارہ ذرا زیادہ سادہ لفظوں میں بیان کرتا ہوں۔ مثلاً اگر ہم سوچیں کہ آنکھوں کی بینائی میں اضافہ اس نعمت کی افادیت بڑھا دیتا ہے اور ہم آنکھوں کے ساتھ ایسی کارروائی کرنے کی صلاحیت بھی رکھتے ہیں جن سے بینائی میں عملاً اضافہ ہو، تو لازم ہے کہ ہم بینائی کی حقیقت اور ساخت سے آگاہ ہوں اور یہ مشورہ دینے کی صلاحیت بھی رکھتے ہوں کہ اس نعمت کو کس طرح بہترین صورت میں اور آسانی سے محفوظ رکھا جا سکتا ہے اور اگر ہم بصارت یا سماعت کی حقیقت سے آگاہ نہ ہوں تو آنکھوں اور کانوں کے بارے میں ہماری مشاورت بے معنی بلکہ حماقت پر مبنی ہوگی۔ ایسے میں ہم کسی کی بینائی یا سماعت میں اضافے پر کیسے قادر ہو سکتے ہیں!

لیشس: ہاں سقراط، اس میں تو کوئی شک نہیں۔

سقراط: اور لیشس ہمارے یہ دونوں دوست اس مرحلے پر ہم سے یہی چاہتے ہیں کہ ہم ان کے بچوں کی شخصیتوں میں نیکی کو راہ دے کر ان کے ذہنوں میں ترقی کا باعث کیسے بن سکتے ہیں؟

لیشس: بالکل ٹھیک!

سقراط: کیا لازم نہیں کہ ہم پہلے بھلائی اور خیر کو سمجھ لیں کیونکہ جس شے کے بارے میں ہم خود بے بہرہ ہوں اسے حاصل کرنے اور اس سے فائدہ اٹھانے کے سلسلے میں ہم دوسروں کو کیا مشاورت مہیا کریں گے؟

لیشس: ہاں سقراط! اس طرح تو ہم کسی کی مدد نہیں کر سکتے۔

سقراط: تب کیا ہم فرض کر لیں جناب لیشس، کہ ہم نیکی اور شرافت کی حقیقت سے آگاہ ہیں؟

لیشس: ہاں! یقیناً یہی مناسب رہے گا۔

سقراط: اور جو کچھ ہم جانتے ہیں، ظاہر ہے اسے بیان بھی کر سکتے ہیں؟

لیشس: یقیناً۔

سقراط: فی الحال ہمیں نیکی اور بھلائی کو جامعیت کے ساتھ جاننے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے کیونکہ (محدود وقت میں محدود صلاحیتوں کے ساتھ) ہم اس کا احاطہ نہ کر پائیں گے۔ آیئے پہلے یہ طے کر لیں کہ ہم اس اصطلاح کا مفہوم کس حد تک جان پائے ہیں؟ اس طرح یہ تحقیق و تدقیق ہمارے لیے آسان ہو جائے گی۔

لیشس: ہاں سقراط، جیسے آپ کہتے ہیں، اسی طرح شروع کیے لیتے ہیں۔

سقراط: چلیے! ہم نیکی کا کون سا پہلو پہلے تحقیق کے لیے منتخب کریں؟ کیا اسی کو پہلے نہ لے لیں جس سے زرہ بکتر میں لڑائی کا فن پھلتا پھولتا ہے؟ یہ وہ خوبی ہے جسے جرأت کہتے ہیں۔

لیشس: جی ہاں، ہمیں یقیناً اسی سے آغاز کرنا چاہیے!

سقراط: تو لیشس، پہلے تو ہم اپنی پوری توجہ اس پر مرکوز کرتے ہیں کہ جرأت آخر ہے کیا؟ اور اس کی ماہیت اور ہیئت کیا ہے۔ دوسرے مرحلے پر ہم یہ دیکھیں گے کہ لڑکوں (نوجوانوں) کو یہ خصوصی پڑھنے لکھنے کے ذریعے کیسے بہم پہنچائی جاسکتی ہے؟ تو چلیں، آپ ہی پہلے بتائیں کہ آپ کے خیال میں جرأت کیا ہے؟

لیشس: سقراط! یہ سوال تو بہت آسان ہے۔ اس کا جواب دینے میں کوئی دقت محسوس نہیں ہوتی۔ یعنی ہم اس شخص کو جرأتمند کہہ سکتے ہیں جو (خطرے کے وقت) بھاگ نہ جائے بلکہ اپنے مورچے میں ڈٹا دشمن سے برسرپیکار رہے۔ اس میں تو غلطی کی کوئی گنجائش ہی نہیں۔

سقراط: بہت خوب لیشس۔ (آپ کا جواب بظاہر درست ہے) مگر مسئلہ یہ ہے کہ شاید میں خود ہی سوال کو مناسب الفاظ میں بیان نہیں کرسکا۔ اسی لیے آپ وہ جواب نہیں دے پائے جو میں معلوم کرنا چاہتا تھا۔

لیشس: اس سے سقراط، آپ کا مطلب کیا ہے؟

سقراط: میں وضاحت کی کوشش کرتا ہوں۔ آپ اس شخص کو جری کہیں گے جو اپنے مورچے میں ڈٹا دشمن سے برسرپیکار رہے؟

لیشس: جی ہاں، میں یہی کہوں گا۔

سقراط: میں بھی یہی کہوں گا مگر آپ اس آدمی کو کیا کہیں گے جو ایک جگہ رکنے کی بجائے بھاگتے ہوئے لڑتا ہے؟

لیشس: یقیناً وہ بھی جری کہلائے گا۔

سقراط: میں بھی یہی کہوں گا مگر ایک اور شخص کے بارے میں کیا خیال ہے جو اڑتے ہوئے لڑے۔

سقراط: جیسے ساتھی کے باشندوں (Scythians) کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ اڑتے ہوئے اور للکارتے ہوئے لڑتے ہیں یا جیسے ہومر، ایکنیاس (Acneas) کے بارے میں کہتا ہے کہ "انھیں معلوم ہے کہ دشمن کو کیسے للکارا جاتا ہے اور دوران جنگ ادھر سے ادھر اڑ کر پہنچا جاتا ہے"۔ اور وہ خود ایکنیاس کے بارے میں بھی رائے دیتے ہوئے کہتا ہے کہ "وہ خوف اور فرار کا علم بھی رکھتا

ہے۔ بلکہ اسے تو خوف اور فرار کے علم کا بانی کہنا چاہیے“۔

لیشس: ہاں سقراط: ہومر (Homer) یہ کہنے میں حق بجانب ہے کیونکہ وہ رتھوں کی لڑائی کی بات کر رہا ہے اور شاید آپ بھی صحیح کہہ رہے تھے کیونکہ آپ سائتھی کے باشندے (Scythian) کی گھڑ سوار فوج کی بات کر رہے تھے اور ان کے لڑنے کا انداز بھی ایسا ہی تھا مگر آہن پوش یونانی تو اپنی صفوں میں ڈٹ کر ہی لڑنا جانتا ہے۔

سقراط: مگر آپ لیشس لیسی ڈیمون کے باشندوں کے بارے میں تو تسلیم کریں گے کہ جب پلیٹیا (Plataea) کے میدان میں ان کا ٹکراؤ ہلکی ڈھالوں والے ایرانیوں سے ہوا تو انھیں ڈٹ جانے کی بجائے بھاگ کھڑے ہونے میں عافیت نظر آئی۔ مگر جب ایرانیوں کی صفوں میں بھگدڑ مچی تو وہ فوراً پلٹے اور آخر پلیٹیا کا میدان مار لیا۔

لیشس: یہ تو سچ ہے۔

سقراط: میرا مطلب، جب میں نے اپنی غلطی کا اعتراف کیا، یہ تھا کہ میں سوال کو مناسب لفظوں میں پوچھ نہیں سکا اور نتیجتاً آپ بھی مناسب جواب نہیں دے پائے۔ دراصل میں نے جس جرأت کے بارے میں سوال کیا تھا وہ صرف بھاری آہن پوش لڑاکوں کی جرأت ہی کے بارے میں نہیں تھا بلکہ وہ گھڑ سوار فوج اور دیگر طرز کے دستوں کی جرأت کے بارے میں بھی تھا اور جرأت سے مراد بھی محض وہ جرأت نہ تھی جو صرف میدان جنگ میں دیکھنے میں آتی ہے بلکہ اس سے وہ جرأت بھی مراد ہے جس کا مظاہرہ، بیماری، افلاس، سمندری اور طوفان کی تباہیوں اور سیاسی ناانصافیوں اور ظالمانہ کارروائیوں کے خلاف کیا جاتا ہے اور وہ جرأت بھی جس کا مظاہرہ نہ صرف دکھ، درد اور خوف کے خلاف کیا جاتا ہے بلکہ ان سب سے کہیں زیادہ جرأت خواہشات اور انبساط میں دکھانا پڑتی ہے (جن کے ہاتھوں میں انسان سب سے زیادہ آسانی سے کھلونا بن جاتا ہے)، خواہ وہ ان کی اپنی صفوں تک محدود رہے یا اس کا رخ دشمن کی طرف ہو۔ سو لیشس! یہ بھی جرأت ہی ہے۔ کیوں، ہے کہ نہیں؟

لیشس: ہاں سقراط یقیناً یہ بھی جرأت ہی ہے۔

سقراط: یہ تمام لوگ جری (جرأت مند) کہلائے جاسکتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ بعض لوگ جرأت کا مظاہرہ خوشی کو ہضم کرتے وقت کرتے ہیں تو بعض درد کو برداشت کرتے وقت۔ اسی طرح کچھ

خواہشات اور خوف کی صورت میں جری ثابت ہوتے ہیں اور بعض ایسی ہی صورتوں میں (میرے تصور کے مطابق) سخت بزدل بھی ثابت ہوتے ہیں۔

لیشس: آپ نے درست کہا۔

سقراط: سو میں نے جو جرأت اور بزدلی کی بات کی ہے وہ عمومی معنوں میں ہے۔ مزید وضاحت کے لیے میں جرأت سے ابتدا کرتا ہوں اور آپ سے ایک سوال اور پوچھتا ہوں یعنی وہ کون سی مشترک خصوصیت ہے جو مذکورہ بالا جرأت کی اقسام میں پائی جاتی ہے اور وہی دراصل حقیقی جرأت ہے؟ آپ میرا مفہوم سمجھ رہے ہیں ناں!

لیشس: اچھی طرح سمجھ نہیں پایا ہوں۔

سقراط: میری بات کا مطلب یہ ہے (میں دراصل یہ پوچھنا چاہتا ہوں) کہ وہ خاصیت کون سی ہے جسے سرعت کہتے ہیں؟ اور جو دوڑنے، موسیقی بجانے، گفتگو کرنے، سیکھنے اور بہت سے ایسے ہی اعمال وافعال میں پائی جاتی ہے۔ بلکہ ہمارے ہاتھ، پاؤں، منہ، زبان، آواز اور ذہن کے ہر قابل ذکر فعل میں موجود ہوتی ہے۔ کیا آپ ان تمام خصائص کے ساتھ 'سرعت' کی اصطلاح استعمال نہیں کریں گے؟

لیشس: یقیناً کروں گا۔

سقراط: فرض کیجیے کوئی مجھ سے پوچھے: سقراط، وہ مشترک خاصیت کون سی ہے، جو لفظ 'سرعت' کے ہر قسم کے استعمال میں آپ موجود تصور کرتے ہیں؟ تو میں یہی جواب دوں گا کہ وہ خاصیت جس کے باعث متعلقہ کام کم ترین وقت میں پورا ہو جاتا ہے خواہ اس کام کا تعلق دوڑنے، بولنے یا کسی بھی قسم کے فعل کے ساتھ ہو۔

لیشس: آپ کی یہ بات بھی بالکل درست ہے۔

سقراط: اور اب لیشس، آپ اسی انداز میں مجھے بتائیں گے کہ وہ مشترک خاصیت جسے جرأت کہتے ہیں کیا ہے اور جو اس اصطلاح کے ہر نوع کے استعمال میں ایک ہی مفہوم دیتی ہے۔ چاہے وہ رنج یا لطف یا اسی انواع کی دیگر کیفیتوں میں استعمال ہو رہی ہیں؟ جن کا میں نے ذکر کیا ہے۔

لیشس: میرے خیال میں جرأت روح کی مخصوص قوت برداشت اور عزم واستقلال ہے، بشرطیکہ میں اس عالمگیر خاصیت اور ہیئت کا ذکر کروں جو ان سب کوائف میں موجود ہوتی ہے۔

سقراط: ارے، ایسے سوال کا جواب دینے کے لیے ہمیں یہی تو کرنا ہوگا۔ پھر بھی میں یہی کہوں گا کہ ہر قسم کی

[illegible] بزدلی کو جرأت کا نام نہیں دیا جاسکتا۔ وجہ بھی سن لیجیے لیشس، میرا خیال ہے آپ جرأت کو ایک شریفانہ، نوبل اور مثبت خاصیت قرار دیں گے۔

لیشس: بے حد عمدہ اور مثبت خاصیت جناب!

سقراط: اور آپ یقیناً یہ بھی کہیں گے کہ ایک عقلمندانہ ثابت قدمی بھی ایک عمدہ اور باوقار خاصیت ہوگی۔

لیشس: بہت ہی عمدہ اور باوقار۔ بے شک!

سقراط: مگر احمقانہ ثابت قدمی کو آپ کیا کہیں گے؟ کیا ایسی ثابت قدمی کو دوسری طرف یعنی منفی اور بری یا تکلیف دہ خاصیت قرار نہیں دیا جائے گا؟

لیشس: کیوں نہیں!

سقراط: کیا آپ کسی تکلیف دہ اور منفی شے کو عمدہ یا باوقار کہہ سکتے ہیں؟

لیشس: میرا خیال ہے کہ نہیں کہہ سکتا۔

سقراط: تو احمقانہ ثابت قدمی کو آپ جرأت نہیں کہہ سکتے کیونکہ یہ عمدہ یا باوقار نہیں ہو سکتی جبکہ جرأت کو ہم عمدہ یا باوقار قرار دے چکے ہیں۔

لیشس: آپ درست فرما رہے ہیں۔

سقراط: گویا آپ ہی کے الفاظ میں صرف عقلمندانہ ثابت قدمی ہی جرأت کہلا سکتی ہے۔

لیشس: درست!

سقراط: مگر آپ جس عاقلانہ صلاحیت کا ذکر کر رہے ہیں تو وہ عاقلانہ کس ضمن میں؟ کیا تمام چھوٹی بڑی باتوں میں عاقلانہ؟ مثلاً کوئی شخص اپنی رقم کو عقلمندی سے خرچ کرنے میں ثابت قدمی اور استقلال کا مظاہرہ کرے اس خیال سے کہ اس طرح وہ اپنی رقم کا بہترین اور زیادہ سے زیادہ معاوضہ حاصل کر سکے گا تو آپ اسے بھی جرأت مندی ہی کہیں گے؟

لیشس: قطعاً نہیں!

سقراط: یا مثلاً ایک شخص طبیب ہے اور اس کے بیٹے یا کسی دوسرے مریض کو پھیپھڑوں کی سوزش کا عارضہ ہے اور وہ [illegible] شے (جو اس کی صحت مزید بگاڑ سکتی ہے) کھانے کی ضد کرتا ہے جبکہ وہ شخص ڈٹا ہوا ہے [illegible] نقصان دہ شے کھانے نہیں دیتا۔ کیا یہ بھی جرأت ہے۔

لیشس: [illegible] کی طرح ہے۔ لہٰذا اسے بھی کسی طور جرأت نہیں کہا جاسکتا۔

سقراط: ایک دفعہ پھر ایسے شخص کی مثال لیجیے جو جنگ میں ثابت قدمی دکھاتا ہے اور جنگ پر مائل بھی ہے اور یہ سوچ کر ثابت قدم رہتا ہے کہ وہ بہتر حالت میں ہے اور اس کی مخالف فوج کی تعداد بھی کم ہے اور وہ جنگی حکمت عملی میں بھی اس سے کم تر ہیں۔ سو وہ ان پر فوقیت کے احساس سے ان کے سامنے ڈٹ جاتا ہے اور اس کے مقابلے میں وہ شخص جو یہ جانتے ہوئے بھی کہ دشمن کی تعداد زیادہ ہے، وہ بہتر حالت میں اور زیادہ تجربہ کار جنگجو ہے، ان کے سامنے ڈٹ جاتا ہے۔ سو ان دونوں میں سے آپ کس کو زیادہ جرأت مند اور بہادر کہیں گے؟

لیشس: مگر یہ تو پہلے کے مقابلے میں بیوقوفانہ ثابت قدمی ہے۔ ہے ناں؟

سقراط: ہے تو!

لیشس: اس طرح آپ یہ بھی کہیں گے کہ پیدل دستوں کے مقابلے میں لڑنے والا گھوڑا سوار زیادہ جری ہے کیونکہ وہ اس مادی سہولت کے باعث اس شخص کے مقابلے میں زیادہ ثابت قدم رہے گا جس کے پاس ایسا سوچنے کا کوئی جواز نہیں (یعنی گھوڑا نہیں)؟

سقراط: شاید ایسا ہی ہے۔

لیشس: اور جو اپنی سپاہ کے استعمال یا تیر اندازی کی مہارت رکھتا ہے وہ اس شخص کے مقابلے میں زیادہ ثابت قدمی دکھائے گا اور زیادہ جری ہوگا جس کے پاس ایسی مہارت موجود نہیں؟

سقراط: یقیناً!

لیشس: اگر کوئی شخص کنویں میں گر پڑے اور غوطہ لگائے حالانکہ وہ غوطہ خوری کے فن سے آگاہ نہ ہو اور یوں باہر نکل آئے تو کیا وہ ایسے شخص کے مقابلے میں زیادہ جرأتمند نہ ہوگا جو غوطہ خوری کی مہارت کے باعث بچ نکلتا ہے؟

سقراط: ایسی صورت میں اور کیا کہا جا سکتا ہے؟

لیشس: کچھ بھی نہیں بشرطیکہ جیسا وہ سوچتا ہے حقیقت میں بھی ویسا ہی ہو۔

سقراط: یہی تو میں بھی سوچتا ہوں۔

لیشس: اور وہ لوگ جو ایسی ثابت قدمی میں خطرے کو دعوت دیتے اور خطرہ مول لیتے ہیں بیوقوف سمجھے جائیں گے، خصوصاً ان لوگوں کے مقابلے میں جو متعلقہ فن میں مہارت کے باعث خطرہ مول لینے کی جرأت کرتے ہیں؟

سقراط:

لیشس: یقیناً بیوقوف سمجھے جائیں گے۔

سقراط: مگر اس سے پہلے ہم بیوقوفانہ دلیری اور ثابت قدمی کو نقصان دہ قرار دے چکے ہیں۔

لیشس: یہ بھی سچ ہے۔

سقراط: جبکہ ہم جرأت کو ایک مثبت خاصیت قرار دے چکے ہیں۔

لیشس: درست!

سقراط: مگر یہاں ہم بیوقوفانہ ثابت قدمی کو بھی جرأت ہی کہہ رہے ہیں جسے پہلے ہم نقصان دہ قرار دے کر رد کر چکے ہیں۔

لیشس: اس میں شک نہیں۔

سقراط: کیا ہمارا یہ کہنا درست ہے؟

لیشس: فی الحقیقت سقراط! مجھے یقین ہے کہ ہم درست نہیں ہیں۔

سقراط: سو بقول آپ کے لیشس: آپ اور میں ڈوری طرز کے مطابق معلوم نہیں ہوتے یعنی قول و فعل میں مطابقت اور ظاہر ہے اس بیان کے بعد ہمارے قول کی فعل میں مطابقت نہیں رہی۔ کیونکہ اس سے یہ صورت حال پیدا ہو گئی ہے کہ اگر کوئی شخص ہمیں میدان عمل میں دیکھے تو جرأتمند کہے گا اور اگر ہماری گفتگو سنے تو اس کی رائے برعکس ہو جائے گی۔

لیشس: یہ تو بالکل ہی صحیح بات ہے۔

سقراط: اور یہ کہ کیا ہماری یہ صورت حال تسلی بخش ہے۔

لیشس: ہرگز نہیں۔

سقراط: فرض کیجیے کہ ہم اس اصول کو جس کا ہم نے ابھی ذکر کیا ہے کسی حد تک قبول کر لیں تو کیا درست ہوگا؟

لیشس: آپ کی مراد کس اصول سے ہے اور کس حد تک اسے قبول کیا جائے۔

سقراط: ثابت قدمی کا اصول خود ہمیں بھی حقائق کی جستجو میں کچھ ثابت قدمی کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔ شاید اسی طرح تلاش حق کی کوشش میں کمزوری کی وجہ سے جرأت ہم پر ہنس نہ سکے گی۔

لیشس: میں تو جستجو جاری رکھنے پر تیار ہوں اگرچہ ایسی تگ و دو کا میں کبھی عادی نہیں رہا مگر جو کچھ ابھی کہا گیا ہے اس کی بدولت مجھ میں اختلاف رائے کا جذبہ ابھر آیا ہے اور مجھے دکھ اس بات کا ہے کہ میں

اپنے نقطہ نظر کو مناسب لفظوں میں بیان کرنے سے قاصر رہا ہوں۔ مجھے واضح طور پر محسوس ہوتا ہے کہ میرے ذہن میں جرأت کی ایک واضح تصویر ہے مگر بیان کرتے وقت وہ کسی نہ کسی طرح میرے بیان کی گرفت سے نکل جاتی ہے اور میں اس کی مکمل ماہیئت بیان نہیں کر پاتا۔

سقراط: لیکن میرے عزیز دوست! ایک اچھے کھلاڑی کا فرض یہ ہے کہ وہ ایسی مشکلات کی وجہ سے راستہ نہ چھوڑے بلکہ منزل پر پہنچنے کی جدوجہد جاری رکھے۔ سستی اسے زیب نہیں دیتی۔

لیشس: ہاں! اسے ست نہیں پڑنا چاہیے۔

سقراط: تو کیا ہم اپنے دوست نکیاس کو اس بحث میں شمولیت کے لیے دعوت نہ دیں کیونکہ کھیلوں کے بارے میں اس کا تجربہ ہم دونوں سے بہتر ہے۔ آپ اس معاملے میں کیا کہتے ہیں؟

لیشس: مجھے خوشی ہوگی اگر وہ ہمارے ساتھ شامل ہو۔

سقراط: آیئے نکیاس اور اپنے دوستوں کی مدد کیجیے جو دلائل کے بھنور میں پھنس کر رہ گئے ہیں اور اب ان کی سانس پھولنے لگی ہے۔ ہمارا انجام دیکھنے سے قبل ہی آپ ہماری مدد کو آئیں اور ہمیں اس بھنور سے نکالنے کے ساتھ ساتھ اپنی رائے سے بھی نوازیں۔ ذرا بتائیں کہ جرأت سے متعلق آپ کیا کہتے ہیں؟

نکیاس: میں یہی سوچ رہا تھا سقراط کہ آپ اور لیشس اس کی مناسب تعریف نہیں کر پائے۔ کیونکہ آپ شاید ایک خوبصورت کہاوت بھول رہے ہیں جو میں نے خود آپ کے منہ سے سنی ہے۔

سقراط: وہ کون سی کہاوت ہے نکیاس؟

نکیاس: میں نے اکثر آپ کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ "ہر شخص اس معاملہ میں عقلمند ہے جس میں اس سے اچھائی سرزد ہو اور اس معاملہ میں نادان ہے جس ضمن میں اس سے برائی سرزد ہو۔

سقراط: ہاں یہ تو بالکل درست ہے! نکیاس۔

نکیاس: سو اگر بہادر آدمی کی اچھائی کو آپ اچھائی قرار دیں تو اسے عقلمند اور دانا ماننا پڑے گا۔

سقراط: لیشس! آپ نکیاس کی بات سن رہے ہیں؟

نکیاس: ہاں میں سن تو رہا ہوں مگر اچھی طرح سمجھ نہیں پایا۔

سقراط: میرا خیال ہے کہ میں اس کا مطلب سمجھ رہا ہوں اور مجھے لگتا ہے کہ وہ جرأت کو ایک طرح کی عقلمندی یا دانائی قرار دینا چاہتا ہے۔

لیشس: سقراط! اس کی اس بات سے ہم کیا مطلب لے سکتے ہیں؟

سقراط: یہ تو آپ خود ہی اس سے پوچھ لیجیے!

لیشس: بہت اچھا!

سقراط: نکیاس آپ ہی اسے بتائیں کہ آپ اس قسم کی عقلمندی سے کیا مراد لیتے ہیں؟ کیونکہ یہ تو ظاہر ہے کہ آپ اس سے ایسی دانائی تو یقیناً مراد نہیں لیں گے جس کی مدد سے بانسری بجائی جاسکتی ہے؟

نکیاس: یقیناً نہیں۔

سقراط: اور شاید وہ بھی نہیں جس سے بین (قدیم یونان میں بجائی جانے والی بین) بجائی جاسکے۔

نکیاس: یقیناً نہیں!

سقراط: تو پھر یہ علم (دانائی) کیا ہے اور کس شے سے متعلق ہے؟

لیشس: سقراط! میرا خیال ہے آپ اس سے نہایت عمدہ سوال پوچھ رہے ہیں اور میں بھی یہی چاہوں گا کہ وہ بتائیں کہ یہ علم یعنی دانائی (حقیقی معنوں میں) کیا ہے اور یہ کس چیز کے علم کا نام ہے؟

نکیاس: میں یہ کہنا چاہتا ہوں لیشس کہ جرأت وہ علم ہے جس کی مدد سے ہم جنگ یا ایسی دوسری آزمایشوں میں اعتماد یا خوف سے دوچار ہوتے ہیں۔

لیشس: سقراط! اس کی باتیں عجیب وغریب نہیں لگ رہیں؟

سقراط: کیوں لیشس! یہ بات آپ کے ذہن میں کیوں آئی؟

لیشس: بھئی اس لیے کہ جرأت ایک شے ہے اور دانائی دوسری!

سقراط: اسی بات کا تو نکیاس انکار کر رہا ہے۔

لیشس: ہاں! اسی بات کا وہ انکار کر رہا ہے۔ لیکن وہ کافی احمق معلوم ہوتا ہے۔

سقراط: میرا خیال ہے ہمیں اسے برا بھلا کہنے کی بجائے اسے مشورہ دینا چاہیے۔

نکیاس: اصل میں لیشس مجھے مشورہ دینا نہیں چاہتا۔ بلکہ سقراط وہ میری حماقت کا ذکر کر کے اپنی حماقتوں پر پردہ ڈالنا چاہتا ہے۔

لیشس: نکیاس آپ نے بالکل ٹھیک کہا کہ آپ احمقانہ باتیں کر رہے ہیں اور میں اسے ثابت کرنے کی کوشش کروں گا۔ پہلے مجھے ایک سوال کا جواب دیجیے! کیا طبیبوں کو بیماری کی خطرناکی/شدت کا علم نہیں ہوتا! اور کیا جرأت مند شخص کو خطرات کا علم نہیں ہوتا؟ سو طبیبوں کے کام کو دیگر جرأتمند

لوگوں کے کارناموں میں شامل کیا جاسکتا ہے؟

نکیاس: ہرگز نہیں۔

لیشس: مویشیوں کی دیکھ بھال کرنے والے شخص یا ایسے ہی دیگر شعبوں کے کارکنوں کی مثال دی جاسکتی ہے۔ یہ سب لوگ وہ علم رکھتے ہیں جس کی بدولت انھیں ان کے اپنے فن میں خوف یا اعتماد کی صورت حال کا سامنا ہوتا ہے پھر بھی وہ ایک خاص حد سے زیادہ جرأتمند ثابت نہیں ہوتے۔

سقراط: نکیاس یہ لیشس کیا کہہ رہا ہے اس کی باتیں اہم محسوس ہوتی ہیں۔

نکیاس: ہاں وہ کچھ کہہ تو رہا ہے لیکن درست نہیں کہہ رہا۔

سقراط: وہ کیسے؟

نکیاس: کیونکہ اسے یہ اندازہ نہیں ہے کہ ایک طبیب کا علم فقط صحت اور بیماری تک محدود ہوتا ہے۔ وہ بیمار شخص کو بیماری کی تفصیلات کے سوا کچھ بتا نہیں سکتا۔ لیشس، کیا، آپ تصور کر سکتے ہیں کہ طبیب جانتا ہے کہ بیماری مریض کے لیے کس حد تک خطرناک ثابت ہو سکتی ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو بہت سے مریضوں کے لیے صحت یاب ہونا ممکن نہ رہتا۔ میں آپ سے یہ بھی سننا چاہتا ہوں کہ آیا زندگی ہر حالت میں موت سے بہتر ہوتی ہے؟ کیا بعض حالات میں موت انسان کے لیے زندگی سے زیادہ مہربان ثابت نہیں ہوتی؟

لیشس: ہاں میری رائے میں بھی یقیناً ایسا ہی ہے۔

نکیاس: آپ کا کیا خیال ہے یہ سب باتیں ان لوگوں کے لیے خوفناک ہوتی ہیں جن کا مرجانا بہتر ہوتا ہے اور ان کے لیے بہتر ہوتی ہیں جن کے لیے زندہ رہنا بہتر ہوتا ہے؟

لیشس: یقیناً نہیں۔

نکیاس: اور کیا آپ یہ تصور کرتے ہیں کہ طبیب اور اس طرح کے دیگر فنون کے ماہر اس حقیقت سے آگاہ ہوتے ہیں یا وہ لوگ بہتر جانتے ہیں جو خوف اور امید کے میدان میں بطور خاص تربیت یافتہ ہوتے ہیں؟ اور انھی کو حقیقتاً جرأت مند کہنا چاہیے؟

سقراط: لیشس کیا آپ سمجھ رہے ہیں کہ نکیاس کیا کہنا چاہتا ہے؟

لیشس: ہاں میرا خیال ہے میں اس کی بات سمجھ رہا ہوں۔ دراصل غیب گو لوگ ہی جرأت مند کہلائے جاسکتے ہیں۔ کیونکہ وہی لوگ فی الحقیقت بہتر طور پر یہ جانتے ہیں کہ کس مریض کا مرجانا بہتر ہے اور کس

کا زندہ رہنا؟ مگر اس کے باوجود بھی لیشس کیا آپ (انھی اصولوں کی بنیاد پر) خود کو غیب گو کہہ سکتے ہیں یا یہ کہ آپ نہ غیب گو ہیں اور نہ جرأت مند؟

نکیاس: کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ غیب گو وہی ہو سکتا ہے جسے خوف یا امید کی اصل بنیاد کا علم ہو؟

لیشس: ہاں میں یہی کہنا چاہتا ہوں۔

نکیاس: میں بھی اسی کے بارے میں کہنا چاہتا ہوں کیونکہ غیب گو وہی شخص ہو سکتا ہے جو آنے والے واقعات کی علامات جان سکے۔ ان واقعات میں موت، پیدائش، مال کا نقصان، بیماری یا جنگ میں فتح و شکست وغیرہ ہو سکتے ہیں۔ مگر ان منفی حالات سے کس کو فائدہ حاصل ہو سکتا ہے یہ بتانا غیب گو کا کام نہیں بلکہ اس کا ہے جسے پہلے سے ایسا کچھ معلوم ہو۔

لیشس: میں تو نکیاس کی باتیں بالکل ہی نہیں سمجھ پا رہا سقراط محترم: کیونکہ وہ جب یہ کہتا ہے کہ جرأت مند شخص کے لیے غیب گو یا طبیب یا ایسے کسی فن کا ماہر یا کسی خاص خاصیت کے حامل ہونے کی ضرورت نہیں اس طرح تو یہی کہا جا سکتا ہے کہ وہ کوئی دیوتا ہی ہو سکتا ہے جسے جری قرار دیا جانا ممکن ہو۔ میرا خیال ہے کہ وہ یہ اعتراف کرنے کی جرأت نہیں کر پا رہا کہ جو کچھ وہ بیان کر رہا ہے اس کا حقیقت سے کوئی واسطہ ہے۔ اس مشکل کو چھپانے کے لیے، جس میں وہ اس وقت پھنسا ہوا ہے، وہ باتوں کو گھما پھرا کر پیش رہا ہے۔ میں اور آپ بھی اگر اپنی بات کو نامعقولیت اور عدم تسلسل سے چھپانا چاہتے تو یہی کچھ کرتے۔ ہاں البتہ اگر ہم عدالت میں دلائل دے رہے ہوتے تو پھر ایسا انداز اختیار کرنا مناسب تھا۔ مگر بے تکلف دوستوں کی ایسی محفل میں لفاظی کی اوٹ لینا بالکل مناسب معلوم نہیں ہوتا۔

سقراط: لیشس! میں آپ کی بات سے سو فی صد متفق ہوں۔ مگر میرا اندازہ ہے کہ نکیاس بے حد سنجیدہ ہے اور وہ محض باتیں نہیں بنا رہا۔ سو ہمیں اس سے درخواست کرنی چاہیے کہ وہ اپنی بات کی وضاحت کرے اور اگر اس کی باتیں واقعی معقول ہیں تو ہمیں اس کی بات تسلیم کر لینے میں کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے اور اگر نہیں تب ہم اپنا مشورہ پیش کر سکیں گے۔

لیشس: سقراط اگر آپ چاہیں تو اس سے پوچھیں۔ میں تو ضرورت سے زیادہ پوچھ چکا ہوں۔

سقراط: مجھے سوال نہ پوچھنے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی اور میرا سوال میری اور آپ کی یعنی دونوں کی طرف سے ہوگا۔

لیشس: بہت اچھا!

سقراط: ہاں تو جناب نکیاس! یہ بتایئے (بلکہ ہم دونوں کو بتایئے کیونکہ میں اور لیشس اس دلیل میں شریک ہیں) کہ کیا آپ واقعی اس کی تصدیق کرتے ہیں کہ جرأت حقیقت میں امید اور خوف کی بنیادوں کے علم کو کہتے ہیں؟

نکیاس: ہاں میں اس کی تصدیق کرتا ہوں۔

سقراط: اور یہ بھی کہ ایسا علم ہر شخص کو دستیاب نہیں ہوتا اور یہ کہ طبیب اور غیب گو بھی چونکہ یہ علم نہیں جانتے لہٰذا جب تک یہ مخصوص علم حاصل نہ کرلیں، جری نہیں کہلا سکتے؟ آپ یہی کہنا چاہتے ہیں ناں؟

نکیاس: جی ہاں! میں یہی کہنا چاہتا ہوں۔

سقراط: ایسی صورت میں یہ ایسی بات نہیں کہ ہرایرے غیرے کے علم میں سما سکے۔ ہر کوئی جری کہلانے کا بھی مستحق نہیں ہوسکتا۔

نکیاس: میں بھی یہی سمجھتا ہوں کہ نہیں۔

سقراط: نکیاس! بالکل نہیں ہوسکتا بلکہ میں تو کہتا ہو کہ اہل کرومیون (Crommyonian) جیسے بڑے سور کو بھی جری نہیں کہا جاسکتا اور یہ سب میں محض مذاق میں نہیں کہہ رہا۔ بلکہ اس لیے کہ وہ شخص جو آپ کی اس منطق کو کہ جرأت دراصل خوف اور امید کی بنیاد کا علم ہے، تسلیم کرتا ہے ان جنگلی درندوں کی دلیری کا اعتراف ہرگز نہیں کرسکے گا جب تک وہ یہ نہ تسلیم کرلے کہ شیر، چیتا، سور یا ایسے دوسرے جانور اس حد تک تو عقل وفہم کے مالک ہوتے ہی ہیں کہ بے شمار ایسی باتوں کا اندازہ اور علم رکھتے ہیں جن سے انسان نابلد ہوتے ہیں جو آپ کے تصورِ جرأت کے حامی ہیں۔ اس کی تصدیق کریں گے کہ شیر، بارہ سنگھا، بھینسا اور بندر اپنے اپنے حالات کے حوالے سے مناسب جرأت کے مالک ہوتے ہیں۔

لیشس: ارے سقراط، خدا کی قسم یہ سب تو بہت عمدہ ہے اور نکیاس، امید ہے آپ ہمیں بتائیں گے کہ آیا یہ جانور جنھیں ہم سب جرأت مند تسلیم کرتے ہیں۔ انسانوں کے مقابلے میں زیادہ عقلمند ہیں یا پھر آپ اس کے مقابلے میں آفاقی حقیقت سے اتفاق کی جرأت کریں گے کہ ایسا نہیں ہے۔

نکیاس: کیوں لیشس! جہاں تک ایسے جانوروں کا تعلق ہے جنھیں خطرے کے خوف کا احساس نہیں ہوتا میں انھیں جرأت مند نہیں کہتا بلکہ انھیں بے خوف یا بے سمجھ قرار دیتا ہوں۔ کیا آپ ان معصوم بچوں

کو دلیر اور جرأت مند کہہ سکتے ہیں جو کسی خطرے سے محض اس لیے نہیں ڈرتے کہ انھیں اس کی اہمیت کا احساس ہی نہیں ہوتا؟ میری سوچ کے مطابق بے خوف اور جری میں بنیادی فرق ہے میری رائے میں سمجھ بوجھ کے بعد کی جرأت ہی دراصل وہ خاصیت ہے جو بہت کم لوگوں کو میسر آتی ہے اور جہاں تک عمومی بے خوفی اور جرأت مندی کا تعلق ہے اور جس کے لیے سوچ اور فکر کی ضرورت نہیں ہوتی، بڑی عام صفت ہے اور اس سے لوگوں کی ایک بڑی اکثریت بشمول مرد عورتیں اور بچے بلکہ جانور بھی متصف ہو سکتے ہیں۔

آپ اور آپ کی طرح کے دیگر لوگ جس کیفیت کو جرأت مندی کہتے ہیں اسی کو میں احمقانہ جلد بازی قرار دیتا ہوں کیونکہ میرے نزدیک جرأت مندانہ افعال وہی ہو سکتے ہیں جن میں دانائی ایک اہم عنصر کی حیثیت سے شامل ہو۔

لیشس: سقراط، ذرا غور کیجیے! یہ صاحب کس مہارت سے، اپنے زعم میں، خود کو مطمئن کرنے کے لیے الفاظ کا انتخاب کرتے ہیں اور ان سب کو جرأت مندی کے اعزاز سے محروم کیے دیتے ہیں جنھیں ایک زمانہ جرأت مندوں کی حیثیت سے جانتا ہے۔

نکیاس: ایسا نہیں ہے۔ لیشس! آپ گھبرائیے نہیں۔ میں، لی میکس (Lamachus) اور بہت سے دوسرے اہل ایتھنز کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار ان لفظوں میں کرنا چاہتا ہوں کہ آپ جرأت مند ہیں اور اسی وجہ سے دانا بھی۔

لیشس: میں اس کا بھی جواب دے سکتا ہوں مگر میں آپ کو خود اپنے ذریعے سے یہ کہنے کا موقع نہیں دینا چاہتا کہ میں کوئی مغرور اہل ایکسن (Aexonian) ہوں۔

سقراط: لیشس، اسے ان الفاظ میں جواب دیجیے! بلکہ مجھے اندازہ ہے کہ آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ یہ سب کچھ کہنے کے لیے جو دانائی کی رہنمائی کر رہی ہے اس کا منبع کہاں ہے۔ اس نے یہ سب کچھ میرے دوست ڈیمون سے حاصل کیا ہے اور ڈیمون ہر وقت پروڈیکس (Prodicus) کے ساتھ دیکھا جاتا ہے جو تمام سوفسطائیوں میں الفاظ کو ان کے خالص ترین مفہوم میں استعمال کرنے میں ممتاز سمجھا جاتا ہے۔

لیشس: جی ہاں سقراط: اور اس عمدگی کا اصل امتحان کسی حکومتی شخص کی بجائے کوئی تشکیک پسند سوفسطائی ہی کر سکتا ہے جسے معاشرہ بڑی خوشی سے قیادت کے لیے منتخب کر لیتا ہے۔

سقراط: ہاں میرے عزیز دوست! مگر یہ بھی سوچیے کے کوئی فرد غیر معمولی ذہانت کے بغیر ممتاز حکومتی شخص نہیں بن سکتا اور میں محسوس کرتا ہوں کہ جرأت کے بارے میں جو نظریہ نکیاس نے قائم کیا ہے وہ بہر طور اس قابل ہے کہ اس کا امتحان کیا جا سکے۔

لیشس: تو پھر جناب سقراط! آپ خود ہی اس کا امتحان کیجیے۔

سقراط: ہاں! میں یہی کروں گا دوست! مگر یہ مت سوچنا کہ میں آپ کو اس باہمی عمل سے آزاد کر رہا ہوں کیونکہ میں یہ ضرور چاہوں گا کہ آپ بھی اپنا ذہن استعمال کیجیے! اور اس سوال کا جواب ڈھونڈنے میں میری مدد کیجیے!

لیشس: اگر آپ یہی چاہتے ہیں تو ظاہر ہے میں ایسا ہی کروں گا۔

سقراط: ہاں ہاں! میں یہی چاہتا ہوں مگر نکیاس میری آپ سے درخواست ہے کہ آپ اپنا نقطۂ نظر ذرا دوبارہ پیش کریں۔ آپ کو یاد ہوگا کہ شروع ہی میں ہم نے جرأت کو نیکی کا حصہ قرار دیا ہے۔

نکیاس: مجھے یاد ہے۔

سقراط: اور آپ نے بھی یہی کہا تھا کہ اگر چہ یہ واقعی جرأت کا حصہ ہے مگر اس کے کچھ اجزا بھی ہیں جن سے مل کر نیکی کا وجود مکمل ہوتا ہے۔

لیشس: ہاں میں نے یہ کہا تھا۔

سقراط: کیا آپ ان اجزا کے متعلق بھی مجھ سے متفق ہیں کیونکہ میرے نزدیک جرأت کے علاوہ عدل اور اعتدال ذات وغیرہ جیسے خصائص بھی نیکی کے اجزا کی حیثیت رکھتے ہیں۔ آپ بھی یہی نہیں کہتے؟

نکیاس: یقیناً۔

سقراط: بہت خوب گویا یہاں تک ہم میں مکمل اتفاق رائے ہے۔ اب آیئے بات کو ذرا آگے بڑھائیں اور خوفزدہ اور پرامید جیسی اصطلاحات سے متعلق بھی اتفاق رائے کی کوشش کریں۔ میں نہیں چاہتا کہ میں کچھ سوچ رہا ہوں اور آپ کچھ اور....... چلیے پہلے میں ہی اپنی رائے کا اظہار کیے دیتا ہوں اگر میں غلطی کروں تو میری اصلاح کر دیجیے گا۔ میرے نزدیک خوفناک اور امید افزا معاملات کا انحصار ان عوامل پر ہوتا ہے جو خوف پیدا کرنے یا اس کی پیدائش روکنے میں اپنا کردار ادا کرتے ہیں اور خوف کا تعلق حال یا ماضی سے نہیں ہوتا بلکہ یہ فقط حال یا مستقبل سے متعلق ہے اور ہمیشہ ایک متوقع برائی ہے۔ لیشس کیا آپ اس سے متفق ہیں یا نہیں؟

لیشس: ہاں سقراط، مجھے اس بات سے مکمل اتفاق ہے۔

سقراط: یہی تھا میرا نقطۂ نظر! نکیاس گویا خوفناک اشیا کا تعلق مستقبل میں متوقع برائی سے ہے اور امید افزا معاملات کا تعلق بھی مستقبل سے ہے مگر وہ یا تو اچھے ہیں یا معتدل۔ آپ اس سلسلے میں مجھ سے متفق ہیں یا نہیں؟

نکیاس: ہاں مجھے اس سے اتفاق ہے۔

سقراط: اور انہی معاملات کے علم کو آپ جرأت کہتے ہیں؟

لیشس: بالکل!

سقراط: اب دیکھنا یہ ہے کہ آپ لیشس اور مجھ سے تیسرے نکتے پر بھی متفق یا نہیں؟

نکیاس: وہ تیسرا نکتہ کیا ہے؟

سقراط: میں بتاتا ہوں۔ ان (لیشس) کا اور میرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ علم یا سائنس کا تعلق صرف ماضی سے ہی نہیں بلکہ ماضی، حال اور مستقبل تینوں کا اپنا اپنا علم ہے اور خاص طور پر تیسرا علم وہ ہے جو مستقبل کے بہترین معاملات سے آگاہ کرتا ہے مگر ان تینوں علوم کو فقط ایک ہی سائنس کنٹرول کرتی ہے۔ مثلاً صحت کی سائنس کو لیجیے۔ یہ تمام زمانوں یعنی ماضی، حال اور مستقبل میں صحت کے معاملات سے نمٹتی ہے۔ اسی طرح مویشی بانی یا زراعت کی سائنس ہے۔ جو زمین کی پیداوار کے علم کو ہر زمانے میں کنٹرول کرتی ہے۔ جہاں تک ایک جرنیل کے فن کا تعلق ہے، آپ خود بھی اس بات کی گواہی دیں گے کہ اسے مستقبل سے متعلق اندازے لگانے میں کمال حاصل ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ غیب گو بھی اس کے سامنے پانی بھرتے نظر آتے ہیں کیونکہ وہ خوب سمجھ سکتا ہے کہ مستقبل میں جنگ کے حوالے سے کیا رونما ہونے والا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قانون کی نظر میں غیب گو جرنیل کے ماتحت ہوتا ہے نہ جرنیل، غیب گو کے۔ لیشس کیا میں نے درست نہیں کہا؟

لیشس: بالکل درست کہا ہے آپ نے!

سقراط: اور نکیاس کیا آپ بھی اس امر کی تصدیق کریں گے کہ ایک قسم کی سائنس، اس ایک ہی قسم کی مخصوص اشیا کو ماضی، حال اور مستقبل تینوں زمانوں میں کنٹرول کرتی ہے اور اس کا فہم عطا کرتی ہے؟

نکیاس: جی ہاں سقراط، میری رائے بھی یہی ہے۔

اور دوست من جیسا کہ آپ نے کہا، جرأت درحقیقت خوف اور امید کے علم کو کہتے ہیں؟

سقراط:

نکیاس: جی ہاں!

سقراط: امید اور خوف کا دوسرا نام مستقبل کی بھلائیاں اور مستقبل کی برائیاں ہیں؟

نکیاس: یہ بھی حقیقت ہے۔

سقراط: اور اسی سائنس کا تعلق مستقبل سے ہے (بلکہ زمانے کی بھی قید نہیں)۔

نکیاس: یہ بھی درست ہے!

سقراط: تب بھی جرأت کو خوف اور امید کی سائنس نہیں کہا جا سکتا کیونکہ یہ دونوں کیفیتیں مستقبل سے مخصوص ہیں جبکہ جرأت کا تعلق دوبڑی سائنسوں کی طرح بیک وقت ماضی، حال اور مستقبل بلکہ ہر زمانے سے ہوتا ہے۔

نکیاس: آپ کی بات میں وزن ہے۔

سقراط: ایسی صورت میں نکیاس آپ نے جو جواب دیا ہے وہ فقط ایک تہائی درست ہے یعنی وہ جرأت کے ایک تہائی مفہوم کی وضاحت کرتا ہے جبکہ ہمارے سوال کا دائرہ جرأت کے مکمل مفہوم کا احاطہ کرتا ہے اور آپ ہی کے نقطۂ نظر کے مطابق (جو آپ کا موجودہ نقطۂ نظر ہے) جرأت نہ صرف خوف اور امید کی صرف مستقبل کے حوالے سے سائنس ہے بلکہ یہ ہر طرح اچھائی اور برائی کا تمام زمانوں کے اعتبار سے احاطہ کرتی ہے۔ آپ اپنے بیان میں اس ترمیم وتخفیف کے حوالے سے کیا کہتے ہیں؟

نکیاس: میرے پاس اتفاق کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔

سقراط: مگر ایسی حالت میں تو انسان اگر ہر نیکی اور بدی کے بارے میں یہ جانتا ہو کہ وہ کیسی ہے، کیسی تھی اور کیسی ہوگی اور کیونکر پیدا کی جا سکتی ہے تو ایسا شخص تو مکمل ترین انسان ہوگا اور اس کی ذات میں نیکی کے کسی پہلو یعنی عدل، معتدل مزاجی اور مردانگی وغیرہ کے لحاظ سے کوئی کمی نہیں ہو سکتی۔ وہ نہ صرف ان تمام خصائص کا حامل ہوگا بلکہ یہ بھی جانتا ہوگا کہ ان میں سے کیا مفید ہے اور کیا مضر۔ اور چاہے وہ فطری ہوں گی یا ماورائے فطرت انھیں وہ اپنے قبضۂ تصرف میں بھی رکھ سکتا ہوگا۔ وہ نہ صرف نیکی کی راہ دکھا سکتا ہوگا بلکہ انسانوں اور دیوتاؤں دونوں سے متعلق اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہو سکتا ہوگا۔

نکیاس: سقراط، مجھے محسوس ہورہا ہے کہ آپ نے جو کچھ کہا اس میں کافی حد تک سچائی ہے۔

سقراط: مگر نکیاس اس طرح آپ نے جرأت کی جو نئی تعریف پیش کی ہے اس کے مطابق یہ نیکی کا فقط ایک حصہ ہونے کے بجائے سرتاسر نیکی ہے۔

نکیاس: ایسا ہی لگتا ہے۔

نکیاس: ارے ہاں، ابھی تو کہہ رہے تھے۔

سقراط: مگر یہ تو ہمارے موجودہ نقطۂ نظر کے برعکس ہے۔

نکیاس: ہاں! ایسا ہی لگتا ہے۔

سقراط: نکیاس، اس کا مطلب یہ ہوا کہ حقیقی معنوں میں جرأت جس کیفیت کا نام ہے اسے دریافت کرنے میں بلاشبہ ہم ناکام رہے ہیں۔

نکیاس: بے شک ہم دریافت نہیں کر پائے۔

لیشس: پھر بھی میرے اچھے دوست نکیاس، آپ کو یہ عظیم دریافت لازمی کر لینا چاہیے تھی کیونکہ جب میں سقراط سے سوال پوچھ رہا تھا تو آپ ان میں بڑھ چڑھ کر کیڑے نکال رہے تھے۔ مجھے تو بڑی توقع تھی کہ ڈیمون کی دانائی سے آپ نے ضرور استفادہ کیا ہوگا۔

نکیاس: لیشس، میں شروع ہی سے دیکھ رہا ہوں کہ آپ کو جرأت کے تصور سے اپنی ناواقفیت کی اتنی فکر نہیں ہے بلکہ اس کی زیادہ فکر ہے کہ میری جانب سے بھی ویسی ہی کم علمی کا مظاہرہ ہو اور اگر ہم دونوں وہ بنیادیں بھی (اس موضوع سے متعلق) نہیں جانتے جو ایک عام اچھا انسان لازمی جانتا ہے تو بتائیے ہمارا کیا فائدہ؟ مجھے تو آپ ساری دنیا کے معمولی لوگوں کی طرح لگتے ہیں جن کی نظر ہمسائے کے گھر تک تو پہنچ جاتی ہے مگر اپنی ذات تک نہیں پہنچتی۔ میرا تو خیال ہے کہ ہمارے زیر بحث موضوع پر ضرورت سے بھی زیادہ بحث ہو چکی ہے اور اگر کسی موضوع پر ہماری رائے ادھوری رہی ہے تو ہم بعد میں ڈیمون کی مدد سے اس کی تصحیح کر سکتے ہی۔ جس کی ہنسی اڑانا آپ کا مشن ہے حالانکہ آپ نے اسے دیکھا تک نہیں۔ ویسے اس ضمن میں ہم دوسرے علما سے بھی مدد لے سکتے ہیں اور کسی موضوع سے متعلق معلومات پر میں خود مطمئن ہوں تو میں وہ آپ تک بھی ضرور پہنچاؤں گا کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ آپ کو علم کی سخت ضرورت ہے۔

لیشس: نکیاس، اس امر کا تو مجھے احساس ہے کہ آپ بہر حال ایک دانشور ہیں۔ تاہم میں ملیسیاس اور

ائی میکس سے یہ درخواست ضرور کروں گا کہ وہ آپ کو اور مجھے بالخصوص اپنے بچوں کی تعلیم،
تربیت کے حوالے سے اپنے مشیروں میں شامل نہ کریں بلکہ جیسے میں نے پہلے بھی کہا ہے انھیں
سقراط سے اس سلسلے میں درخواست کرنی چاہیے اور اس کا کوئی عذر قبول نہیں کرنا چاہیے۔ یقین
کیجیے اگر میرے اپنے بچے بھی حصول تعلیم کی عمر میں ہوتے تو میں سقراط ہی کی مدد حاصل کرتا۔

نیسیاس: اس سے تو مجھے بھی اتفاق ہے بشرطیکہ سقراط انھیں اپنی شاگردی میں لینا قبول کر لے۔ میں نکریٹس (Niceratus) کے لیے ان کے علاوہ کسی اور معلم کی سفارش نہیں کر سکتا مگر مجھے اندازہ ہے کہ جب انھیں اس کے لیے کہوں گا تو وہ خود ذمہ داری لینے کی بجائے کسی دوسرے اور معلم کا نام پیش کر دیں گے مگر لائسی میکس مجھے یقین ہے وہ آپ کی بات ضرور سنیں گے۔

لائسی میکس: اسے سننا چاہیے نکیاس کیونکہ اس کے لیے میں بھی وہ کچھ کرنے کو تیار ہوں گا جو میں بہت سے دوسروں کے لیے نہیں کر سکتا۔ آپ کیا کہتے ہیں سقراط۔ کیا آپ ہماری درخواست پر غور کریں گے اور کیا آپ نوجوانوں کی شخصیتوں کے سدھارنے میں حصہ لینے میں دلچسپی رکھتے ہیں؟

سقراط: سچ تو یہ ہے لائسی میکس! اگر میں نوجوانوں کی بہتری کے لیے کسی بھی خدمت سے انکار کروں تو یقیناً غلطی کا مرتکب ٹھہروں گا اور اگر اس بحث کے دوران میں یہ ثابت کر سکا ہوں کہ میں وہ کچھ جانتا ہوں جسے نکیاس اور لیشس نہیں جانتے تو بے شک آپ نے مجھے اس ذمہ داری کے لیے منتخب کر کے غلطی نہیں کی۔ مگر ہم جب سب کے سب کسی نہ کسی حد تک الجھن کا شکار ثابت ہوئے ہیں تو پھر کسی ایک کو دوسروں پر اولیت دینے کا کوئی جواز نہیں۔ میرا خیال ہے ایسی اولیت کا (میرے سمیت) کوئی مستحق نہیں۔ تاہم میں آپ کو ایک مشورہ ضرور دینا چاہتا ہوں اور وہ بھی اس درخواست کے ساتھ کہ یہ ہم لوگوں سے آگے نہیں بڑھے گا (ہماری ذات تک رہے گا) اور مشورہ یہ ہے کہ ہم میں سے ہر ایک کو پہلے تو خود ہمارے اپنے لیے ایک قابل ذکر اور قابل بھروسا استاد تلاش کرنا چاہیے کیونکہ ہمیں اس کی شدید ضرورت ہے اور اس کے بعد نوجوانوں کے لیے ڈھونڈنا چاہیے اور اس کے لیے اس کی پروا ہرگز نہیں کرنی چاہیے کہ اس پر اخراجات کیا ہوں گے۔ یہ بالکل صحیح نہیں کہ ہم جیسے ہیں ویسے ہی رہیں (یعنی اپنے علم اور تجربے میں اضافہ نہ کریں) اور اگر کوئی ہماری عمر کے لوگوں کو سکول جاتے دیکھ کر ہنسے گا تو اس کی خدمت میں ہومر کے یہ الفاظ پیش کر دوں گا:

"ضرورت مند کو شرم و حیا زیب نہیں دیتی"۔

آیئے! اس سے بے نیاز ہو کر کہ لوگ کیا کہیں گے، ہم اپنے اپنے بچوں کی تعلیم کو خود اپنی تعلیم کا ذریعہ بنالیں۔

لائسی میکس: سقراط، اگرچہ میں آپ سب سے عمر میں بڑا ہوں، مگر مجھے خود اپنے بچوں کے ساتھ سکول جانے میں کوئی عار محسوس نہیں ہوتا۔ البتہ مجھے آپ کی ایک لحاظ سے معاونت چاہیے۔ کل علی الصبح آپ میرے گھر تشریف لایئے تاکہ ہم ان معاملات اور ان سے متعلق منصوبوں کو حتمی شکل دے سکیں۔ آج کی بحث کو ہم یہیں پر ختم کرتے ہیں۔

سقراط: جناب لائسی میکس، میں کل اگر خدا نے چاہا تو ضرور آپ کے گھر آؤں گا اور آپ کی خواہش کا احترام کروں گا۔

☆☆☆

پروٹاغورس

(Protagoras)

شرکائے گفتگو:

سقراط (جو گفتگو کی روداد اپنے ساتھی کو بتا رہا ہے)؛ **بقراط** (Hippocrates)؛

السی بیاڈس (Alcibiades)؛ کرائیٹیاس (Critias)؛ **پروٹاغورس** (Protagoras)؛

ہپیاس (Hippias)؛ **پروڈیکس** (Prodicus)؛ **دیگر سوفسطائی** (Sophists)؛

کالیس (Callias) (ایتھنز کا ایک متمول باسی)

منظر: **کالیس کا دیوان خانہ**

ساتھی: جناب سقراط! آپ کہاں سے تشریف لا رہے ہیں؟ ویسے میرا یہ سوال قطعی غیر ضروری تھا کیونکہ مجھے معلوم ہے آپ حسین وجمیل السی بیاڈس کے تعاقب میں تھے۔ میں نے اسے کل دیکھا تھا اس کی ڈاڑھی نکل آئی تھی، بھرپور ڈاڑھی جو ایک مکمل مرد کی ہو سکتی ہے۔ میرے یہ الفاظ آپ کو بُرے تو نہیں لگے؟ تاہم یہ حقیقت ہے کہ وہ اب بھی خاصا حسین وجمیل ہے۔

سقراط: ارے بھئی اس کی ڈاڑھی کا کیا مذکور ہے! کیا آپ نے ہومر (Homer) کے جملے نہیں سُنے جس نے کہا ہے:

"نوجوان کا حُسن اس وقت اور بھی نکھر آتا ہے جب اس کی مسیں بھیگنے لگتی ہیں۔"

اسی بات نے السی بیاڈس کے حُسن کو چار چاند لگا دیے ہیں۔

ساتھی: اور سنائیے! معاملات کیسے جا رہے ہیں؟ کیا آپ اس سے ملتے رہے ہیں؟ اور کیا اس کا رویہ آپ سے فیاضانہ تھا؟

سقراط: ہاں! میرا خیال ہے کہ وہ مجھ پر بہت مہربان ہے اور آج تو وہ خاص طور پر مہربان تھا۔ ابھی میں اسی کے ہاں سے تو آ رہا ہوں۔ وہ مجھے ایک بحث کی تیاری میں مدد دے رہا تھا اور آپ کو یہ سُن کر حیرت ہوگی کہ میں نے اکثر اسے نظر انداز کیا ہے اور اکثر میں بھول جاتا تھا کہ وہ میرے پاس موجود ہے۔

ساتھی: اس کا کیا مطلب ہے؟ کیا اس کے اور آپ کے مراسم میں کوئی کھنڈت پڑ گئی ہے؟ کیونکہ اس سے زیادہ خوبصورت دوست تو آپ کو چراغ لے کر ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملے گا۔ کم از کم اس شہر ایتھنز میں تو ممکن ہی نہیں۔

سقراط: جی ہاں، میں نے اس سے بھی زیادہ خوبصورت ایک شخص دریافت کیا ہے۔

ساتھی: کیا مطلب! کیا وہ کوئی غیر ملکی ہے؟

سقراط: ہاں غیر ملکی ہی ہے۔

ساتھی: کس ملک سے ہے؟

سقراط: ابڈیرا (Abdera) سے۔

ساتھی: تو کیا واقعی آپ کی رائے میں وہ کلینیس (Cleinias) کے بیٹے سے بھی زیادہ خوبصورت ہے؟

سقراط: کیا دانائی خوبصورتی نہیں ہے؟

ساتھی: ارے تو سقراط کیا واقعی آپ ایسے کسی دانا فرد سے مل چکے ہیں؟

سقراط: ہاں اگر تم کسی شخص کو یہ اعزاز دینا چاہو تو پروٹاغورس سے زیادہ کوئی شخص اس کا اہل نہیں۔

ساتھی: کیا! پروٹاغورس ایتھنز میں ہے۔

سقراط: بے شک! وہ پچھلے دو دن سے یہاں ہے۔

ساتھی: اور آپ اس وقت اسی سے گفتگو کر کے آ رہے ہیں؟

سقراط: ہاں میں نے اس کی بہت سی باتیں سُنی ہیں اور بہت سی اپنی بھی کہی ہیں۔

ساتھی: تو جناب پھر، اگر آپ کی کوئی اور مصروفیت نہ ہو تو یہاں تشریف رکھیے اور مجھے ملاقات کے بارے میں تمام حالات سے آگاہ کیجیے۔ لیجیے یہ میرا خادم آپ کے لیے جگہ چھوڑے دیتا ہے۔

سقراط: یقین کیجیے آپ سُنیں گے تو میں اُلٹا شکر گزار ہوں گا۔

ساتھی: اور آپ بیان کریں گے تو ہم شکر گزار ہوں گے۔

آپ کا دوبارہ شکریہ! سنیے!

سقراط: گزشتہ رات یا شاید آج صبح بہت سویرے اپالوڈورس (Apollodorus) کے بیٹے اور فیسن (Phason) کے بھائی بقراط نے اپنی بید سے میرا دروازہ آن کھٹکھٹایا۔ کسی نے دروازہ کھول دیا۔ وہ اندر چلا آیا اور چلایا سقراط، تم جاگ رہے ہو یا سوئے ہوئے ہو؟ میں نے اس کی آواز پہچان لی اور کہا بقراط کیا یہ آپ ہیں؟ کیا کوئی اہم خبر لائے ہیں؟

ہاں ایک اچھی خبر۔ وہ بولا۔ اچھی ہی اچھی۔

آپ بہت خوش ہیں؟ میں نے پوچھا۔ مگر بولو تو خبر کیا ہے؟ اور آپ اس قدر منہ اندھیرے یہاں کیسے؟

وہ میرے قریب کھسک آیا اور بولا۔ پروٹاغورس آ گیا ہے؟

میں نے کہا ہاں۔ وہ دو دن قبل آیا ہے۔ آپ نے ان کی آمد سے متعلق کہیں سے سُن لیا؟

خدا کی قسم! ہاں، وہ بولا۔ مگر کل شام سے قبل مجھے خبر نہ تھی۔

اس کے بعد وہ بڑی تعظیم سے میرے قدموں میں بیٹھ گیا اور کہنے لگا۔ کل شام کو کافی تاخیر سے جب میں اپنے بھگوڑے غلام سیٹائرس (Satyrus) کو ڈھونڈنے کے سلسلے میں اونو (Oenoe) سے لوٹ رہا تھا اور اگر کوئی دوسرا معاملہ درپیش نہ ہوتا تو غلام کے بارے میں، میں آپ کو بھی مطلع کرتا مگر خیر، بہت دیر گئے جب ہم رات کا کھانا کھا کر بس سونے کی تیاری کر رہے تھے کہ میرے بھائی نے مجھے بتایا کہ پروٹاغورس آیا ہوا ہے۔ پہلے تو میں اسی وقت آپ کے پاس آ رہا تھا۔ مگر پھر میں نے سوچا کہ اتنی رات گئے آپ کو تنگ کرنا مناسب نہیں۔ مگر جیسے ہی مجھے تھکاوٹ اور نیند سے ذرا افاقہ ہوا میں سیدھا یہاں دوڑا آیا ہوں۔

میں جو اس شخص کی احمقانہ جرأت اور بے چینی کے بارے میں جانتا تھا، کہا۔ آخر مسئلہ کیا ہے؟ کیا پروٹاغورس نے تمھیں لوٹ لیا ہے یا کوئی نقصان پہنچایا ہے؟

اس نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔ ہاں اس نے میری عقل و خرد پر ڈاکا ڈالا ہے اور اب مجھے لوٹا ہوا مال لوٹاتا نہیں۔ یقین کیجیے میں نے کہا، اگر آپ اس کی فیس کا بندوبست کریں اور ذرا دوستانہ انداز میں اس سے مراسم بڑھائیں تو وہ یقیناً آپ کو بھی اپنی طرح عقل مندی میں یگانۂ روزگار بنا دے گا۔

وہ بولا۔ خدا کی قسم! اگر ایسی بات ہے تو وہ میرا سب کچھ لے لے اور وہ سب کچھ بھی جو میرے دوستوں کے پاس ہے، اگر وہ چاہے اور اسی لیے تو میں یہاں آیا ہوں کہ آپ اس سے میرے لیے اس موضوع پر بات کریں کیونکہ میں کم عمر اور ناتجربہ کار ہوں اور نہ ہی میں نے کبھی اس سے ملاقات کا شرف حاصل کر کے براہ راست گفتگو کی۔ بس اس کی شہرت ہی سُنی ہے کیونکہ پہلے پہل جب وہ ایتھنز میں آیا تھا اس وقت میں بچہ تھا اور تب سے میں نے لوگوں کے منہ سے اس کی تعریفیں ہی سُنی ہیں۔

سقراط: میرا خیال ہے وہ دنیا کا عظیم ترین خطیب اور مقرر ہے۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ہم ابھی اس سے ملنے کے لیے نکل کھڑے ہوں۔ صرف اسی طرح ہم اسے گھر ہی میں پکڑ لیں گے۔ میں نے سُنا ہے کہ وہ ہپونیکس (Hipponicus) کے بیٹے کالیئس کے گھر پر ٹھہرا ہوا ہے۔ آؤ بس چلتے ہیں۔

میں نے جواب دیا، ابھی ٹھہرو! میرے دوست، ابھی بہت سویرا ہے۔ البتہ میں اُٹھ جاتا ہوں اور ہم صحن کا ایک چکر لگا لیں۔ جب تک دن نکل آئے گا اور اس وقت ہم اس کے پاس چلے چلیں گے۔ گھبراؤ نہیں۔ پروٹاغورس اکثر گھر پر ہی ہوتا ہے۔ ہم وہاں اس سے مل سکیں گے۔

خیر ہم اُٹھ گئے اور صحن کے چکر لگانے لگے۔ اسی وقت میں نے سوچا کہ اس کے شوق کی شدت کو آزمانا چاہیے۔ سو میں نے اس کا امتحان لینے کے لیے اس سے پوچھا، سُنیے بقراط! آپ پروٹاغورس کے پاس جانا چاہتے ہیں۔ اس کے لیے اس قدر بے چین ہیں کہ بڑی سے بڑی فیس دینے کو تیار ہیں۔ بھلا یہ تو بتائیے کہ آپ اس کے بارے میں معقول حد تک جانتے بھی ہیں کہ وہ شخص کون ہے اور آپ کو اس سے کس فائدے کی توقع ہے؟ فرض کریں کہ آپ، کوس (Cos) جسے اسکلیپیاڈ (Asclepiad) بھی کہتے ہیں، کے بقراط کے پاس جائیں اور اسے اس کی فیس دینے لگیں اور کوئی آپ سے پوچھے کہ بھائی اپنے ہم نام کے پاس کیا لینے آئے ہو اور اسے رقم بھی پیش کر رہے ہو کیا بھلا تم اسے جانتے بھی ہو؟ تو آپ ایسے شخص کو کیا جواب دیں گے؟ وہ بولا۔ میں اس شخص سے یہی کہوں گا کہ یہ فیس میں اس کے طبیب ہونے کی وجہ سے دے رہا ہوں۔

اور وہ آپ سے کیا سلوک کرے گا؟

ظاہر ہے جو ایک طبیب (فزیشن) کو کرنا چاہیے!، وہ جواب میں بولا۔

اور فرض کیجیے آپ آرگائیو (Argive) کے پولی کلیٹس (Polycleitus) اور ایتھنز کے فیڈیاس

کے پاس جائیں اور اس کو رقم دینے لگیں اور کوئی پوچھ لے کہ یہ پولی کلیس اور (Pherdhas)
فیڈیاس ہیں کون اور آپ انھیں یہ رقم کیوں دینے لگے ہیں؟ تو آپ کا جواب کیا ہوگا؟
ظاہر ہے میں جواب میں یہی کہوں گا کہ وہ مجسمہ تراش ہیں۔
اور وہ آپ کے لیے کیا کریں گے؟
مجسمہ تراشیں گے اور کیا کریں گے؟
ہاں تو اب ہم پروٹاغورس کے پاس جارہے ہیں اور اسے آپ کی طرف سے رقم کی پیشکش بھی کرنے والے ہیں اور وہ بھی اس نیت کے ساتھ کہ ہمارے اپنے ذرائع کے اندر کام ہوگیا تو بہتر ورنہ ہم اپنے دوستوں کے ذرائع بھی استعمال کر ڈالیں گے اور عین اس وقت جب ہم پورے جوش وخروش کے ساتھ اس اہتمام میں مصروف ہیں، کوئی ہمارے پاس آئے اور پوچھے کہ ہاں بھئی بقراط! یہ پروٹاغورس کون ہے؟ کیا ہے؟ اور آپ اسے اتنی بڑی رقم کس ضمن میں دینے لگے ہیں؟ تو ہمارا جواب کیا ہونا چاہیے؟ مثلاً ہم جانتے ہیں فیڈیاس ایک مجسمہ ساز ہے اور ہومر ایک شاعر ہے۔ اسی طرح ہم پروٹاغورس کو کیا کہیں گے۔ اس کو کس نام سے موسوم کریں گے۔
وہ بولا، اسے لوگ ایک سوفسطائی[1] کہتے ہیں، سقراط۔

تو کیا ہم اسے اس کے بطور سوفسطائی کردار ہی کے باعث اسے فیس دیں گے؟

اس نے کہا۔ یقیناً
اور فرض کیجیے کہ وہ شخص آپ سے مزید آپ کے بارے میں پوچھے کہ پروٹاغورس آپ کے ساتھ کیا کرے گا کہ آپ اس سے ملنے جارہے ہیں؟
اس نے ذرا شرمیلے انداز میں جواب دیا چونکہ سورج نکلنے والا تھا اور خاصی روشنی ہوگئی تھی لہٰذا میں اس کے چہرے کا رنگ دیکھ سکتا تھا۔ اس نے کہا۔ ظاہر ہے وہ مجھے بھی سوفسطائی ہی بنائے گا۔
خدا کے لیے بقراط! آپ کو ہیلینا والوں (Hellenes) کے سامنے خود کو سوفسطائی کی حیثیت سے پیش کرتے ہوئے شرم نہیں آئے گی؟

ہاں سقراط! مجھے اس حقیقت کا اعتراف ہے کہ میں شرمندہ ہوں گا۔

(۱) قدیم یونان کے وہ فلاسفہ جو تشکیک کی بات کرتے تھے۔

مگر تم یہ فرض نہ کرو کہ پروٹاغورس کی تربیت کا انداز عمومی ہوگا۔ شاید آپ اس سے اس طرح سیکھ
پائیں جیسے کوئی گرائمر، موسیقی یا ورزش کا فن سیکھتا ہے کہ اسے اپنا پیشہ بنالے بلکہ آپ کو محض تعلیم کی
غرض سے سیکھنا ہوگا (یعنی تعلیم برائے تعلیم کی نیت سے) محض اس لیے کہ جیسے بھی طور پر آزاد شرفا کو
حاصل کرنا چاہیے!

بالکل یہی۔ اس نے فوراً کہا۔ یہی تو میری رائے بھی ہے۔ خصوصاً پروٹاغورس کی تعلیم سے متعلق
اس سے مختلف رائے ہو ہی نہیں سکتی۔

میں نے کہا۔ مجھے یقین نہیں ہے کہ آپ جو کچھ کرنے جا رہے ہیں اس کی اصلیت سے آگاہ
ہوں۔

یعنی میں کیا کر رہا ہوں۔

تم اپنی روح اور ذہن کی نگرانی کا فریضہ اس کو سونپنے جا رہے ہو جسے سوفسطائی کہتے ہو! اور مجھے
یقین نہیں کہ آپ کو اچھی طرح علم ہو کہ سوفسطائی کسے کہتے ہیں؟ اور اگر واقعی نہیں جانتے تو گویا تم
اپنی روح کی باگ ڈور ایسے شخص کے ہاتھوں میں دینے جا رہے ہو جس کے بارے میں تمھیں
یقین کیا معلوم ہی نہیں کہ اس کی تعلیمات تمھارے لیے مفید ہوں گی یا مضر!

اس نے جواب دیا۔ میرا خیال ہے کہ میں یہ سب یقینی طور پر جانتا ہوں۔

اچھا تو یہ بتاؤ کہ تم اس شخص کے بارے میں کیا تاثر رکھتے ہو؟

میں اسے ایک ایسے شخص کی حیثیت سے جانتا ہوں جو عالم ہے اور دانائی اور حکمت کی باتیں جانتا
ہے۔ یہی اس کے نام سے بھی جھلکتا ہے۔

کیا یہی باتیں ہم کسی مصور اور بڑھئی کے بارے میں بھی نہیں کہہ سکتے کہ وہ دانائی کی باتیں جانتے
ہیں اور فرض کرو کوئی ہم سے پوچھے: ایک مصور کی دانائی کی کیا علامات ہیں؟ تو ہم یہی جواب دیں
گے کہ اس کی دانائی کی علامت میں ان کی یہ صلاحیت شامل ہے کہ وہ کسی شے کی بالکل ہو بہو تصویر
بنالیتے ہیں (جو ایک عام آدمی نہیں کر سکتا) اور اگر سوال کرنے والا ہم سے مزید پوچھ بیٹھے، ایک
سوفسطائی کے کام میں دانائی اور حکمت کا کون سا پہلو پوشیدہ ہے؟ اور اس کے فن کا کیا نتیجہ ہے جس
پر وہ فخر کر سکتا ہے؟ اس کا ہم کیا جواب دے سکتے ہیں؟

سقراط، اس کا ہم کیا جواب دیں گے؟ اس کا جواب اس کے علاوہ اور ہو ہی نہیں سکتا کہ سوفسطائی ایسا شخص ہے، جو لوگوں کو فصیح البیان بناتا ہے۔

ہاں۔ میں نے کہا، یہ کسی حد تک تو درست جواب ہے مگر مکمل طور پر ٹھیک نہیں۔ اس میں مزید سوالوں کی گنجائش پیدا ہوتی ہے یعنی یہ کہ ایک سوفسطائی کسی شخص کو کسی موضوع پر فصیح البیان بناتا ہے؟ یوں تو ہم موسیقی کے مخصوص آلے کے ماہر کے بارے میں بھی یہی کہہ سکتے ہیں کہ وہ اپنے شاگرد کو وہ آلہ بجانے کے فن کے حوالے سے فصیح گفتگو پر قادر کر سکتا ہے۔ کیا یہ سچ نہیں ہے؟

بالکل سچ ہے۔

پھر تو یہ سوال ضروری ہے کہ آخر سوفسطائی انسان کو کس موضوع پر فصیح گفتگو کے لیے تیار کرتا ہے؟ کیا وہ اپنے شاگردوں کو اسی فن میں فصاحت عطا نہیں کرے گا جسے وہ خود بخوبی سمجھتا ہوگا؟

ہاں۔ ہونا تو یہی چاہیے!

اور وہ کون سا علم ہے جو ایک سوفسطائی جانتا ہے اور اپنے شاگردوں کو سکھاتا ہے؟

وہ کہنے لگا، اس کا شاید میں صحیح طور پر جواب نہیں دے سکتا۔ کیونکہ یہ بات خود مجھ پر واضح نہیں ہے۔

اس پر میں نے اپنی بات شروع کی۔ ہاں تو آپ اس خطرے سے تو واقف ہی ہوں گے جس سے آپ دوچار ہونے والے ہیں؟

اگر تم اپنے جسمانی معاملات کی نگرانی بھی کسی کو سونپنے لگو تو یہ جاننے کے لیے ضرور بے قرار ہو گے کہ اس میں تمھارے لیے فائدے اور نقصان کے کون کون سے پہلو ہیں اور کوئی بھی فیصلہ کرنے سے پہلے تم کافی دن سوچ بچار کرو گے اور اپنے عزیزوں اور دوستوں سے مشاورت کرو گے تب کہیں جا کر تم اس ضمن میں کوئی فیصلہ کرو گے لیکن یہ تو تمھاری روح کا معاملہ ہے اور اس ضمن میں نہ تم نے سوچا، نہ اپنے والدین سے نہ دوستوں سے بات کی جبکہ جونہی یہ غیر ملکی نظر آیا تم نے اپنے جسم اور روح کو اس کے حوالے کرنے کا ارادہ کر لیا جیسے تم نے خود کہا۔ شام کو تمھیں اس کے آنے کی خبر ملی اور صبح دم اس سے ملنے کے لیے تم دوڑے آئے۔ تم نے نہ غور و فکر میں مناسب وقت صرف کیا، نہ کسی سے اس ضمن میں مشورہ کیا کہ کسی اجنبی پر اس حد تک اعتبار کیا جائے یا نہیں۔ تم نے اس ضمن میں اس قدر مصمم ارادہ کر لیا ہے کہ تم ہر مخالفت اور مشکل یا رکاوٹ کو دور کر کے پروٹاغورس کی شاگردی اختیار کرو گے خواہ اس کے لیے تمھیں اپنی اور اپنے دوستوں تک کی تمام دولت ہی کیوں

نہ صرف کرنا پڑے۔ گویا تم اس ارادے کی کوئی بھی قیمت دینے کو تیار ہو۔ حالانکہ تمھارے اپنے اعتراف کے مطابق تم اسے جانتے اور پہچانتے تک نہیں ہو۔ نہ کبھی تم نے اس سے بات ہی کی ہے اور اس پر مستزاد یہ کہ تم اسے سوفسطائی کہتے ہو اور اس سے قطعی نابلد ہو کہ سوفسطائی فی الحقیقت کس کو کہتے ہیں؟ اس کے باوجود بھی تم خود کو اس کا شاگرد بنانے پر تلے ہوئے ہو۔

جب اس نے میری لمبی چوڑی تقریر سُنی تو جواب دیا، تمھارے لفظوں سے اور کوئی نتیجہ نہیں نکلتا۔ میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ کیا سوفسطائی اس کو نہیں کہتے جو روح کی غذا کا بندوبست تھوک یا پرچون میں کرتا ہے۔ میرا تو خیال ہے کہ یہی اس کی فطرت ہوتی ہے۔

اور روح کی غذا کیا ہوتی ہے؟

میں نے کہا، علم ہی روح کی غذا ہے اور سوفسطائی جب علم کے نام پر ہمارے ہاتھ کچھ بیچتے ہوئے اس کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملائے تو اس سے ہمیں دھوکے میں نہیں آ جانا چاہیے۔ اس وقت اس کی حیثیت بھی تھوک یا پرچون میں کھانے پینے کی اشیا یعنی جسمانی خوراک بیچنے والے جیسی ہوتی ہے جو ایسا کرتے وقت، یہ دیکھے بغیر کہ اس کا مال کیسا ہے؟ اس کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملاتا رہتا ہے خواہ وہ مال جسمانی صحت کے لیے مضر ہو یا مفید اور ان کے خریدار بھی، ماسوائے ان کے جو معالجے میں تربیت کار ہوں یا طبیب، اور اتفاق سے وہ ایسی اشیا کے خریدار بنیں، ان خواص کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ یہی حال علم کے ان بیوپاریوں کا ہے جو چند علمی چٹکلے اپنے جھولے میں ڈالے شہر شہر پھرتے ہیں اور ضرورت مندوں کو وہ چٹکلے تھوک یا پرچون قیمت میں مہیا کرتے ہیں اور میرے دوست! بہت سے لوگ ان علمی چٹکلوں کے روحِ انسانی پر منفی اثرات سے آگاہ بھی ہوں تو اس میں حیرانی کی کوئی بات نہیں سوائے ایسی صورت کے جب خریدار ہی خود روحوں کا طبیب بھی ہو، دیگر خریدار بھی ایسی باتوں سے نابلد رہتے ہیں۔ سو اگر تمھیں اندازہ ہے کہ اچھا کیا ہے اور بُرا کیا، تو تم پروٹاغورس یا کسی بھی ایسے شخص سے ان کے علمی چٹکلے خرید لو لیکن عزیز من، اگر تم ایسے حقائق سے ناواقف ہو تو ذرا صبر کرو اور اتنی جلدی اور اپنے عزیز ترین مقاصد کو داؤ پر نہ لگاؤ۔ کیونکہ کھانے پینے کی اشیا خریدنے میں جس قدر نقصان کا احتمال ہے، علم کی خریداری میں اس سے کئی گنا زیادہ ہے۔ کھانے پینے کی اشیا کے بارے میں تو یہ ہے کہ اگر ان اشیا کو خرید بھی لیں مگر گھر آ کر فوراً استعمال کرنے کی بجائے، انھیں کسی ماہر کو دکھا کر تحقیق کر

کہ ان اشیا میں سے کیا کھانا پینا مفید ہے اور کیا مضر اور یہ کہ ان کی کتنی مقدار کب اور کتنے وقفے سے کھانا پینا چاہیے؟ ایسی صورت میں مضر اشیا کے استعمال میں مضمر خطرات کے امکانات کم کیے جا سکتے ہیں لیکن علم کی خریداری میں صورت حال مختلف ہوتی ہے۔ علم سے متعلق اشیا جب کوئی خریدتا ہے تو اسے کسی دوسرے برتن میں ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانے کی نوبت (مادی اشیا کی طرح) نہیں آتی بلکہ جسم اور روح کو یہ بار براہِ راست اُٹھانا پڑتا ہے اور پھر اس کے جو بھی مثبت یا منفی اثرات مرتب ہونا ہوتے ہیں خود بخود اور فوری طور پر ہو جاتے ہیں۔ سو ایسے معاملات میں چونکہ ہم اس قدر کم عمر اور ناتجربہ کار ہیں کہ ان کی اصلیت کو سمجھنے سے عاری ہیں۔ لہٰذا ایسی خریداری سے قبل کسی بزرگ یا زیادہ تجربہ کار شخص سے مشورہ کرنا لازم ہے۔ آیئے اب اپنے پروگرام کے مطابق چل کر پروٹاغورس کی گفتگو سنتے ہیں اور جب فرض کیجیے وہ کچھ بتا چکے تو دوسروں سے بھی رائے لے لیں کیونکہ پروٹاغورس اس وقت کالیکس کے گھر میں ہے اور میرے علم کے مطابق وہ وہاں تنہا نہیں ہے بلکہ وہاں ایلس (Elis) سے تعلق رکھنے والا ہپیاس، سیاس (Ceos) کا رہنے والا پروڈیکس اور چند دیگر ممتاز اہل علم بھی موجود ہیں۔

اس بات پر ہم دونوں متفق ہو گئے اور اپنی منزل کی جانب رواں دواں ہو گئے۔ یہاں تک کہ ہم گھر کے آنگن تک پہنچے اور وہاں ہم ذرا دیر کو رُکے تا کہ ہم اس بحث کو مکمل کر لیں جو خواہ مخواہ راستے میں شروع ہو گئی تھی۔ ہم آنگن میں اس وقت تک کھڑے رہے جب تک کہ ہم نے اپنی بحث مکمل کر کے کوئی متفقہ نتیجہ اخذ نہیں کر لیا۔ مجھے ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے دربان نے، جو شاید وہاں سوفسطائیوں کی اس قدر متواتر آمد و رفت سے تنگ آیا ہوا تھا، کافی حد تک ہماری گفتگو سُن لی تھی۔ کیونکہ جب ہم نے دروازہ کھٹکھٹایا اور اس نے کھولا تو وہ ناگواری سے بڑبڑا رہا تھا۔ پھر کوئی سوفسطائی آئے ہوں گے ارے وہ گھر پر نہیں ہے۔ یہ کہا اور دونوں ہاتھوں سے دروازہ یوں بند کیا جیسے وہ ہمارے سر پر دے مارنا چاہتا ہو۔ ہم نے دوبارہ دستک دی۔ اب کے اس نے چلا کر کہا:

تم نے سُنا نہیں میں نے کیا کہا ہے۔ خدا کے بندو! وہ گھر پر نہیں ہے۔

میں نے نرمی سے پکار کر کہا۔ میرے دوست تم گھبراؤ نہیں۔ ہم سوفسطائی نہیں ہیں اور نہ ہی ہم کالیکس سے ملنے آئے ہیں بلکہ ہم تو پروٹاغورس سے ملنے کے مشتاق ہیں اور میری درخواست ہے کہ تم ہمیں اس سے ملا دو۔

آخرکار بعد از خرابی وہ اس پر راضی ہوا اور دروازہ کھول دیا گیا۔

جب ہم اندر داخل ہوئے تو ہم نے پروٹاغورس کو برآمدے میں چہل قدمی کرتے پایا۔اس کے پہلو بہ پہلو ہپونیکس کا بیٹا کالیس، اس کی ماں کی طرف سے سوتیلا بھائی اور اس کے باپ پیریکلس (Pericles) کا بیٹا پیرالس (Paralus) اور گلوکون (Glaucon) کا بیٹا کارمیڈس (Charmides) بھی موجود تھے۔ اس کی دوسری سمت پیریکلس کا دوسرا بیٹا زینتھی پس (Xanthippus)، فلیومیلس (Philomelus) کا بیٹا فلیوپائیڈز (Philippides) کے علاوہ مینڈی (Mende) کا اینٹی موئرس (Antimoerus) جو پروٹاغورس کے شاگردوں (چیلوں) میں سب سے نمایاں ہے اور فسطائیت کو بطور پیشہ اختیار کرتا ہے، موجود تھے۔ ان کے پیچھے سُننے والوں کی لمبی قطار تھی جو پروٹاغورس کے ساتھ مختلف شہروں سے اس وقت ہوگئی تھی جب اس نے ان شہروں کا دورہ کیا تھا۔ اورفیئس (Orpheus) کی طرح پروٹاغورس نے بھی اپنے دبنگ لہجے کے باعث انھیں متاثر کیا تھا اور وہ بے اختیار اس کے پیچھے ہوگئے تھے۔ یہاں یہ بتانا مناسب ہے کہ اس ہجوم میں (اگرچہ بہت کم مگر) کچھ ایتھنز کے لوگ بھی موجود تھے۔ ان پیروکاروں کے انداز سے میں بہت متاثر ہوا۔ دیکھنے والا منظر تھا، وہ کمال ادب سے اس کے ہمراہ چل رہے تھے۔ وہ اس کی راہ میں حائل نہ ہوتے بلکہ جونہی وہ اور اس کے دیگر ساتھی واپس پلٹتے تو مجمع بڑی باقاعدگی سے کوئی بدمزگی پیدا کیے بغیر اِدھر اُدھر ہٹ جاتا تاکہ اسے آگے بڑھنے میں دقت نہ ہو اور وہ مجمع کے آگے ہی رہے۔ تاہم وہ سارا مجمع اس کے پیچھے ہو لیتا اور بڑی ترتیب کے ساتھ اس کی باتیں سُنتا ہوا اس کی تقلید جاری رکھتا۔ اس کے پیچھے (جیسے ہومر نے کہا کہ: میں نے نگاہ اُٹھائی تو کیا دیکھتا ہوں) دوسرے برآمدے میں ایلین (Elean) کے علاقے کا ہپیاس ایک صدارتی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا اور جن لوگوں نے اسے گھیرا ہوا تھا، ان میں اریکسی میکس (Eryximachus) اکیومینس (Acumenus) کا بیٹا، مارّی نوسی (Myrrhinusian) کا فیڈرس (Phaedrus) اور اینڈروشن (Androtion) کا بیٹا اینڈرون (Andron) شامل تھے۔ اس کے علاوہ کچھ اجنبی بھی تھے جنھیں وہ اپنے آبائی شہر ایلس سے اپنے ساتھ لایا تھا۔ اس کے علاوہ کچھ اور لوگ بھی تھے۔ وہ لوگ ہپیاس سے طبعیات اور ستارہ شناسی کے بارے میں سوالات کر رہے تھے اور وہ انھیں مذہبی روایات کے مطابق جوابات دے رہا تھا۔ اس ضمن میں اسے اچھی خاصی تقریر کرنا پڑ رہی تھی۔

علاوہ ازیں جب میں نے سیان (Cean) کے پروڈیکس کو ایتھنز میں دیکھا تو میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ اسے ایسے کمرے میں ٹھہرایا گیا تھا جو ہپونیکس کے دور میں توشہ خانہ ہوا کرتا تھا۔ چونکہ گھر مہمانوں سے بھرا ہوا تھا لہٰذا خود کالیکس یہاں سے کسی دوسرے مہمان خانے میں منتقل ہو گیا تھا۔ پروڈیکس ابھی تک بستر میں تھا۔ وہ بھیڑ کی کھال کے کمبل اور بستر کی چادروں میں ملفوف ایک ڈھیر کی صورت میں نظر آ رہا تھا۔ اس کے قریب ہی کاؤچ پر پاسانیئس (Pausanias) جس کا تعلق سرامیئس (Cerameis) سے ہے اور اسی کے ساتھ ایک خوبصورت نقوش کا مالک نوجوان بھی تھا اور اگر میں غلطی نہیں کر رہا تو وہ قابلِ ذکر ظاہری حُسن کے ساتھ خوبصورت فطرت کا بھی مالک محسوس ہوتا تھا۔ کسی نے اسے آگاتھان (Agathon) کے نام سے پکارا تھا۔ ظاہری قرائن سے لگتا تھا کہ اسے پاسانیئس کے محبوب کا درجہ بھی حاصل ہے۔ اس نوجوان کے علاوہ وہاں دو اور نوجوان بھی تھے جن میں سے ایک سیپس (Cepis) کا بیٹا تھا اور دوسرا لُوکولوفائیڈس (Leucolophides) کا۔ ان کے علاوہ بھی چند لوگ موجود تھے۔ میں یہ جاننے کے لیے بے چین تھا کہ پروڈیکس کس موضوع پر اظہارِ خیال کر رہا ہے۔ کیونکہ اس کی شخصیت میں مجھے دانائی اور دوسروں کو متاثر کرنے کی صلاحیت نظر آتی تھی۔ اگرچہ میں آج تک اس کے قریبی حلقوں میں شامل نہیں ہو پایا۔ اب میں اس کی گونج دار آواز سُن رہا تھا۔

جیسے ہی ہم اندر داخل ہوئے ہمارے پیچھے پیچھے خوبصورت خدوخال کا مالک السی بیاڈس بھی داخل ہوا۔ مجھے معلوم ہے کہ تم اور کالسیچرس (Callaeschrus) کا بیٹا کرائیٹیاس اُسے بہت ہی خوبصورت قرار دیتے ہو۔

داخلے کے بعد ہم ذرا رُکے۔ ادھر اُدھر دیکھا اور سیدھے پروٹاغورس کے پاس پہنچے۔ میں نے اس سے مخاطب ہو کر کہا، اے پروٹاغورس! میں اور بقراط آپ سے ملاقات کے لیے حاضر ہوئے ہیں۔

اس نے ہماری طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔ تم لوگ مجھ سے تنہائی میں بات کرو گے یا پورے گروپ کی بحث میں حصہ لینا چاہتے ہو؟

آپ جو مناسب سمجھیں۔ میں نے جواب دیا۔ بلکہ زیادہ بہتر یہ ہوگا کہ آپ ہماری عرض سُن کے خود فیصلہ کریں کہ آپ ہم سے الگ ملاقات کریں گے یا سب کی موجودگی میں۔

کیا غرض ہے آپ کی؟ اس نے پوچھا۔

میں وضاحت کرتا ہوں۔ میں نے جواب دیا۔ میرا دوست بقراط ایتھنز کا مقامی آدمی ہے۔ اپالوڈورس کا بیٹا اور ایک خوشحال گھرانے کا فرد ہے۔ ذاتی خوبیوں کے اعتبار سے بھی یہ اپنی عمر کے لوگوں میں ممتاز ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ اہم سیاسی مقام حاصل کرنے کی پوری پوری صلاحیت رکھتا ہے۔ اس ضمن میں اس کا خیال ہے اگر اسے آپ کے ساتھ گفتگو کا موقع مل جائے تو اس کی علمی صلاحیت میں خاطر خواہ اضافے کے لیے بے حد مفید ہوگا۔ اب آپ فیصلہ کیجیے کہ اس سے اس کی تعلیم کے مجوزہ پروگرام کے بارے میں اکیلے میں بات کرنا پسند کریں گے یا پورے گروپ کی موجودگی میں ایسا ممکن ہو پائے گا۔

سقراط! آپ کا شکریہ کہ آپ نے مجھے کسی قابل سمجھا کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ کسی شخص کا کسی اجنبی شہر میں آ کر نوجوانوں کو اس بات کا قائل کرنا کہ وہ اپنے اعزہ واقربا کو یا دیگر علما کو نظر انداز کر کے (جن میں جوان اور بوڑھے سبھی شامل ہوتے ہیں) میرے جیسے کسی سیلانی کے پاس اس اُمید پر رہنے لگیں کہ اس طرح بحث وتمحیص کے ذریعے ان کی علمیت میں اضافہ ہوگا، کس قدر مشکل کام ہے۔ اس کے اس طریق کار اور اندازِ فکر سے کئی طرح کے حسد کا پیدا ہونا لازمی ہوتا ہے۔ سوایسے پردیسی کو اس طرح کی کئی دشمنیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اب سوفسطائیت کو ہی لیجیے، میرے خیال میں یہ فن عہد قدیم کی عظیم یادگاروں میں سے ہے لیکن اس دور میں اس کے ماہرین طرح طرح کے بھیس بدلتے تھے کیونکہ انھیں بہت سے خطرات کا سامنا تھا اور وہ اپنے فن کو نسبتاً قابلِ قبول فن کے پردے میں چھپا کر رکھتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی بہت سی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں جیسے ہومر، ہیزیوڈ (Hesoid) اور سیمونائیڈس (Simonides) نے اپنے فن کو شاعری کے پردے میں چھپائے رکھا، اس طرح اورفیس (Orpheus) اور موسائیس (Musaeus) نے خود کو پیامبر اور کاہن کی صورت میں پیش کیا اور میرے علم کے مطابق کچھ لوگوں مثلاً اکیوس (Iccus) کا تعلق ٹارینٹم (Tarentum) سے ہے یا اس سے بھی بعد کے زمانے میں ہیروڈیکس (Herodicus) ہے جس کا بڑا چرچا تھا اور جو پہلے میگارا (Megara) میں رہتا تھا اور آج کل سلیمبریا (Selymbria) میں مقیم ہے اور اعلیٰ درجے کا سوفسطائی ہے۔ اس نے موسیقار کا بہروپ بھر رکھا تھا۔ حالانکہ درحقیقت منجھا ہوا سوفسطائی تھا۔ اسی طرح اگاتھوکلیس (Agathocles) کی مثال لے لو۔ ایسے اور بھی بہت سے

لوگ گنوائے جا سکتے ہیں جنھوں نے سوفسطائی کے فن کو دیگر فنون کے پردے میں چھپایا ہوا تھا کیونکہ انھیں کسی نہ کسی تھیسز کے چکر میں گرفتار ہونے کا خطرہ رہتا تھا۔ البتہ میرا اندازہ ویسا نہیں ہے کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ اس طرح چھپنے سے ایک سچے سوفسطائی کا مقصد حاصل نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ ایسے نام نہاد سوفسطائی ایک طرف تو حکومت کو دھوکا دیتے ہیں کیونکہ وہ ان کے بھیس کے باعث اندھیرے میں رہتی ہے۔ دوسری طرف عوام بھی ان کے چکر میں آ جاتے ہیں اور حقائق کو سمجھے بوجھے بغیر محض حکمرانوں کی ہاں میں ہاں ملانے پر اکتفا کرتے ہیں۔ گویا بھاگ جانا یا بھاگتے ہوئے پکڑے جانا آج کل سب سے بڑی حماقت ہے اور اس سے اُلٹا عوام کے غم و غصے میں اضافہ ہوتا ہے کیونکہ بھگوڑے پر انھیں کوئی اعتراض ہو نہ ہو وہ اسے ضرور سمجھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے ان سے ذرا مختلف راہ اختیار کی ہے۔ میں ڈنکے کی چوٹ پر خود کو سوفسطائی قرار دیتا ہوں اور خود کو انسانوں کا معلم سمجھتا ہوں کیونکہ میرے نزدیک چھپنے سے علانیہ طریقہ، تحفظ کے ضمن میں زیادہ آسان اور مؤثر ہے۔ البتہ میں دیگر احتیاطی تدابیر کو بھی نظر انداز نہیں کرتا۔ لہٰذا مجھے توقع ہے کہ اس اعتراف سے کہ میں سوفسطائی ہوں، مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ اب تک اس پیشے میں، میں سالہا سال سے مصروف ہوں۔ میں جب اس میدان میں گزرے سالوں کا حساب کرتا ہوں تو لگتا ہے میں نے اک عمر گزار دی ہے۔ یہاں کون ہوگا جس کا میں روحانی باپ نہیں ہوں۔ سو اگر آپ مجھ سے تبادلۂ خیالات چاہتے ہیں تو میں بصد خوشی اس کے لیے تیار ہوں، اگر آپ لوگوں کی موجودگی میں مجھ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔

مجھے پہلے ہی خدشہ تھا کہ وہ ہپیاس اور پروڈیکس کی موجودگی میں ہم پر اپنے فن خطابت کو آزمائے گا اور ان کے سامنے ہمیں اپنے پرستاروں کی حیثیت سے پیش کرے گا۔ لہٰذا میں نے پوچھا۔ کیوں نہ ہم ہپیاس اور پروڈیکس کو اُن کے حواریوں سمیت بلا لیں تاکہ وہ بھی ہمارے مباحثے کو سُن سکیں۔

اس نے کہا: ہاں! یہ ٹھیک رہے گا۔

کالیس کہنے لگا۔ کیوں نہ ہم ایک مجلس مشاورت منعقد کریں جس میں بیٹھ کر آپ مطلوبہ موضوع پر بحث کر سکیں گے۔

اس بات پر ہمارا اتفاق ہو گیا۔ مجھے بلند پایہ علما اور دانایانِ وقت کی گفتگو سننے کے موقع کو اتنا قریب پا کر بے حد خوشی ہوئی۔ ہم خود ہی کرسیاں اور بینچ وغیرہ اُٹھا لائے اور ہپیاس نے انھیں پہلے سے

موجود بینچوں کے ساتھ ترتیب سے لگا دیا۔

اسی دوران کالیس اور السی بیاڈس، پروڈیکس کو بھی بستر میں سے کھینچ لائے اور اسے اس کے ساتھیوں سمیت (مجلس مذاکرہ میں) لا بٹھایا۔

جب ہم سب بیٹھ گئے تو پروٹاغورس نے اپنی گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کہا، سقراط! اب جبکہ تمام لوگ بیٹھ چکے ہیں، اب تم بتاؤ کہ اس نوجوان کے بارے میں کیا کہنا چاہتے تھے؟

میں نے جواب دیا، میں اسی نقطے سے آغاز کروں گا (جسے میں پہلے بھی پیش کر چکا ہوں) اور اپنی حاضری کا مقصد بھی بار دیگر بیان کرتا ہوں۔ یہ میرا دوست بقراط ہے جو آپ کے خصوصی حلقۂ شاگردان میں شامل ہونے کا خواستگار ہے۔ لہٰذا وہ جاننا چاہتا ہے کہ اگر وہ خود کو آپ کے ساتھ منسلک کر لے تو اس کا کیا حشر ہوگا؟ بس میں نے یہی کچھ کہنا ہے۔

پروٹاغورس نے جواب دیا، نوجوانو! اگر تم خود کو میرے ساتھ منسلک کر لو تو پہلے ہی روز جب تم گھر لوٹو گے تو اپنے آپ کو پہلے سے بہتر انسان پاؤ گے، اگلے دن پہلے روز سے بہتر اور پھر اسی طرح ہر روز تم خود کو گزشتہ روز سے بہتر محسوس کرو گے۔

میں نے یہ جواب سُن کر کہا، جناب پروٹاغورس آپ کے یہ جملے سُن کر مجھے ذرا بھی حیرت نہیں ہوئی۔ یہاں تک کہ اس عمر میں بھی اگر کوئی شخص آپ کو ایسی باتیں سکھا دے جو پیشتر ازیں آپ کے علم میں نہ تھیں تو گویا آپ پہلے سے بہتر حالت میں ہو جائیں گے مگر اپنے جواب کو زیادہ بلیغ بنانے کے لیے میں ایک مثال سے وضاحت کرنا چاہتا ہوں کہ فرض کیجیے بقراط خود کو آپ کے ساتھ منسلک کرنے کی بجائے ہراکلی (Heraclea) کے زیوکسپس (Zeuxippus) کے ساتھ منسلک کرنے کا اعلان کر دے جو نوجوان ہے اور گزشتہ دنوں کچھ عرصہ ایتھنز میں رہ کر گیا ہے اور بقراط اسی طرح اس کی خدمت میں بھی حاضر ہو جیسے آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہے اور وہ بھی آپ کی طرح اسے یہی کہے کہ اس کے ساتھ منسلک ہونے کے نتیجے میں اس کا مسلسل ذہنی ارتقا ہوگا اور وہ ہر روز خود کو پہلے سے بہتر محسوس کرے گا اور فرض کیجیے کہ بقراط اس سے یہ پوچھے کہ وہ بڑھوتری اور بہتری کس نوعیت کی ہوگی اور کس پہلو سے شخصیت میں رونما ہوگی تو وہ یعنی زیوکسپس یقیناً اسے جواب دے گا کہ اس کی بڑھوتری اور بہتری فن مصوری میں ہوگی اور اسی طرح فرض کیجیے کہ وہ تھیبان (Theban) کے آرتھاغورث (Orthagoras) کے پاس جائے اور وہ بھی اسے یہی سب

باتیں بتائے اور جب پوچھا جائے کہ بڑھوتری اور بہتری شخصیت کے کس پہلو اور کیسے علم میں ہوگی تو وہ بلادریغ جواب دے گا کہ بانسری بجانے کے فن میں بہتری ہوگی۔ اب آپ سے بھی ہمیں دراصل اسی نوعیت کے جواب کی طلب ہے کہ آپ کی صحبت کے باعث جو بہتری بقراط کی شخصیت میں رونما ہونے والی ہے وہ کس نوعیت کی اور کس خصوصی فن کے حوالے سے ہوگی۔ یہ جواب مجھے بقراط کے لیے چاہیے، یعنی آپ نے جو فرمایا ہے کہ پہلے روز وہ گھر بہتر حالت میں لوٹے گا اور پھر ہر آنے والے دن میں اس کی حالت بہتر ہوتی جائے گی تو اس سے آپ کی مراد کس خصوصی فن یا نوعیت سے ہے؟

میرے اس طویل استفسار کے جواب میں پروٹاغورس گویا ہو: آپ کا سوال پوچھنے کا انداز بڑا دلکش ہے اور ایسے سوالات کے جوابات دینا جو سلیقے سے پوچھے گئے ہوں، مجھے بے حد مرغوب ہے۔ اگر بقراط میرے پاس آئے تو اسے اس محنت ومشقت سے سابقہ نہیں پڑے گا جس کی صورت میں دیگر سوفسطائی اپنے شاگردوں کی توہین کرتے رہے ہیں اور آرٹ سے پیچھا چھڑانے میں کامیاب ہوتے ہی بغیر وقفے کے انھیں نفع ونقصان کے چکر میں جھونک دیا جاتا ہے یا نجوم، حساب، جیومیٹری اور موسیقی وغیرہ میں دھکیل دیا جاتا ہے (یہ کہتے ہوئے اس نے اچٹتی سی نظر بقراط پر ڈالی) لیکن یہ جب میرے پاس آئے گا تو وہی کچھ سیکھے گا جس کی خواہش لے کر آیا ہوگا اور ذاتی یا ملکی دونوں قسم کے معاملات میں، میں اسی ہوشیاری کا قائل ہوں۔ حقیقی معنوں میں وہ انہی میں تربیت اور نظم وضبط پیدا کرنے کی تربیت حاصل کرے گا۔ وہ یہ سیکھے گا کہ گھر کو سلیقے سے کیسے رکھا جاسکتا ہے۔ علاوہ ازیں وہ حکومت کے معاملات میں بھی بہترین قول اور فعل کی تربیت حاصل کرے گا۔

جہاں تک میں سمجھا ہوں۔ میں نے کہا: آپ سیاست کی تعلیم دیتے ہیں اور لوگوں کو بہتر شہری بنانے کا دعویٰ کرتے ہیں؟

ہاں سقراط۔ یہی پیشہ ہے جس کی میں تربیت دیتا ہوں۔

ایسی صورت میں مجھے کہنے دیجیے کہ اگر اس میں کوئی بات غلط نہیں تو آپ کا پیشہ بہت ہی مقدس ہے۔

میں نے اس کے جواب میں اظہار خیال کیا کیونکہ جناب پروٹاغورس، مجھے یہ تسلیم کرنے میں کوئی

یقین ہی نہیں رکھتا کہ یہ فن سکھایا بھی جا سکتا ہے۔ البتہ میں اپنے
ک نہیں کہ میں اس پر سرے سے قاصر ہوں۔ البتہ میں یہ بتا سکتا ہوں کہ یہ کہنا کیونکر
مد یقین کی کوئی قابلِ فہم توجیہ پیش کرنے سے قاصر ہوں۔ البتہ میں یہ بتا سکتا ہوں کہ یہ کہنا کیونکر
درست ہے کہ یہ فن انسان سے انسان کو سکھانا ممکن نہیں، نہ ہی اسے مناسب ترین الفاظ میں ابلاغ
کیا جا سکتا ہے۔ میرے کہنے کا مطلب ہے کہ ایتھنز کے لوگ بہت سمجھ دار ہیں اور انھیں اس پر فخر
ہے کہ اب انھیں دیگر اہلِ ہیلینا نے بتایا ہے۔ لہٰذا آج یہ بات بآسانی قابلِ فہم ہے کہ جب ہمیں
عمارت کی تعمیر کا مسئلہ درپیش ہو تو مشاورت کے لیے لامحالہ ماہرین تعمیرات ہی کو زحمت دی جائے
گی اسی طرح جہاز سازی کے مسئلے سے نمٹنے کے لیے ماہرین جہاز سازی کی مشاورت درکار
ہوگی۔ یہی حال دیگر علوم و فنون کا ہے جن کی تعلیم و تدریس کا مرحلہ درپیش ہو اور اگر ان مذکورہ
مسائل سے نمٹنے کے لیے کوئی ایسا فرد اپنی خدمات پیش کرے جس کے بارے میں متعلقہ لوگوں کا
تاثر یہ ہو کہ وہ مطلوبہ کام کے لیے تجربہ کار یا تربیت یافتہ نہیں ہے تو وہ اس کی پیشکش پر ہنسیں گے
بلکہ اس وقت تک اس کا مضحکہ اُڑاتے رہیں گے جب تک کہ وہ خود ہی فرار نہ ہو جائے اور اگر وہ
ڈٹے رہنا چاہے تو نتیجتاً پرائی ٹینز (Prytanes) کے سپاہی کو اپنا فریضہ ادا کرنا پڑتا ہے گویا آرٹ
کے پروفیسروں کے ساتھ نمٹنے کا ان کا یہ انداز ہے۔ البتہ جہاں تک حکومتی یا قومی معاملات کا تعلق
ہے تو اس میں ہر شخص کی آواز سُنی جاتی ہے اور اس میں نہ پیشے کی قید ہے نہ مرتبے کی۔ بلکہ کوئی
موچی ہو یا بڑھئی، ٹھٹھیرا ہو، ملاح ہو یا مسافر، یہاں تک کہ امیر، غریب کی اونچ نیچ کو بھی خاطر میں
نہیں لایا جاتا بلکہ جو چاہتا ہے کھڑا ہو کر اپنا نقطۂ نظر بیان کر سکتا ہے کوئی اس کی زبان نہیں پکڑتا۔
محض اس لیے کہ جو باتیں ان کارکنوں کے تجربے میں ہوتی ہیں۔ وہ انہی کے ذریعے معلوم کی جا
سکتی ہیں اور جس طرح خود انھوں نے کسی اُستاد سے سیکھا پڑھا ہوتا ہے، اسی طرح ان کی دسترس
میں جو علوم و فنون ہوتے ہیں انھیں بھی کسی تربیتی منصوبے کے ذریعے سیکھا نہیں جا سکتا اور یہ بات
جس طرح ریاست کے امور پر صادق آتی ہے اسی طرح افراد کے معاملات پر بھی ان کا اطلاق
ممکن ہے۔ کس قدر دلچسپ بات ہے کہ ہماری سوسائٹی کے بہترین اور عقل مند ترین لوگ ایسے
ہیں جو اپنے علم و فن کے ذریعے تدریس و ترویج نہیں کر سکتے۔ جیسے ان نوجوانوں کے والد
پیریکلس (Pericles) کی مثال لے لیں اس نے اپنی اولاد کو ہر اس علم میں جو اساتذہ سے حاصل
ہو سکتا ہے، بہترین معلومات فراہم کیں مگر جہاں تک اس کی ذاتی سیاسی سوجھ بوجھ کا تعلق ہے، اس

کا شائبہ تک ان جوانوں کو منتقل نہیں کر سکا۔ بس انھیں اسی توقع پر آزادانہ بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیا گیا ہے کہ وہ ٹھوکریں کھاتے کھاتے آخر بھلائی اور نیکی کے مطلوبہ معیار کو چھو ہی لیں گے۔ اسی طرح ایک اور مثال ملاحظہ کیجیے! ہمارے دوست کلینیس (Cleinins) کو تو آپ جانتے ہی ہوں گے جس کے چھوٹے بھائی السی بیاڈس کی سرپرستی انہی کلینیس کے ذمے تھی، کلینیس کو خدشہ تھا کہ پیریکلس اس کے بھائی کا اخلاق بگاڑ دے گا سو اس نے اسے اس کے ہاں سے ہٹایا اور برائے تعلیم و تربیت اریفرون (Ariphron) کے سپرد کر دیا۔ مگر ابھی چھ ماہ بھی نہیں گزرنے پائے تھے کہ اس نے اس رائے کے ساتھ اسے واپس بھیج دیا کہ وہ اس کی تعلیم و تربیت سے معذور ہے کیونکہ اسے معلوم نہیں کہ اس جیسے از کار رفتہ شخص کا علاج کیسے ممکن ہے، اس طرح کی بے شمار مثالیں پیش کرنا ممکن ہے جن سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ مہارت جو کسی شخص کے پاس تھی وہ اسے دوسروں کو منتقل نہیں کر پایا چاہے اس مقصد کے لیے آنے والا شخص اس کا واقف کار تھا یا اجنبی!

سوپروٹاغورس! ان مثالوں کی موجودگی میں مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجیے کہ نیکی (وجود میں موجود ہوتی ہے مگر) سکھائی نہیں جا سکتی۔ مگر جب میں آپ کی باتیں سنتا ہوں تو مجھے یقین سا ہونے لگتا ہے کہ جو کچھ آپ فرما رہے ہیں اس میں کچھ حقیقت ضرور ہے کیونکہ میں آپ کے تجربے، تعلیم اور آپ کی اختراعات سے بخوبی آگاہ ہوں۔ اس لیے میرا جی چاہتا ہے کہ آپ براہ کرم مجھے قائل کریں کہ نیکی بھی سکھائی جا سکتی ہے۔ کیا آپ ایسا کرنا پسند فرمائیں گے؟

سقراط! میں تمھارے لیے یہ بھی کر گزروں گا۔ اس نے کہا۔ بلکہ مجھے ایسا کر کے خوشی ہوگی مگر آپ کی منشا کیا ہے؟ کیا وہ خطیبانہ انداز اختیار کروں جو ایک بزرگ ساتھی کو اپنے کم عمر اور نا تجربہ کار ساتھیوں کی تعلیم کے لیے مناسب ہوتا ہے یا آپ مباحثے اور سوال و جواب کا انداز پسند کریں گے؟

اس کے لیے بہت سے لوگ بول اُٹھے اور سب نے متفقہ طور پر کہا کہ وہ اپنی پسند کا طریق کار اختیار کر لیں۔

خوب۔ اس نے کہا۔ ایسی صورت میں گفتگو کا انداز ہی بہتر رہے گا۔

کسی زمانے میں اس کرۂ ارض پر صرف دیوتا ہی سکونت پذیر تھے اور فانی انسان اور دیگر مخلوقات کا نام و نشان تک نہ تھا اور جب ان تمام مخلوقات کی تخلیق کا مرحلہ آیا تو دیوتاؤں نے مل کر آگ، پانی

اور ان کے بیشتر مرکبات سے زمین کے سینے میں ان کی مختلف شکلیں تشکیل دیں اور جب انھیں سورج تلے ظاہر کرنے کا وقت آیا تو اس سے پہلے پرومیتھیس (Prometheus) اور اپی میتھیس (Epimetheus) کو علم ہوا کہ انھیں ان کی نوعیت کے اعتبار سے خصائص عطا کیے جائیں۔ چنانچہ اپی میتھیس نے پرومیتھیس سے کہا: میں خصائص تقسیم کرتا ہوں، آپ ساتھ ساتھ جانچ پڑتال کرتے جائیں۔ اس پر اتفاق ہو گیا۔ سو تقسیمِ خصائص کی اپی میتھیس کے ہاتھوں تکمیل ہوئی۔ بعض ایسی مخلوقات تھیں جنھیں قوت بغیر رفتار عطا ہوئی جبکہ کمزوروں کو اس نے سرعتِ رفتار عطا کر دی، بعض کو شکاری اعضا دیئے جبکہ دوسروں کو اس سے محروم رکھا۔ البتہ انھیں ذاتی تحفظ کے لیے دیگر ذرائع عطا کر دیئے۔ کسی کو جسامت کی صورت میں ذریعۂ تحفظ عطا کیا تو کسی کو اتنا چھوٹا بنایا کہ وہ فضا میں اُڑ جائے یا زمین میں بل بنا کر رہنے لگے اور وہ یوں محفوظ رہے۔ چنانچہ اس نے ایسا اہتمام کیا کہ ہر قسم کی مخلوق کو کم از کم اتنا تحفظ ضرور دستیاب رہے کہ ان کی نسل ختم نہ ہونے پائے اور جب اس نے مختلف مخلوقات کو ایک دوسرے کے خلاف دفاع کی صلاحیت عطا کر دی تو اس نے انھیں موسموں کی شدتوں اور آسمانی بلاؤں کے تحفظ کا ملکہ بھی عطا کیا۔ انھیں پر و بال یا سخت اور موٹی کھال کی صورت میں سردی اور گرمی کی تکلیف دہ شدت سے تحفظ فراہم کیا تا کہ جب وہ آرام کرنا چاہیں تو انھیں فطرت کی آرام دہ گود میسر آ سکے۔ بعض کو اس نے سموں، بالوں اور پاؤں کے نیچے مخصوص قسم کی کھال دی (تا کہ زمین کی تپش، ٹھنڈک یا ناہمواری سے محفوظ رہیں)۔ اسی طرح ان کی خوراک میں بھی بے پناہ تنوع رکھا۔ کسی کے لیے گھاس اور سبزہ طے ہوا۔ کچھ کے لیے درختوں کے پھل، کسی کے لیے پودوں کی جڑیں اور کسی کی خوراک کے لیے دوسرے جانوروں کا گوشت مقرر ہوا۔ بعض جانوروں کی نسل ایک آدھ بچے سے بڑھنی قرار پائی مگر جو جانور ان کا شکار بننے والے تھے انھیں ہر سال کئی کئی بچوں کی پیدائش کی صلاحیت دی (تا کہ اوّل الذکر جانوروں کو شکار وافر میسر آئے) اور اس طرح ان کی نسل کے تحفظ کا سامان کیا۔ اس طرح اپی میتھیس کچھ زیادہ دانائی کا ثبوت نہ دے سکا کیونکہ اس نے بھول کر تمام کی تمام صلاحیتیں اور خصائص وحشی حیوانوں میں تقسیم کر دیئے اور جب انسان کی باری آئی تو اس کے لیے کچھ نہ بچا تھا۔ اس سے اپی میتھیس سخت پریشان ہوا۔ عین اس عالمِ پریشانی میں پرومیتھیس اس کی تقسیم کے عمل کا معائنہ کرنے آن پہنچا۔ اس نے دیکھا کہ دیگر جانوروں کو مطلوبہ صلاحیتیں اور خصائص عطا کیے جا چکے ہیں جبکہ

انسان سب سے زیادہ محروم ہے اس کے پاؤں کے تحفظ کے لیے کچھ نہیں ہے۔ جلد اس کی سادہ اور نازک ترین (بالوں وغیرہ کے بغیر) رہ گئی ہے اور نہ ہی دیگر جانوروں کی طرح اسے دفاعی اعضا عطا ہوئے ہیں (مثلاً سینگ اور پنجے وغیرہ) عین وہ لمحہ سر پر تھا جب انسان کو زمین سے نکال کر سورج کی روشنی میں لانا طے تھا۔ ایسے میں پرومیتھیئس کو انسان سے مسائل کے حل کی اور کوئی تجویز نہ سوجھی تو اس نے فوراً ہیفسٹس (Hephaestus) اور ایتھین (Athene) کا میکانیاتی فن آگ کے وجود سمیت انسان کے حوالے کر دیا (ظاہر ہے آگ کے بغیر انسان نہ دیگر ضرورتیں پوری کر سکتا تھا اور نہ ہی مذکورہ میکانیاتی فن سے استفادہ کرنے پر قادر ہوتا)۔ اس طرح انسان کو بھی زندگی کے تحفظ کا کچھ نہ کچھ وسیلہ ہاتھ آ ہی گیا جو اس کی خردمندی کی صورت میں تھا البتہ اس میں سیاسی سوجھ بوجھ شامل نہ کی گئی، کیونکہ اس کا وجود زیوس کی مملکت تک محدود تھا جہاں پرومیتھیئس کی پہنچ نہ تھی۔ علاوہ ازیں وہاں باقاعدہ پہرا تھا۔ البتہ ایتھین اور ہیفسٹس کے عمومی ورکشاپ میں وہ سب کی آنکھ بچا کر گھس گیا۔ یہیں وہ اپنے پسندیدہ فنون کو بروئے کار لانے کی کارروائی کیا کرتا تھا۔ سو یہاں سے اس نے ہیفسٹس کا آگ کے استعمال کا فن اور ایتھین کا فن لیا اور اسے بھی انسان کے حوالے کر دیا۔ یوں انسان کی زندگی کی راہ طے کرنے کے وسائل دستیاب ہو سکے۔ کہا جاتا ہے کہ بعد ازاں پرومیتھیئس پر اس چوری کے ضمن میں مقدمہ چلا اور یوں اسے اپی میتھیئس کی غلطی کی سزا بھگتنا پڑی۔

چونکہ انسان کو بعض الوہی خصائص میسر تھے اس لیے یہ پہلا حیوان ثابت ہوا جسے دیوتاؤں کے وجود کا شعور میسر آیا کیونکہ صرف انسانی وجود ہی میں دیوتاؤں کے جسمانی خصائص کی جھلکیاں موجود تھیں۔ چنانچہ وہ ان کے بت تراش کر ان کی قربان گاہیں تعمیر کر سکتا تھا۔ اس نے جلد ہی دیوتاؤں کے لیے اور ان سے متعلق ذکر و اذکار کے لیے فنِ گفتگو (زبان) کی ایجاد کا مرحلہ طے کر لیا۔ اسے مکان بنانے، لباس تیار کرنے، جوتے بنانے اور زمین سے رزق حاصل کرنے کا سلیقہ آ گیا۔ ان آسایشات کے باوجود انسان نے ایک زمانے تک انفرادی زندگی بسر کی اور اس وقت تک شہر وجود میں نہیں آئے تھے۔ مگر اس طرزِ حیات کا سب سے خطرناک پہلو یہ تھا کہ انسان اپنی فطری کمزوری اور نحیف و نزار جسم کے باعث درندوں کا شکار ہو جاتا تھا اور جو فنی مہارت اس وقت تک انسان کو میسر تھی اس کی مدد سے وہ فقط روزی اور سر چھپانے کے ذرائع کی فکر کر سکتا تھا۔

اسے درندوں سے نبردآزما ہونے کی صلاحیت اس وقت تک حاصل نہ ہو سکی تھی۔ وہ صرف خوراک کے حصول کے وسائل پر دسترس رکھتا تھا اور حکومت کے انداز اور وسائل کی نوبت ہی نہیں آئی تھی اس لیے انسانوں کی باہمی جنگ و جدال کی ضرورت پیدا نہیں ہوئی تھی۔ ایک زمانے کے بعد تحفظِ ذات کے احساس نے انسان کو مل جل کر رہنے پر اُکسایا اور یوں وہ شہر بسانے لگا۔ اس کا (ابتدائی ادوار میں) نقصان یہ ہوا کہ فنِ حکومت سے ناواقفیت کے باعث وہ باہمی تعلقات کے معاملے میں کافی پھوہڑ رہے اور صحت مند باہمی تعلقات سے قطعی نابلد رہنے اور باہمی چپقلشوں میں شدت آنے پر ایک بار پھر بکھر جانے پر مجبور ہوئے یا تباہی کا نشانہ بنے۔ ایسے عالم میں زیوس (عظیم دیوتا) کو خدشہ لاحق ہو گیا کہ انسان جیسی (مفید اور دلچسپ) مخلوق کہیں بالکل ناپید ہی نہ ہو جائے چنانچہ اس نے ہرمیس (Hermes) کو دنیا میں بھیجا جو اپنے ساتھ، شہروں کو امن و آشتی کا گہوارہ بنانے کے لیے، اپنے ساتھ تکریم و تعظیم، عدل، دوستی اور بھائی چارے کے علاوہ مصالحت پسندی جیسے خصائص لایا تا کہ ان سے بہبود اور آسایش فراہم کی جا سکے۔ ہرمیس نے زیوس سے دریافت کیا کہ وہ انسانوں کے درمیان عدل و انصاف اور مصالحت پسندی کو فروغ کیسے دے؟ کیا وہ ان خوبیوں کو بھی دیگر صلاحیتوں کی طرح تقسیم کر دے یعنی ایک آدمی کو بے شمار دوسرے لوگوں کے لیے فنِ ادویہ یا ایسا کوئی مفید فن دے دے جس سے وہ دوسروں کو فائدہ پہنچا سکے؟ کیا انسانوں میں عدل و انصاف اور مصالحت پسندی بھی ان ہی فنون کی طرز پر ایک گروہ میں سے ایک آدھ کو عطا کرے یا اس خاصیت کو تمام نسلِ انسانی میں برابر تقسیم کر ڈالے؟ زیوس نے اسے یہ خاصیت تمام مخلوق میں مساویانہ تقسیم کرنے کی ہدایات کرتے ہوئے کہا:

> ''میں چاہتا ہوں کہ ہر ایک کو اس خاصیت میں سے حصہ ملے کیونکہ اس کے بغیر شہروں کا وجود ممکن نہیں اس لیے کہ اگر شہروں میں نیکیوں میں سے حصہ پانے والوں کی تعداد محدود ہو تو وہ باہمی اتفاق و اتحاد مفقود ہو جاتا ہے جو شہروں کے وجود کے لیے لازم ہے۔ بلکہ میری جانب سے ایک ضابطہ جاری کرو کہ جو عدل اور مصالحت پسندی کے خصائص سے عاری ہوگا، اس سے زندگی سلب کر لی جائے گی کیونکہ ظلم (عدل کا متضاد) شہروں کے لیے عذاب سے کم نہیں۔''

اور یہی وجہ ہے سقراط، کہ دنیا میں بالعموم اور ایتھنز میں بالخصوص بڑھئی یا ایسے میکانکی فنون کی مہارت میں سے محدود تعداد میں لوگوں کو حصہ ملتا ہے اور آپ جانتے ہیں کہ کوئی دوسرا (غیر متعلق فریق) اس فن کے حصول کی کوشش کرے تو اس کی حوصلہ شکنی کی جاتی ہے تاکہ وہ گنے چنے منتخب ماہرین میں شمار نہ ہونے پائے اور جیسا کہ میں نے پہلے کہا ان کا یہ رویہ فطری ہے لیکن یہی لوگ جب سیاسی حسن عمل سے متعلق فیصلہ کرنے کو جمع ہوتے ہیں، جس کا وجود کہ فقط عدل وانصاف اور دانائی ہی کے ذریعے ممکن ہے، تو اس وقت وہ ہر متعلقہ اور غیر متعلقہ فرد کو اظہار خیال کا موقع دیتے ہیں کیونکہ وہ اس پر یقین رکھتے ہیں کہ اجتماعی بھلائی کے ایسے کاموں میں پوری آبادی کی شرکت لازمی ہے اور اگر ایسا نہ ہوا تو شہری ریاست کا وجود خطرے میں پڑ جائے گا۔ سو سقراط، میں نے اس کرشمے کی پوری وضاحت آپ کے سامنے پیش کر دی ہے۔

لہٰذا اگر آپ یہ سوچتے ہیں کہ، لوگ عدل وانصاف اور ایمانداری جیسی دیگر سیاسی بھلائیوں میں حصہ لینے پر اظہار طمانیت کرتے ہیں تو آپ غلطی پر نہیں ہیں (آپ کی سوچ درست ہے)۔ اس ضمن میں کچھ مزید دلائل بھی پیش کیے جا سکتے ہیں مثلاً دیگر صورتوں میں (جو آپ کے علم میں بھی ہوں گی) اگر کوئی شخص مطلوبہ مہارت نہ رکھنے کے باوجود بانسری بجانے یا ایسے کسی دوسرے فن میں مہارت کا دعویٰ کرے تو لوگ یقیناً اس کا دعویٰ سن کر ہنس دیں گے یا پھر اسے برا بھلا کہیں گے جبکہ یہ بھی ممکن ہے کہ اس کے متعلقین اسے دیوانہ قرار دے کر اس کے علاج معالجے کی فکر میں پڑ جائیں مگر جب کسی شخص کی دیانت یا ایسی کسی سیاسی بھلائی کا سوال ہو تو چاہے اس کی بددیانتی کا شہرہ پہلے سے ہو، پھر بھی ایسا شخص عوامی سطح پر آ کر اپنی بددیانتی کا اعتراف بھی کرے اور اپنے تئیں یہ سمجھتا ہے کہ اس نے اچھے جذبے کے تحت ایسا کیا ہے تب بھی لوگ اس کے اعتراف بددیانتی کو حماقت تصور کریں گے کیونکہ لوگوں کا خیال ہے کہ چاہے کوئی ایماندار ہو یا نہ ہو اسے اظہار بہر طور دیانتداری ہی کا کرنا چاہیے (کیونکہ علی الاعلان بددیانتی کے اعتراف سے اس برائی کے فروغ کی راہ نکلتی ہے)۔ چنانچہ اگر کوئی ایسا کہے گا تو گویا اپنے حواسوں میں نہیں ہوگا۔ ان کا یہ بھی خیال ہے کہ تھوڑی بہت دیانت ہر شخص میں موجود ہوتی ہے اور اگر کوئی شخص قطعی طور پر دیانت سے خالی ہے تو اسے دنیا میں رہنے کا کوئی حق نہیں۔ میں اسی کو ثابت کرنے کی کوشش میں ہوں کہ لوگ اس نوعیت کی بھلائیوں میں رہنمائی کرنے اور رائے دینے کا حق ہر ایک کو دینے میں حق بجانب ہیں

کیونکہ ان کی رائے میں ہر فرد اس طرح کی نیکیوں میں عملاً شریک ہوتا ہے۔ اب میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کروں گا کہ اسے اس امر کا بخوبی اندازہ نہیں ہوتا کہ یہ فطرتاً ودیعت ہوتی ہیں یا بذریعہ اکتساب اختیار کی جا سکتی ہیں۔ یہ ایسی شے کی حیثیت رکھتی ہیں جن کے بارے میں علم حاصل کرنا لازم ٹھہرتا ہے البتہ ایسے علم کا حصول تکلیف برداشت کیے بغیر ممکن نہیں ہوتا۔ اس ضمن میں کوئی ہدایات جاری نہیں کر سکتا، نہ ہی کوئی رکاوٹ ڈال سکتا ہے اور نہ ہی ان لوگوں کے غم و غصے کا اظہار ممکن ہے جن کو آسمانی بلیات کی وجہ سے تباہی یا بے حد مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ہو یا اتفاقاً ایسا ہو (یعنی ان میں انسانی کوششوں کا دخل نہ رہا ہو)۔ نہ ہی انھیں سزا دینا مناسب ہوتا ہے اور نہ ان کے تحفظ ہی کا اہتمام کیا جا سکتا ہے البتہ ان پر رحم کھایا جاتا ہے، مثلاً کون احمق ہوگا جو بدصورت، کوتاہ قامت یا دبلے پتلے لوگوں کی ہیئت بدلنے کے لیے مشورہ دینے کی ضرورت محسوس کرے۔ یعنی ان کے فطری نقائص کا ذمہ دار خود اسے ٹھہرائے کیونکہ ایسے شخص کو معلوم ہوتا ہے کہ ایسے نقائص یا خامیاں خود انسان کے بس میں نہیں اور یہ اتفاق یا فطری خواص کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ البتہ ایسا شخص جس میں ان خصائص کی کمی ہو جنھیں سیکھا یا علم کے ذریعے حاصل کیا جاتا ہے بلکہ ان کے برعکس برائی کی خاصیتیں موجود ہوں مثلاً بدکرداری، ظلم اور ناانصافی جو خصوصاً سیاسی بھلائی کے برعکس ہوتی ہیں تو ایسے شخص کو لوگ بُرا بھلا بھی کہیں گے اور اسے سزا بھی دینا چاہیں گے۔ ایسی صورت میں ہر شخص دوسرے کو سزا بھی دے گا اور اسے بُرا بھی سمجھے گا کیونکہ اس کے خیال میں جن خصائص کو بذریعہ اکتساب حاصل کیا جا سکتا ہے انھیں وہ اس دباؤ کی بدولت حاصل کر لے۔ ہاں سقراط، البتہ اگر آپ ممکن سزا کی نوعیت پر غور کریں تو اس حقیقت کا ادراک حاصل کر سکیں گے کہ انسانوں کی عمومی رائے میں نیکی کا حصول اور اس پر عمل لازم ہے مگر اس اصول کے تحت کوئی کسی غلط کار کو سزا نہیں دیتا۔ نہ اس وجہ کا کھوج لگانا چاہتا ہے جو کسی کے جرم کی بنیاد ثابت ہوتی ہے مگر وہ جو مناسب اور قرار واقعی سزا کے حق میں ہے ردِّ عمل کا اظہار نہیں کرتا کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اگرچہ جو کچھ ہو چکا اس کا ازالہ تو ممکن نہیں۔ البتہ مستقبل اس کے لیے اہم ہے۔ اسی لیے وہ چاہتا ہے کہ سزا پر عمل درآمد ہو تاکہ جرم کرنے والے کو اسے سزا پاتے دیکھنے والے یا والوں کو بھی جرم کرنے کی آیندہ جرأت نہ ہو۔ گویا وہ جرم کی بیخ کنی کی نیت سے سزا کا اطلاق چاہتا ہے۔ جو جرم کرنے والے کو علیحدگی میں یا سب کے سامنے ملامت کرنے کو لازم قرار دیتے ہیں۔ خود آپ کے شہر ایتھنز میں

لوگ جرم کرنے والوں کو سزا دینے یا اس سے بدلہ لینے پر یقین رکھتے ہیں۔ گویا ان لوگوں کا شمار بھی ایسے ہی لوگوں میں ہونا چاہیے جن کی رائے میں نیکی قابلِ اکتساب ہوتی ہے۔ لہٰذا سقراط، مجھے کہنے دیجیے کہ آپ کے شہر کے لوگ کسی ٹھٹھیرے یا موچی کو سیاسی معاملات میں رائے دہی کا حق اسی اُصول کے تابع دیتے ہیں کہ نیکی خاندان یا رنگ و نسل سے مشروط نہیں بلکہ اسے بلا امتیاز طبقات اور رنگ و نسل سیکھا جا سکتا ہے۔

البتہ نیک اور اچھے لوگوں کی اولادوں کے بارے میں آپ کا بیان کردہ ایک مسئلہ ابھی حل طلب ہے یعنی یہ کہ آخر اچھے لوگ اپنی اولادوں کو وہ علوم تو سکھا دیتے ہیں جو اساتذہ کے ذریعے سیکھے جا سکیں مگر ان میں ایسی بھلائی ودیعت (تربیت) نہیں کر سکتے جو خود ان میں موجود ہوتی ہیں اور اسی کے ساتھ ہی سقراط، میں اپنی حکایت اور دلائل کو ختم کرتا ہوں۔ آپ براہِ کرم اس سوال پر توجہ مرکوز کیجیے کہ آیا کوئی ایسی خاصیت موجود ہے یا بالکل نہیں جس میں شہر (اگر کوئی شہر واقعی وجود رکھتا ہو) کے تمام شہری شمولیت کر سکیں۔ آپ کے مسئلے کا حل دراصل اسی سوال کے جواب میں مضمر ہے کہیں اور نہیں۔ کیونکہ ایسی کوئی خاصیت انسان کو انفرادیت عطا کرنے کے لیے ہونی چاہیے جو بڑھئی، لوہار یا کمہار وغیرہ کی فنکارانہ صلاحیتوں سے ذرا مختلف ہو یعنی وہ صلاحیت عدل، اعتدال ذات یا تقدس کی صورت میں ہو جسے انسانی نیکی کا نام دیا جا سکتا ہے۔ شاید یہی وہ وصف ہے جس میں معاشرے کے ہر فرد کو شریک ہونا چاہیے اور حقیقت میں یہی وہ وصف ہے جس کی مدد سے لوگ لکھ پڑھ سکتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ کوئی شخص کم عمر ہو یا بالغ اگر اس وصف سے عاری ہے تو اسے مار کر بھی پڑھانا چاہیے۔ یہاں تک کہ اس سزا کے نتیجے میں وہ بہتر انسان بن سکے۔ اسی لیے یہاں روایت ہے کہ اگر کوئی ایسی ہدایات اور سزا کے باوجود لکھنے پڑھنے سے عاری رہے تو اسے یا دیس نکالا یعنی جلاوطنی کی سزا دی جاتی ہے یا سرے سے ہی اس کی زندگی ختم کر دی جاتی ہے کیونکہ اس کے بارے میں یہی سمجھا جاتا ہے کہ اس کا نقص ناقابلِ علاج ہے لہٰذا اس کا مر جانا ہی معاشرے کے حق میں ہے اور اگر میری باتیں درست ہیں تو پھر ذرا ان لوگوں کے بارے میں خیال کیجیے جو اپنی اولاد کو باقی سب کچھ سکھاتے ہیں سوائے اس بنیادی وصف کے۔ ذرا غور تو کیجیے کہ ان کا رویہ کس قدر غیر حقیقی ہوگا۔

چونکہ ہم پہلے ہی ثابت کر چکے ہیں کہ ایسا غیر حقیقی رویہ رکھنے والے (خوشحال) لوگ دراصل نیکی

اور شرافت کو بھی قابلِ اکتساب سمجھتے ہیں۔ اسی لیے یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ انھیں ایسی باتیں سکھانے کا اہتمام تو لازمی کریں جن کی غیر موجودگی میں سزائے موت یا جلاوطنی جیسی سزاؤں کا اطلاق ممکن نہ ہو مگر ان اہم خصائص کو نظر انداز کر دیں جن کے بغیر کوئی فرد دائمی جلاوطنی یا موت کی سزا کا مستحق ٹھہر سکتا ہو۔ سقراط، سچ بتائیے یہ کیسے ممکن ہے؟

تعلیم و تعلم کا آغاز زندگی کی ابتدا ہی سے ہو جاتا ہے اور پھر یہ سلسلہ آخری لمحوں تک جاری و ساری رہتا ہے۔ لہٰذا جونہی وہ گفتگو اور بول چال کو سمجھنے لگتا ہے اس کی ماں اور دایہ اور اسی طرح اس کا باپ اور اُستاد اس کی تربیت کی منصوبہ بندی کے لیے سر جوڑ کر بیٹھ جاتے ہیں۔ اس مرحلے پر بچہ ان چاروں ہستیوں کی رہنمائی کے بغیر غلط اور درست، جائز اور ناجائز میں امتیاز کی صلاحیت سے عاری رہتا ہے۔ اسی طرح اسے پتا نہیں ہوتا کہ کون سا رویہ قابلِ تکریم ہے اور کون سا قابلِ مذمت، کس کام کو بالا اہتمام کرنا چاہیے اور کس سے اجتناب ضروری ہے۔ اگر کوئی بچہ عمر کے اس مرحلے پر مذکورہ ہدایات پر عمل پیرا ہو جاتا ہے تو درست، ورنہ اسے سزا دی جاتی ہے اور مار پیٹ کے ذریعے اسے سیدھا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس کے ذرا دیر بعد اسے اُستاد کے حوالے کر دیا جاتا ہے تاکہ لکھنے پڑھنے کی صلاحیتوں سے زیادہ اس کے انداز و اطوار پر توجہ دی جا سکے۔ اساتذہ والدین کی منشا کے عین مطابق ان کی تربیت کے عمل کی نگرانی کرتے ہیں اور جب لڑکا اس کی زبانی ہدایات کے علاوہ اس کی تحریر بھی پڑھنے کے قابل ہو جاتا ہے تو اس کے ہاتھ میں عظیم شعرا کا کلام تھما دیا جاتا ہے جنھیں وہ سکول کے بنچ پر بیٹھ کر پڑھنے لگتا ہے۔ ان کتب میں کلام کی صورت میں ہدایت کی مثالیں، داستانیں قدیم زمانے کے عظیم لوگوں کی زندگیوں کے قابلِ ستایش کارناموں کا ذکر ہوتا ہے۔ جنھیں نہ صرف اسے زبانی یاد کرنا ہوتا ہے بلکہ اس سے یہ بھی توقع رکھی جاتی ہے کہ وہ انھیں اس طرح پلے باندھ لے کہ عملی زندگی میں ان کے کارناموں کی پیروی کرتے ہوئے ان جیسا بننے کی کوشش کرتا رہے۔ اسی ضمن میں ادب (شاعری) کا اُستاد اس امر کا خیال بھی رکھتا ہے کہ خام آدمی اس کا شاگرد بننے سے اجتناب کرے اور اسے اعتدالِ ذات کی صلاحیت اور وصف حاصل ہو، شاگرد کو دیگر منفرد شعرا سے بھی متعارف کرایا جاتا ہے جن کے کلام میں موسیقیت اور شعریت بدرجہ اتم موجود ہوتی ہے۔ اس طرح لڑکوں کو موسیقیت کا شعور دے کر ان کی ذات میں ہم آہنگی اور اعتدال پیدا کرنے کی سعی کی جاتی ہے تاکہ ان کی روح اچھے اوصاف سے متصف ہو

سکے اور وہ زیادہ متوازن افراد بن کر اُبھریں۔ قول و فعل دونوں کے اعتبار سے معاشرے میں مطابقت کے ساتھ رچ بس سکیں کیونکہ زندگی کے ہر موڑ پر توازن اور ہم آہنگی کی ضرورت پڑتی رہتی ہے۔ اس مرحلے کے بعد اسے جمناسٹک کے ماہر کے پاس بھیجا جاتا ہے۔ اس کا مقصد بچوں کو بہترین ذہنی، روحانی اور اخلاقی ساخت کا حامل جسم بنانا ہوتا ہے تا کہ وہ جنگ یا ایسی کسی دوسری آزمایش میں (عقل و جسم کی عدم مطابقت کے باعث پیدا ہونے والی) بزدلی کے نتیجے میں پیٹھ نہ دکھائیں۔ البتہ یہ سب کچھ وہی لوگ کر سکتے ہیں جنھیں وسائل دستیاب ہوں۔ ایسے لوگوں کے بچے مقابلتاً جلد سکول جاتے ہیں اور تا دیر وہاں رہ سکتے ہیں۔ یہ مرحلہ بھی بخیر و خوبی طے ہو جائے تو ان کے قانون پڑھنے کا مرحلہ آتا ہے۔ گویا اس طرح وہ اپنی ذاتی خواہشات کے زیر اثر ان معیارات کے مطابق زندگی گزار سکتے ہیں جو معاشرے نے متعین کیے ہیں۔ ابتدا میں ان کی مثال پہلے درجے کے اس طالب علم کی سی ہوتی ہے جسے اُستاد لکھائی سکھانے لگے تو پہلے اسے تختی پر آڑی ترچھی لکیریں ڈالنا سکھاتا ہے۔ اسی طرح قانون کے ان طالب علموں کو اساتذہ اور شہری ریاست قانون کے ڈھانچے سے متعارف کراتی ہے۔ یہ قانون دراصل قدیم زمانے میں ماہرینِ قانون سے ترتیب دیا ہوتا ہے۔ سو یہ قانونی ہدایت نامہ نوجوانوں کے حوالے اس غرض سے کیا جاتا ہے کہ چاہے وہ حاکم ہوں یا ماتحت اپنے کردار کی تصحیح کے لیے اس سے رہنمائی لیں اور اگر کوئی جان بوجھ کر اس سے روگردانی کرے تو اس کی تصحیح کی جاتی ہے یعنی اسے جوابدہی کرنا پڑتی ہے۔ یہ اصطلاح صرف آپ ہی کے ملک میں نہیں بلکہ دیگر کئی ممالک میں مستعمل ہے اور یہ دیکھا گیا ہے کہ قانون کے سامنے معاشرے کا ہر فرد جواب دہ ہوتا ہے۔ سو جناب اگر نیکیوں کی تشکیل اور تحفظ کے لیے اس قدر پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں اور اتنی احتیاط برتی جاتی ہے تو جناب سقراط، آپ نیکیوں کے قابلِ اکتساب ہونے سے متعلق شک اور حیرت میں کیوں پڑتے ہیں۔ سو جناب اس وہم کو دل سے نکال دیجیے کیونکہ اگر آپ اس کے برعکس سوچیں گے تو آپ کی حیرت دوچند ہو جائے گی۔

اب رہا یہ سوال کہ اکثر اچھے اور بااثر والدین کے بیٹے نکمے کیوں رہ جاتے ہیں تو اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں کیونکہ جیسا میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ ریاست اس حقیقت کا احترام کرتی ہے کہ نیکی کسی فرد کی ذاتی صفت نہیں (کیونکہ) اس کے وجود اور عدم وجود سے ریاست براہِ راست متاثر ہوتی ہے۔ اور اگر ایسا ہے (اور یہی سب سے بڑی حقیقت ہے) تو میں آپ کو دعوتِ فکر دیتا ہوں

کہ آیا اس سے بڑھ کر اور کون سی ایسی خاصیت ہوگی جس کا وجود ریاست کے وجود اور بقا کے لیے لازمی اور ابدی ہو۔ فرض کیجیے کہ ریاست کا کوئی وجود نہ ہو جب تک کہ ہم میں سے ہر کوئی نَے نواز نہ ہو (جہاں تک افراد کے باصلاحیت ہونے کا تعلق ہے) اور ہر کوئی دوسرے کو ذاتی طور پر بھی اور عوام کے علم میں لا کر بھی دوسروں کو مختلف فنون سکھانے میں آزاد ہو۔ اور بُرا سیکھنے والے کو بُرا بھی کہہ سکے بالکل ایسے ہی جیسے قانون اور نظامِ عدل کے طالب علموں کے ساتھ ہوتا ہے کیونکہ وہ دیگر فنون کی طرح اس علم میں کمی بیشی کو چھپا نہیں سکتے اور اسے مجبوراً بیان کرتے اور طلبہ تک پہنچاتے ہیں۔ کیونکہ یہ فطری بات ہے کہ معاشرے کا ہر فرد دوسرے کی نیکی اور صلاحیت عدل میں دلچسپی رکھتا ہے۔ اسی لیے وہ قانون اور نظامِ عدل کی تدریس و تربیت فراہم کرنے کے لیے ہر وقت تیار رہتا ہے۔ فرض کیجیے اتنی ہی آزادی سے ہم بانسری نوازی (یا ایسے دیگر فنون) کی تربیت بھی کر سکتے تو سقراط آپ کیا سمجھتے ہیں کہ اچھے بانسری نوازوں ہی کے بچے اچھے بانسری نواز ہو سکتے۔ میرا خیال ہے کہ ہرگز نہیں کیونکہ انھیں انفرادیت صرف اس حقیقت کی بنیاد پر میسر آتی اگر ان میں اس فن سے متعلق فطری صلاحیتیں میسر ہوتیں اور اس کا امکان ہمیشہ باقی رہتا ہے کہ اچھے سے اچھے بانسری نواز کا بیٹا بھی بانسری نواز ہو سکتا تھا۔ اسی طرح نکمے بانسری نواز کا بیٹا اس فن میں انفرادیت حاصل کر سکتا اور تمام کے تمام بانسری نواز ان کے مقابلے میں منفرد ہوتے ہیں جو اس فن سے بالکل بے بہرہ ہوتے ہیں۔ اسی طرح آپ یقیناً اس سے اتفاق کریں گے کہ قانون کی تعلیم حاصل کرنے والے نکمے سے نکمے لوگ بھی اَن پڑھ لوگوں سے بہتر قرار پائیں گے بلکہ ان کے مقابلے میں (اندھوں میں کانا راجا کے مصداق) وہ ماہرین ہی شمار ہوں گے۔ البتہ انھیں نیکی کو زیرِ عمل لانے کے لیے ایسی تعلیم یا عدالت یا قانون نافذ کرنے والے افراد یا اداروں کی صورت میں کوئی دباؤ ضروری نہیں (بلکہ یہ ان کی فطری بھلائی کا نتیجہ ہوتا ہے) خواہ وہ جاہل وحشی ہی کیوں نہ ہو۔ صورتِ حال کا سٹیج پر شاعر فیریکریٹس (Pherecrates) نے گزشتہ برس لینائین (Lanaean) کے تہوار میں کیا تھا۔ اس کے کورس میں جن آدم بیزاروں کا ذکر کیا گیا ہے ان کے درمیان رہتے ہوئے بھی آپ یوری بیٹس (Eurybates) اور فرائینانڈس (Phrynondas) سے مل کر خوش ہوں گے اور آپ کو دنیا کے اس حصے کی حرام زدگی کو دوبارہ دیکھ پانے کی خواہش بے چین رکھے گی۔ اور سقراط! بالخصوص آپ اس قدر بے صبرے ہیں تو اس کی وجہ دراصل یہ ہے کہ ہر شخص نیکی کی تعلیم اپنی

صلاحیتوں اور قابلیت کے مطابق دے پاتا ہے اور آپ جو یہ پوچھتے ہیں کہ اساتذہ آج کل کہاں دستیاب ہیں؟ اور یہ کہ لاطینی کون پڑھا سکتا ہے تو جواب یہ ہے کہ ایسے اساتذہ بھی آج کل نا پید ہیں۔ یہ سوال بھی آپ کے ذہن میں پیدا ہوگا کہ یہ کارندے (لوہار، بڑھئی وغیرہ کے کام کرنے والے) دانائی کی باتیں کہاں سے سیکھتے ہیں جبکہ ان کو عملی فن ان کے والدین سے ملتے ہیں۔ انھوں نے نئی نسل کو اپنا فن پوری مہارت سے منتقل کیا ہے مگر یہ سوال اہم ہے کہ ان کے فن کو آگے کون بڑھائے گا؟ ایسے لوگوں کے استاد کی فراہمی، عزیزم سقراط، واقعی ایک مشکل مرحلہ ہے۔ البتہ جو لوگ روحانی اعتبار سے جاہل ہیں ان کی تعلیم کا بندوبست ممکن ہے اور یہ بات نیکی یا دیگر معاملات کی تعلیم پر برابر منطبق ہوتی ہے کہ اگر ہم ایسے لوگوں کی تعلیم پر مقرر ہوں جن کی صلاحیتیں ان بنیادی صلاحیتوں سے قدرے زیادہ ہوں جو نیکی کی تعلیم کے لیے درکار ہوتی ہیں تو نتائج پر صابر و شاکر رہنے کے سوا کوئی چارہ نہیں اور جیسا اُستاد میں خود کو سمجھتا ہوں، یا دیگر تمام لوگوں (جنھیں اس تعلیم و تربیت سے شغف ہو) کے لیے ایسا علم جاننا ضروری ہے جس کی بدولت انسان نیک اور پاکباز ہو سکے۔ سو میں اپنے شاگردوں کو، ان سے وصول کی گئی فیس سے بڑھ کر علم دیتا ہوں اور اس کا اعتراف میرے تمام شاگردوں کو ہے۔ اس ضمن میں، میں نے ادائیگی کا حسبِ ذیل اُصول طے کر رکھا ہے۔

کوئی بھی شاگرد میری، شاگردی کے دوران، اگر خود چاہے تو فیس دے ورنہ اس پر کوئی زبردستی نہیں اور اگر کوئی میری فیس مقررہ مقدار میں ادا نہیں کرنا چاہتا تو اسے عبادت گاہ میں جا کر میری تعلیمات کی فیس کا تعین خود کرنا ہوتا ہے اور پھر میں اس سے اس کے خیال کے مطابق مناسب قرار پانے والی فیس قبول کر لیتا ہوں۔

اور سقراط، یہی میری حکایت (Apotogue) ہے اور اس کے ذریعے میں یہ ثابت کرنا چاہتا ہوں کہ نیکی کی تعلیم ممکن ہے اور ایتھنز کے لوگوں کی رائے بھی یہی ہے۔ میں نے یہ ثابت کرنے کی بھی کوشش کی ہے کہ اچھے اور مشہور لوگوں کا کم علم رہ جانا ناممکن نہیں ہے (البتہ اس کی کوئی نہ کوئی وجہ ہوتی ہے) ان میں پولی کلیٹس (Polycleitus) کے بیٹوں کی مثال سب سے زیادہ اہم ہے جو یہاں موجود ہمارے نوجوان دوستوں پیرالس (Paralus) اور زین تھپس (Xanthippus) کے ساتھیوں میں سے ہے کیونکہ یہ اپنے والدین کے پاسنگ بھی نہیں ہیں اور یہ بات بہت سے

دوسرے آرٹسٹوں کے بیٹوں پر بھی صادق آتی ہے تاہم خود پیرالس اور زین تھپس کے بارے میں کچھ کہنا ابھی قبل از وقت ہوگا کیونکہ یہ ابھی کم عمر ہیں اور ابھی ان کے بننے بگڑنے کے امکانات مساویانہ طور پر موجود ہیں۔ پروٹاغورس نے ان الفاظ پر اپنا خطاب ختم کر دیا تاہم میرے کان میں کسی کے یہ الفاظ دیر تک گونجتے رہے:

"اس کی آواز اس قدر شیریں تھی کہ بات اگرچہ ختم ہوئی مگر جیسے اب بھی
میں اس کے حسن صوت کے جادو کے زیر اثر ہوں اور اسے دوبارہ سننے
کے لیے ہمہ تن گوش ہوں!"

اور جب مجھے یہ ادراک ہوا کہ اس نے اپنا مافی الضمیر واقعی بیان کر دیا ہے تو میں نے ذرا مشکل سے اپنے حواس مجتمع کیے اور بقراط کی جانب متوجہ ہو کر کہا:

اے اپالوڈورس کے بیٹے، میں تمھارا مشکور ہوں کہ تم مجھے یہاں لائے۔ میں پروٹاغورس کے خطاب سے محروم ہونا پسند نہیں کر سکتا تھا۔ خصوصاً اس لیے بھی کہ اس سے قبل میرا نقطۂ نظر یہ تھا کہ کسی بھی طرح کی تربیت کسی بُرے شخص کو نیک نہیں بنا سکتی مگر اب میرے علم میں بے پناہ اضافہ ہو چکا ہے۔ اگرچہ اب بھی میرے ذہن میں ایک چھوٹی سی الجھن باقی ہے اور مجھے اُمید ہے کہ جیسے محترم پروٹاغورس نے اس سے قبل میرے شبہات کا مثبت جواب دیا ہے اسی طرح اس الجھن سے متعلق بھی مجھے مطمئن کریں گے اور وہ اُلجھن یہ ہے کہ اگر کوئی فرد پیریکلس یا اس پائے کے کسی دوسرے خطیب کے پاس جائے اور اسی موضوع پر اپنے سوالات سے متعلق موضوع پر شاید اسے ایسی ہی ایک شاندار تقریر سُننے کو ملے مگر اس دوران اگر وہ اپنی اُلجھن کو ثانوی سوالات کی صورت میں پیش کرنے کی کوشش کرے تو وہ مقرر کچھ نہیں کہہ پائے گا جیسے ہم کسی کتاب کو پڑھ کر اس میں مندرج معلومات سے آگاہ تو ہو سکتے ہیں مگر اس سے سوالات نہیں پوچھ سکتے اور نہ ہی کتاب ہم سے سوال پوچھتی ہے اور ان کے خطاب کے کسی مخصوص نقطے پر کوئی اعتراض اُٹھایا جائے تو اس کے جواب میں بھی وہ طویل اور بلند آہنگ خطاب سے نواز دیتے ہیں جیسے کسی تانبے کے برتن کو ٹھوکر لگے تو وہ دیر تک گونجتا رہتا ہے جب تک کہ اس پر کوئی ہاتھ نہ رکھ دے۔ مگر پروٹاغورس کی بات اور ہے یہ نہ صرف پُر مغز خطاب پر قادر ہیں (جیسا کہ ابھی انھوں نے اپنی شاندار تقریر سے ثابت کیا ہے) بلکہ ان کے ضمنی سوالات کے جوابات بھی مختصر مگر بامعنی اور برمحل ہوتے ہیں اور نہ صرف یہی

بلکہ وہ خود بھی جب کوئی سوال پوچھتے ہیں تو اس کا جواب بڑے صبر و سکون سے سنتے ہیں اور اسے پرد نا غور س میں آپ سے ایک چھوٹا سا سوال پوچھتا ہوں اور اگر آپ نے اس کا جواب دے دیا تو میں مکمل طور پر مطمئن ہو جاؤں گا۔ ابھی آپ نے کہا کہ نیکی سکھائی جا سکتی ہے......... تو میں اسے آپ کا ایک فتویٰ مانتا ہوں اور یہاں اور کوئی ایسا ہے بھی نہیں جس پر بھروسا کیا جا سکے تاہم ایک الجھن ایسی ضرور ہے جس سے متعلق مجھے اپنا ذہن تیار کرنے میں دقت ہو رہی ہے۔ ابھی آپ نے زیوس (Zeus) (عظیم دیوتا) کا ذکر کیا جس نے انسان کو عدل اور مصالحت پسندی عطا کی۔ اس کے علاوہ اپنی گفتگو کے دوران مسلسل آپ نے عدل، اعتدالِ ذات، تقدس اور ایسی دیگر خوبیوں کا ذکر کیا اور ان کی وضاحت یوں کی گویا ان کی مجموعی کیفیت اور تاثر کا نام نیکی ہے۔ اب ایک بار پھر آپ میری تسلی کے لیے بتائیے کہ کیا نیکی فی الحقیقت عدل، اعتدال ذات اور تقدس کی مجموعی کیفیت ہی کا نام ہے یعنی یہ تمام چیزیں نیکی کے اجزا ہیں اور یہ سب مل کر ایک بڑے مجموعے یعنی نیکی کو تشکیل دیتے ہیں یا یہ کہ یہ تمام ایک ہی خوبی کے مختلف نام ہیں۔ یہی اشتباہ اور ابہام ابھی میرے ذہن میں باقی ہے۔

سقراط! ان سوالوں کا جواب بہت آسان ہے اور وہ یہ کہ جن خوبیوں کا آپ نے ذکر کیا ہے وہ ایک ہی بڑی کیفیت یعنی نیکی کے حصے ہیں۔

اور کیا یہ حصے، میں نے پوچھا، ایسے ہیں جیسا کہ منہ، ناک، آنکھیں اور کان وغیرہ چہرے کے حصے ہیں یا ایسے کہ سونے کے مختلف ٹکڑے جو فقط جسامت کے اعتبار سے چھوٹے بڑے مگر ہیئت کے اعتبار سے ایک ہوتے ہیں۔

میں تو یہی کہوں گا جناب سقراط کہ یہ اوّل الذکر نوعیت میں مختلف ہیں۔ یعنی منہ، آنکھ، ناک اور کان وغیرہ چہرے کے اجزا ہونے کی مانند مجموعی نیکی کا حصہ ہیں (اور یوں باہم متفرق بھی جیسے آنکھیں اور ناک ایک ہی چہرے کا حصہ ہونے کے باوجود مختلف وظائف کے لیے مخصوص ہیں)۔

تو کیا یہ ممکن ہے کہ انسان ایک نیکی کا کچھ حصہ رکھتا ہو اور کچھ حصہ دوسری قسم سے؟ یا یہ لازم ہے کہ اگر ایک جزو نیکی اس کے وجود میں ہو تو باقی سب بھی لازماً ہوں۔

ہرگز نہیں، اس نے کہا۔ کیونکہ یہ بات اکثر دیکھنے میں آتی ہے کہ بعض لوگ منصف مزاج ہوتے ہیں مگر دلیر نہیں ہوتے۔ اسی طرح بعض دلیر ہوتے ہیں، عادل نہیں۔

اس کا مطلب ہے کہ آپ اس سے بھی انکار نہیں کریں گے کہ جرأت اور دانائی بھی نیکی کا حصہ ہیں؟

یقیناً ایسا ہی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں۔ اس نے جواب دیا۔ بلکہ ان اجزا میں دانائی سب سے زیادہ مقدم اور مقدس ہے۔

اور یہ بھی کہ یہ سب ایک دوسری سے مختلف خوبیاں ہیں؟ میں نے پوچھا۔

جی ہاں۔ جواب ملا۔

اور چہرے کے مختلف اعضا کی طرح ان میں سے ہر ایک کے وظائف بھی منفرد ہیں؟ جیسے آنکھ نہ صرف شکل وصورت میں کان سے مختلف ہے بلکہ اس کا فعل بھی کان سے جدا ہے۔ یہی حال دوسرے اعضا و اجزا کا ہے یعنی شکل اور فعل دونوں اعتبار سے باہم منفرد ہیں۔ میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ نیکی کے مختلف اجزا بھی کیا اسی طرح ماہیت اور وظائف دونوں اعتبار سے مختلف ہیں یعنی یہ کہ کیا وہ ہیئت اور وظائف کے اعتبار سے بھی باہم اختلاف سے متصف ہیں؟ کیونکہ ہماری مثال سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے۔

ہاں سقراط! یہ سمجھنے میں کہ یہ اجزائے نیکی باہم متفق ہیں، آپ غلطی پر نہیں ہیں۔

اس کا مطلب ہے، میں نے مزید کہا، جیسے نیکی کا کوئی بھی جزو دوسرے جزو سے، علم سے، عدل سے، جرأت سے، اعتدال ذات سے یا تقدس سے مشابہ نہیں ہو سکتا؟

بالکل نہیں ہوتی۔ اس نے کہا۔

میں نے کہا، ایسی صورت میں فرض کیجیے میں اور آپ ان خصائص کی ماہیت کے بارے میں مزید تحقیق کرنا چاہتے ہیں یوں پہلے مرحلے پر آپ کو اس سے اتفاق کرنا پڑے گا کہ عدل ایک ماہیت کا حامل ہے۔ آپ اتفاق کرتے ہیں ناں؟ میری تو یہی رائے ہے۔ کیا آپ کی نہیں؟

اس نے کہا۔ میری بھی یہی رائے ہے۔

اور فرض کیجیے کوئی آپ سے اور مجھ سے دریافت کرتا ہے: اے پروٹاغورس اور اے سقراط! جس شے کو تم لوگ عدل کہہ رہے تھے کیا وہ منصف ہے یا غیر منصف، اور میں اس کا جواب دوں کہ منصف ہے تو کیا آپ کی رائے میرے ساتھ ہوگی یا مخالف؟

آپ کے ساتھ ہی ہوگی۔ اس نے کہا۔

اس پر میں اسے جواب دوں گا کہ عدل اپنی ماہیت میں معقول اور منصفانہ ہے۔ کیا آپ اس سے متفق ہوں گے؟

ہاں! اس کا جواب تھا۔

اور فرض کیجیے وہ شخص اپنی جستجو جاری رکھتے ہوئے پوچھے۔ ہاں تو کیا تقدس نام کی کوئی شے واقعی وجود رکھتی ہے؟ تو ہم یقیناً اس کا جواب ہاں میں دیں گے۔ ایسا ہی ہے ناں!

بالکل یہی بات ہے۔ اس نے کہا۔

آپ بھی تصدیق کریں گے، مجھے یقین ہے کہ ایسی کوئی شے موجود ہے۔ ایسی ہی بات ہے کہ نہیں؟

اس نے ہاں میں سر ہلایا۔

اور کیا یہ کوئی ایسی شے ہے، جس کی اصلیت میں تقدس ہے یا حقیقت اس کے برعکس ہے؟ اگر کوئی یہ سوال پوچھے تو مجھے غصہ تو ضرور آئے گا مگر میں یہی کہوں گا، صبر بھئی صبر! اگر تقدس میں ہی تقدیس نہیں ہے تو پھر کسی بھی اور شے میں کیسے ہو سکتی ہے۔ آپ اس ضمن میں کیا کہتے ہیں؟ کیا آپ کا جواب بھی وہی نہیں ہوگا جو میرا ہے؟

اس کے بعد، فرض کیجیے کہ وہ شخص ہمارے پاس آ کر کہتا ہے، ابھی آپ لوگ کیا کہہ رہے تھے؟ میں کچھ صحیح طور پر نہیں سُن سکا۔ شاید آپ کہہ رہے تھے کہ نیکی کے مختلف اجزا باہم متماثل نہیں ہوتے، میں اس کے جواب میں یہی کہوں گا کہ مجھے تم نے یہی کہتے ہوئے سُنا ہوگا مگر حقیقت تمھارے تصور کے مطابق نہیں کیونکہ میں اپنی رائے نہیں دے رہا تھا بلکہ میں تو محض سوال پوچھ رہا تھا جواب تو پروٹاغورس نے دیا ہے۔ اور فرض کریں وہ آپ کی طرف متوجہ ہو کر پوچھے کہ پروٹاغورس! کیا آپ نے یہی کہا ہے؟ اور کیا واقعی آپ اس کی تصدیق کرتے ہیں کہ اجتماعی نیکی کا ایک عنصر دوسرے سے مختلف اور منفرد ہوتا ہے؟ کیا اس پر ہی آپ یقین رکھتے ہیں؟ تو آپ اس کا جواب کیا دیں گے؟

سقراط! میرے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ ہوگا کہ جو کچھ اس نے کہا ہے میں اس کی تصدیق کروں گا۔

بہت خوب پروٹاغورس! ہم یہی فرض کر لیتے ہیں مگر فرض کریں وہ اپنے سوالات جاری رکھے اور مزید دریافت کرے کہ، اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ تقدس صلاحیت عدل اور صلاحیت عدل تقدس کی مانند نہیں ہو سکتا۔ بلکہ صورت حال اس کے برعکس ہوگی یعنی عدل عدم تقدس کی مانند اور تقدس عدم

عدل یعنی ظلم کے مترادف ہوگا؟ ایسے میں چونکہ تقدس عدم عدل کی مانند ہے اور عدم عدل یا ظلم کا تقدیس سے عاری ہونا لازم ہے، ایسی صورت میں ہم اسے کیا جواب دیں گے؟ کم از کم میں اپنے طور پر تو اسے یہی جواب دوں گا کہ تقدس مقام عدل پر ہے اور عدل میں تقدیس پائی جاتی ہے اور میں آپ کی طرف سے بھی یہی جواب فراہم کر دوں گا بشرطیکہ آپ مجھے اس کی اجازت دیں۔ اوّل تو عدل تقدس کی مانند ہے یا کم از کم اس کے قریب ترین ہے۔ بلکہ میں تو اسی پر زور دوں گا کہ تقدس اور عدل قطعی مترادف ہیں اور میں چاہتا ہوں کہ آپ مجھے اجازت دیں کہ میں آپ کی جانب سے بھی یہی جواب پیش کر دوں۔ کیا اس ضمن میں آپ مجھ سے متفق ہوں گے؟

اس کا جواب کچھ اس طرح تھا: سقراط! میرا آپ سے اتفاق رائے ممکن نہیں کیونکہ میرے نزدیک تقدس عدل اور عدل تقدس نہیں بلکہ ان میں ایک واضح فرق ہے مگر اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ اگر آپ اسی میں خوش ہیں تو چلیے میں بھی تسلیم کیے لیتا ہوں کہ عدل تقدس ہے اور تقدس عدل!

معاف کرنا، میں نے کہا۔ میں یہ نہیں چاہتا کہ اگر آپ چاہیں یا اگر آپ کریں۔ اس طرح کے جوابات مجھے مطمئن نہیں کر سکتے۔ بلکہ میں تو چاہتا ہوں کہ میں اور آپ کسی ٹھوس دلیل کی بنیاد پر ایک دوسرے سے اتفاق کریں اور میں سمجھتا ہوں کہ نتیجہ ٹھوس حقیقت پر مبنی اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب یہ اگر مگر سے پاک ہو۔

بہت اچھا جناب۔ اس نے کہا، چلیے میں تسلیم کیے لیتا ہوں کہ عدل میں تقدس کی جھلک ہے کیونکہ یہ نقطۂ نظر ہمیشہ سے موجود رہا ہے کہ ہر شے دوسری شے سے کسی نہ کسی اعتبار سے مشابہ ہوتی ہے۔ گویا سفید کسی نہ کسی طرح سیاہ کے اور سخت نرم کے مشابہ ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ ایک دوسرے کے انتہائی برعکس عناصر میں بھی مشابہت کا کوئی نہ کوئی پہلو موجود ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ چہرے اعضا اور اجزا کے جس اختلاف کا آپ ذکر کر رہے تھے اس کے باوجود ان میں مشابہت کا پہلو موجود ہوتا ہے حالانکہ شکل اور افعال کے اعتبار سے وہ یکساں نہیں بلکہ قطعی مختلف ہیں۔ تاہم کسی نہ کسی نقطۂ نظر سے ان میں مشابہت کا پہلو تلاش کرنا ممکن ہے اور اسی اصول کی بنیاد پر کہ ہر شے کسی نہ کسی حوالے سے دوسری اشیا کے مشابہ ہوتی ہے۔ آپ ان اعضا کو باہم متماثل ثابت کر سکتے ہیں۔ تاہم اس حقیقت کو بھی جھٹلایا نہیں جا سکتا کہ ایک مخصوص پہلو سے مشابہت دو اشیا کو قطعی یکساں قرار دے سکتی۔ اسی طرح سے کسی خاص پہلو کا اختلاف اشیا کو قطعی مختلف یا برعکس ثابت نہیں کرتا۔ میں نے

حیرانی سے کہا، یعنی آپ یہ سمجھتے ہیں کہ عدل اور تقدس میں یکسانیت کا بس ایک معمولی سا عنصر وجود رکھتا ہے؟

ہرگز نہیں، جس قدر مشابہ آپ خود ان دونوں خصائص میں سمجھتے ہیں، میں اس سے بھی زیادہ پر متفق ہو سکتا ہوں۔

بہت خوب! میں نے کہا۔ میں جانتا ہوں اس کی وضاحت میں آپ کو دقت ہو رہی ہے لہٰذا میں اس کی ایک اور مثال پیش کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔

کیا آپ حماقت کے وجود پر یقین رکھتے ہیں؟

ہاں بالکل رکھتا ہوں۔

اور کیا دانائی حماقت کے بالکل برعکس نہیں ہے؟

یہ بھی درست ہے؟

اور یہ کہ اگر لوگ صحیح عمل کریں جن سے فائدہ پہنچے تو آپ یقیناً ان لوگوں کو معتدل مزاج ہی کہیں گے؟

یقیناً یہی کہوں گا، اس نے کہا۔

اور اعتدالِ ذات ہی ان کو معتدل مزاج بناتی ہے؟

یقیناً۔

اور وہ لوگ جو صحیح کام کرنے کی بجائے بے وقوفی سے کام کرتے ہیں تو گویا ایسے کرتے ہوئے وہ اعتدالِ متصور سے عاری تصور ہوں گے؟

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

گویا احمقانہ افعال حماقت کی وجہ سے اور اچھے کام اعتدالِ ذات کی بدولت سرانجام پاتے ہیں؟

اس نے ہاں میں جواب دیا۔

اور جو کام توانائی سے کیا جائے وہ مضبوط ٹھہرتا ہے اور جسے کمزوری سے سرانجام دیا جائے وہ کمزور؟

اس نے اس پر بھی صاد کیا۔

اور متماثل کام متماثل ذہن کا فرد اور مختلف کام مختلف ذہن کا فرد سرانجام دیتا ہے؟

اس سے بھی وہ متفق تھا۔

ایک مرتبہ پھر بتایئے، کیا حسن نام کی کوئی شے ہے؟

جی ہاں۔

اور یہ بھی کہ اس کے برعکس "بدصورت" ہے؟

اور کیا ہوگا!

اور کیا اچھائی بھی کوئی شے ہے؟

یقیناً ہے!

اور اس کا برعکس بُرائی ہے؟

یقیناً برائی ہی ہے!

اور آواز کے حوالے سے "باریک" ایک خاصیت ہے؟

جی ہاں!

اور اس کا برعکس "بھاری" ہے۔

بالکل ایسا ہی ہے! اس نے کہا۔

تو گویا ہر مخالف کا فقط ایک ہی برعکس ہوتا ہے اور کوئی نہیں ہوتا؟

اس کا جواب اثبات میں تھا۔

ٹھہریے۔ ہم نے جو کچھ تسلیم کیا ہے اسے ذرا دہرالیں۔ سب سے پہلے ہم نے یہ تسلیم کیا ہے کہ ہر شے کا صرف ایک ہی برعکس ہوتا ہے اور اس کے علاوہ نہیں؟

ہاں! ہم نے یہی طے کیا ہے۔

اور ہم نے اس سے بھی اتفاق کیا ہے کہ برعکس کام برعکس ذہن کے فرد ہی کی کارستانی ہوتی ہے؟

جی ہاں!

اور مزید یہ کہ جو کچھ حماقت سے کیا گیا وہ اس کے برعکس ہوگا جو اعتدالِ ذات سے کیا جائے؟

جی ہاں!

اور جو کام معتدل انداز میں کیا جائے وہ اعتدالِ ذات کی مدد سے اور احمقانہ کام حماقت کے باعث ہوتا ہے؟

اس نے ہاں میں ہاں ملائی۔

اور جو دو کام ایک دوسرے سے برعکس ہوں انھیں برعکس مزاج کے لوگوں نے سرانجام دیا ہوگا؟

جی ہاں!

گویا اگر اعتدالِ ذات کے ذریعے ایک کام ہو تو حماقت سے ہونے والا کام اس سے قطعی مختلف ہوگا؟

جی ہاں!

اور مختلف انداز میں بھی ہوگا؟

یقیناً!

اور اسی لیے مخالف ذہن و مزاج کے فرد کا کارنامہ بھی ہوگا؟ اور اس سے خود بخود یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ حماقت یقیناً اعتدالِ ذات کے برعکس کوئی شے ہے؟

صاف ظاہر ہے!

اور آپ کو یاد ہوگا کہ ابھی ابھی ہم نے حماقت کو دانائی کے برعکس کہا ہے؟

جی ہاں!

ایسی صورت میں، جناب پروٹاغورس! ان دونوں بیانات میں سے کون سا درست ٹھہرے گا؟ ایک بیان کے مطابق ہر شے کا صرف اور صرف ایک برعکس یا متضاد ہوتا ہے۔ دوسرے بیان میں کہا گیا ہے کہ دانائی اگرچہ اعتدالِ ذات سے مختلف ہے مگر دونوں نیکی کے اجزا ہیں اور دونوں اجزا ایک دوسرے سے مختلف اور منفرد ہیں اور یہ انفرادیت ان کی ماہیت میں بھی ہے اور وظائف میں بھی اور چہرے کے مختلف اجزا اور اعضا کی مثال (جو گزشتہ سطور میں بیان ہوئی ہے) ان پر صادق آتی ہے سو یہ بتائیے کہ ان دونوں بیانات میں سے ہم کس سے صاد کریں کیونکہ دونوں ایک دوسرے سے بالکل لگا نہیں کھاتے۔ ان میں کوئی مماثلت نہیں۔ ظاہر ہے دونوں میں کوئی مماثلت ہو ہی نہیں سکتی۔ کیونکہ ہر شے کا فقط ایک متضاد تسلیم کیا جاتا ہے مگر حماقت جو ایک کیفیت ہے اس کی متضاد دو کیفیتیں ہیں یعنی دانائی اور اعتدالِ ذات۔ کیوں جناب پروٹاغورس یہ بات درست نہیں ہے؟

اس کے علاوہ یا اس سے مختلف، اس ضمن میں، آپ کیا کہہ سکتے ہیں؟

اس نے بڑی ہچکچاہٹ کے ساتھ اس سے اتفاق کا اظہار کیا۔

علاوہ ازیں اعتدالِ ذات اور دانائی بالکل اسی طرح مشابہ ہیں جس طرح اس سے قبل ہم عدل اور تقدس کو مشابہ قرار دے چکے ہیں۔ اس لیے سو پروٹاغورس، اس سے پہلے کہ حواس جواب دے جائیں، یہ بحث ختم کر دیں۔ کیا آپ سوچ سکتے ہیں کہ کوئی غیر عادل (ظالم) شخص ناانصافی کے باوجود معتدل مزاج ہو سکتا ہے؟

سقراط مجھے ایک ایسی بات سے اختلاف کرنے پر پشیمانی ہے جس سے اکثریت نے اتفاق کیا ہے۔

میں نے پوچھا، ایسی صورت میں کیا مجھے ان لوگوں سے یا آپ سے اس موضوع پر بحث کرنی چاہیے؟

میں تو سمجھتا ہوں کہ اگر آپ ان لوگوں سے بحث کریں گے تو آپ ایسا کرنے والے پہلے شخص ہوں گے۔

آپ کیا پسند کریں گے؟ کیا آپ مجھے اتنا بتائیں گے کہ آپ کی رائے کیا ہے؟ کیا آپ ان لوگوں سے متفق ہیں؟ دراصل میں اپنی دلیل کی معقولیت کو پرکھنا چاہتا ہوں تاہم اس کا نتیجہ یہی نکلے گا کہ میں جو پوچھنے والا ہوں اور آپ جو جواب دینے والے ہیں، دونوں آزمائش میں پڑ جائیں گے۔

پہلے تو پروٹاغورس نے یوں ظاہر کیا گویا وہ انکار کرنا چاہتا ہو کیونکہ اس نے کہہ دیا کہ دلیل حوصلہ افزا نہیں ہے مگر آخرکار اس نے اثبات میں جواب دے دیا۔

ایسی صورت میں، میں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا، بالکل، ابتدا سے شروع کر کے میرے سوالات کے جواب دیجیے! کیا آپ سمجھتے ہیں کہ کچھ لوگ معتدل مزاج ہونے کے باوجود عدل سے عاری ہو سکتے ہیں؟

ہاں۔ اس نے کہا۔ اسے تسلیم کر لیا جانا چاہیے۔

اور آپ یہ بھی سمجھتے ہیں کہ اعتدالِ ذات مثبت شے ہے؟

جی ہاں۔

اور اچھی شے ظاہر ہے عدل کے خلاف عمل کے دوران انسان کی مثبت رہنمائی کرے گی؟

یہ تو مسلم ہے۔

میں نے کہا۔ اس روحانی ہدایت (اعتدالِ ذات کی رہنمائی) کے باوجود بھی کیا لوگ عدل سے

روگردانی میں کامیاب ہوں یا ناکام، رہنمائی کا وجود مسلم ہوگا؟
نہیں! صرف کامیابی کی صورت میں مسلم ہوگا۔
اور کیا اچھائی کے وجود پر آپ یقین رکھتے ہیں؟
بالکل رکھتا ہوں۔
اور اچھائی وہی ہے جو انسان کے لیے مفید اور موزوں ہو؟
ہاں! حقیقت یہی ہے۔ اس نے کہا۔ البتہ کچھ اشیا ایسی ہیں جو انسان کے لیے غیر موزوں ہونے کے باوجود اچھی کہلا سکتی ہیں۔
مجھے ایسے لگا جیسے پروٹاغورس اکھڑ رہا ہو۔ وہ یوں جوش وخروش کا مظاہرہ کر رہا تھا جیسے بحث نہیں بلکہ جنگ میں حصہ لینے والا ہو۔ یہ دیکھتے ہوئے میں نے اپنے کام سے کام رکھنے کا فیصلہ کرتے ہوئے اس سے کہا۔
پروٹاغورس! جب آپ کہتے ہیں کہ بعض اشیا انسان کے لیے ناموزوں ہوتی ہیں تو کیا آپ ان کی صرف انسان کے لیے ناموزونیت کی بات کرتے ہیں یا انھیں سرے سے ناموزوں سمجھتے ہوئے بھی اچھا قرار دیتے ہیں؟
ایسا نہیں ہے۔ اس نے کہا، دراصل میں ایسی بہت سی اشیا کے بارے میں جانتا ہوں مثلاً گوشت، شراب (مشروبات)، ادویہ اور ایسی دس ہزار مزید اشیا ہیں جو انسانوں کے لیے ناموزوں ہیں البتہ کئی موزوں بھی ہیں۔ ایسی بھی اشیا ہیں جو انسان کے لیے نہ مفید ہیں نہ مضر البتہ گھوڑوں کے لیے موزوں ہیں۔ بعض بیلوں کے لیے مناسب ہیں تو کچھ کتوں کے لیے۔ ایسی اشیا بھی ہیں جو حیوانوں کے لیے نہیں مگر درختوں اور پودوں کے لیے مفید ہیں اور پھر ان میں بھی فرق ہے، مثلاً کچھ پودوں کے پتوں کے لیے مفید ہیں تو کچھ جڑوں کے لیے، مثلاً کھاد ہی کی مثال لے لیں، پودوں کی جڑوں میں ڈالیں تو فائدہ دے گی اور اسی کو شاخوں اور پتوں پر چھڑک دیں تو ضرر رساں ثابت ہوگی۔ بہت سی دیگر مثالوں میں سے زیتون کے تیل کی مثال ہے کہ یہ پودوں کے لیے اور بالخصوص جانوروں کے بالوں کے لیے زہر ہے مگر یہی تیل انسان کے نہ صرف بالوں کے لیے بلکہ جسم کے لیے بھی انتہائی مفید ہے۔ (بلکہ اسے بدل بدل کر مختلف نوعیتوں میں استعمال کریں تو اتنے ہی متنوع فوائد حاصل ہوتے ہیں) ان فوائد میں سے سب سے زیادہ انسانی جسم کے بیرونی

حصوں کے لیے مفید ہے اور لطف یہ ہے کہ بیرونی استعمال میں یہ جس قدر زیادہ مفید ہے اتنا ہی
اندرونی استعمال میں مضر ہے اس لیے حکما غذا میں اس کے استعمال کی سختی سے ممانعت کرتے ہیں
(خصوصاً مریضوں کو) سوائے بہت معمولی مقدار کے جو گوشت یا دیگر اغذیہ کی ناپسندیدہ باس ختم
کرنے کے لیے استعمال کیا جائے۔

جب پروٹاغورس نے یہ طویل جواب فراہم کیا تو اس کے مصاحبوں نے خوب داد دی۔ سالبرتم
نے کہا۔ جناب پروٹاغورس! میرا حافظہ کچھ اچھا نہیں اور جب بھی کوئی طویل خطاب کی صورت میں
کچھ کہتا ہے تو میں اس کی گفتگو کے اکثر حصے بھول جاتا ہوں۔ ایسے عالم میں مجھے ایسے لگتا ہے کہ
جیسے میں ثقلِ سماعت کے عارضے میں مبتلا ہوں اور مجھے بلند آہنگ آواز ہی سنائی دے سکتی ہے۔
اب ایسے حافظے کی موجودگی میں، میں آپ سے درخواست کروں گا کہ آپ گفتگو میں اختصار
اختیار کرتے ہوئے مجھے ساتھ لے کر چلیں۔

آپ کا مطلب کیا ہے؟ اس نے استفسار کیا، یعنی میں اپنے جوابات کو مختصر کروں؟ کیا بہت ہی مختصر
کر دوں؟

نہیں یوں بھی نہیں۔ میں نے جواب دیا۔

پھر بھی کافی مختصر؟

ہاں! میں نے کہا۔

تو کیا میں اپنے حساب سے مختصر جواب دوں یا ایسا اختصار برتوں جو آپ کے لیے قابلِ قبول ہو؟
میں نے سنا ہے کہ آپ فصاحت اور مختصر گوئی (بلاغت) دونوں پر قادر ہیں۔ میں نے کہا۔ لہٰذا
میرے ساتھ گفتگو کے دوران آپ بلاغت کو بروئے کار لائیں تو عنایت ہوگی۔

سقراط! وہ گویا ہوا، میں نے لفاظی کی ان گنت جنگیں لڑی ہیں۔ سو اگر الفاظ کے استعمال کے ضمن
میں، میں نے حریف فرد یا گروہ کی منشا کو ملحوظ رکھا ہوتا، جیسا کہ اس وقت آپ چاہتے ہیں تو ذرا
سوچیے میں کیسے کامیابیاں حاصل کرتا۔ اس طرح تو پروٹاغورس کا نام حرفِ غلط کی طرح مٹ چکا
ہوتا۔

میں محسوس کر رہا تھا کہ وہ اپنے سابقہ جواب سے مطمئن نہیں مگر پھر بھی اس کا بس چلتا تو وہ اب
جواب دینے پر تیار نہ ہوتا اور مجھے یہ بھی محسوس ہوا کہ بحث کو جاری رکھنا میری کوئی مجبوری نہیں

ہے۔ سو میں نے کہا، میں آپ کو بحث پر مجبور نہیں کرتا، جب تک کہ آپ خود نہ چاہیں۔ لیکن اگر آپ یہ چاہتے ہیں کہ میں آپ کی خواہش کے احترام میں بحث جاری رکھوں تو مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں۔ اب جیسا کہ آپ کے بارے میں لوگوں کا خیال ہے یا جیسے آپ نے خود بھی اپنے بارے میں فرمایا ہے کہ آپ کو مختصر گوئی میں بھی کمال حاصل ہے۔ اس کے علاوہ آپ بے پناہ عقل وخرد کے مالک ہیں تاہم میں اس قدر طویل تقریروں سے مفہوم اخذ کرنے کی صلاحیت سے محروم ہوں میری دلی خواہش ہے کہ میں انھیں سمجھ پاؤں۔ جبکہ دوسری طرف آپ دونوں صلاحیتوں کے حامل ہیں تو مناسب یہی ہے کہ آپ مختصر گفتگو کریں اور اس پر آپس میں بحث کر لیں۔ جبکہ میں محسوس کرتا ہوں کہ آپ اختصار سے دانستہ گریزاں ہیں۔ ایسے میں میرے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہے گا کہ میں محفل سے اُٹھ جاؤں اور آپ کی عالمانہ گفتگو سے محروم ہی رہوں۔ (کچھ اس لیے بھی کہ مجھے کسی اور مقام پر بھی حاضری دینا ہے) سو میں اجازت چاہتا ہوں اگر چہ میرا دل یہیں اٹکا رہے گا کیونکہ آپ کی گفتگو سے محرومی کوئی معمولی بات نہیں۔

میں یہ الفاظ کہہ کر اُٹھنے کو تھا کہ کالیئس نے دائیں ہاتھ سے میری کلائی اور بائیں ہاتھ سے میرے اس پُرانے چغے کو پکڑ لیا اور بولا۔

سقراط! ہم آپ کو جانے نہیں دیں گے کیونکہ آپ کے جانے سے یہ دلچسپ بحث بھی انجام کو پہنچ جائے گی۔ سو میری درخواست ہے کہ آپ تشریف رکھیں۔ دراصل آپ کی اور پروتاغورس کی بحث میرے لیے (اور دیگر حاضرین کے لیے بھی) تمام دنیا کی دلچسپیوں سے بڑھ کر ہے۔ کیا آپ اس سارے مجمع کو اس خوشی سے محروم کر دیں گے۔

میں چونکہ اُٹھ کھڑا ہوا تھا اور قریب تھا کہ رخصت ہوں، سو میں نے کہا:

ہپونیکس کے بیٹے! آپ کے فلسفیانہ مزاج کا میں ہمیشہ سے معترف رہا ہوں اور اس وقت بھی میں اس موقع کی ستائش میں رطب اللسان ہوں۔ آپ کی فرمائش کو میں نے اہمیت یقیناً دی ہوتی، مگر کاش، میں ایسا کر سکتا! سچ تو یہ ہے کہ میں مزید ٹھہرنے سے قاصر ہوں جو کچھ آپ اس وقت مجھ سے چاہتے ہیں وہ میرے لیے اسی قدر ناممکن ہے جیسے آپ مجھے حیمرا (Himera) کے کرائسن (Crison) کے ساتھ دوڑ لگانے کی فرمائش کر دیں وہ بھی اس وقت جب وہ عین عروج کی حالت میں تھا یا ایسے ہی فرد کے ساتھ پورے دن کی دوڑ کا حکم صادر کر دیں۔ ظاہر ہے ایسی کسی بھی فرمائش

کے جواب میں تو میں یہی عرض کروں گا کہ میں تو آپ کی فرمایش اپنی ٹانگوں تک پہنچادوں گا مگر، تعمیل حکم سے قاصر ہیں اور اگر بہر صورت آپ کرایسن اور مجھے سٹیڈیم میں آمنے سامنے دیکھنا چاہتے ہیں تو آپ کو اسے حکم دینا پڑے گا کہ وہ اپنی رفتار کو کم کر کے میری رفتار کے برابر لائے کیونکہ تیز بھاگنا میرے بس میں نہیں۔ البتہ اسے رفتار کم کرنے میں دقت نہیں ہونی چاہیے اور اسی طرح اگر آپ چاہتے ہیں کہ میری اور پروٹاغورس کی بحث جاری رہے تو آپ کو انھیں مجبور کرنا پڑے گا کہ وہ اپنے جوابات کو مختصر کریں اور اصل موضوع سے منسلک رہیں جیسا کہ بحث کے شروع میں انھوں نے کیا ہے اور اگر وہ ایسا کرنے سے معذور ہیں تو آپ ہی بتایئے بحث کے جاری رہنے کا امکان کہاں ہوگا؟ کیونکہ بحث ایک چیز ہے اور خطابت دوسری۔ سو میری درخواست ہے کہ دونوں کے فرق کو ملحوظ رکھا جائے۔

کالیس نے کہا۔ مگر سقراط! آپ جانتے ہیں کہ پروٹاغورس کو اپنے انداز سے گفتگو کا حق ہے جیسے کہ آپ بھی اپنے مخصوص انداز ہی میں گفتگو پسند کرتے ہیں۔

اس مرحلے پر السی بیاڈس نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔

کالیس! اس سلسلے میں آپ کا بیان حقائق پر مبنی نہیں ہے کیونکہ ہمارے دوست سقراط نے تقریر کرنے کے فن کے حوالے سے پروٹاغورس کی برتری کا اعتراف کیا ہے حالانکہ اس سے قبل ہم نے ایسا موقع کبھی نہیں دیکھا کہ سقراط نے بحث و مباحثے اور دلائل کے استعمال کے ضمن میں کسی کی برتری تسلیم کی ہو۔ لہٰذا اگر اسی طرح پروٹاغورس مباحثے میں سقراط کی برتری تسلیم کرلے تو میں اس بات کی ضمانت دیتا ہوں کہ سقراط بحث جاری رکھنے پر تیار ہو جائے گا لیکن اگر پروٹاغورس چاہتے ہیں کہ بحث میں بھی ان کی برتری کو تسلیم کیا جائے تو ضروری ہے کہ انھیں پابند کریں کہ وہ سوالات کے حقیقی جوابات تک محدود رہیں۔ دراصل یہ ان کی فنکارانہ چالاکی ہے کہ وہ سوال کے اصل نقطہ سے پھسل کر طویل خطاب کا سہارا لیتے ہیں اور بات کو اتنی دور لے جاتے ہیں کہ سامعین کے ذہن میں اصل سوال کہیں کھو کر رہ جاتا ہے (مجھے یقین ہے کہ یادداشت اور حافظہ سقراط کا مسئلہ نہیں ہے۔ وہ صرف بن رہے ہیں۔ وہ بھی میرے نقطہ نظر ہی سے مطابقت رکھتے ہوئے طویل خطابت سے دوران بحث اجتناب پر زور دیتے ہیں۔) میرے نزدیک سقراط کے دلائل پروٹاغورس کے دلائل کے مقابلے میں زیادہ ٹھوس اور پُر مغز ہیں۔ میرا تو یہی خیال ہے اور محفل میں موجود ہر شخص

(اگر چاہے تو) اپنے خیالات کا اظہار کر سکتا ہے۔

جب السی بیاڈس یہ سب کچھ کہہ چکا تو کسی نے شاید کرائیٹیاس سے کہا۔

اے پروڈیکس اور ہپیاس صاف نظر آ رہا ہے کہ کالیکس حقیقت میں پروٹاغورس کی طرفداری پر مائل ہے۔ اسی طرح السی بیاڈس کے بیان سے صاف ظاہر ہے کہ وہ دوسری سمت یعنی سقراط کی حمایت پر کمر بستہ ہے۔ مگر میں آپ کو خبردار کرتا ہوں کہ ہمیں کسی کی طرفداری میں ملوث نہیں ہونا۔ نہ سقراط کی اور نہ ہی پروٹاغورس کی۔ البتہ ہم اس امر پر غیر جانبدارانہ طور پر مصر رہیں گے کہ بحث کو جاری رہنا چاہیے۔

پروڈیکس نے اس کے الفاظ کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا، میرے خیال میں کرائیٹیاس بالکل ٹھیک کہتا ہے۔ کیونکہ ایسی محفلوں کے آداب میں یہ بات سرفہرست ہے کہ سامعین کو مباحثے کے فریقین میں سے کسی کی حمایت یا مخالفت نہیں کرنی چاہیے بلکہ غیر جانبداری کا دامن نہیں چھوڑنا چاہیے۔ تاہم یاد رہے کہ غیر جانبداری کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ فریقین کو پہلے ہی برابر برابر قرار دے دیا جائے۔ مطلب یہ ہے کہ دونوں فریقوں کے دلائل غیر جانبداری سے سُنے جائیں مگر دونوں کو بغیر سوچے سمجھے برابر نہ قرار دے دیا جائے۔ بلکہ جو اپنے دلائل کے ذریعے سے زیادہ دانائی ثابت کرے اسے برتر سمجھا جائے اور اس کے برعکس کو کمتر قرار دیا جائے اور پروٹاغورس اور سقراط، میں اور کرائیٹیاس آپ سے بھی یہ درخواست کرتے ہیں کہ آپ ایک دوسرے کی باتوں کے خلاف دلائل ضرور دیں مگر الجھنے کی کوشش نہ کریں۔ کیونکہ دوست ہمیشہ ایک دوسرے کے ساتھ خوش دلی سے بحث کرتے ہیں جبکہ الجھنا اور جھگڑنا دشمنوں کا شیوہ ہوتا ہے۔ اسی طرح ہماری محفل خوشگوار رہ سکتی ہے۔ بلکہ آپ خود مقرر ہیں سامعین کی محبت اور احترام بھی حاصل کر پائیں گے جبکہ آپ کو معلوم ہے کہ محض تعریف کو احترام نہیں کہا جا سکتا کیونکہ سامعین کی طرف سے سنجیدہ توثیق احترام کہلاتی ہے۔ جبکہ تعریف محض ایک غیر سنجیدہ بیان ہے جس کا توثیق سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، (اور اگر آپ نے اس صورت حال کو ملحوظ رکھا) تو ہم سامعین محض خوش نہیں بلکہ مشکور ہوں گے اور آپ جانتے ہیں کہ شکر گزاری کا تعلق ذہن اور روح دونوں سے ہوتا ہے اور یہ کیفیت اس وقت پیدا ہوتی ہے جب ہم دانائی اور علم کی کوئی بات سُن پاتے ہیں اور خوشی کا تعلق جسمانی اور ظاہری کیفیت سے ہے جو اس صورت میں حاصل ہوتی ہے جب کہ جسمانی ضرورت (کھانے پینے

وغیرہ کی صورت میں) پوری ہو۔

جب اس نے یہ الفاظ کہے تو پروڈیکس اور بہت سے دوسرے سامعین نے اس کی بے حد تعریف کی۔ اس کے بعد ممتاز دانشور ہپیاس نے گفتگو کرتے ہوئے کہا:

آپ جتنے لوگ اس جگہ جمع ہیں سب کے سب فطرت کے حوالے سے ایک دوسرے کے رشتہ دار، دوست اور ہم وطن ہیں مگر محض قانونِ فطرت کے حوالے سے، کیونکہ یہ قانونِ فطرت ہے کہ "ہم جنس باہم جنس پرواز"۔ جبکہ قانون تو محض انسانی تخلیق ہے اور بعض اوقات ہم ایسا کچھ بھی قانون کے دباؤ سے کرنے پر مجبور ہوتے ہیں جو قانونِ فطرت کے خلاف ہوتا ہے۔ ذرا غور کیجیے اور دیکھیے کہ ہم جن اشیا کی حقیقت کو جاننے اور سمجھنے کا دعویٰ کرتے ہیں اور دنیا میں دانا ترین افراد شمار ہوتے ہیں اور اس شہر میں اکٹھے ہیں جسے "شہرِ دانش" کی حیثیت حاصل ہے اور جس گھر میں جمع ہیں وہ اس شہر کے معززین میں سے معزز ترین فرد کا گھر ہے۔ سو ہمیں ایسا کچھ نہیں کرنا چاہیے جو ان کے وقار کے منافی ہو کیونکہ ایسا کرنے سے معززین کی توہین ہوگی۔ چنانچہ لازم ہے ہم معقول انداز میں بحث کریں۔ گھٹیا درجے کے لوگوں کی طرح جھگڑنا ہمیں زیب نہیں دیتا۔ میں پروٹاغورس سے اور سقراط سے بھی درخواست کرتا اور نصیحت کرنا چاہتا ہوں کہ کسی نکتے پر اتفاق رائے کی طرف آئیں۔ ہم یہاں آپ دونوں کے مابین مبصر کی حیثیت سے موجود ہیں اور سقراط! آپ یہاں انتہائی اختصار پر زور نہ دیں اگر پروٹاغورس کو اعتراض ہو، بلکہ موضوع کو تقریر کی صورت میں پھیلنے دو۔ اس طرح تم بھی تو اپنی لفاظی سے فائدہ اُٹھا سکتے ہو اور پروٹاغورس! آپ بھی دریا کو کوزے میں بند کرنے کی بجائے کوزہ ہی دریا میں نہ پھینک دیں (کہ لوگ مفہوم تلاش ہی کرتے رہ جائیں) بلکہ آپ دونوں کو ایک حدِ اعتدال قائم کرنا چاہیے۔ اب میری نصیحت کے مطابق بحث کو آگے بڑھانا چاہیے بلکہ بہتر ہوگا کہ آپ کسی شخص کو جج یا منصف یا محفل کا صدر مقرر کرلیں تا کہ وہ آپ کی گفتگو پر نظر رکھے اور کمی یا بیشی کی صورت میں حکم جاری کرتا رہے۔

تمام حاضرینِ محفل نے اس تجویز کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور اتفاق رائے سے قبول کرلیا۔ سقراط نے کہا کہ وہ مجھے جانے نہ دے گا اور یہ بھی کہ میں کسی منصف کا نام تجویز کروں مگر میں نے کہا:

بحث کے لیے کسی منصف کا انتخاب مناسب نہیں معلوم ہوتا کیونکہ اگر منتخب شدہ آدمی بحث میں شریک فریقین سے کم مایہ ہوا تو یہ ضابطے کی خلاف ورزی ہوگی کہ کم مایہ فرد کو بلند پایہ افراد کی محفل کی

مدارت کا اختیار نہیں۔ اگر وہ فریقین کے ہم پلہ ہوا تو بھی اس سے کوئی فائدہ نہ ہوگا کیونکہ جو ہمارے مساوی ہے اس کی سوچ بھی ہماری ہی سوچ جیسی ہوگی۔ سو وہ فیصلے کے مقام پر نہ ہوگا۔ لہٰذا اس کے انتخاب کا فائدہ؟ اور اگر آپ کہیں کہ آیئے اپنے میں سے بہترین کا انتخاب کر لیں تو اس کے جواب میں، میں یہی کہوں گا کہ خود پروٹاغورس سے بہتر اور دانا تر فرد آپ کہاں سے لائیں گے اور اگر آپ کسی ایسے شخص کو لائیں جو بہتر نہ ہو مگر آپ محض ظاہر کریں کہ وہ بہتر ہے تو پھر اس کے اوپر بھی کسی کو متعین کرنا پڑے گا اور اس پہلے شخص کے کم مایہ ہونے کی صورت میں بہت بُرا تاثر قائم ہوگا اور میرے لیے تو یہ بُرا تاثر بہت ہی تکلیف دہ بات ہوگی۔ ایسی صورت میں مجھے کہنے دیجیے کہ بحث کو آپ کی پسند اور خواہشات کی حدود میں جاری رکھنے کے لیے میں کیا کروں گا۔ اگر پروٹاغورس کسی سوال کا جواب نہ دے پائیں یا نہ دینا چاہیں تو بتا دیں، میں اس کا جواب مہیا کروں گا اور اپنے جواب ہی کے ذریعے میں یہ ظاہر کرنے کی بھی کوشش کروں گا کہ مجھے ان سے جوابات کے کس انداز کی طلب ہے اور جب میں پروٹاغورس کی مرضی کے مطابق (جس قدر سوالات وہ چاہیں) جواب دے چکوں تو پھر سوال میں کروں گا اور پروٹاغورس ان کا جواب دیں اور پھر بھی اگر وہ اختصار کے ساتھ جواب نہ دے پائیں تو آپ اور میں مل کر ان کے انداز کی تصحیح کریں گے جیسے آپ نے میرے انداز کی تصحیح کی ہے تاکہ بحث کے ماحول میں کوئی ناپسندیدہ کیفیت نہ ہو اور ظاہر ہے اس کے لیے کسی خاص منصف کی ضرورت نہیں پڑے گی کیونکہ آپ سب اس مباحثے کے منصف ہوں گے۔

اس تجویز کو تقریباً متفقہ طور پر منظور کر لیا گیا اور پروٹاغورس، اگرچہ بادلِ نخواستہ، مگر بہر صورت سوالات پوچھنے پر راضی ہو گیا اس پر بھی کہ جب کافی تعداد میں سوال پوچھ چکے گا تو پھر میرے سوالات کے جوابات بھی وہ اسی اختصار سے دے گا جسے میں نے ملحوظ رکھا ہوگا۔ اس نے درج ذیل انداز میں سوالات کا آغاز کیا:

اس نے کہنا شروع کیا، سقراط، میری رائے یہ ہے کہ شاعرانہ صلاحیت تعلیم و تعلم میں کلیدی صلاحیت کی حیثیت رکھتی ہے اور اس سے مراد وہ صلاحیت یا استطاعت ہے جس کے ذریعے یہ معلوم کیا جا سکتا ہے کہ کس شاعر کی کون سی بات درست ہے اور کون سی غلط اور یہ کہ اس بنا پر مختلف شعرا میں امتیاز کیسے قائم کیا جا سکتا ہے اور اگر کوئی پوچھے تو ایسے امتیازات کا جواز بھی واضح کیا جا

سکے گا۔ میں یہ چاہوں گا کہ آپ اور میں جس سوال کو زیر بحث لا رہے تھے اسے شاعری کی اس صنف میں منتقل کر دیں۔ ہم پہلے کی طرح نیکی پر گفتگو کریں گے مگر دلائل شاعری کے اقتباسات میں سے دیں گے۔ چنانچہ سیمونائیڈس اپنی ایک نظم میں تھیسالی کے (Thessalian) کریون (Creon) کے بیٹے سکوپس (Scopas) سے مخاطب ہو کر کہتا ہے:

''انسان کو ایک طرف دو ہاتھوں، پاؤں، ذہن اور ایسی صلاحیتوں کے ساتھ حقیقی اچھا انسان بننے اور خامیوں سے پاک کارنامے سرانجام دینے کے لیے بڑے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں۔''

یہ نظم آپ کے علم میں ہے یا مجھے مکمل طور پر دہرانا پڑے گی؟

اس کی ضرورت نہیں۔ میں نے کہا۔ میں نے اس قصیدے کو نہ صرف پڑھا ہے بلکہ اس کے مندرجات اور مضمرات کا گہرا مطالعہ بھی کیا ہے۔

بہت خوب! تو کیا آپ سمجھتے ہیں کہ یہ قصیدہ نہ صرف اچھا لکھا گیا ہے بلکہ حقیقت بھی ہے؟

جی ہاں! میں نے کہا۔ اچھا بھی ہے اور مبنی بر حقیقت بھی۔ لیکن اگر اس میں تضاد پایا جائے تو پھر یہ اچھا اور حقیقی کیسے ہو سکتا ہے؟

ہاں! میں نے کہا۔ تضاد کی صورت میں تو ایسا کہنا غلط ہوگا۔

تو اس میں تضاد نہیں ہے؟ اس نے پوچھا۔ بے شک جائزہ لے لیجیے۔

ہاں، میرے دوست! میں خوب جائزہ لے چکا ہوں۔

تو کیا آگے بڑھتے ہوئے شاعر نے یہ نہیں کہا: میں پٹیکس (Pittacus) کے اس جملے سے متفق نہیں ہوں حالانکہ ایک بہت بڑے دانا کا قول ہے کہ انسان مشکل ہی سے اچھا ہو سکتا ہے اور یہاں آپ دیکھتے ہیں کہ وہی بات اس شاعر نے بھی کہی ہے۔

یہ تو میرے علم میں ہے۔

اس نے کہا، اور گویا آپ سمجھتے ہیں۔ کہ دونوں باتیں ایک دوسرے کی تائید کرتی ہیں؟

جی ہاں۔ میں نے اطمینان سے کہا۔ میرا تو یہی خیال ہے (اگرچہ میرے ذہن میں ایک تشویش سی تھی کہ نجانے پروٹاغورس کے ذہن میں کون سا تضاد ہے؟) کیا آپ کا خیال اس کے برعکس ہے؟

کیسے؟ اس نے کہا۔ دونوں باتیں کیسے مترادف ہو سکتی ہیں؟ ایک طرف تو وہ کہتا ہے کہ انسان کو

فی الحقیقت اچھا انسان بننے کے لیے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں اور آگے جا کر وہ پٹیکس کے اس جملے کو تنقید کا نشانہ بناتا ہے کہ 'انسان شاذ و نادر ہی اچھا ہوتا ہے' جو اس کے اپنے کلام کے مترادف ہے اور جب وہ کسی ایسے شخص پر الزام لگاتا ہے، جس نے اس کے کلام کے مترادف کوئی بات کی ہے تو گویا وہ خود کو موردِ الزام ٹھہراتا ہے تو یہ طے ہے کہ یا تو اس کا پہلا بیان غلط ہے یا دوسرا۔

حاضرین میں سے بہت سے لوگوں نے پروٹاغورس کے اس اعتراض پر تالیاں بجا کر اس کی تعریف کی۔ پہلے تو میرا سر چکرایا جیسے میں بے ہوش ہوئے جا رہا ہوں اور جب میں نے اس کے الفاظ اور ان کے ردعمل کے طور پر لوگوں کی واہ واہ اور تالیوں کی گونج سُنی تو مجھے لگا جیسے کسی ماہر باکسر نے میرے جبڑے پر کامیاب مکا جڑا ہے۔ مگر اس کے الفاظ اور اس کے شاندار ردعمل کے وقفے کے دوران ہی میں نے ایک بار پھر غور کیا کہ شاعر ان دونوں جملوں کے ذریعے حقیقت میں کہنا کیا چاہتا ہے؟ لہٰذا اسے ہی اس کی مدد کو آنا چاہیے۔ میں نے اسے کہا، میں آپ سے اپیل کرتا ہوں یوں جیسے (ہومر کے کلام کی روشنی میں) اکیلس (Achilles) نے سکیمنڈر (Scamander) کا محاصرہ کر لیا تو اس نے سمویس (Simois) کو مدد کے لیے یوں پکارا:

''عزیز بھائی! آؤ ہم مل کر اپنے ہیرو کی قوت میں اضافہ کریں۔''

سو میں آپ کو پکارتا ہوں کیونکہ مجھے خطرہ ہے کہ پروٹاغورس سیمونائیڈس کا کام تمام کر ڈالنے پر تلا ہوا ہے۔ آپ چونکہ مترادفات پر سند کی حیثیت رکھتے ہیں، آپ ارادے اور خواہش کے فرق کو واضح کیجیے۔ اس کے علاوہ کچھ دوسری خوبیاں بھی جن سے متعلق آپ نے ابھی اپنی انفرادیت ثابت کی ہے تو میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ کیا آپ اس سے متفق ہیں کیونکہ میری رائے میں سیمونائیڈس کے الفاظ میں کوئی تضاد نہیں اور پروڈیکس سب سے پہلے تو میں آپ سے اس بات پر رائے چاہتا ہوں کہ ہونے اور بننے میں فرق ہے یا نہیں۔

بالکل فرق ہے۔ پروڈیکس کا جواب تھا۔

کیا سیمونائیڈس نے سب سے پہلے اپنے نقطۂ نظر کو بیان کرتے ہوئے یہ نہیں کہا کہ اچھا انسان بننے میں سخت محنت لگتی ہے۔

بالکل یہی بات ہے۔ پروڈیکس نے جواب دیا۔

اور اگلے جملے میں اس نے پٹیکس (Pittacus) سے اس طرح اختلاف نہیں کیا جیسے پروٹاغورس کا

بیان ہے بلکہ اپنے بیان سے مختلف بات کہنے کی وجہ سے اختلاف کیا ہے۔ کیونکہ پٹیکس اور سیمونائیڈس کے جملوں میں واضح فرق ہے۔ یہ سچ ہے کہ مشکل ہی سے کوئی اچھا ہوتا ہے اور انسان مشکلات سے گزر کر اچھا بنتا ہے۔ یہ دو مختلف باتیں ہیں۔ میرے دوست پروڈیکس یقیناً اس کی تائید کریں گے کہ پروٹاغورس ہونے اور پروٹاغورس بننے میں زمین آسمان کا فرق ہے اور اگر ان دو کیفیتوں کو مختلف تسلیم کر لیا جائے تو یہ طے ہو جاتا ہے کہ سیمونائیڈس نے اپنے ہی الفاظ سے اختلاف نہیں کیا۔ مجھے کہنے دیجیے کہ پروٹاغورس اور بہت سے دوسرے بھی ہیز یوڈ کی ہاں میں ہاں ملائیں گے جس نے کہا ہے:

"ایک طرف تو یہ کہ اچھا انسان بننا آسان نہیں۔
کیونکہ دیوتاؤں نے نیکی کو محنت شاقہ کا ثمر قرار دیا ہے۔
مگر دوسری طرف جب آپ ایک اونچی جگہ پر پہنچ چکے ہوں۔
تب نیکی پر قائم رہنا مشکل ہو جاتا ہے جب کہ پستی کی طرف جانا آسان ہوتا ہے۔"

پروڈیکس نے میری بات سُن کر صاد کیا مگر پروٹاغورس بولا۔ "آپ کی تصحیح کی کوشش نے جملے میں موجود غلطی کے حجم کو بڑھا دیا ہے۔

افسوس! پروٹاغورس! اس کا مطلب ہے کہ میں وہ بدقسمت طبیب ہوں جو بیماری کے علاج کے ذریعے اُلٹا بیماری کی شدت کو بڑھا دیتا ہے۔

اس نے کہا۔ یہی حقیقت ہے۔

میں پوچھا۔ وہ کیسے؟

وہ یوں کہ شاعر یہ کہہ ہی نہیں سکتا کہ نیکی جس کا تمام لوگوں کی نظر میں حصول مشکل ہے اسے یوں آسانی سے قائم رکھا جا سکتا ہے۔

خوب! میں نے کہا۔ ہم خوش قسمت ہیں کہ ہمارے درمیان پروڈیکس موجود ہے جو کہ پروٹاغورس! میرے خیال میں نہ صرف یہاں موجود سب لوگوں سے زیادہ معمر ہے کہ بلکہ شاید وہ خود سیمونائیڈس کا ہم عمر بلکہ اس سے بھی بڑی عمر کا ہوگا۔ آپ اگرچہ بہت سے علوم کے حوالے سے پڑھے لکھے ہیں مگر لگتا ہے کہ اس مخصوص موضوع یعنی مترادفات میں مناسب فہم نہیں رکھتے۔ میں چونکہ پروڈیکس کا اس میدان میں شاگرد ہوں اس لیے میں جانتا ہوں۔ آپ شاید لفظ "سخت" کے

متعلق غلط فہمی کا شکار ہیں کہ اس سے کس مفہوم کی طرف سیمونائیڈس اشارہ کرتا ہے اور مجھے اجازت دیجیے کہ میں آپ کی اصلاح کروں جیسے پروڈیکس نے میری اصلاح کی ہے جب میں نے ''خوفناک'' کو تعریف کے معنوں میں استعمال کیا ہے۔ مثلاً اگر میں کہوں کہ پروٹاغورس (خوفناک حد تک) دانا ہے تو وہ مجھے کہتے ہیں کہ تمھیں شرم نہیں آتی کہ دانائی جیسی شے کو ''خوفناک'' بتاتے ہو اور تب وہ (پروڈیکس) مجھے سمجھاتے ہیں کہ خوفناک ہمیشہ منفی مفہوم میں استعمال ہوتا ہے اور کوئی نہیں چاہتا کہ اسے خوفناک حد تک صحتمند یا دولت مند کہا جائے، البتہ خوفناک بیماری یا خوفناک جنگ یا خوفناک بُرائی کی تراکیب موزوں ہیں کیونکہ خوفنا کی بہر طور پر ایک منفی کیفیت ہے۔ لہٰذا ہم یہ سمجھنے میں حق بجانب ہیں کہ سیمونائیڈس اور سیان (Cean) کے دوسرے لوگ سخت کو بُرے معنوں میں یا کم از کم ناقابلِ فہم کے معنی میں استعمال کرتے ہیں۔ یہ ہمیں پروڈیکس ہی سے پوچھنا چاہیے کیونکہ وہ ہمیں اپنے ہم وطن سیمونائیڈس کے لہجے کے بارے میں بہتر طور پر بتا سکیں گے۔ پروڈیکس! آپ ہی بتائیے زیر بحث شاعر سیمونائیڈس کے ہاں سخت کا اصل مفہوم کیا ہے؟

پروڈیکس نے جواب دیا، منفی معنوں میں استعمال کیا ہے۔

میں نے کہا، اور پروڈیکس! اس لیے یہ سمجھنا درست ہے کہ 'سختی اچھی ہے' کہنے کا مطلب ہے جیسے کوئی کہے کہ بُرائی ہی اچھائی ہے۔

جی ہاں! درحقیقت اس کا مقصد یہ ہی تھا۔ اس نے کہا، اور دراصل سیمونائیڈس کو وہ اس لیے موردِ الزام ٹھہراتا ہے کہ وہ بھی لیزبی باشندوں (Lesbian) کی طرح بربری زبان (گنواروں کی زبان) استعمال کر جاتا تھا اور یوں اصطلاحات کے صحیح المعانی استعمال میں ماہر نہ تھا۔

میں نے کہا۔ پروٹاغورس آپ نے سُنا کہ ہمارے دوست پروڈیکس کیا کہہ رہے ہیں۔ کیا آپ ان کے جواب میں کچھ کہنا چاہیں گے؟

پروٹاغورس نے پروڈیکس کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ آپ سخت غلطی پر ہیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ سیمونائیڈس کے ''سخت'' کا لفظ بُرائی کے معنی میں نہیں بلکہ ایسی شے کے مترادف کے طور پر استعمال کیا ہے جو آسان نہ ہو یا جسے سمجھنے میں دقت ہو۔ مجھے اس سلسلے میں یقین ہے۔

میں نے کہا۔ میں بھی یہی کہنا چاہتا ہوں کہ ''سخت'' کا مطلب وہی ہے جو آپ سمجھتے ہیں۔

پروڈیکس اصل میں مذاق کر رہے تھے۔ وہ دیکھنا چاہتے تھے کہ آپ اپنے مؤقف پر قائم رہتے ہیں یا نہیں دراصل سیمونائیڈس ایسا (بُرائی کے مفہوم میں) کہہ ہی نہیں سکتا تھا کیونکہ اسی نظم میں آگے چل کر وہ یہ بھی کہتا ہے کہ یہ عطا صرف خدا کی دسترس میں ہے، اور ظاہر ہے کہ وہ یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ 'اچھائی ہی بُرائی ہے'۔ کیونکہ وہ آگے چل کر کیسے کہہ دیتا ہے کہ 'یہ عطا صرف خدا کی دسترس میں ہے اور یہ کہ یہ اسی (خدا) کی خوبی ہے اور اس میں اور کوئی شریک نہیں۔ اگر سیمونائیڈس کے الفاظ کا یہی مفہوم ہوتا تو پروڈیکس اسے ایسے کردار کے طور پر متعارف کراتا جو اس خطے کے لوگوں کے لیے شایانِ شان اور قابلِ قبول نہ ہوتا اور میں آپ کو بتا دوں۔ میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا، کہ میرے نظریے کے مطابق سیمونائیڈس کی اس نظم کا اصل مفہوم کیا ہے کیونکہ شاعری اور سخن فہمی میں میری صلاحیت کے تعین کے لیے آپ نے یہی شرط رکھی تھی اور اگر آپ خود روشنی ڈالنا چاہیں تو مجھے آپ ہمہ تن گوش پائیں گے۔

پروٹاغورس نے اس تجویز کے جواب میں کہا: جیسے تمھاری مرضی! اور ہپیاس، پروڈیکس اور بہت سے دوسروں نے بھی میری تجویز کو مناسب قرار دیا۔

سو اب میں سیمونائیڈس کی اس نظم کا اصل مفہوم واضح کرنے کی کوشش کروں گا۔ میں نے کہا۔ ایک قدیم فلسفہ ہے جو ہیلاز (Hellas) کے دیگر علاقوں کے مقابلے میں کریٹ (Crete) اور لیسی ڈیمون (Lacedaemon) میں زیادہ مروج ہے اور اس فلسفے کو ماننے والے فلاسفہ بھی ان خطوں سے زیادہ اور کہیں نہیں۔ بہرصورت یہ ایک راز ہے جسے لیسی ڈیمون کے لوگ چھپانا پسند کرتے ہیں۔ وہ ظاہر نہیں کرنا چاہتے کہ وہ جنگی مہارت اور ساز و سامان کی بجائے محض دانائی کی مدد سے دنیا پر حکمرانی کر رہے ہیں۔ وہ سوفسطائی جن کا ذکر پروٹاغورس نے کیا ہے، بھی اسی خیال کے حامل ہیں۔ دراصل ان کا خیال ہے کہ ان کی حکومت کا اصل راز ان کے محکوموں کو معلوم ہو گیا تو ان پر ان کی گرفت قائم نہ رہ سکے گی۔ کیونکہ اس طرح ہر کوئی ان کی عقل و خرد کو استعمال کر کے ان کے مقابلے میں آ جائے گا۔ البتہ ان کا یہ راز ان دیگر شہری ریاستوں میں فاش نہیں ہوا جو لیسی ڈیمون کے لوگوں کی ظاہرداری کی نقل کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے ہتھیاروں کی ترقی پر زور دیتے ہیں، جنگی مشقیں جاری رکھتے ہیں اور فوجی کارروائیوں میں مددگار مختصر لباس پہنتے ہیں کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ ان ہی خصائص نے لیسی ڈیمون کے لوگوں کو دیگر ہیلینا والوں (Hellenes)

(یونانیوں) پر حکمرانی کا موقع عطا کیا ہے۔ اب جبکہ لیسی ڈیمون کے لوگ گھماؤ پھراؤ کی بجائے، اپنے ملک کے داناؤں کے ساتھ آزادانہ بحث و تمحیص چاہتے ہیں اور محض راز داری کو کامیابی کے لیے کافی نہیں سمجھتے، تو اپنے فلسفے کو ترقی پسندانہ شکل دینے کی ضرورت محسوس کرتے ہیں جو اجنبیوں کے علم میں نہ آئے تو وہ کریٹ کے لوگوں کی طرح اپنے نوجوانوں کو اپنے ملک سے باہر جانے کی اجازت نہیں دیتے مبادا انھیں جو سبق جدید فلسفے کے مطابق دیا گیا ہے اسے وہ بھول نہ جائیں اور حال یہ ہے کہ لیسی ڈیمون اور کریٹ میں نہ صرف مرد بلکہ عورتیں بھی اس فلسفے سے اپنی بلند پایہ کارکردگی میں فخر محسوس کرتی ہیں اور آپ کو اسی سے جان لینا چاہیے کہ میں لیسی ڈیمون کے لوگوں کو فلسفے اور قیافہ شناسی میں بے پناہ خوبیوں کا مالک قرار دیتا ہوں حد تو یہ ہے کہ اگر کوئی شخص کسی معمولی لیسی ڈیمون کے فرد سے بحث کرنا چاہے تو اسے ایسے محسوس ہوگا کہ بظاہر یہ معمولی سا شخص بحث کے دوران ایسے ایسے نکتے نکال لاتا ہے جو بڑے پُر مغز اور معنی خیز ہوتے ہیں اور غلطی کا امکان مفقود نظر آنے لگتا ہے اور اس سے گفتگو کرنے والا شخص بچے کی طرح اس کے اشاروں پر ناچتا محسوس کرتا ہے اور ہمارے عہد کے بلکہ اس سے پہلے کے زمانوں کے لوگوں نے بھی اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے کہ لیسی ڈیمون کے لوگ جمناسٹکس سے بھی زیادہ فلسفے سے اپنی محبت کا اظہار کرتے ہیں۔ انھیں شدت سے احساس ہے کہ معقول حد تک پڑھا لکھا شخص ہی ایسی باتیں منہ سے نکال سکتا ہے ایسے لوگوں میں ملیٹس (Miletus) کا تھیلس (Thales)، میٹائیلین (Mitylene) کا پٹیکس اور پرین (Priene) کے بیاس (Bias) .... اور خود ہمارے اپنے سولون (Solon) اور لنڈی کا کلوبولس (Cleobulus the Lindian) اور چینی کا مائی سن (Mysan the Chenian) بھی شامل ہیں اور عاقل لوگوں کی فہرست میں ساتواں نام لیسی ڈیمون کے چائیلو (Chilo) کا ہے۔ یہ تمام لوگ لیسی ڈیمون تہذیب کے چاہنے والے، حریف اور پیروکار تھے اور کوئی بھی سمجھ سکتا ہے کہ ان کی دانائی ان کے ہمیشہ یاد رہنے والے خوبصورت مگر مختصر جملوں کی صورت میں ہوتی تھی جو ان کے منہ سے پھولوں کی طرح جھڑتے تھے۔ ان کے یہ شاہکار جملے ڈیلفی (Delphi) میں اپالو کے مقبرے پر کندہ ہیں جن کی شہرت دور دور تک پھیل چکی ہے اور وہ آج ہر کسی کی زبان پر ہیں، مثلاً ''خود اپنے آپ کو پہچانو۔'' یا ''کچھ بھی ہو حد سے زیادہ نہ ہو،'' وغیرہ۔ میں یہ سب کچھ اس لیے کہہ رہا ہوں کہ لیسی ڈیمون کے لوگوں کا یہ اندازِ اختصار ہی دراصل قدیم

فلسفے کا حسن تھا۔ اسی ضمن میں پٹیکس کا ایک مقولہ تھا جو دانا لوگوں میں بے حد مقبول ہوا اور وہ یہی جملہ تھا "Hard is to be good" یعنی ''اچھا ہونا سخت مشکل ہے'' اور سیمونائیڈس جو دانا شخص کی حیثیت سے شہرت حاصل کرنے کی دیوانگی میں مبتلا تھا اس حقیقت سے اچھی طرح واقف تھا کہ وہ اس مشہور جملے کا جادو زائل کر سکے گا اور جس طرح اس نے اتھلیٹکس میں بے شمار لوگوں کو شکست دی تھی، وہ اس علمی میدان میں بھی سر بلند ہونا چاہتا تھا اور اگر میں غلطی پر نہیں تو اس کی اس پوری نظم کے پیچھے لیسی ڈیمون کے لوگوں کی جادو کو زائل کرنے کی خواہش چھپی تھی۔

لہٰذا ہمیں مل کر اس کے الفاظ کا جائزہ لینا اور تجزیہ کرنا چاہیے اور اس طرح یہ پرکھنا چاہیے کہ جو کچھ میں عرض کر رہا ہوں وہ کہاں تک درست ہے۔ سیمونائیڈس بھی ایک لحاظ سے دیوانہ ہی تھا جیسا کہ اس نے نظم کے آغاز ہی میں جہاں نیک بننا مشکل کام ہے کہنا چاہا ہے تو لفظ سخت یعنی "On one hand" کہا ہے۔ ایک طرف تو اچھا انسان بننا اچھا خاصا مشکل کام ہے، لہٰذا لفظ سخت کے استعمال کا کوئی جواز ہی نہیں بنتا جب تک اس کا رویہ پٹیکس کے الفاظ سے متعلق کسی قدر معاندانہ ہو۔ پٹیکس کہتا ہے کہ 'اچھا ہونا مشکل امر ہے۔' اور وہ اس کو رد کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اصل مشکل شے خود پٹیکس ہے جس کا اچھا ہونا مشکل ہے۔ وہ نیکی کو اچھائی کے ساتھ نہیں بلکہ ''سخت'' کے ساتھ منسلک کرتا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ جو بھی مشکل کام ہوگا لازماً اچھا ہوگا، اگر چہ کچھ اچھے لوگ تھے جو فی الحقیقت اچھے تھے تو کچھ ایسے بھی ہو سکتے ہیں جو اچھے تھے مگر فی الحقیقت اچھے نہ تھے۔ (یہ بڑا سادہ مشاہدہ ہے اور بہر صورت سیمونائیڈس کے شایانِ شان نہیں ہے۔) آپ بہر حال یہی سمجھیں کہ اس نے لفظ "Truely" کو پٹیکس کے مفہوم کے برعکس استعمال کیا ہے (ہم فرض کیے لیتے ہیں کہ سیمونائیڈس گویا پٹیکس کے سوالات کے جوابات فراہم کر رہا ہے۔) پٹیکس جیسے سیمونائیڈس سے مخاطب ہو کر کہتا ہے۔

اے دوست: اچھا ہونا سخت مشکل ہے اور سیمونائیڈس جواب دیتا ہے۔ پٹیکس آپ اس سلسلے میں غلطی پر ہیں۔ مشکل اچھا ہونے میں نہیں ہے بلکہ ایک طرف (Foure Squares in hand)، پاؤں اور دماغ رکھتے ہوئے اچھا ہونا اور وہ بھی بغیر کسی خامی کے، یہ اصل مشکل ہے۔ اس اقتباس کو اس طرح پڑھنے سے، ایک طرف تو مفہوم کے حوالے سے لفظ کی معنویت کا اضافہ ہوا اور دوسرے اس فقرے کے اختتام پر ''حقیقی طور پر'' (Truely) لانے سے جملے کی ساخت فطری انداز اختیار کر

لیتی ہے اور آنے والے حصہ نظم کی روشنی میں یہ اس کا صحیح مفہوم بھی ہے۔ نظم کی تشریح کے ضمن میں بے شمار وضاحتیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ بلکہ یہ مہارت کا عمدہ نمونہ ہے اور خوبصورت انداز میں اسے مکمل کیا گیا ہے مگر یہ باریکیاں عام لوگوں کے لیے آسان فہم نہیں ہوں گی۔ تاہم میں نظم کا عمومی مرکزی خیال بیان کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ البتہ یہ ضرور کہوں گا کہ نظم کے جس حصے کو بھی لیں اس کا پیغام بہرحال پیکس کے قول کے برعکس ثابت ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ جس طرح اظہارِ خیال کرتا ہے اس کے مطابق نظم میں آگے چل کر ایسا لگتا ہے گویا وہ یہ کہنا چاہتا ہے کہ اگرچہ اچھا بننے میں دقت اور مشکل ضرور ہے مگر ایک بار اور محض ایک بار ایسا ہونا ضرور ممکن ہے۔ ایک بار اچھا بن کے اس حالت پر قائم رہنا یا، جیسا کہ پیکس آپ نے تائید کی ہے، اچھا ہونا ممکن نہیں ہے بلکہ انسان کو اس کی صلاحیت عطا ہی نہیں ہوئی۔ خدا نے البتہ یہ عنایت انسان پر کی ہے جب حالات انسان کو گھیر لیتے ہیں تو اس کے پاس بُرا بننے کے سوا چارہ نہیں ہوتا۔ اب بتائیے کہ معاملے کے اختتام پر کس کو مجبوری گھیر سکتی ہے۔ انفرادی حیثیت سے متعلق یہ جملہ نہیں کہا گیا کیونکہ انفرادی حالت میں تو انسان ہے ہی مجبورِ محض اور جو کوئی پہلے ہی (حالات کے) رحم و کرم پر ہو اس پر مزید زوال کہاں سے آئے گا۔ اسی کو گرایا جائے گا ناں جو پہلے کھڑا ہو۔ گرے کو گرانے کی بات بڑی غیر فطری لگتی ہے۔ سو حالات کی ستم ظریفی کا اثر اسی پر ہو گا جس کو کسی نہ کسی زمانے میں اقتدار اور قوت حاصل رہی ہو، ورنہ جو سدا سے بے یار و مددگار رہا ہو اس کے لیے زوال گویا بے معنی لفظ ہو گا۔ کوئی بھی طوفان (طوفانِ نوح) ناخدا کی پریشانی کا سبب بن سکتا ہے یا موسم کی غیر متوقع تبدیلی سے کسان کو فکر لاحق ہو سکتی ہے کیونکہ جو اچھا ہے اسی کے بُرے ہونے کی بات کی جا سکتی ہے (جو بُرا ہی ہو اس کے بُرا بن جانے کی بات غیر فطری ہو گی) اسی موضوع کو ایک اور شاعر نے کچھ اس طرح بیان کیا ہے:

"اچھی چیزیں کبھی اچھی اور کبھی بُری ہوتی ہیں۔"

البتہ بُرے کے بُرا بننے کی بات عبث ہے کیونکہ وہ سدا ہی بُرا ہوتا ہے کیونکہ جب حالات انسان کو خصوصاً صاحب وسائل، اہلِ ہنر اور ایک انسان کو اپنی گرفت میں لیتے ہیں تو اُسے بُرا بننے پر مجبور ہونا پڑتا ہے اور پیکس آپ جو کہتے ہیں کہ اچھا ہونا مشکل ہے۔ حالانکہ دقت اچھا ہونے میں نہیں بلکہ اچھا بننے میں ہے۔ پھر بھی اچھا بننا ممکن تو ہے جبکہ ازلی طور پر اچھا ہونا تو قطعی ناممکن ہے جیسے:

"کیونکہ وہ جو اچھے کام کرتا ہے، اچھا کہلاتا ہے اور جو بُرے کام کرے بُرا ہی کہلائے گا۔"

البتہ یہ طے کرنا ضروری ہے کہ کس طرح کے کام کو آپ اصل مفہوم میں اچھا کہیں گے؟ اور کس طرح کا کام انسان سرانجام دے تو خود بخود اچھا سمجھا جائے گا؟ ظاہر ہے کہ اچھائی کو مکمل طور پر جاننے سے ہی ایسا ممکن ہوگا، مثلاً بیمار کے علاج کی نوعیت کو سمجھنا ہی انسان کو اچھا طبیب بناسکتا ہے مگر وہ جو بُرا کرتا ہے بُرا کہلاتا ہے، تو بُرا طبیب کون کہلائے گا؟ وہی جو پہلے تو طبیب ہو اور دوسرے اچھا طبیب ہو کیونکہ اچھا نہیں ہوگا تو اس پر اچھے سے بُرا بننے کا مرحلہ کیسے آئے گا؟ مگر ہم جیسے نااہل افراد بڑھئی یا ایسے دوسرے کام کرنے والے افراد تو بن سکتے ہیں مگر طبیب نہیں بن سکتے جبکہ ہم بُرائی میں بھی ملوث رہیں۔ اسی طرح کوئی بھی اچھا آدمی وقت کے اثر سے، تھکاوٹ کے باعث یا کسی بھی دوسرے منفی اتفاق سے اچھائی کے درجے سے بتدریج گر سکتا ہے (خالص بُرائی علم سے محروم ہونے کی صورت میں ہی ممکن ہے۔) مگر بُرا آدمی کبھی بُرا نہیں بنے گا کیونکہ وہ پہلے ہی بُرا ہے اور اگر اس کے بُرا بننے کی بات لازم ہے تو یہ بھی لازم ہے کہ وہ کبھی نہ کبھی اچھا رہا ہو۔ چنانچہ نظم کے الفاظ ایک تو یہ ظاہر کرتے ہیں کہ انسان کے لیے ہمیشہ اچھا رہنا مشکل ہے اور دوسرے یہ کہ اس کے اچھے بننے کے ساتھ ساتھ بُرا بننے کے امکانات بھی ہمیشہ موجود رہتے ہیں۔

علاوہ ازیں:

"وہی لوگ طویل زمانوں تک اچھے رہ سکتے ہیں جنھیں دیوتاؤں کی محبت میسر ہو۔"

یہ سب کچھ سیمونائیڈس کے خیالات سے متعلق ہے جو اس کے آئندہ الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے کیونکہ آگے چل کر وہ کہتا ہے:

"سو میں اپنی زندگی کو ناممکن الحصول اشیا کی تگ و دو میں کیوں ضائع کروں۔ یہ ایک ایسی انہونی توقع ہوگی کہ ہم زمین کا سینہ چیر کر ثمرِ حیات حاصل کرنے والے انسانوں سے خطاؤں سے مبرا ہونے کی توقع کریں۔
اگر میں ایسے کسی شخص کو ڈھونڈ پایا تو آپ کو بھی ضرور مطلع کروں گا۔"

(اس طرح وہ پوری نظم میں پٹیکس کے خیالات پر حملے کرتا ہوا محسوس ہوتا ہے)

''مگر وہ جو خطا سے دانستہ بچا رہے میری بے لوث محبت اور تعریف کا مستحق ٹھہرتا ہے۔ ضرورت کے بغیر تو دیوتا بھی جنگ پر آمادہ نہیں ہوتے۔''

یہ الفاظ بھی خیالات کے ایسے ہی موڑ کو ظاہر کرتے ہیں کیونکہ سیمونائیڈس اس قدر احمق نہ تھا کہ ان لوگوں کی تعریف میں رطب اللسان ہو جو دانستہ تگ و دو کے باعث بُرائی سے بچے رہے، حالانکہ اس کے علم میں تھا کہ بہت سے لوگ ایسے ہیں جنھوں نے جان بوجھ کر بُرائی کی ہوگی۔ کیونکہ کوئی بھی ذی شعور اس پر یقین نہیں کر سکتا اور اسے جائز قرار نہیں دے سکتا کہ لوگ اپنے اختیار میں ہوتے ہوئے بُرائی کریں یا غلطی کا ارتکاب کریں یا کوئی ایسا کام کریں جو ان کی عزت و وقار کو بٹا لگا سکتا ہو۔ کیونکہ انھیں پتا ہے کہ انسان ہمیشہ غلطی اور خلاف وقار کام ہمیشہ نادانستہ کرتا ہے اور اسی لیے سیمونائیڈس یہ کبھی نہیں کہتا کہ وہ ایسے شخص سے پیار کرتا ہے اور اس کی تعریف کرتا ہے جو رضا کارانہ بُرائی سے بچتا رہے (لفظ رضا کارانہ خصوصاً توجہ طلب ہے) کیونکہ اس کی رائے میں کہ اچھے لوگ اکثر خود کو مجبور کر کے دوسرے انسانوں سے محبت کرتے ہیں اور ان کی تعریف کرتے ہیں، ان سے دوستی کا دم بھرتے ہیں اور ان کے خیالات کی تائید کرتے ہیں۔ البتہ بعض اوقات انسان نادانستہ محبت کا ارتکاز بھی کرتا ہے جیسے وہ والدین، وطن اور ایسی دیگر اشیا سے کرتا ہے تو بُرے لوگ جب اپنے والدین یا ملک میں کوئی نقص دیکھتے ہیں تو ان میں بھی کیڑے نکالنے لگتے ہیں۔ وہ ان کے نقص کو اپنی ذات تک بھی نہیں رکھتے بلکہ انھیں دوسروں تک پہنچاتے ہیں یعنی مشتہر کرتے ہیں اور وہ ایسا محض اس خوف سے کرتے ہیں کہ لوگ انھیں بھی اسی وجہ سے موردِ الزام نہ ٹھہرا دیں اور لوگ بھی یہی کرتے ہیں کہ وہ ان پر لگائے گئے الزامات کو اور بھی بڑھا چڑھا کر بیان کرتے ہیں تا کہ ان کی شہرت کو جس قدر نقصان پہنچا سکتے ہیں پہنچا ڈالیں مگر اچھے لوگ ایسا نہیں کرتے۔ وہ خود کو ان کی تعریف تک ہی محدود رکھتے ہیں۔ کیونکہ انھیں اپنے محسوسات کے اظہار پر قابو حاصل ہوتا ہے۔ تاہم اگر لوگ ان کو ناراض بھی کر دیں تو بھی خود پر قابو پا کر اپنی نسل کے انسانوں کی تعریف ہی پر خود کو اکساتے رہتے ہیں خود سیمونائیڈس بھی شاید یہ احساس رکھتا ہے کہ اسے اکثر اپنی مرضی کے خلاف دوسروں کی خامیوں کو چھپانے اور خوبیوں کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنے پر مجبور ہونا پڑتا ہے اور وہ پٹیکس سے بھی یہی کہنا چاہتا ہے۔ وہ اسے الزام نہیں دیتا کیونکہ وہ تو خود بھی الزامات سے ماورا نہیں ہے:

''کیونکہ میں مطمئن ہوں (وہ کہتا ہے) اس وقت تک، جب تک انسان
بُرائی اور حماقت سے محفوظ ہے، اور جب تک عدل اس کے علم کا حصہ ہے
(کہ عدل ہی ریاست کی بقا کی ضمانت ہے) اور اسے معقول ذہن عطا ہوا
ہے۔ اس وقت تک میں اس میں کوئی خرابی، کوئی کوتاہی نہیں پاتا کیونکہ
لوگوں کی خطاؤں کا سراغ لگانا میرے فرائض میں نہیں اور یوں بھی
حماقتوں کی انتہا نہیں اور احمق ان گنت ہیں۔''

اس اقتباس میں وہ کہتا ہے کہ اگر اسے لوگوں کو الزامات کا نشانہ بنا کر لطف حاصل ہوتا تو بے شمار
الزامات کے مواقع دستیاب تھے۔

''ہر وہ شے اچھی ہے، بُرائی جس کے ساتھ منسلک نہیں ہو سکی۔''

اس سے اس کی مراد یہ ہرگز نہیں کہ دنیا میں کوئی اچھائی ایسی نہیں جس میں بُرائی کی ملاوٹ نہیں
کیونکہ یہ تو وہی بات ہوئی کہ دنیا میں ایسی کوئی سفیدی نہیں جس میں سیاہی کی ملاوٹ نہ ہو اور ظاہر
ہے کہ یہ احمقانہ جملہ ہوگا۔ دراصل وہ یہ کہنا چاہتا ہے کہ دنیا میں اچھائی یا بُرائی کے درمیان بھی کچھ
اشیا ہیں جن میں خالصتاً بُرا نہ ہونے کے باوجود کوئی خرابی نہیں اور وہ ان کے وجود کو تسلیم کرتا ہے۔
وہ کہتا ہے:

''زمین کے وسیع سینے پر بیج بو کر پھل حاصل کرنے والوں میں مجھے مکمل
طور پر ماورائے الزام کوئی شخص نظر نہیں آتا۔ (اگر کوئی مجھے ملا تو آپ کو
مطلع کروں گا) یوں گویا میں تعریف نہیں کرتا مگر ایسے شخص کی جو اعتدال
کی حدود کے اندر زندگی گزارتا ہو۔ بس اگر وہ بُرائی سے دور ہے تو میرے
لیے اچھا ہے۔ خصوصاً وہ شخص جو محبت کرے اور دوسروں کی خوبیوں کا
اعتراف کر سکے۔''

یہاں غور کیجیے اس نے ایک لیزبی (Lesbian) لفظ ''منظور'' (approve) استعمال کیا ہے کیونکہ
اسے معلوم ہے کہ وہ پٹیکس سے مخاطب ہے۔

''جو دانستہ دوسروں کے اوصاف کا اعتراف کرے اور بُرائی سے بچا
رہے۔''

یہاں لازم ہے کہ لفظ ''رضا کارانہ'' کے بعد فل سٹاپ (Full Stop) لگایا جائے۔ مگر کچھ ایسے بھی ہیں کہ جن سے میں بے ساختہ محبت کرتا ہوں اور ان کی تعریف کا خوگر ہوں اور پیکس میں نے آپ پر بھی الزام نہ دھرا ہوتا بشرطیکہ آپ نے معتدل اچھائی اور صداقت کی بات کی ہوتی۔ مگر اب میں آپ کو مورد الزام ٹھہراتا ہوں کیونکہ آپ سچائی اور حقیقت کو محض ظاہر میں دیکھ کر غلط باتوں میں اُلجھ گئے ہیں اور اسی انداز میں اعلیٰ ترین موضوعات کو بھی زیر بحث لانے لگے ہیں۔ اس لیے پروڈیکس اور پروٹاغورس! میں نے کہا، یہ ہے وہ سب کچھ جو سیمونائیڈس کی اس نظم سے میں اخذ کر پایا ہوں۔

ہپیاس بولا، سقراط! میرے خیال میں تم نے نظم کی بہترین تشریح پیش کی ہے مگر میں نے بھی اس نظم سے اپنے انداز میں مفہوم اخذ کیا ہے اور اگر آپ اجازت دیں تو میں پیش کر سکتا ہوں۔

نہیں ہپیاس، ابھی نہیں، السی بیاڈس نے فوراً مداخلت کرتے ہوئے کہا، پھر کسی وقت پر اُٹھا رکھیے: اس وقت ہم اس معاہدے کی پاسداری کریں گے جو سقراط اور پروٹاغورس کے مابین طے پایا ہے۔ یہاں تک کہ جب تک پروٹاغورس سوالات کرتا جائے سقراط ان کے جواب دے اور اگر پروٹاغورس جواب دینے کا فریضہ سنبھالے تو سوال سقراط کرے۔

میں نے کہا۔ میری بھی خواہش ہے کہ پروٹاغورس اپنی مرضی اور پسند سے سوال پوچھنے یا جواب دینے میں سے جس کا چاہے انتخاب کرے لیکن اگر وہ محسوس نہ کرے تو میں نظموں اور غزلوں پر بات کرلوں اور پروٹاغورس اس سوال کی طرف واپس آجائیے جو میں اس سے قبل آپ سے پوچھ رہا تھا۔ میں دراصل آپ کی مدد سے اس موضوع کو منطقی انجام تک پہنچانا چاہتا ہوں۔ دراصل شعرا کے متعلق گفتگو میرے نزدیک کسی عوامی جگہ پر ہونے والے کھیل تماشے کی طرح پُر لطف ہوتی ہے۔ اگرچہ وہاں عام افراد کی پہنچ بھی ہوتی ہے جو اپنی کم علمی کی وجہ سے بحث وتمحیص کے ذریعے ایک دوسرے کے مافی الضمیر سے آگاہی کی صورت میں لطف اندوز تو ہو نہیں سکتے خصوصاً جب وہ شراب بھی پی رہے ہوں سو وہ بانسری نواز لڑکیوں کے معاوضے میں اضافے کا سبب بنتے ہیں یعنی انھیں بار بار کرایہ پر لینے سے ان کی بازاری قیمت بڑھتی ہے۔ وہ اسی طرح ایک دوسرے کے وجود سے لطف حاصل کرنے کے اس ذریعے کی منہ مانگی قیمت دینے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ مگر جہاں (آپ لوگوں جیسے) شرفا اور پڑھے لکھے لوگ موجود ہوں وہاں بانسری بجانے والی لڑکیوں، ناچنے

والی لڑکیوں اور بربط بجانے والی لڑکیوں کی ضرورت نہیں پڑتی، وہ لوگ ایسی فضولیات اور کھیلوں سے لطف اندوز ہونے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ انھیں باہمی بحث وتمحیص میں زیادہ دلچسپی ہوتی ہے۔ ان کے لیے لطف کے حصول کا ذریعہ ان کی اپنی آوازیں ہی ہوتی ہیں اور وہ لوگ بحث بھی سلیقے اور نظم وضبط سے کرتے ہیں اور اگرچہ شراب پینے پلانے میں انھیں بھی مکمل آزادی ہوتی ہے مگر وہ اس قدر ہوش میں رہتے ہیں کہ انھیں اس امر کا احساس تک رہتا ہے کہ انھیں دوسرے کی بات کو سننا ہے اور اپنی باری پر بات بھی کرنی ہے اور جیسا مجمع یہاں موجود ہے اور جیسے لوگ ہم ایک دوسرے کو سمجھتے ہیں ہمیں اپنے مافی الضمیر کے اظہار کے لیے دوسروں کی آوازوں کی ضرورت نہیں خصوصاً شعرا کے کلام کی، کہ جس کے بارے میں تحقیق مشکل ہوتی ہے کہ مخصوص الفاظ کے ذریعے وہ جانے کیا کہنا چاہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب مختلف افراد کسی بھی شاعر کے مخصوص کلام کے اقتباس کا حوالہ دیتے ہیں تو ان سے اپنی اپنی پسند اور سمجھ بوجھ کے مطابق مفہوم اخذ کرتے ہیں۔ یوں زیرِ بحث نکتہ کبھی بھی واضح نہیں ہو پاتا (اور وجہ اختلاف موجود رہتی ہے) چنانچہ بحث کے شرکا کو بحث وہیں چھوڑ کر عمومی گفتگو کی طرف لوٹنا پڑتا ہے اور بحث میں نقطۂ نظر کے ثبوت کی ذمہ داری فریقِ مخالف پر ڈالنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ میں بھی ایک ایسا ہی نمونہ بحث متعارف کرانا چاہتا ہوں کہ ہم شعرا کے نقطۂ نظر کی طویل اور لاحاصل بحث میں پڑنے کی بجائے ایک دوسرے کی مہارت کو آزمائیں (خالص بحث اور منطق کے ذریعے اپنی ذہانتوں کا لوہا منوائیں) اور یوں بحث کو منطقی نتیجے تک پہنچانے کی کوشش کریں۔ اگر آپ سوال پوچھنے کے موڈ میں ہوں تو میں جواب دینے کو تیار ہوں اور اگر آپ چاہیں تو میرے سوالات کا جواب دیں اور مجھے موقع دیں تو میں نامکمل بحث کو مکمل کر سکوں۔

میں نے یہ اور کچھ مزید دلائل دیئے۔ مگر پروٹاغورس نے خاص طور پر کچھ قابلِ ذکر گفتگو نہ کی جس کی اس سے توقع تھی۔ ایسے میں السی بیاڈس، کالیئس کی طرف متوجہ ہو کر بولا۔

کالیئس! کیا آپ سمجھتے ہیں کہ پروٹاغورس کا یہ رویہ جائز ہے کہ جو کچھ خود کہنا چاہتا ہے اسی کے متعلق جواب دینا پسند نہیں کرتا؟ میں تو، کم از کم، اس کے رویے کو جائز نہیں سمجھتا۔ اسے یا تو بحث کو جاری رکھنا چاہیے یا کھل کر انکار کرنا چاہیے۔ ہم ان کا ارادہ جاننا چاہتے ہیں۔ ایسی صورت میں سقراط کسی اور سے بحث کرے گا اور باقی لوگ بھی آزادی سے باہم گفتگو کر سکیں گے۔

مجھے لگا جیسے پروٹاغورس، السی بیاڈس کے الفاظ سُن کر کچھ شرمندہ شرمندہ سا نظر آنے لگا ہے اور دیگر شرکا کا اصرار بھی السی بیاڈس کے نقطۂ نظر میں شامل ہو گیا تو وہ بادل نخواستہ اس پر تیار ہوا کہ میں سوال کروں اور وہ جواب دے گا۔ لہٰذا میں نے کہا:

پروٹاغورس! یہ ہرگز مت سمجھیے گا کہ میرے سوال کرنے میں درحقیقت کوئی اور مقصد چھپا ہے بلکہ سچ تو یہ ہے کہ میں خود اپنی بعض اُلجھنوں کو رفع کرنا چاہتا ہوں کیونکہ میں ہومر کے اس جملے پر یقین رکھتا ہوں کہ:

''جب دو افراد ساتھ ساتھ چلتے ہیں تو ایک دوسرے کو راہ سجھاتے ہیں۔''

کیونکہ تمام لوگ جنھیں ساتھی میسر ہو زیادہ مستعد ثابت ہوتے ہیں چاہے معاملہ الفاظ کا ہو یا خیالات کا۔ مگر جب کوئی ''کسی شے کو تنہائی میں دیکھتا ہے'' تو اس وقت تک وہ ناک کی سیدھ میں آگے بڑھتا جاتا ہے جب تک اس کی ملاقات کسی ایسے شخص سے نہیں ہو جاتی جسے وہ اپنے مشاہدات سے آگاہ کر کے ان کی تصدیق یا تردید نہ کروالے۔ میں بطور خاص آپ کے ساتھ بحث میں ملوث ہونا پسند کرتا ہوں کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ آپ کے علاوہ یہاں اور کوئی نہیں جو اچھے انسان کے لیے ضروری مواد خصوصاً نیکی کے بارے میں آپ سے بہتر جانتا ہو۔ ایسے لوگ تو یہاں موجود ہیں جو خود تو ضرور اچھے ہیں مگر اپنی اچھائی دوسروں تک منتقل کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ آپ البتہ ایسے فرد ہیں جس سے اس کی توقع کی جاسکتی ہے۔ علاوہ ازیں آپ میں ایک خوبی یہ بھی ہے کہ جہاں دیگر سوفسطائی اپنے پیشے کو چھپاتے ہیں وہاں آپ اپنی ذات پر اعتماد کی بدولت اپنے اُستاد، ماہر تعلیم اور سوفسطائی ہونے اور نیکی کی تعلیم دینے کا اعتراف کرتے ہیں بلکہ برملا اس کا معاوضہ بھی طلب کرتے ہیں۔ ظاہر ہے ایسی صورت میں ان معاملات کی چھان پھٹک اور ان کا امتحان کرنے کے لیے میں آپ کی موجودگی سے ضرور فائدہ اُٹھانا پسند کروں گا۔ اسی لیے میں سوالات پوچھنا پسند کروں گا اور مجھے ایسا کرنا بھی چاہیے۔ اسی ضمن میں، میں یہ بھی چاہتا ہوں کہ میں پہلے ہی جو سوال پوچھ رہا تھا اس سے متعلق آپ کے جواب کے ذریعے اپنی یادداشت تازہ کرلوں اور اس ضمن میں بھی آپ کی مدد سے استفادہ کروں اور اگر میں غلطی پر نہیں تو سوال کچھ یوں تھا کہ کیا دانائی، اعتدالِ ذات، صلاحیتِ عدل، جرأت اور تقدس پانچوں ایک ہی شے کے مختلف نام ہیں یا یہ کہ ان میں سے ہر ایک کا مخصوص مفہوم اور وظیفہ ہے اور یہ ایک دوسرے کی جگہ

نہیں لے سکتے۔ آپ نے غالباً یہی جواب دیا تھا کہ یہ پانچوں صلاحیتیں باہم امتیاز اور انفرادیت کی حامل ہیں اور اگر چہ یہ الگ الگ اپنی شناخت رکھتی ہیں مگر ایک ہی اجتماعی شے یعنی نیکی کے مختلف اجزا کی حیثیت کی حامل ہیں۔ البتہ یہ ان اجزا کی حیثیت لوہے یا سونے کے مختلف ٹکڑوں پر صادق نہیں آتی کہ انھیں جوڑنے سے بھی ایک ہی شے یعنی لوہا یا سونا حاصل ہوتا ہے بلکہ ان کی حیثیت چہرے کے اجزا (کان، ناک، آنکھ وغیرہ) کی سی ہے کہ مجموعی طور پر چہرہ ترتیب دینے کے باوجود بھی نہ صرف شکل کے اعتبار سے بلکہ وظائف کے اعتبار سے بھی یہ باہم منفرد ہی رہتے ہیں۔ میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ کیا اب بھی آپ اسی رائے پر قائم ہیں؟ اور اگر نہیں تو براہ کرم اپنا تازہ نقطۂ نظر بیان فرمایئے خواہ وہ پہلے سے مختلف ہی کیوں نہ ہو کیونکہ مجھے شبہ ہے کہ آپ نے مجھے آزمانے کے لیے یہ نقطۂ نظر پیش کیا تھا۔

سقراط! میں اس کا جواب دیے دیتا ہوں۔ اس نے کہا کہ اگر چہ پانچوں خصائص نیکی کا حصہ ہیں مگر ان میں سے چار میں کسی قدر مشابہت پائی جاتی ہے سوائے پانچویں خاصیت کے جسے ہم جرأت کا نام دیتے ہیں اس کو میں ایسے ثابت کر سکتا ہوں کہ آپ نے ایسے بہت سے لوگ دیکھے ہوں گے جو نیکو کار نہیں ہوتے، نہ ان میں تقدس ہوتا ہے، وہ اعتدالِ ذات سے بھی عاری ہوتے ہیں، جاہل بھی قرار دیے جا سکتے ہیں مگر ان میں غضب کی جرأت موجود ہوتی ہے۔

ٹھہریے! میں نے کہا، مجھے اس پر ذرا غور کرنے دیجیے! جب آپ جرأت مند یا بہادر آدمی کہنا چاہتے ہیں تو کیا آپ کی رائے اس اعتمادِ ذات سے ہے جو بہادری کی بنیاد ہے یا آپ کسی اور صلاحیت کو ان کی بہادری کی بنیاد سمجھتے ہیں؟

ہاں! اس سے میری مراد وہ جوش اور حوصلہ ہے جو انھیں اس مقام پر جا پہنچنے پر اکساتا ہے جہاں دوسرے نہیں پہنچ پاتے۔

دوسری بات یہ کہ کیا آپ نیکی کو کوئی مثبت شے ہی سمجھتے ہیں۔ ایسی ہی مثبت شے جیسا آپ اپنے پیشے یعنی تدریس کے بارے میں سمجھتے ہیں۔

جی ہاں! اس نے کہا۔ تمام اشیا سے بہترین وہ بات ہوگی جسے میں مکمل طور پر جان سکوں!

میں نے پوچھا۔ کیا یہ (نیکی) جزوی طور پر اچھی اور جزوی طور پر بُری ہے یا مکمل طور پر اچھی ہے؟

نہ صرف مکمل طور پر اچھی (مثبت) ہے بلکہ تمام مثبت اشیا میں اعلیٰ ترین مرتبے پر ہے۔

ان لوگوں کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں جو پورے اعتماد سے کنویں میں چھلانگ لگا دیتے ہیں؟

میں انھیں غوطہ خور کہوں گا۔

اور اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ وہ غوطہ خوری کا علم رکھتے ہیں۔

جی ہاں! یہی وجہ ہے۔

اور یہ بتایئے کہ گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھ کر لڑنے والوں میں سے کون زیادہ بااعتماد ہوگا جو زیادہ ماہر گھوڑسوار ہو یا جو کم تجربہ کار ہو؟

وہ جو زیادہ ماہر ہو۔

اور ان میں سے جو ہلکی ڈھالوں کے ساتھ لڑتے ہیں، ان میں سے ڈھال والا زیادہ پُراعتماد ہوگا یا بغیر ڈھال کے؟

پٹیکس! اور یہی بات دیگر صورتوں پر صادق آتی ہے، اس نے کہا۔ اگر آپ کا مؤقف یہ ہے تو جان لیجیے کہ میں بھی یہی سمجھتا ہوں کہ جو کسی فن کے بارے میں متعلقہ علم کے حامل ہوتے ہیں اتنے ہی زیادہ پُراعتماد ہوتے ہیں اور علم کی کمی کم اعتمادی کا سبب بنتی ہے البتہ کم علم لوگ متعلقہ علم حاصل کر لیں تو اس ضمن میں اپنے اعتماد کو خود بخود بہتر پائیں گے۔

کیا آپ نے ایسے لوگ نہیں دیکھے جو ان معاملات میں کورے ہونے کے باوجود غضب کے پُراعتماد ہوتے ہیں؟

ہاں۔ اس نے کہا۔ میں نے ایسے لوگ بھی دیکھے ہیں جو زیادہ پُراعتماد ہوتے ہیں۔

تو کیا آپ اُن پُراعتماد لوگوں کو جرأت مند نہیں سمجھتے؟

ایسی صورت میں، وہ بولا۔ جرأت کا لفظ مناسب نہ ہوگا کیونکہ میں ایسے لوگوں کو دیوانہ سمجھتا ہوں۔

تب پھر آپ کے خیال میں جرأت مند کون ہوتے ہیں؟ کیا پُراعتماد لوگ جرأت مند نہیں ہوتے؟

ہاں! میں اپنے بیان پر قائم ہوں۔

میں نے کہا، اور (آپ کی باتوں سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے) کہ وہ لوگ جو علم تو نہیں رکھتے مگر فقط اعتماد رکھتے ہیں، دیوانے ہیں؟ مگر ساتھ ہی ساتھ یہ بھی طے ہے کہ دانا ترین افراد وہی ہیں جو سب سے زیادہ پُراعتماد ہوں اور جو سب سے زیادہ پُراعتماد ہوں وہ سب سے زیادہ بہادر اور جرأت مند

ٹھہریں گے سو اس لحاظ سے بھی دانائی ہی کو جرأت کہا جائے گا۔

نہیں سقراط! اس نے جواب دیا، جو کچھ میں نے کہا تھا اسے یاد رکھنے میں آپ سے غلطی ہوئی ہے۔ آپ کے پوچھنے پر میں نے یہ ضرور کہا کہ جرأت مند لوگ پُر اعتماد ہوتے ہیں مگر آپ نے یہ نہیں پوچھا کہ کیا پُر اعتماد لوگوں کو جری کہا جائے گا؟ کیونکہ اگر آپ نے یہ پوچھا ہوتا تو میرا جواب یہی ہوتا کہ سبھی پُر اعتماد لوگ جری نہیں ہوتے اور میرا جو جواب تھا اسے آپ غلط ثابت نہیں کر پائے۔ البتہ آپ کی گفتگو سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کے خیال میں جو لوگ علم حاصل کر لیں ان کے اعتماد میں اضافہ ہوتا ہے اور وہ اس عہد کے مقابلے میں، جب وہ کم علم یا بے علم تھے، اب زیادہ پُر اعتماد ہو گئے ہیں اور وہ ان دوسرے لوگوں کے مقابلے میں بھی زیادہ پُر اعتماد ہیں جن کے پاس علم کی دولت نہیں۔ اسی سے آپ نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ جرأت دراصل دانائی کے مترادف ہے۔

مگر اس طرح کے انداز دلائل سے آپ یہی تصور کر پاتے ہیں کہ اصل قوت دانائی کے ساتھ ہے۔

اگر آپ یہ پوچھیں کہ کیا قوی لوگ زیادہ باصلاحیت ہوتے ہیں تو میرا جواب ہاں میں ہوگا اور اسی طرح کیا جو کشتی لڑنے کے علم (فن) سے آگاہ ہیں بہتر پہلوان ثابت نہیں ہوتے ان کے مقابلے میں جو اس ضمن میں کم علم ہیں اور سیکھنے کے بعد ان کی صلاحیت کار میں کیا اضافہ نہیں ہوتا تو میں اس سے بھی اتفاق کروں گا (یعنی اضافہ ہوتا ہے) اگر میں نے اس طرح جواب دیا ہوتا (بشرطیکہ آپ نے پوچھا ہوتا) تب آپ یہ کہنے میں حق بجانب ہوتے کہ دانائی ہی اصل قوت ہے۔ اس صورت میں بھی یہ تسلیم نہیں کر سکتا کہ باصلاحیت لوگ ہی قوی تر ہوتے ہیں حالانکہ میں قوی لوگوں کی صلاحیت کا اعتراف کر چکا ہوں۔ کیونکہ صلاحیت کار اور قوت دو متفرق چیزیں ہیں کیونکہ اوّل الذکر کا تعلق علم اور دیوانگی (یا غصے) سے ہے جبکہ مؤخر الذکر کا منبع جسمانی صحت ہے۔ یہی سب کچھ اعتماد ذات اور جرأت کے بارے میں کہہ سکتا ہوں کہ وہ باہم مترادف نہیں ہیں اور اس کی دلیل یہ ہے کہ اگرچہ جری لوگ پُر اعتماد ہوتے ہیں مگر ہر پُر اعتماد شخص جری قرار نہیں دیا جا سکتا کیونکہ اعتماد اور صلاحیت کار تو انسان کو فن اور دیوانگی سے میسر آتے ہیں جبکہ جرأت اسے فطرت کی طرف سے اور صحت مند روح کی موجودگی میں عطا ہوتی ہے۔

میں نے کہا، آپ اس بات سے اتفاق کریں گے پروٹاغورس، کہ بعض لوگ صحت مند زندگی گزارتے ہیں اور بیماری کے عالم میں زندہ رہتے ہیں۔

اس نے تائید کی۔

اور کیا آپ سمجھتے ہیں کہ جو دکھ اور درد کے ساتھ زندہ رہتا ہے اچھی زندگی گزارتا ہے؟

نہیں۔ ہرگز نہیں۔

اور جو زندگی کے آخری لمحوں تک خوش باش رہے کیا اس کی زندگی خوشگوار نہیں کہلائے گی؟

یقیناً کہلائے گی۔

گویا خوشگوار زندگی گزارنا اچھائی ہے اور تکلیف دہ زندگی گزارنا بُرائی؟

ہاں! بشرطیکہ لطف اور لذت کو آپ اچھا اور قابلِ احترام قرار دیں۔ اس نے کہا۔

اور کیا آپ اس سے متفق ہو پائیں گے اگر باقی دنیا والے خوشگوار اشیا کو بُرائی اور تکلیف دہ اشیا کو اچھائی قرار دے دیں؟ کیونکہ میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ اشیا خوشگوار کہلائیں گی جب تک ان کے اثرات یا تو خوشگوار کہلائیں یا کم از کم ناگوار نہ ہوں اور جب ان کے اثرات ناگوار ہوں گے تو لامحالہ بُری کہلائیں گی۔

مجھے نہیں معلوم سقراط! اس نے کہا۔ شاید میں یہ غیر محتاط بیان نہیں دے سکتا کہ خوشگوار اشیا اچھی اور ناگوار اشیا بُری ہوتی ہیں۔ نہ صرف موجودہ بحث بلکہ پوری زندگی کا تجربہ مجھے یہ کہنے پر مجبور کرتا ہے کہ بعض ایسی اشیا بھی ہیں جنھیں اچھا نہیں کہا جا سکتا۔ کچھ ایسی بھی ہیں جو اچھائی اور بُرائی، کسی ذیل میں بھی نہیں آتیں۔

اور کیا آپ ایسی اشیا کو خوشگوار کہیں گے جو پُر لطف ہوں یا لطف کا سبب بنیں؟

یقیناً! اس نے کہا۔

تب پھر میرا نظریہ یہ ہے کہ اشیا جب تک خوشگوار ہیں اچھی کہلاتی ہیں اور میرے سوال میں یہ مفہوم ہے کہ لطفِ حظ فی نفسہٖ اچھائی ہے۔

سقراط! آپ کے اپنے پسندیدہ اندازِ گفتگو کے مطابق آیئے اس پر مزید غور و فکر کریں۔ اس نے کہا۔ اور اگر غور و فکر نتیجہ خیز ہو اور ثابت ہو جائے لطف اور اچھائی دونوں ایک ہی شے کے نام ہیں تو ہم دونوں اس پر متفق ہو جائیں گے اور نہیں تو ہم بحث جاری رکھیں گے۔

تو کیا تحقیق آپ شروع کریں گے؟ میں نے پوچھا، یا میں شروع کروں گا؟

آپ آغاز کیجیے؟ اس نے کہا، کیونکہ آپ بحث کے موجد ہیں!

کیا میں ایک وضاحتی نکتے سے آغاز کر سکتا ہوں؟ میں نے پوچھا، فرض کر لیجیے کوئی شخص کسی دوسرے فرد کی صحت یا کسی دیگر جسمانی وصف کے بارے میں تحقیق اور جستجو کرتا ہے۔ وہ اس کا چہرہ دیکھتا ہے۔ انگلیوں کی پوروں کا معائنہ کرتا ہے اور تب کہتا ہے، اپنی چھاتی کھولو اور میری طرف سے پیٹھ موڑ لو تاکہ میں بہتر انداز میں جائزہ لے سکوں۔ میں بھی اس قیاس میں ایسا ہی انداز اختیار کرنا چاہتا ہوں۔ اچھائی اور لطف کے بارے میں آپ کی رائے سُننے کے بعد میں بھی آپ سے یہی کہنا چاہتا ہوں، پروٹاغورس اپنے ذہن پر سے پردہ ہٹائیے۔ علم کے بارے میں اپنی رائے کھل کر بیان کیجیے، تاکہ میں دیکھ سکوں کہ آپ باقی دنیا کے ساتھ متفق ہو سکتے ہیں یا سب سے منفرد ہیں کیونکہ باقی دنیا کی رائے میں تو علم حکمرانی یا احکامات جاری کرنے کی قوت کی بجائے محض ایک ایسی شے ہے کہ جب انسان کے قبضے میں ہو تو بھی کئی مرتبہ غصہ اس پر حاوی ہو جاتا ہے، کبھی یہ خوشی کے نیچے دب جاتا ہے یا درد اور غم اس کے تاثر کو دھندلا دیتے ہیں یا اسی طرح محبت یا خوف اس پر غالب آ جاتے ہیں۔ گویا علم ایک غلام ہے جسے جو جدھر چاہتا ہے گھسیٹ لے جاتا ہے۔ کیا آپ کی بھی یہی رائے ہے؟ یا آپ سمجھتے ہیں کہ علم مقدس اور حکمرانی عطا کرنے والی قوت ہے جس پر کوئی دوسری قوت یا کیفیت قابو نہیں پا سکتی اور ہر انسان کو جو اچھائی اور بُرائی میں تمیز کر سکتا ہو کبھی اجازت نہیں دے گا کہ وہ اس کے برعکس کوئی کام کر سکے۔ البتہ دانائی وہ قوت ہے جو علم کو قوی تر کر دیتی ہے۔

پروٹاغورس بولا، سقراط! مجھے آپ سے مکمل اتفاق ہے اور یہی نہیں بلکہ سب سے بڑھ کر میں یہ کہوں گا کہ علم اور دانائی دنیا کی دو عظیم ترین قوتیں ہیں جو انسان کی دسترس میں ہو سکتی ہیں۔

بہت خوب! میں نے کہا۔ یہی سچ ہے۔ مگر کیا آپ جانتے ہیں کہ لوگوں کی اکثریت کا نقطۂ نظر قطعی مختلف ہے اور وہ یہ کہ انسان صرف اسی شے کو جاننا چاہتا ہے جو بہترین ہو مگر کسی اچھائی کا موقع بروئے کار نہیں لاتا اور اکثر لوگوں نے جن سے میں نے اس کی وجہ پوچھی ہے، یہ کہتے ہیں کہ انسان جب بھی علم کے برعکس عمل کرتا ہے تو اس کے پیچھے کسی درد، غم، خوشی یا ایسی ہی کوئی لگاوٹ ہوتی ہے جن کا ابھی میں نے تذکرہ کیا ہے۔ یعنی ان پر کسی رنج یا الم کا غلبہ آ جاتا ہے۔

ہاں سقراط! اس نے جواب دیا۔ انسان صرف اسی نکتے سے متعلق ہی غلطی پر نہیں ہے۔

فرض کیجیے میں اور آپ کوشش کرتے ہیں کہ لوگوں کو بتا سکیں کہ جب وہ لطف یا خوشی کے تاثر میں ہ

کر غلطی کرتے ہیں، کہیں تو اس سے ان کی کوئی مراد ہوگی اور اس کی وجہ کیا ہے کہ انسان، بہترین کام سرانجام کیوں نہیں دیتا؟ اور جب ہم ان سے کہتے ہیں، دوستو! تم غلطی پر ہو اور جو کچھ کہہ رہے ہو وہ درست نہیں۔ تو شاید وہ جواب دیں: جناب پروٹاغورس اور سقراط! یہ اُنس جس کے بارے میں ہم کہتے ہیں کہ اس کے دھارے میں بہ کر انسان غلطی کرتا ہے، درست نہیں ہے تو براہِ کرم بتا دیجیے کہ وہ کیا ہے۔ اس کیفیت کو کیا نام دیا جا سکتا ہے اور اس کی وضاحت کیونکر ممکن ہے؟

مگر سقراط! ہم دوسروں کے بارے میں خواہ مخواہ زحمت میں کیوں پڑیں، جو اپنے سامنے آنے والی اشیا کے بارے میں کچھ بھی کہہ سکتے ہیں؟

مجھے یقین ہے، میں نے کہا کہ اس سے ہمیں اس انکشاف میں مدد ملے گی کہ آخر جرأت کس طرح نیکی کے دیگر اجزا سے متعلق ٹھہرتی ہے۔ اگر آپ ہمارے مابین ہونے والے معاہدے کی پیروی کرنے پر ذہنی طور پر تیار ہیں تو میں بتا سکتا ہوں کہ ہم باہمی اتفاق سے کس طرح اس اُلجھن سے چھٹکارا پا سکتے ہیں؟ کیا آپ سمجھ رہے ہیں۔ نہیں سمجھ پا رہے تو بھی کوئی بات نہیں۔

آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ اس نے کہا، میں چاہتا ہوں کہ جس انداز میں آپ نے بات کا آغاز کیا ہے اسے آگے بڑھایئے۔

بہت اچھا! میں نے کہا۔ فرض کیجیے لوگ اپنا سوال دہراتے ہیں تو آپ خوشی اور انبساط کی رو میں بہ جانے کی کیفیت کے بارے میں کیا کہیں گے؟ میں تو اپنے طور پر یہ جواب دوں گا۔

سُنیے! پروٹاغورس اور ہم یہ ثابت کرنے کی کوشش کریں گے کہ لوگ کھانے پینے یا دیگر جسمانی خواہشات کے ہاتھوں مجبور ہو کر ان سے منسلک بُرائی سے واقف ہونے کے باوجود ان میں بلا اختیار ملوث ہو جاتے ہیں تو یہی تو کہا جائے گا کہ وہ انبساط کی رو میں بہ گئے تھے؟ اس سے تو وہ انکار نہیں کر سکیں گے اور فرض کیجیے آپ اور میں ان کے پاس دوبارہ جا کر یہی سوال دہراتے ہیں آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ (کھانا، پینا یا ایسی دیگر خواہشات کی تکمیل کا سبب بُرائی کیونکر ہے؟ محض اس لیے کہ یہ فوری اور وقتی خوشی اور انبساط مہیا کرتی ہے یا اس لیے کہ اس سے، آیندہ کے لیے بیماری، مفلسی یا ایسی کسی خرابی کے پیدا ہونے کا امکان جنم لیتا ہے؟ کیا مستقل بُرے نتائج نہ ہونے کے باوجود بھی حصولِ لذت کو بُرا کہا جا سکتا ہے۔ کیا محض فطری طور پر انبساط فراہم کرنے ہی کی وجہ سے یہ بُرائی میں شامل ہو جاتی ہیں۔ وہ یقیناً یہی جواب دیں گے کہ یہ کوائف فوری لذت پہنچانے

کی ملامیت کے باعث بُرائی کے زمرے میں نہیں آتے بلکہ اس بنا پر ان پر بُرائی کا لیبل لگتا ہے کہ ان سے مستقبل کی بیماری عسرت وتنگدستی یا ایسی خرابیاں پیدا ہونے کا امکان ہوتا ہے؟

پروتاغورس نے کہا، مجھے یقین ہے کہ لوگ عموماً یہی جواب دیں گے جیسا آپ نے سوچا ہے۔

اور جو شے بیماری پیدا کرتی ہے وہ درد وغم کا سبب نہیں بنتی؟ اور کیا عسرت وتنگدستی کا منطقی انجام درد و غم نہیں ہے؟

اگر میں غلطی پر نہیں تو لوگ اس سے بھی متفق ہی ہوں گے۔

پروتاغورس نے اس کی تائید کی۔

ایسے میں، میں آپ کی طرف سے اور اپنی طرف سے ان لوگوں سے یہ کہوں گا، کیا آپ لوگ ان اشیا کو اس لیے بُرا نہیں سمجھتے کہ اس سے ہماری خوشیاں غارت ہوتی ہیں اور اس کے بدلے میں ہمیں رنج وغم ملتا ہے؟ وہ اس سے بھی یقیناً متفق ہوں گے۔

ہم دونوں کا خیال تھا کہ لوگ اس سے اتفاق کریں گے۔

اب میں اس کے مخالف نقطۂ نظر کے حامل سے سوال کرتا ہوں کہ دوستو! جب تم اچھائی کے تکلیف دہ ہونے کی بات کرتے ہو تو کیا تمھارے پیشِ نظر علاج کی غرض سے زیرِ عمل آنے والی اچھائیاں نہیں ہیں؟ مثلاً ورزش کی تکلیف، جمناسٹک کی تربیت کی مشکلات، فوجی خدمات، طبیب کی طرف سے برائے علاج جلانا، گھاؤ دینا یا کڑوی دوا پلانا یا فاقے تجویز کرنا وغیرہ؟ کیا یہ سب ایسی چیزیں نہیں ہیں کہ اگرچہ بظاہر تکلیف دہ ہیں مگر ان میں بھلائی کا پہلو موجود ہے؟ لوگ یقیناً اس سے متفق ہوں گے۔ پروتاغورس نے بھی اس سے اتفاق کیا۔

اور یہ کہ کیا آپ ان میں بھلائی اس لیے قرار دیتے ہیں کہ ان سے منسلک درد اور تکلیف وقتی اور عارضی ہوتی ہے یا اس لیے کہ ان کے آیندہ نتائج اچھی صحت یا تندرستی کی صورت میں برآمد ہوتے ہیں اور ان سے جسمانی ساخت میں بہتری آتی ہے اور اس کی مدد سے دولت یا لوگوں کی حمایت کے حصول میں آسانی ہوتی ہے؟ اگر میں غلطی پر نہیں تو وہ مؤخر الذکر متبادل کی تائید وحمایت کریں گے۔

اور کیا یہ تمام باتیں خوشی اور انبساط کی صورت میں انجام پذیر ہونے کے علاوہ بھی کوئی خوبی کی وجہ رکھتے ہیں کہ نہیں البتہ درد سے عارضی طور پر ہی چھٹکارا دلانا ان کی خاصیت ہے؟ یا یہ کہ آپ کی نظر

میں غم یا درد اور خوشی یا انبساط کے پیمانوں کے علاوہ بھی انھیں اچھا ثابت کر سکتے ہیں؟ لوگ یقیناً اس کا اعتراف کریں گے کہ واقعی یہی ایک معیار ان کی اچھائیوں سے متعلق پیش کیا جا سکتا ہے؟

میرا بھی یہی خیال ہے۔ پروٹاغورس نے کہا۔

سو کیا آپ اسی بات پر زور نہیں دیں گے کہ آپ انبساط کو اچھائی کے طور پر اور درد و غم کو بُرائی کے طور پر لیتے ہیں؟

اس نے اس سے بھی اتفاق کیا۔

گویا آپ کے خیال میں درد بُرائی ہے اور خوشی اچھائی بلکہ کبھی آپ انبساط کو بھی بُرائی میں شمار کرتے ہیں۔ خصوصاً جب ہم اس انبساط میں ڈوب کر مقابلتاً کسی بہت بڑی مسرت سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں یا یہ کہ اس کی موجودگی درد کی مقدار یا معیار انبساط سے زیادہ رہے۔ تاہم اگر آپ خوشی اور انبساط کو کسی دوسرے جواز کے باعث بُرا سمجھتے ہیں تو آپ کو وہ جواز ثابت کرنا پڑے گا جب کہ میں سمجھتا ہوں کہ آپ ایسا نہیں کر سکیں گے۔

میرا خیال بھی یہی ہے کہ لوگوں کے پاس ایسے کسی جواز کا ثبوت موجود نہیں ہے۔ پروٹاغورس بولا۔

کیا آپ درد و غم کے بارے میں بھی ایسی ہی رائے کے حامل ہیں؟ خصوصاً آپ درد کو اچھائی سمجھتے ہیں جب یہ بڑے درد سے بے نیاز کر دے یا کہ درد کی مقدار اور معیار خوشی اور انبساط کے مقابلے میں کم تر ہو اور جب آپ کسی دوسرے جواز کی بنیاد پر حقیقی درد کو خوشی کی بنیاد قرار دیں تو آپ کو اس کے جواز کو ثابت کرنا ہوگا.......... مگر آپ کر نہ پائیں گے۔

پروٹاغورس نے اس مرتبہ بھی یہی کہا کہ لوگوں کے پاس ایسا کوئی جواز موجود نہیں۔

میں نے کہا، فرض کر لیجیے کہ لوگ یہ کہیں کہ آپ اس موضوع پر طویل گفتگو کیوں کرتے ہیں اور ایک ہی بات کے لیے مختلف انداز ہائے اظہار کیوں استعمال کرتے ہیں؟ تو میں انھیں جواب دوں گا معاف کرنا دوستو! پہلی بات تو یہ ہے کہ انبساط کی رو میں بہ جانے کی ترکیب بجائے خود ایک مشکل بیان ہے جبکہ پوری بحث کا مرکزی خیال بھی یہی ہے اور پھر دیکھیے کہ بُرائی کو درد کی شکل میں اور انبساط کو اچھائی کے معنوں میں دیکھنے کے علاوہ اور کیا امکان ہے کیونکہ دوسری صورت میں سرے سے ہی پٹڑی سے اُترنے کا خطرہ ہوتا ہے تو کیا ایسی زندگی آپ کو مطمئن کر سکے گی جس میں خوشی ہی خوشی ہو اور درد کا شائبہ تک نہ ہو (یہاں یہ نکتہ قابلِ غور ہے کہ درد کی غیر موجودگی میں خوشی کا

احساس نا قابلِ فہم رہتا ہے) اور اگر آپ خوش ہوں مگر ایسی خوشی اور غم کی نشاندہی نہ کر سکیں جن کا انجام خوشی یا غم کی صورت میں نہیں تو شاید آپ کو عواقب کا اندازہ نہیں اس کے نتائج ملاحظہ کیجیے! اگر آپ کا بیان حقائق پر مبنی ہے تب بحث لایعنی ہے کیونکہ یہ طے ہے کہ اکثر انسان نادانستگی میں بھی بُرائی میں ملوث ہو جاتا ہے حالانکہ وہ دل سے یہی چاہتا ہے کہ اجتناب کرے مگر کیا کرے، خصوصی انبساط اسے اپنے چنگل میں لے کر بے بس کر دیتا ہے یا جب یہ کہتے ہیں کہ انسان جان بوجھ کر اچھائی کو سرانجام دینے سے انکار کرتا ہے کیونکہ اس وقت جس کیف و انبساط کے عالم میں وہ ہوتا ہے اس کے دوران اسے اور کچھ سوجھ ہی نہیں سکتا اور اس کی نامعقولیت اسی وقت ثابت ہو جاتی ہے جب ہم درد، خوشی و انبساط یا اچھائی اور بُرائی کے الفاظ کا استعمال ترک کر دیں۔ یہ چونکہ دو مختلف اشیا ہیں اس لیے ان کو دو الگ ناموں ہی سے پکارا جائے گا، پہلا نام اچھائی یا بُرائی اور دوسرا انبساط یا درد و غم۔ اس صورت حال کو فرض کرتے ہوئے ہم اس خیال پر قائم رہنے پر مجبور ہیں کہ انسان بعض اوقات جانتے بوجھتے بھی بُرائی کا ارتکاب کر ڈالتا ہے۔ تاہم اس پر یہ سوال ہمیشہ قائم رہے گا کہ آخر کیوں؟ سو پہلا جواب تو یہ ہے کہ وہ (انبساط کے) شکنجے میں ہے۔ اگلا سوال ہوگا کس شے کے شکنجے میں؟ اور ہم یہ بتانے کی حالت میں نہیں ہوں گے کہ لطف و انبساط کے شکنجے میں۔ کیونکہ اس سے قبل ہم خوشی کو اچھائی کا مترادف قرار دیتے رہے ہیں۔ سو ہم اپنے جواب میں بھی اس جزوی سوال کو مستور رکھیں گے کہ ہاں شکنجے میں مگر کس شے کے؟ اور یہی سوال ہمارے لیے دہرایا بھی جائے گا اور آخر میں ہمیں کہنا ہی پڑے گا کہ لطف یعنی اچھائی کے شکنجے میں۔ یہ الگ بات ہے کہ ہمارا جواب قہقہوں کی نذر ہو جائے، کیونکہ اگر سوال کرنے والا بر خود غلط قسم کا ہوا تو بے ساختہ پکار اُٹھے گا کہ کس قدر احمقانہ خیال ہے کہ کوئی شخص دانستہ بُرائی میں اس لیے ملوث ہو جاتا ہے کہ نیکی نے اسے اپنی گرفت میں لیا ہوا ہوتا ہے۔ وہ یقیناً اس اُلجھن میں گرفتار رہے گا کہ کیا ایسے اس لیے ہوا کہ اچھائی بُرائی پر قابو پا سکتی ہے یا اس لیے کہ اچھائی بُرائی پر قابو پانے کی صلاحیت نہیں رکھتی اور ہمیں بہر صورت اس سوال کے جواب میں یہ بتانا پڑے گا کہ نیکی بُرائی پر قابو پانے کی صلاحیت سے عاری تھی۔ مگر ایسے تو، جیسے ہم کہتے آ رہے ہیں کہ وہ خوشی اور انبساط کے شکنجے میں پھنسا ہوا تھا، تو اس سے یہ مفہوم نکلے گا کہ ایسا کر کے اس نے کوئی بُرائی نہیں کی۔ پھر بھی سوال پوچھنے والا اصرار کر سکتا ہے کہ ''کیسے؟'' کیا اچھائی کی قدر و منزلت بُرائی سے کم

ہے یا بُرائی اچھائی سے؟ کیا اس کی اصل وضاحت یہ نہیں ہے کہ دونوں (اس عالم میں) ایک دوسرے کے لیے غیر متوازن و متناسب ہیں چاہے وہ تعداد یا مقدار میں زیادتی کی وجہ سے ہوں یا کمی کی بدولت۔ اس سے تو انکار کی گنجایش ہی نہیں۔ مگر ابھی یہ سوال بھی باقی ہے کہ رو میں بہ جانے یا شکنجے میں کسے جانے سے آخر مراد کیا ہے؟ اس طرح تو گویا چھوٹی بُرائی سے بچنے کے لیے بڑی بُرائی میں پھنسنے والی بات ہو جائے گی؟ چلیے یہاں تک بھی تسلیم کیا جاسکتا ہے۔ مگر ایسے میں انبساط اور درد کو اچھائی اور بُرائی کے نام دینا پڑیں گے۔ اس طرح سابقہ بیان میں تبدیلی کرنا پڑے گی کہ انسان دانستہ بُرائی کرتا ہے اور اس بنا پر کہ انبساط کے جادو کے زیر اثر ہوتا ہے جس پر قابو پانا ممکن نہیں۔ اس طرح ایک سوال یہ بھی ہے کہ انبساط اور درد کے باہمی تعلق کو جانچنے کے لیے کون سے پیمانے استعمال ہو سکتے ہیں؟ کیا تعداد و مقدار اور معیار ہی وہ پیمانے نہیں ہیں جن سے ہم اس باہمی تعلق کا اندازہ لگا سکتے ہیں؟ اس سوال کا جواب یوں دیا جاسکتا ہے کہ اس سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ کیا ایسے امتیازات صرف انبساط اور درد ہی کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں اور کیا یہ ممکن ہے کہ ہم انبساط اور درد کو ترازو کے دو پلڑوں میں ڈال کر ان کی شدت کے علاوہ دوری اور قربت وغیرہ کے خصائص کا وزن کر پائیں اور یوں ایک کی فضیلت دوسرے پر ثابت کرسکیں؟ میرا خیال ہے اس سے انبساط کو انبساط کے مقابلے میں اور درد کو درد کے مقابلے میں جانچنا آسان اور بہتر نتائج کا حامل ہوسکتا ہے۔ یعنی دونوں کی مقدار کیفیتوں کی تعداد کے حوالے سے وہ لائحۂ عمل متعین کیا جاسکتا ہے کہ کسی شے کے خوشگوار کو تکلیف دہ کے مقابلے میں برتر ثابت کیا جاسکے۔ میرے دوست! کیا آپ اس حقیقت کو تسلیم نہیں کریں گے؟ لوگ بھی، میرا خیال ہے کہ اس حقیقت کے وجود سے انکار نہیں کرسکتے؟ اس کے پاس مجھ سے اتفاق کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

اس وقت میں نے کہا، اگر آپ یہاں تک مطمئن اور متفق ہیں تو میرے ایک اور سوال کا جواب دیجیے! کیا آپ محسوس نہیں کرتے کہ کسی شے کا حجم اگر دور سے کم دکھائی دیتا ہے تو قریب آنے پر زیادہ نظر آنے لگتا ہے؟ میرا خیال ہے کہ عام لوگ اس شے کو بھی تسلیم ہی کریں گے۔ یہی اصول موٹائی، تعداد اور آواز وغیرہ پر لاگو ہوتا ہے یعنی وہ قریب سے مساوی یا زیادہ محسوس ہوتی ہے مگر فاصلے سے ان کی مقدار کم ہوتی محسوس ہوتی ہے۔ اسے سمجھنا بھی لوگوں کے لیے ناممکن اور مشکل نہیں ہوگا۔ اب فرض کر لیجیے کہ خوشی زیادہ کے حصول اور کم سے اجتناب سے مشروط ہو تو کیا زندگی

میں محض اسی پر انحصار کیا جاسکتا ہے اور کیا ظاہری مشاہدہ ہی اس تصفیے کے قابل کر سکتا ہے یا اس کے لیے حقیقی پیمائش لازم ہے (خصوصاً کمی یا زیادتی کے مادی پہلو کے اعتبار سے) اور کیا یہ پیمائش کے ذرائع بھی دھوکے کا ذریعہ نہیں اور کیا ظاہری پیمائش کی سہولت کے باوجود ہمیں اکثر اپنے انتخاب پر پشیمان ہونا نہیں پڑتا؟ کیونکہ اسی کی بدولت ہم کمی اور زیادتی یا اچھائی اور بُرائی کے ضمن میں دھوکا کھاجاتے ہیں۔ البتہ اتنا ضرور ہے کہ پیمائش کے فن میں طویل مہارت کے بعد انسان ظاہر مقدار وتعداد کے دھوکے سے بچ کر حقیقت شناسی کی صلاحیت پالیتا ہے اور اس طرح انسان روحانی (نفسیاتی) طور پر اس قدر باصلاحیت ہوجاتا ہے کہ ایسے معاملات میں صحیح صحیح اندازے لگا کر اپنی زندگی کو خطرات سے محفوظ کر پاتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ لوگ بآسانی اس حقیقت کو سمجھ لیں گے کہ فی الحقیقت یہ صلاحیت پیمائش کی ہے جو انسان کو تحفظِ حیات کا مقصد حاصل کرنے کی صلاحیت عطا کرتی ہے۔

جی ہاں! پروٹاغورس نے کہا، پیمائش کی صلاحیت واقعی ایسی ہی خصوصیت ہے۔

فرض کیجیے، انسانی زندگی کی بقا کے لیے نامناسب اور مناسب کا انتخاب بھی ضروری ہے اور ساتھ ہی یہ علم بھی کہ انسان چاہے ذاتی حوالے سے چاہے، باہمی تعلقات کے حوالے سے، کب زیادہ کا انتخاب کرے اور کب کم کا۔ قربت طلب کرے یا دوری، یہ بھی ہمارے لیے تحفظ حیات کا اصول قرار پاتا ہے اور کیا یہ 'علم' نہیں ہے؟ خصوصاً مقدار کی کمی بیشی کے ضمن میں علم پیمائش اور تعداد کے ضمن میں جفت اور طاق کا علم۔ مجھے یقین ہے لوگ اس نظریے کو بھی قبول کرلیں گے۔ کیا نہیں؟

پروٹاغورس کا اپنا خیال بھی یہی تھا کہ لوگ اسے یقیناً درست تسلیم کرلیں گے۔

ایسی صورت میں، میرے دوست! جب میں لوگوں سے کہوں کہ انسانی زندگی کے تحفظ اور آسایش کے لیے جو عوامل درکار ہیں ان میں انبساط اور درد میں فرق، باہمی تعلق اور دیگر متعلقات کا علم، کم یا زیادہ اور چھوٹے یا بڑے کے انتخاب سے متعلق اصول وضوابط کا علم اور قربت یا دوری میں سے کسی ایک محرک کے انتخاب کی صلاحیت اور متعلقہ عوامل شامل ہیں تو کیا اس سے یہ مراد نہیں ہے کہ اس سلسلے میں ہمیں ان کے خصائص ونقائص یا برابری، مثبت اور منفی دونوں عوامل کے تقابل کے حوالے سے ملحوظ رکھنا ہوں گے؟

اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں۔

اور مقداروں کی پیمائش کا یہ علم لامحالہ سائنس کہلائے گا۔

ہاں! اس نے کہا، مجھے یقین ہے لوگ اس پر صاد کریں گے۔

اس آرٹ یا سائنس کی اصلیت کا تعین حقیقت میں مستقبل میں طے ہوگا۔ مگر ایسی سائنس کا وجود کم از کم اس سوال کا جواب فراہم کر دیتا ہے جو آپ لوگوں نے مجھ سے اور پروٹاغورس سے دریافت کیا تھا۔ ایک مرحلے پر اگر آپ کو یاد ہو، آپ کے نقطۂ نظر کے جواب میں پروٹاغورس اور میں نے بالاتفاق اعلان کیا تھا کہ علم سے زیادہ عظیم اور قوی کوئی شے نہیں اور علم جس صورت میں بھی موجود ہو اسے غم، درد، خوشی اور انبساط اور تمام ذہنی کیفیات کو حلقۂ اثر میں لینے کی قدرت حاصل ہوتی ہے۔ جبکہ آپ یہ کہتے ہیں کہ عالم انبساط میں انسان علم تک کے خلاف جذبات کی رو میں بہ جاتا ہے۔ ہم نے اس سے اتفاق نہیں کیا تھا۔ پھر آپ بھی ہمارے ساتھ متفق ہو گئے اور کہا۔ اے پروٹاغورس اور سقراط! اگر ایسا نہیں ہے تو بتائیے انبساط کے نشے میں سرشار ہو کر جذبات کی رو میں بہنے کی کیفیت کا کیسے اندازہ لگایا جا سکتا ہے اور آپ یہ بھی بتائیے کہ آپ اس کیفیت کو کیا نام دیتے ہیں؟ اگر میں فوراً ہی اس کیفیت کو جہالت کا کہہ دیتا تو آپ سب لوگ ہنس دیتے مگر اب صورت حال یہ ہے کہ ہمارا مضحکہ اُڑانے کی صورت میں گویا آپ اپنا مضحکہ اُڑائیں گے کیونکہ آپ اس سے متفق ہو چکے ہیں کہ انسان درد و غم اور خوشی و انبساط میں سے کسی ایک کے انتخاب میں غلطی کا مرتکب ہو سکتا ہے۔ اچھائی اور بُرائی کے حوالے سے ان کے انتخاب کا انحصار ان کے علم پر ہوتا ہے اور آپ نے یہ بھی تسلیم کیا کہ وہ اس ضمن میں غلطیاں بھی کرتے ہیں اور یہ غلطیاں عمومی علم کے حوالے سے بھی ہو سکتی ہیں اور اس مخصوص علم کے حوالے سے بھی ہو سکتی ہیں جسے علم پیمائش کہا جاتا ہے اور آپ کو یہ بھی معلوم ہے جو غلطی علم کے استعمال کے بغیر کی جائے وہ جہالت ہی پر مبنی ہوتی ہے۔ اسی سے آپ جذبات کی رو میں بہنے کا مفہوم سمجھ سکتے ہیں۔ ہمارے دوست پروٹاغورس، پروڈیکس اور ہپیاس پہلے ہی اعلان کر چکے ہیں کہ وہ اسی لاعلمی اور جہالت کی بیماری ہی کے معالج ہیں۔ مگر آپ لوگ جو اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ موجودہ خرابی کی وجہ غفلت اور جہالت نہیں ہے اور جس فن کی میں وکالت کر رہا ہوں وہ سکھایا نہیں جا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ خود بھی علما کے پاس نہیں جاتے نہ اپنے بچوں کو اساتذہ کے پاس بھیجتے ہیں اور اپنے طور پر گویا بچت کرتے ہیں۔ مگر یہ بچت نہیں اُلٹا نقصان ہے کیونکہ اسی رویے کی بدولت نہ آپ کی معاشرتی زندگی کسی کام کی رہی ہے

نہ ذاتی زندگی۔ یہ وہ جواب ہے جو ہم عوام کو دیں گے اور آپ پیپاس اور پروڈیکس، میں آپ لوگوں سے پوچھتا ہوں بلکہ پروٹاغورس بھی اس کا جواب دیں (کیونکہ یہ دلائل آپ کے اور ہمارے دونوں فریقوں کے لیے لازم ہیں) کہ آیا جو کچھ میں نے عرض کیا ہے وہ حقیقت سے مطابقت میں ہے یا نہیں؟

وہ تمام لوگ سمجھتے ہیں کہ میں نے جو کچھ بھی کہا عین حقیقت تھا۔

تو گویا آپ اس سے متفق ہیں کہ خوشگوار فعل (یا ماحول یا صورت حال) نیکی اور بھلائی ہے جبکہ تکلیف دہ حرکت برائی ہے۔ یہاں میں اپنے دوست پروڈیکس سے استدعا کروں گا کہ وہ (ناموں کے حوالے سے) مخصوص صلاحیت استعمال کرتے ہوئے انبساط انگیز کی مزید توجیہ کریں یعنی انبساط انگیز، خوش آیند اور پرلطف وغیرہ کی تفصیلات میں نہ پڑیں بلکہ میری درخواست معزز ترین پروڈیکس سے یہ ہے کہ میری پسند کے مطابق اور اس انداز میں جواب دیں جو میں نے تجویز کیا ہے۔

پروڈیکس یہ سن کر ہنس دیا۔ تاہم باقی لوگوں نے بھی میری تجویز کی حمایت کی۔

اس کے علاوہ میرے دوست! اس کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں؟ کیا وہ تمام اعمال جو اس نیت سے سرانجام دیے جائیں کہ زندگی میں سے درد و غم کو ختم کر کے اسے خوشیوں کا گہوارہ بنا دیا جائے تو ایسے افعال کو آپ قابلِ عزت اور مفید ہی تو کہیں گے اور یہ بھی کہ قابلِ عزت کام ہر صورت میں مفید اور نیک کام ہی کہلاتے ہیں۔ آپ کا کیا خیال ہے؟

سبھی لوگوں نے جو اس محفل میں موجود تھے اس امر کی تائید کی۔

اس کے بعد میں نے کہا، اگر صرف اچھائی ہی خوشگوار قرار دی جا سکتی ہے تو کوئی بھی شخص کوئی بھی عمل اس یقین کے ساتھ نہیں کر سکتا کہ جب وہ بہتر فعل سرانجام دے رہا ہے تو اس صورت میں اس سے بہتر کا حصول یا بہتر کارروائی سرانجام دینا ممکن ہے یعنی وہ ہر فعل کو بہترین سمجھ کر قرار دے رہا ہوتا ہے اور اس سے بہتر کی توقع نہیں کر سکتا۔ اس کی کم مائیگی کا یہ احساس جو دراصل احساسِ کمتری کی ہی ایک صورت ہے، اس کی جہالت ہی کی علامت ہے حالانکہ اصل دانائی کا تقاضا تو یہ ہے کہ وہ نگاہ بلند اور اپنی ذات پر (اعلیٰ کارکردگی کے امکان کے حوالے سے) اعتماد رکھے۔

ہم سب ان الفاظ کے ساتھ بھی متفق ہو گئے۔

میں نے اس مرحلے پر کہا۔ دیکھیے ایک شے خوف یا دہشت نام کی بھی ہوتی ہے اور محترم پروڈیکس میں آپ سے توقع رکھتا ہوں کہ آپ بھی خوف اور دہشت کے حوالے سے میری اس تعریف سے متفق ہوں گے کہ خوف اور دہشت دراصل بُرائی کی توقعات کا دوسرا نام ہے۔

پروٹاغورس اور ہپیاس مجھ سے متفق ہو گئے مگر پروڈیکس نے کہا کہ بات خوف کی ہو رہی ہے دہشت کی نہیں (اور یہ کہ ان دونوں میں بنیادی فرق ہے)۔

محترم پروڈیکس، آپ فکرمند نہ ہوں۔ میں نے کہا۔ میں دراصل یہ دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ اگر آپ کے سابقہ بیانات درست ہیں تو ظاہر ہے کہ کوئی شخص ایسی کسی شے کو قبول نہیں کرے گا جس سے وہ کسی دباؤ کے بغیر بھی خوفزدہ ہو۔ ایسی صورت میں آپ کا یہ فرمان سابقہ فرمان کی ضد نہیں ٹھہرے گا جو پہلے ہی درست تسلیم کیا جا چکا ہے کہ انسان ایسی اشیا کے بارے میں سوچتا ہے جن کے بارے میں اسے ڈر ہو کہ وہ بُرائی میں شمار ہوتی ہیں حالانکہ کوئی بھی شخص نہ تو ایسی کسی شے کے لیے کسی کو قائل کر سکتا ہے نہ اسے بغیر دباؤ کے قبول کر سکتا ہے کہ جو کچھ وہ کر رہا ہے وہ بُرائی میں شمار ہوتا ہے۔

یہ بات بھی عالمگیر حقیقت کی حیثیت سے متفقہ طور پر تسلیم کر لی گئی۔ اس پر میں نے کہا۔ جناب ہپیاس اور پروڈیکس، ہماری طرف سے تو یہی پیشگی شرائط ہیں اور اب میں جناب پروٹاغورس سے درخواست کروں گا کہ وہ بیان فرمائیں گے کہ جو کچھ انھوں نے آغاز مباحثہ میں بیان فرمایا اس کی صداقت کیسے ثابت کریں گے؟ میں جب آغاز مباحثہ کی بات کرتا ہوں تو اس سے مراد اُن کا بالکل اوّلین بیان نہیں ہے کیونکہ اس بیان میں تو انھوں نے فرمایا تھا کہ نیکی کے پانچ مختلف اجزا ہیں اور وہ پانچوں ایک دوسرے سے وظائف اور مقاصد کے اعتبار سے قطعی مختلف ہوتے ہیں۔ ان کے اس بیان کی بات نہیں کرتا۔ میرا اشارہ تو ان کے اس اگلے بیان کی طرف ہے جس میں انھوں نے فرمایا تھا کہ ان پانچوں میں سے چار اجزا تو ایک دوسرے سے کافی مماثلت رکھتے ہیں مگر پانچواں جزو جسے ہم جرأت کہتے ہیں قطعی مختلف ہے اور اس ضمن میں انھوں نے دلیل یہ دی تھی کہ بہت سے غیر متقی، غلط کار، اعتدالِ ذات سے عاری اور جاہل لوگ سب سے زیادہ جری ثابت ہوتے ہیں جو اس امر کی دلیل ہے کہ جرأت بہر طور نیکی کے دیگر اجزا سے قطعی مختلف اور متفرق ہے۔ اس وقت بھی میں ان کے فرمان سے حیران ہوا تھا مگر اب جیسا کہ میں نے معاملہ آپ کے ساتھ

زیر بحث لانے کی کوشش کی ہے، پہلے سے بھی زیادہ متحرک ہوں اور جب میں نے ان سے پوچھا کہ کیا بہادر اور جری سے ان کی مراد اعتمادِ ذات رکھنے والے لوگ ہیں تو ان کا جواب ہاں میں تھا۔ اس اضافے کے ساتھ کہ ایسے لوگ اپنی ذات پر اعتماد رکھنے کے علاوہ لڑنے مرنے کے لیے بھی ہر وقت مستعد رہتے ہیں۔ (جناب پروٹاغورس، اگر آپ کو یاد ہو تو آپ نے یہی فرمایا تھا ناں!)

پروٹاغورس نے اعتراف کیا۔

اس پر میں نے کہا۔ یعنی یہ جری لوگ انہی خطرات کی طرف دوڑتے ہیں جن سے بزدل لوگ فرار اختیار کرتے ہیں؟

نہیں اس نے جواب دیا۔

تو کیا کسی مختلف شے کے حوالے سے وہ بہادر ہوتے ہیں؟

ہاں۔ اس نے جواب دیا۔

یعنی بزدل لوگ وہاں جانا پسند کرتے ہیں جہاں سلامتی ہو اور بہادر وہاں جاتے ہیں جہاں خطرات ہوں؟

ہاں سقراط۔ عام لوگوں کا یہی خیال ہے!

مگر میں تو یہ جاننا چاہتا ہوں۔ میں نے کہا۔ کہ جیسے آپ نے فرمایا، بہادر لوگ خطرات کی طرف دوڑتے ہیں تو کیا وہ ان کو خطرات ہی سمجھ کر دوڑتے ہیں یا کسی غلط فہمی کی بنا پر ایسا ہوتا ہے؟

نہیں۔ اس نے کہا۔ بلکہ آپ خود ہی یہ بات پہلے ہی ثابت کر چکے ہیں کہ وہ خطرات کو خطرات ہی سمجھ کر دوڑتے ہیں۔

میں نے کہا۔ یہ بھی درست ہے۔ اور اگر اس بات کو ہم حقیقی معنوں میں ثابت کر سکیں کہ کوئی بھی ایسی جگہ پر جانا نہیں چاہتا جہاں خطرات ہوں۔ البتہ وہ ضبطِ نفس جس کے باعث لوگ خطرات کا سامنا کرتے ہیں، درحقیقت وہ لاعلمی ہوتی ہے (یعنی وہ اصل خطرے کو پہچان نہیں پاتے)۔

اس سے بھی پروٹاغورس نے اتفاق کیا۔

یہ بات بہادر اور بزدل دونوں قسم کے لوگوں پر صادق آتی ہے کہ وہ ایسے حالات کا سامنا آسانی سے کر سکتے ہیں جن کے بارے میں وہ پُر امید ہوں۔ گویا یوں بزدل اور بہادر دونوں ایک جیسی شے کا سامنا کرتے ہیں؟

مگر پھر بھی سقراط! پروٹاغورس بولا، میرے خیال میں تو جس شے کو بزدل سامنا کرنے کے لیے قبول کرتا ہے، بہادر کے لیے وہ شے برعکس ہونی چاہیے، مثلاً عملی تجربہ بتاتا ہے کہ بہادر جنگ پر جانے کے لیے تیار ہو جاتا ہے جبکہ بزدل ایسا سوچ بھی نہیں سکتا۔

محترم اور غیر محترم کے بارے میں جنگ پر جانے کے حوالے سے آپ کی رائے کیا ہے؟

اس نے کہا، محترم جانا چاہیں گے۔

اور یہ تو ہم پہلے ہی طے کر چکے ہیں کہ محترم لوگ اچھے ہوتے ہیں (اچھائی سے منسلک ہوتے ہیں)۔

یہ حقیقت ہے اور میں اس رائے پر ہمیشہ ڈٹا رہوں گا۔

درست! میں نے کہا۔ ان دونوں قسم کے لوگوں میں سے جو لوگ جنگ پر جانے کو تیار نہیں ہوتے کیسے لوگ کہلائے جائیں گے درآں حالیکہ جنگ بہرطور اچھی اور قابلِ اعزاز وافتخار شے ہے؟

وہ یقیناً بزدل کہلائیں گے۔ اس نے جواب دیا۔

اور اس کے بارے میں کیا خیال ہے کہ جو شے اچھی اور باعث افتخار ہو وہ خوشگوار ہوتی ہے؟

اس کا تو ہم پہلے اعتراف کر چکے ہیں کہ ایسی شے خوشگوار ہی ہوتی ہے۔ اس نے جواب دیا۔

اور کیا بزدل لوگ جب عمدہ، خوشگوار اور بہتر شے کی طرف رجوع نہیں کرتے تو وہ لوگ یہ جانتے ہیں کہ کیا کر رہے ہیں؟

اگر ہم اسے درست سمجھیں تو ہمارا سابقہ بیان خود بخود غلط ثابت ہو جائے گا۔ اس نے کہا۔

اور کیا بہادر لوگ بہتر، زیادہ خوشگوار اور عمدہ شے کی طرف رجوع نہیں کرتے؟

یقیناً کرتے ہیں، اس نے کہا۔

اور یہ کہ جرأت مند آدمی کے خوف اور اعتماد میں سے کچھ بھی کم درجہ نہیں ہوتا؟

درست! اس نے کہا۔

چلیے کم درجہ نہ سہی تو کیا قابل احترام واعزاز ہوتا ہے؟

اس نے اثبات میں جواب دیا۔

اور اگر قابلِ اعزاز واحترام ہوگا تو اسے اچھائی کہیں گے؟

جی ہاں!

مگر بزدل آدمی کا خوف بھی اور اعتماد بھی بے وقوف اور دیوانے آدمی کی طرح کم درجہ ہوتا ہے؟

اس نے ہاں میں جواب دیا۔

اور یہ کم درجہ اعتماد اور خوف دراصل جہالت اور غیر تعلیم یافتہ ہونے کی وجہ سے ہوتا ہے؟

بالکل صحیح۔ اس نے کہا۔

تو کیا بزدل شخص جس مقصد کے تحت ایسا کام کرتا ہے اس کو آپ بزدلی کہیں گے یا بہادری؟

اسے ہم بزدلی کہیں گے۔ اس نے کہا۔

کیا ان کی بزدلی ان کی خطرے سے عدم واقفیت کی بنا پر نہیں ہوتی؟

اس نے کہا۔ یقیناً۔

اور اسی عدم واقفیت کے باعث ہی وہ بزدل ہوتے ہیں؟

جی ہاں!

اور بزدل ظاہر کرنے کی وجہ (جس کی آپ نے تصدیق کی ہے) بزدلی ہوتی ہے؟

اس نے مثبت جواب کے لیے سر ہلایا۔

اور جرأت و مردانگی یقیناً بزدلی کے برعکس شے ہے؟

درست!

گویا دانائی جس کے باعث ہم جان پائے ہیں کہ کیا خطرناک ہے اور کیا نہیں، عدم واقفیت سے متضاد ٹھہرے گی؟

اس سے بھی اس نے اتفاق کیا۔

اور ان سے عدم واقفیت بزدلی ہے؟

اس نے اس جملے پر بڑی ردوقدح کے بعد صاد کیا۔

اور اس بات کا علم کہ کیا خطرناک ہے اور کیا نہیں، جرأت کہلائے گا۔ اور وہ ان اشیا کی عدم واقفیت کے برعکس ہے؟

اس سے اس نے اتفاق نہیں کیا مگر کچھ کہا بھی نہیں بلکہ خاموش رہا۔

کیا خیال ہے پروٹاغورس آپ نہ مثبت جواب دیتے ہیں نہ منفی .... کیوں؟

اس نے کہا۔ آپ خود ہی دلائل کو مکمل کر لیں۔

صرف ایک سوال اور مجھے پوچھنا ہے۔ میں نے کہا۔ وہ یہ کہ کیا آپ اب بھی اپنے اسی نقطۂ نظر پر قائم ہیں کہ ایسے لوگ بھی ہیں جو جاہل ہونے کے باوجود بہادر ہوتے ہیں؟

لگتا ہے سقراط! آپ نے تہیہ کرلیا ہے کہ مجھ سے جواب سُن کر رہیں گے؟ سو مجھے کہنے دیجیے کہ اس قدر مسلسل بحث وتمحیص اور مضبوط دلائل سُننے کے بعد اب میرے لیے ایسا کہنا ناممکن ہے۔

اس تمام بحث وتمحیص سے میری غرض یہ تھی کہ میں نیکی کے انسانی رویوں کے ساتھ تعلق اور اس کی ہیئت کی یقین دہانی کے علاوہ یہ بھی ثابت کرسکوں کہ نیکی کو بھی تعلیم کہا جاسکتا ہے۔ آپ کی اور ہماری بحث کا یہی ایک نتیجہ برآمد ہوتا ہے اور وہ اس لیے کہ اگر یہ دلیل بھی انسانی زبان رکھتی ہوتی تو ہم پر ہنستی اور کہتی، سقراط اور پروتاغورس، تم دونوں تو کوئی انوکھی مخلوق ہو اور تم سقراط تم تو اس پر زور دیتے رہے ہو کہ نیکی کو تعلیم نہیں کہا جاسکتا اور اب تم خود ہی اپنے بھرپور دلائل کی مدد سے یہ ثابت کرنے پر تلے ہوئے کہ اسے سکھایا جاسکتا ہے (یا سیکھا بھی جاسکتا ہے)۔ گویا اپنے ہی بیان کی نفی کر رہے ہو۔ اب تم یہ ثابت کرنے پر تلے ہوئے کہ وہ تمام اشیا جو عدل، اعتدالِ ذات اور جرأت وغیرہ علم کے دائرے میں آتی ہیں اور اس سے یہ صاف عندیہ ملتا ہے کہ ان کوائف کی مجموعی صورت یعنی نیکی کو سیکھا اور سکھایا جاسکتا ہے کیونکہ اگر نیکی، پروتاغورس کے بقول علم کے علاوہ کوئی شے ہوتی تو ماننا پڑتا کہ اسے سیکھنا یا سکھانا ممکن ہے لیکن اگر نیکی خالصتاً علم ہی کی ایک صورت ہے تو یہ یقین کیے بغیر چارہ نہیں کہ اسے سیکھنا یا سکھانا عین ممکن ہے۔ دوسری جانب پروتاغورس جو ابتدا میں اس کا قائل تھا کہ اس کی تدریس ممکن ہے اب اسے غیر علم ثابت کرنے پر تلا ہوا ہے اور اسے غیر علم تسلیم کرلیا جائے تو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ اس کی تدریس ممکن نہیں۔

سو پروتاغورس! اپنے اس خیال سے متعلق اس قدر ذہنی انتشار کا شکار ہونے پر زبردست خواہش رکھتا ہوں کہ اس ذہنی انتشار کا حل ڈھونڈنا چاہیے۔ چنانچہ میں اس وقت تک بحث جاری رکھنے کے حق میں ہوں جب تک کہ ہم نیکی کی اصلیت مکمل طور پر نہ جان جائیں اور یہ بھی ظاہر نہ ہوجائے کہ اس کی تعلیم وتدریس ممکن ہے یا نہیں۔ ایسا نہ ہو کہ ایپی میتھیس ہمیں اپنے دلائل کے جال میں پھانس لے اور بحث میں ہمیں بھٹکا دے۔ جیسا کہ آپ کی بیان کردہ کہانی سے ظاہر ہے کہ وہ ہمارے ضمن میں پہلے بھی ایسا کر چکا ہے کیونکہ میں جب بھی خود اپنی زندگی سے متعلق پرومیتھیس جیسی احتیاط میں مصروف ہوتا ہوں تو میں آپ کے ایپی میتھیس پر پرومیتھیس ہی کو ترجیح دیتا ہوں

اور جیسا میں نے پہلے بھی کہا، اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو میں اس تحقیق و جستجو میں آپ کی مدد کا خواستگار ہوں۔

پروتاغورس نے جواب دیتے ہوئے کہا، سقراط! میں گھٹیا ذہنیت کا آدمی نہیں ہوں اور نہ ہی بدطینت ہوں۔ میں آپ کی ذہنی توانائی اور مباحثے کی صلاحیت کا معترف ہوں۔ میں پہلے بھی کئی بار اس کا اظہار کر چکا ہوں کہ آپ کو میں اپنے تمام جاننے والوں میں سرفہرست سمجھتا ہوں اور آپ کی عمر کے تمام لوگوں میں آپ کو برتر خیال کرتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ فلسفے میں نام پیدا کریں گے۔ آیئے اس بحث کو کسی اور وقت کے لیے اُٹھا رکھیں۔ مناسب ہوگا کہ اس وقت کچھ اور کسی ہلکے پھلکے موضوع کو زیر گفتگو لائیں۔

یقیناً! میں نے کہا، ضرور آپ چاہتے ہیں تو یہی ہوگا۔ کیونکہ مجھے اپنی اس مصروفیت سے نمٹنا ہے جس کا میں پہلے ذکر کر چکا ہوں اور اس سے اسی لیے صرف نظر کیے ہوئے تھا کہ میں معزز کالیئس کی فرمائش ٹال نہیں سکتا تھا۔

اس طرح بحث اختتام پذیر ہوئی اور ہم سب اپنی اپنی راہ لگے۔

یوتھیڈیمس

(Euthydemus)

شرکائے گفتگو:

سقراط (Socrates) (گفتگو کا مرکزی کردار)؛ کریٹو (Crito)؛
کلینیس (Cleinias)؛ یوتھیڈیمس (Euthydemus)؛
ڈائیونائیسوڈورس (Dionysodorus)؛ سٹیسی پس (Ctesippus)۔

منظر: اپالو کی عبادت گاہ کے قریب ایک لائیسیم (خاص مدرسہ)۔

کرایٹو: سقراط! کل وہ شخص کون تھا جس کے ساتھ آپ مدرسے میں محوِ گفتگو تھے؟ آپ کو لوگوں نے گھیر رکھا تھا۔ میں آپ لوگوں کی گفتگو تو نہیں سُن سکا مگر لوگوں کے کندھوں پر سے میں نے اُس شخص کی ایک جھلک دیکھی تھی۔ مجھے وہ کوئی اجنبی لگا۔ کون تھا وہ؟

سقراط: وہاں تو دو افراد تھے۔ آپ کس کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں؟

کریٹو: میں جس شخص کی بات کر رہا ہوں وہ آپ کے دائیں ہاتھ دوسرے نمبر پر بیٹھا تھا۔ اس کے اور آپ کے درمیان کلینیس تھا جو ایگزیوکس (Axiochus) کا چھوٹا بیٹا تھا جس کی پرورش بہت عمدگی سے ہوئی ہے۔ حالانکہ وہ میرے بیٹے کریٹوبولس (Critobulus) کا ہم عمر ہے مگر اس سے کہیں زیادہ تیز اور خوش شکل ہے اور دیکھنے میں کم عمر لگتا ہے۔

سقراط: کریٹو! جس کا ذکر آپ کر رہے ہیں وہ یوتھیڈیمس تھا اور جو میرے بائیں ہاتھ بیٹھا تھا وہ اس کا بھائی ڈائیونائیسوڈورس تھا۔ اس نے بحث میں حصہ لیا تھا۔

کریٹو: میں ان دونوں میں سے کسی کو نہیں جانتا سقراط! وہ شاید نئے آنے والے سوفسطائیوں میں سے ہیں۔ وہ کس ملک سے ہیں؟ اور ان کی تخصیص علم کے کس شعبہ میں ہے؟

سقراط: بنیادی طور پر وہ کرۂ ارض کے اسی حصے سے تعلق رکھتے ہیں اور کچھ عرصہ قبل چیوس (Chios) سے تھورائی (Thurii) منتقل ہوئے ہیں مگر وہاں سے بھی انھیں نکال باہر کیا گیا اور تب سے وہ ہمارے علاقے میں رہتے ہیں اور جہاں تک کریٹو! آپ نے ان کی کسی شعبۂ علم میں تخصیص کے بارے میں پوچھا ہے تو وہ حیران کن ہے۔ انھیں اپنے شعبۂ علم کی معراج پر سمجھ لیجیے! اس سے قبل میں حقیقی پن کرائیٹم (کراٹے) کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ وہ دراصل جنگوں کی پیداوار ہیں مگر ایکرنینی (Acarnanian) کے دو بھائیوں کی مشہور جوڑی کی طرح محض جسمانی توانائی کے بل بوتے پر لڑنے والے نہیں ہیں۔ اگرچہ وہ جسمانی طور پر غیر معمولی طور پر موزوں ہیں مگر ہر قسم کے فنونِ جنگ بھی ان کی دسترس میں ہیں اور انھیں زرہ بکتر اور دیگر لوازمات کے ساتھ لڑنے میں خصوصی مہارت حاصل ہے اور معاوضہ لے کر وہ اس فن کی تربیت بھی دیتے ہیں البتہ لطف کی بات یہ ہے کہ وہ قانونی جنگ کے بھی ماہر ہیں۔ وہ نہ صرف اپنے مؤقف کی بھرپور وکالت کر سکتے ہیں بلکہ دوسروں کو بھی خطابت کا فن اس انداز سے سکھا سکتے ہیں کہ ان کا سیکھنے والا اپنے خطاب کے ذریعے عدالتوں کو متاثر کر سکتا ہے۔ مگر یہ تو ان کے فن کی محض ابتدا تھی۔ اب تو انھوں نے پینکراٹیئم (Pancratiastic) (کراٹے کی ایک قسم جس میں باکسنگ اور کشتی کا ایک خوبصورت امتزاج پایا جاتا ہے۔ مترجم) یعنی کراٹے میں بھی اپنا لوہا منوالیا ہے۔ اب یہاں انھوں نے اس فن میں بھی مہارت حاصل کر لی ہے جو لڑائی کا منفرد انداز ہے اور جسے وہ اب تک نظر انداز کرتے چلے آ رہے تھے۔ اب کوئی ان کے مقابل آنے کی جرأت بھی نہیں کر سکتا۔ یہی صلاحیت انھیں لفظوں کی جنگ کے ضمن میں بھی حاصل ہے۔ یہاں تک کہ وہ کسی طے شدہ بات کو بھی جھوٹا ثابت کرنا چاہیں تو یہ ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ میں تو اب خود کو ان کے حوالے کرنے سوچ رہا ہوں۔ عزیزم کریٹو! کیونکہ ان کا دعویٰ ہے کہ وہ اپنی صلاحیت مختصر ترین مدت میں دوسروں کو بھی سکھا سکتے ہیں۔

کریٹو: مگر سقراط! کیا آپ سیکھنے کی عمر سے گزر نہیں چکے؟ میرے پاس ایسا کہنے کا جواز ہے۔

سقراط: ہرگز نہیں کریٹو! یہ جان کر مجھے بے حد تشفی ہوئی ہے کہ مقدمات لڑنے کا فن اُنھوں نے بھی حال ہی میں سیکھا ہے۔ یعنی یہی کوئی سال دو سال قبل اور اسی سے انھیں اپنی جدید ترین دانائی و آگاہی عطا ہوئی ہے۔ البتہ یہ خطرہ مجھے ضرور محسوس ہوتا ہے کہ کہیں میں خود ان کی شہرت کو نقصان پہنچانے کا

جب نہ بن جاؤں جیسا کہ میں نے میٹروبیئس (Metrobius) کے بیٹے کونس (Connus) کے ساتھ کیا جو بہترین بربط نواز اور میرا اُستاد تھا اور جب میں نوجوان لوگوں کے ساتھ اس سے سیکھنے کے لیے جاتا تھا تو خوب میری ہنسی اُڑائی جاتی تھی اور خود کونس کو بھی دادا جی کا اُستاد کہہ کر چھیڑا جاتا تھا۔ اب میں اجنبیوں کو ویسے ہی تجربے سے دوچار کرنا پسند نہیں کروں گا۔ شاید اسی بدمزگی کے پیش نظر ایسا بھی ہو کہ وہ مجھے بطور اُستاد تسلیم ہی نہ کریں۔ البتہ یہ ہوسکتا ہے کہ چونکہ میں چند اور بوڑھوں کو اپنا ساتھ دینے پر تیار کرلوں۔ جس طرح میں نے کونس کے پاس جانے کے لیے بعض لوگوں کو اپنا ساتھ دینے پر مجبور کر دیا تھا۔ البتہ اب میں یہ بھی توقع رکھتا ہوں کہ ان میں سے ایک آپ بھی ہوں گے بلکہ کیوں نہ آپ کے بیٹے کو بطور چارے کے ساتھ لے جائیں۔ اسے تو یقیناً صاحب عمر کی حیثیت سے ان کے ہاں داخلہ مل جائے گا اور مجھے اُمید ہے کہ ان ہی کی بدولت ہمیں بھی موقع مل سکتا ہے۔

کریٹو: مجھے تو کوئی اعتراض نہیں سقراط۔ آپ چاہتے ہیں تو ٹھیک ہے مگر پہلے ذرا مجھے ان کی کچھ تفاصیل سے تو آگاہ کریں تا کہ مجھے پیشگی اندازہ ہو جائے کہ ہم کیا سیکھنے جا رہے ہیں؟

سقراط: ابھی آپ کو بتاتا ہوں کیونکہ ان کی کچھ نہ کچھ باتیں میں پہلے ہی سُن چکا ہوں۔ میں نے وہ باتیں پوری دلچسپی سے سُنی تھیں اس لیے ان میں سے اکثر میرے ذہن میں ہیں۔ میں آپ کو پوری بات بتاتا ہوں۔ اتفاق سے میں اس وقت لائسیم کے ڈریسنگ روم میں اکیلا بیٹھا تھا جہاں آپ نے مجھے دیکھا تھا اور اُٹھنے ہی کو تھا کہ مجھے مانوس آفاقی اشارہ ملا۔ سو میں دوبارہ بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد دونوں بھائی یوتھیڈیمس اور ڈائیونا ئیسوڈورس اندر آئے۔ ان کے ساتھ متعدد دوسرے لوگ بھی تھے جو یقیناً ان کے چیلے تھے۔ وہ صحن کی ڈیوڑھی میں داخل ہوئے۔ ابھی انھوں نے دو تین چکر ہی لگائے تھے کہ کلینیس اندر داخل ہوا۔ وہ آپ کے بقول پہلے سے کافی بہتر لگ رہا تھا اور اس کے پیچھے اس کے پرستاروں کا مجمع تھا۔ انہی لوگوں میں خوب صحت مند جوان پائیا کا (Paeanian) ٹیسی پس بھی تھا۔ مگر اس کے شباب میں تندی اور ترشی زیادہ تھی۔ کلینیس نے داخل ہوتے ہی مجھے دیکھ لیا اور سیدھا میری طرف لپکا کیونکہ میں تنہا بیٹھا تھا۔ وہ آ کر میرے دائیں جانب بیٹھ گیا، جیسا کہ آپ نے ابھی ذکر کیا ہے جب کہ ڈائیونا ئیسوڈورس اور یوتھیڈیمس نے جب اسے دیکھا تو ذرا دیر کو رکے، آپس میں کھسر پھسر کی اور ساتھ ساتھ ہم پر نظر بھی ڈالتے جاتے تھے۔ (کیونکہ میں

خاص طور پر انھیں غور سے دیکھ رہا تھا)۔اس کے بعد یوتھیڈیمس آ کر اس نوجوان کے ساتھ بیٹھ گیا اور دوسرا بھائی میرے بائیں جانب براجمان ہو گیا۔ان کے ساتھی بھی ادھر ادھر بیٹھ گئے۔ میں نے ان دونوں بھائیوں کو جنھیں میں نے ایک مدت سے نہیں دیکھا تھا سلام کیا اور پھر کلینیس سے مخاطب ہو کر کہا: یہ دو ذہین وفطین نوجوان ہیں یوتھیڈیمس اور ڈائیونائیسوڈورس لیکن کلینیس بھی عقل میں کم نہیں کیونکہ وہ بھی عقل کے بلند مقام پر ہے خصوصاً فنونِ جنگ کا تو یہ ماہر ہے۔کم از کم ان کا علم فوجی انتظام وانصرام،فنِ جنگ اور بالخصوص زرہ بکتر پہن کر جنگ لڑنے میں تو انھیں کمال حاصل ہے اور اس پر مستزاد کہ یہ قانون کے بھی ماہر ہیں اور جب کوئی زخمی ہو تو قانون کے ہتھیار کو کیسے استعمال کر سکتا ہے، اس بات کی تربیت دینے میں بھی ان کا کوئی مقابل نہیں۔

وہ دونوں یہ سب کچھ سنا کر بس مجھے یوں دیکھتے رہے جیسے میرے بارے میں کوئی اچھی رائے نہ رکھتے ہوں۔ پھر انھوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور ہنسنے لگے اور بالآخر یوتھیڈیمس بولا۔

سقراط! یہ سب وہ باتیں ہیں جنھیں ہم کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ ہمارے نزدیک ان کی حیثیت ثانوی ہے۔

اس پر میں ان سے مخاطب ہوا اور پوچھا کہ اگر یہ پیشے آپ لوگوں کے لیے غیر اہم اور ثانوی حیثیت رکھتے ہیں تو آخر آپ اوّلیت کن کاموں کو دیتے ہیں؟ آپ سے درخواست ہے کہ کچھ ہمیں بھی بتائیے کہ آخر وہ علوم کیا ہیں؟

اس نے مجھے جواباً کہا کہ یہ نیکی کی تعلیم ہے اور یہی ہمارا اہم ترین اور اصل پیشہ ہے اور ہم یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ اسے ہم کسی شخص کے مقابلے میں جلد اور بہترین انداز میں سرانجام دے سکتے ہیں۔

اچھا! میں نے پوچھا۔مگر یہ آپ لوگوں نے سیکھا کہاں سے؟ جیسے میں ابھی ذکر کر رہا تھا، میرا خیال تو یہ تھا کہ زرہ بکتر پہن کر جنگ ہی آپ کی اہم ترین کامیابی ہے اور آپ جب پچھلی مرتبہ یہاں آئے تھے تو خود آپ نے بھی یہی کہا تھا اور اگر واقعی اس مرتبہ آپ کے پاس کوئی خصوصی علم ہے، اوہ! معاف کیجیے گا میرا لہجہ کچھ ایسا ہو گیا تھا جیسے میں خود کو آپ لوگوں سے برتر سمجھتا ہوں۔ میں اپنے اندازِ اظہار کی اس بیہودگی پر آپ سے معذرت خواہ ہوں۔ مگر ڈائیونائیسوڈورس اور یوتھیڈیمس کیا آپ اس سلسلے میں پُراعتماد ہیں۔ دراصل یہ میدان اس قدر وسیع ہے کہ آپ کی

باتیں مجھے کچھ ناقابلِ یقین سی لگتی ہیں۔

سقراط! انھوں نے کہا، اس سلسلے میں آپ ہم سے حلف لے سکتے ہیں۔

ایسے میں تو آپ کو ایک شہنشاہ سے بھی بڑھ کر خزانے کا مالک سمجھتا ہوں یعنی علم کا خزانہ! اگر آپ مناسب سمجھیں تو براہِ کرم اپنی اس دانائی کا کچھ مظاہرہ ہمارے لیے بھی کر دیں۔

جناب سقراط! وہ بولا۔ ہم دونوں اسی غرض سے تو یہاں آئے ہیں اور ہمارا مقصد اپنے علم کا محض مظاہرہ کرنا ہی نہیں بلکہ جو بھی چاہے ہم اسے تعلیم دینے کو تیار ہیں۔

میں نے کہا۔ کم از کم آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ ہر بھلائی پسند شخص آپ سے یہ فن سیکھنا پسند کرے گا اور ان میں سے اوّلین میں ہوں گا۔ اسی طرح ہمارے یہ نوجوان دوست کلینیس اور سٹیسی پس اور ان جیسے بہت سے دوسرے لوگ ہیں جو ایسا چاہیں گے۔ (وہ لوگ اسی وقت ہمارے اردگرد اکٹھا ہونا شروع ہو گئے تھے)۔ اس لمحے سٹیسی پس، کلینیس سے ذرا فاصلے پر درمیان میں حائل ہو گیا اور جب یوتھیڈیمس مجھ سے بات کرنے کو ذرا سا آگے جھکا تو وہ ان دونوں کے درمیان حائل ہو گیا۔ اب سٹیسی پس کچھ تو اس لیے کہ وہ اپنے محبوب کو دیکھ نہیں پا رہا تھا اور کچھ اس جوش خروش کے لیے کہ وہ ان کے زیرِ تربیت آنے کے لیے بے قرار ہے، اچھل کر بالکل ہمارے بالمقابل کھڑا ہو گیا۔ یہی حال کلینیس کے دیگر پرستاروں کا ہوا۔ ان میں یوتھیڈیمس اور ڈائیونائیسوڈورس کے شاگرد بھی شامل ہو گئے۔ یہی وہ لوگ تھے جن کا نام لے کر میں نے کہا تھا کہ یہ لوگ اس کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کرنا چاہتے ہیں۔ اس پر سٹیسی پس اور دیگر لوگوں نے بیک زبان اس پر آمادگی ظاہر کی بلکہ پُر زور طریقے سے ان دونوں سے ان کی دانائی کا مظاہرہ کرنے کی فرمائش کرنے لگے۔ اس مرحلے پر میں نے کہا۔

اے یوتھیڈیمس اور ڈائیونائیسوڈورس آپ میرے ساتھ اور دیگر حاضرین کے ساتھ مہربانی کرتے ہوئے ہمیں اپنی ذہانت اور فطانت کے کچھ کرشمے دکھایئے۔ اپنے کمال کا مکمل ترین مظاہرہ کرنا تو شاید آپ کے لیے (اس محدود وقت میں) آسان نہ ہو ہمیں اتنا بتا دیجیے کہ کیا آپ محض اس شخص کو اپنی تعلیم کے ذریعے نیک بنا سکتے ہیں جو ایسا کرنے کا دل سے خواستگار ہو یا ان لوگوں کو بھی جو اس کے لیے تیار نہیں۔ خواہ اس وجہ سے کہ وہ نیکی کی تعلیم کو ممکن نہیں سمجھتے یا اس لیے کہ وہ آپ کو اس فن کا اُستاد نہیں سمجھتے؟ کیا آپ کا علم بالخصوص ایسے منفی ذہن کے حامل افراد کو

قائل کرنے کی طاقت اور صلاحیت بھی رکھتا ہے یا صرف ان لوگوں کو متاثر کر سکتا ہے جو اس کے پہلے ہی طلب گار رہے ہوں؟

یقیناً سقراط! ہمارا فن دونوں طرح کے لوگوں کے لیے ہوگا۔ ڈائیونا ئیسوڈورس نے کہا۔ آج کے دور کے لوگ بالخصوص فلسفے اور نیکی کی تعلیم کو ممکن نہیں سمجھتے یا اس لیے کہ وہ آپ کو اس فن کا اُستاد نہیں سمجھتے ؟ کیا آپ کا علم بالخصوص فلسفے اور نیکی کی تعلیم کے لیے مؤثر ترین اور سب سے زیادہ باصلاحیت افراد شمار ہوتے ہیں۔

اس نے کہا، ہاں سقراط! میں بھی یہی سمجھتا ہوں کہ یہ صلاحیت ہمیں عطا ہوئی ہے۔

جی ہاں! اور اسی لیے میں عرض کرتا ہوں کہ آپ اپنی صلاحیتوں کے دیگر پہلوؤں سے صرفِ نظر کرتے ہوئے تمام تر توجہ اس نوجوان کو (جو آپ کے سامنے ہے) اس امر پر قائل کرنے میں مرکوز کر دیں کہ یہ فلسفے اور نیکی کی تعلیم کو اپنا شعار بنائے۔ اس کے علاوہ اس ضمن میں بھی اپنی مہارت ثابت کرتے ہوئے مجھ پر اور یہاں موجود دیگر لوگوں پر مہربانی کیجیے کیونکہ یہ سچ ہے کہ یہاں موجود ہر شخص دل سے یہ چاہتا ہے بلکہ اس کے لیے بے قرار ہے کہ حقیقت میں اچھا آدمی بن جائے۔ خصوصاً اس نوجوان کا نام کلینیس ہے اور یہ ایگزیوکس (Axiochus) کا بیٹا اور عظیم بوڑھے السی بیاڈس کا پوتا ہے اور آج کے مشہور نوجوان السی بیاڈس کا چچازاد ہے۔ یہ چونکہ ابھی نوجوان ہے اور ہم سب یہ خطرہ محسوس کرتے ہیں کہ کوئی بھی اسے اپنی چکنی چپڑی باتوں سے سبز باغ دکھا کر غلط راہوں پر لگا سکتا ہے۔ یوں تو یہ تباہ ہو جائے گا۔ آپ لوگوں کی آمد ہمارے لیے عین برموقع ہے اور ہمارے لیے خوش قسمتی کی علامت ہے۔ اُمید ہے آپ ہماری موجودگی میں اس نوجوان کی آزمائش کر سکیں گے اور اس سے بحث کے ذریعے اس کی صلاحیتوں کا جائزہ لیں گے۔ آپ کو اس پر یقیناً کوئی اعتراض نہ ہوگا۔

میں نے کچھ ایسا ہی اچھا انداز اظہار اختیار کیا کہ یوتھیڈیمس نے بڑے پُروقار مگر حوصلہ افزا انداز میں جواب دیا، مجھے تو کوئی اعتراض نہیں۔ ہاں یہ نوجوان اگر جواب دینا چاہے تب!

میں نے جواب دیا وہ اس کا عادی ہے۔ کیونکہ اس کے دوست احباب اکثر آ کر اس سے سوال و جواب اور بحث و تمحیص کا سلسلہ جاری رکھتے ہیں اس لیے وہ آسانی سے آپ کے سوالات کے جوابات دے سکے گا۔

اور! کریٹو اس کے بعد کیا ہوا وہ میں صحیح انداز میں کیسے بیان کر سکتا ہوں کیونکہ حتمی دانائی پر مشتمل گفتگو کوئی معمولی بات تو ہے نہیں۔ سو میں اپنے کلام کی ممکن خامیوں پر پردہ ڈالنے کے لیے اپنی یادداشت اور موسیقیت کو ملا کر بات کو بیان کرنے کی کوشش کرتا ہوں جیسے شعرا حقائق کو شعریت کے جامے میں پیش کر کے اس کے تاثر کو چار چاند لگا دیتے ہیں۔ ان کی گفتگو (میری یادداشت کے مطابق) کچھ اس طرح شروع ہوئی۔

اے کلینیس جو لوگ سیکھتے ہیں (یا پڑھتے لکھتے ہیں) کیا وہ عقل مند کہلائے جانے چاہئیں یا لاعلم؟
نوجوان اس سوال سے خاصا گھبرایا اور پریشانی کے عالم میں میری طرف دیکھنے لگا اور میں نے اسے گھبراہٹ میں پا کر کہا، حوصلہ کرو کلینیس اور ایک باحوصلہ آدمی کی طرح جواب دو۔ جو کچھ بھی آپ کے ذہن میں آئے کہہ ڈالیے۔ مجھے یقین ہے کہ اس سوال و جواب سے آپ کے علم میں بے پناہ اضافہ ہوگا۔

وہ جو بھی جواب دے سقراط، اس نے یوں آگے جھک کر مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا کہ مجھے لگا جیسے وہ میرے کان پکڑنا چاہتا ہے، میرا خیال ہے کہ یہ حلقۂ شاگردان میں منتخب نہ ہو پائے گا۔
اس کے اس جملے کے دوران ہی کلینیس نے جواب دے دیا۔ لہٰذا مجھے اسے مناسب جواب کی طرف اشارہ دینے کا موقع نہیں ملا۔ بہر حال اس نے کہا، کہ وہی لوگ عقل مند تھے جنھوں نے کچھ سیکھا پڑھا۔

یوتھیڈیمس نے گفتگو کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ کچھ لوگ ایسے بھی ہوں گے جنھیں آپ اُستاد کہتے ہیں۔

ایسا ہی ہے ناں!
لڑکے نے تصدیق کی۔

اور وہ ان کے اُستاد ہیں جو پڑھتے اور سیکھتے ہیں مگر آپ کے گرامر کے اُستاد اور قانون کے معلم آپ کو اور دیگر طلبہ کو پڑھاتے رہے اور آپ اس دوران زیرِ تربیت تھے؟
جی ہاں۔

اور اپنے زیرِ تربیت ہونے کے عرصے کے دوران آپ اپنے زیر مطالعہ یا مشاہدہ اشیا میں سے اکثر باتیں نہیں جانتے تھے جن کے بارے میں ابھی علم حاصل کر رہے تھے؟

یقیناً نہیں جانتا تھا!

تو کیا آپ اس وقت بھی دانا تھے؟

اس نے کہا۔ نہیں بالکل نہیں۔

مگر ایسی صورت میں کہ آپ دانا نہ تھے گویا آپ بے علم تھے؟

یقیناً۔

جب آپ سیکھ رہے تھے تو ان مخصوص زیر مشاہدہ و مطالعہ اشیا کے بارے میں بھی نابلد تھے؟

نوجوان نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ (خود آپ کے جواب کے مطابق) دانا نہیں بلکہ نابلد لوگ سیکھتے ہیں۔

اس جملے پر یوتھیڈیمس کے پیروکاروں اور شاگردوں نے جن کا میں نے ابھی ذکر کیا تھا، قہقہہ لگایا اور تالیاں بجائیں اور اس سے قبل کہ نوجوان اپنی سانس درست کر سکے۔ ڈائیونائیسوڈورس نے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے (حوصلہ افزائی کرتے ہوئے) کہا، ہاں یہ بھی بتاؤ کہ جب آپ کے گرامر کے اُستاد نے تمھارے گروپ کو درس و تدریس دیا تو وہ لڑکے جو درس لے رہے تھے انھیں آپ دانا کہیں گے یا اَن پڑھ؟

وہ عقل مند تھے ا کلینیس نے جواب دیا۔

اس طرح تو دانا ہی اصل میں سیکھنے والے ہوئے نہ کہ وہ جو پہلے ہی پڑھے لکھے ہیں۔ اس طرح آپ کا یوتھیڈیمس کو دیا جانے والا آخری جواب درست نہیں ہوا۔

اس دفعہ بھی ان دو سکالروں کے پرستاروں نے تو ہنستے ہوئے اپنی عقیدت کا اظہار کیا جبکہ باقی ہم سب انگشت بدنداں تھے۔ اس موقع پر یوتھیڈیمس نے نوجوان کے ساتھ گفتگو جاری رکھنے کا ارادہ ظاہر کرتے ہوئے پہلے سے بھی زیادہ اہم سوال کیا جو دراصل رقص کے دوہرے چکر کی طرح خوبصورت تھا۔ اس نے پوچھا۔ وہ لوگ جو سیکھتے ہیں، وہ شے سیکھتے ہیں جو وہ جانتے ہیں یا وہ شے جو وہ نہیں جانتے؟

ڈائیونائیسوڈورس نے دوبارہ میرے کان میں کہا۔ سقراط یہ بھی بالکل پہلے ہی کی سی صورت حال ہے، میں نے کہا، واہ! اس کا مطلب ہے آپ کا ماضی اتنا ہی عمدہ تھا؟

یقیناً، اور وہ بھی ہمارے سارے باقی ممکن سوالات کی طرح۔ اس نے کہا۔

مجھے معلوم ہے کیوں۔ میں نے کہا۔ آپ نوجوانوں میں اس قدر مقبول ہیں؟

اسی دوران کلینیس نے یوتھیڈیمس کے سوال کا یہ جواب دیا کہ جن لوگوں نے سیکھا انھوں نے گویا وہ کچھ سیکھا جو وہ نہیں جانتے تھے۔ اس طرح اس نے پہلے جیسے سوالات کا ایک طویل سلسلہ شروع کر دیا، مثلاً:

کیا آپ حروف کو جانتے اور پہچانتے ہیں؟

اس نوجوان کا جواب مثبت تھا۔

تمام حروف کو؟

جی ہاں!

تو اُستاد جب آپ کو املا کراتا ہے تو حروف ہی کے بارے میں کراتا ہے ناں؟

اس کا جواب بھی اس نے ہاں میں دیا۔

اور جب آپ تمام حروف جانتے ہیں پھر بھی وہ اس لیے املا کراتا ہے کہ جان پائے کہ آپ کون سے حروف جانتے ہیں؟

نوجوان نے اس سے اتفاق ہی کیا۔

اس موقع پر دوسرے بھائی نے پوچھا۔ جو کچھ وہ املا کراتا ہے، کیا اس لیے نہیں کراتا کہ آپ کے سیکھنے کا عمل جاری رہے؟ اس طرح آپ جو جانتے ہیں وہ کچھ نہیں سیکھتے بلکہ انھیں وہی سیکھا رہا ہوتا ہے جو پہلے انھیں نہیں جانتا تھا؟

نوجوان نے کہا، ایسا ہوگا۔ مگر میں تو سیکھتا ہوں۔

تاہم اگر آپ تمام حروف سے آگاہ ہیں تو اس کا مطلب ہے کہ آپ وہی کچھ سیکھتے ہیں جو جانتے ہیں۔

ہاں یہ تو صحیح ہے۔ کلینیس نے کہا۔

تب اس نے کہا، گویا آپ کا پہلا جواب غلط تھا۔

ابھی یوتھیڈیمس کے الفاظ اس کے منہ میں ہی تھے کہ ڈائیونائیسوڈورس نے انھیں یوں اچک لیا جیسے کوئی گیند کو پکڑتا ہے اور اس نے اسے دوبارہ نوجوان پر پھینک مارا۔

کلینیس، اس نے کہا، یوتھیڈیمس آپ کو بے وقوف بنا رہا ہے۔ اب آپ مجھے بتائیے کہ کیا تعلیم

سے متعلق ان اشیا کا علم حاصل کرنا نہیں ہے جو ہم سیکھ رہے ہیں؟

کلینیس نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔

اور جاننے کا مطلب دراصل اسی لمحے کسی شے سے متعلق مخصوص علم کا حصول ہے؟

لڑکے نے اس سے بھی اظہارِ اتفاق کیا۔

اور نہ جاننے کا مطلب ہے اس خاص لمحے پر مخصوص شے سے متعلق علم نہ ہونا؟

اس نے اسے بھی درست قرار دیا۔

اور وہ لوگ جو کچھ حاصل کرتے ہیں وہ ہیں جن کے پاس وہ پہلے سے ہے یا وہ جن کے پاس پہلے سے نہیں ہے؟

وہ جن کے پاس پہلے سے نہیں ہے۔

اور آپ پہلے ہی ان لوگوں کو جو نہیں سیکھتے ایسے لوگ کہاں ہیں جن کے پاس علم نہیں ہے؟

لڑکے نے اتفاق کیا۔

گویا وہ جو سیکھتے ہیں ان میں شامل ہیں جو علم حاصل کرتے ہیں نہ کہ وہ جن کے پاس پہلے سے ہے؟

جی ہاں۔ بالکل یہی بات ہے۔

کلینیس! اس نے کہا۔ وہ لوگ جو سیکھتے ہیں دراصل وہ ہیں جو نہیں جانتے، نہ کہ وہ جو جانتے ہیں۔

یوتھیڈیمس اس نوجوان کو (سوالات کے) تیسرے دور میں پھنسانے کو تیار تھا مگر چونکہ مجھے معلوم تھا کہ نوجوان پریشانی کے عالم میں ہے سو میں اسے ذرا سہارا دینا چاہتا تھا تاکہ وہ بالکل ہی ہتھیار نہ ڈال دے۔ میں نے اس کی ڈھارس بندھانے کے انداز میں کہا۔ ''آپ ان دونوں کے اندازہائے اظہار میں یکسانیت سے حیران نہ ہوں اور یہ میں یوں کہہ رہا ہوں کہ آپ کو معلوم نہیں کہ یہ دونوں نوجوان آپ کے ساتھ کیا سلوک کرنے والے ہیں۔ یہ تو محض حیران کن کہانیوں سے متعلق کوری بینٹس (Corybantes) کی طرح آپ کے شوق کو مہمیز دینا چاہتے اور آپ کے ذوقِ تجسس کو اُبھارنا چاہتے ہیں۔ اور یہی تاج پوشی کا جواب بھی ہے جو (آپ آئندہ جان پائیں گے) رقص اور کھیلوں سے متعلق ایک رویہ ہے۔ اسی طرح یہ دونوں ابھی تو آپ کو اکسا رہے ہیں۔ آہستہ آہستہ یہ آپ کے تجسس کے جواب میں حصولِ معلومات کی طرف رہنمائی کرنے لگیں گے۔ ذرا وہ وقت تصور میں لایئے جب آپ سوفسطائیوں کی طرح کی عبادات کے پہلے مرحلے سے گزر

چکے ہوں گے جو کہ پروڈیکس کے بقول اصطلاحات کے درست استعمال کے دائرے میں داخل ہونے کا مرحلہ ہے۔ یہ دونوں غیر ملکی حضرات دراصل آپ کی لاعلمی کی وجہ سے آپ کو یہ بتانے کی کوشش میں تھے کہ تعلیم کے دو معنی ہیں۔ ان میں سے ایک، ایسا علم حاصل کرنا ہے جو اس سے قبل آپ کے تصرف میں نہیں اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ علم آپ کے پاس ہے مگر بے ترتیب صورت میں اور آپ تعلم کے عمل کے ذریعے اپنی معلومات کو ترتیب نو دے دیتے ہیں اس دوسری قسم کو ''تعلیم'' سے زیادہ ''جاننا'' کہنا چاہیے۔ تاہم تعلم کا لفظ بھی بہر حال استعمال ہوتا ہے اور آپ نے ملاحظہ نہیں کیا کہ کس طرح اپنی گفتگو کے ذریعے واضح کیا ہے کہ یہ لفظ دو طرح کے آدمیوں کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ یعنی وہ جو جانتے ہیں اور وہ جو نہیں جانتے۔ ایسا ہی داؤ دوسرے سوال میں بھی تھا، جب انھوں نے پوچھا تھا کہ آیا لوگ وہی کچھ سیکھتے ہیں جو جانتے ہیں یا وہ کچھ جو وہ نہیں جانتے۔ تعلم کی یہ منازل مشکل نہیں ہیں۔ اسی لیے میں کہتا ہوں کہ یہ دونوں حضرات سنجیدہ نہیں بلکہ آپ سے محض شغل کر رہے ہیں۔ کیونکہ یہ لازمی نہیں کہ مخصوص اشیا کا علم رکھنے والا ہر فرد لازماً دانا تر ہوگا۔ ہاں، یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ لفظوں سے کھیل سکتا ہے یعنی وہ لوگوں کو الفاظ کے ہیر پھیر میں پھنسا کر بے وقوف بنا سکتا ہے۔ ایسے لوگوں کی مثال اس شخص کی سی ہوتی ہے جو کسی شخص کو بیٹھتے دیکھ کر چپکے سے اس کے پیچھے سے سٹول ہٹا لیتے ہیں اور جب ان کا وہ دوست آرام سے بیٹھنے کی کوشش میں پیٹھ کے بل گر جاتا ہے تو اس کی ہیئت کذائی دیکھ کر قہقہے لگاتے اور خوشی کا اظہار کرتے ہیں۔ آپ ان لوگوں کے ساتھ اپنی ساری گفتگو کو محض کھیل سمجھیے۔ مگر آنے والے لمحوں میں وہ جو کچھ کریں یا کہیں گے وہ بالکل سنجیدہ ہوگا اور وہ اس سے اپنا اصل مقصد ظاہر کریں گے اور مجھے اُمید ہے کہ وہ اپنا وعدہ پورا کریں گے۔ (وہ میں انھیں بتاؤں گا کہ کیسے)۔ دراصل انھوں نے مجھ سے ہورٹیٹری (hortatory) فلسفے کے مظاہرے کا وعدہ کیا تھا مگر فی الحقیقت وہ پہلے ایک کھیل کھیلنا چاہتے تھے اور اب یوتھیڈیمس اور ڈائیونائیسوڈورس، میں آپ سے بھی یہی کہوں گا کہ ابتدائی کھیل کے طور پر آپ نے کافی کارروائی کر لی ہے۔ کیا آپ اس نوجوان کو یہ بتانے کی زحمت فرمائیں گے کہ کسی شخص کو نیکی اور دانائی کی تعلیم کے لیے کیسے پیش کرنا چاہیے۔ پہلے مثلاً میں آپ کو دکھاتا ہوں کہ اس کے بارے میں میرا تصور کیا ہے اور یہ کہ میں کس نوعیت کی گفتگو سُننے کا متمنی ہوں۔ تاہم اگر میں اپنے متصورہ خیال کا مظاہرہ غیر فنکارانہ اور بے ڈھنگے انداز میں کروں تو

بھی ہنسیے گا مت، کیونکہ میں تو آپ لوگوں کے سامنے فقط زبانی اور فی البدیہہ عرض کروں گا کیونکہ فی الحقیقت میں آپ کی صلاحیتوں سے استفادہ کرنا چاہتا ہوں۔ سو میں چاہوں گا کہ آپ اور آپ کے شاگرد ہنسنے (یا ہنسی اُڑانے) سے اجتناب کریں۔

اور اب اے ایگزیوکس کے بیٹے میں آپ سے ایک سوال پوچھنا چاہتا ہوں کیا تمام لوگ خوشی کے طلب گار نہیں ہوتے؟ پھر بھی شاید یہ ایک بڑا ہی نامعقول سوال ہے جسے کوئی معقول آدمی پوچھنا پسند نہیں کرتا۔ کیونکہ حقیقت میں کوئی بھی فرد ایسا نہیں ہوگا جو خوشی نہ چاہتا ہو۔

کلینیس نے کہا، ہاں کوئی بھی فرد ایسا نہیں ہو سکتا جو خوشی نہ چاہتا ہو۔

سو جب میں نے کہا کہ ہم سب خوشی چاہتے ہیں، تو کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم خوش نہیں ہیں؟ یہی اگلا سوال ہے۔ کیا بہت سی اچھی اشیا کے مالک ہونے کے باوجود خوش نہیں ہیں؟ اور یہ دراصل پہلے سوال کے مقابلے میں کہیں زیادہ سادہ سوال ہے۔ کیونکہ اس کے جواب میں کوئی شک ممکن نہیں۔

لڑکے نے اثبات میں سر ہلایا۔

اور کیسی اشیا کو ہم سب سے زیادہ قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں؟ احمق سے احمق آدمی بھی یہ سوال پوچھنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا کیونکہ اسے علم ہے کہ دولت ہی سب سے زیادہ قدر و منزلت کی حامل شے ہے۔

یقیناً۔ نوجوان کلینیس نے کہا۔

اور کیا صحت اور حُسن بھی وجود کے دیگر خصائص کی طرح قابلِ قدر اور مستحسن نعمتیں نہیں؟

بالکل ہیں۔

کیا اس میں کوئی شک ہے کہ اچھی پیدائش (اچھی نسل) اقتدار اور اپنی سرزمین، عزت و افتخار کو اچھائی کی حیثیت حاصل ہے؟

بالکل ہے۔

اس کے علاوہ کون کون سی اچھائیاں وجود رکھتی ہیں؟ میں نے کہا۔ مثلاً آپ اعتدالِ ذات، عدل و انصاف، جرأت و مردانگی اور ایسے خصائص کو اچھائیوں میں شمار نہیں کر سکتے۔ کلینیس کیا ہم ایسے لوگوں کو اچھے لوگوں میں شمار کر کے صحیح ہوں گے یا شمار نہ کر کے؟ کیونکہ اس ضمن میں دو آرا ہو سکتی ہیں۔

آپ کا کیا خیال ہے؟

ان صلاحیتوں کے حامل اچھے لوگ کہلائیں گے۔

خوب! میں نے کہا۔ کیا ان اچھائیوں میں کہیں دانائی کو بھی جگہ مل سکتی ہے یا نہیں؟

یقیناً اس کا شمار بھی اچھائیوں میں ہوتا ہے۔

ذرا غور کر کے بتایئے کوئی قابلِ ذکر نیکی رہ تو نہیں گئی؟

میرا خیال ہے کوئی نہیں رہ گئی۔ کلینیس نے کہا۔

میں نے کہا: اپنی یادداشت کی بنیاد پر، میں سمجھتا ہوں کہ ہم نے سب سے بڑی اچھائی نظرانداز کر دی ہے۔

وہ کون سی ہے؟ اس نے پوچھا۔

خوش قسمتی (یا قسمت/مقدر) میں نے کہا۔ احمق ترین لوگ بھی اس کے قائل ہیں کہ خوش قسمتی تمام اچھائیوں کی بنیاد ہے۔

بالکل سچ! اس نے کہا۔

اب یہی دیکھ لیجیے، ایگزیوکس کے بیٹے کہ ہم نے ان دونوں اجنبیوں کے لیے ہنسی کا خاصا سامان فراہم کر دیا ہے۔

وہ کیسے؟ آپ کیا کہنا چاہتے ہیں۔

کیونکہ اچھی قسمت کو ہم پہلے ہی گن چکے ہیں اور اب اسے دہرا رہے ہیں۔

یعنی؟

یعنی یہ کہ جب ہم اچھی قسمت کو اپنی فہرست میں رکھ چکے ہیں تو کیا اس کا اعادہ حماقت نہیں؟

اس نے پھر اس کا مفہوم پوچھا تو مجھے وضاحت کرنا پڑی کہ دانائی یقینی طور پر اچھی قسمت ہی ہے۔

یہ بات تو ایک بچہ بھی جانتا ہوگا۔

وہ سادہ لوح نوجوان مبہوت رہ گیا اور اسے حیران دیکھ کر میں نے کہا۔ کیا آپ کو علم نہیں کہ وہ لوگ جو بانسری بجا سکتے ہیں وہ اس فن میں بہت ہی کامیاب اور خوش نصیب لوگ ہیں؟

اس میں شک ہی نہیں۔

اور جو لوگ کتابت جانتے اور حروف پڑھنے اور لکھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں وہ اس سلسلے میں خوش قسمت

ترین لوگ ہوتے ہیں؟

یقیناً۔

اور سمندر کی وسعت اور خطرناکیوں کے درمیان کامیاب ناخدا کیا خوش قسمت فرد نہیں ہوتا۔

اس سے زیادہ خوش قسمت اور کون ہوگا؟

اور اگر آپ جنگ میں شامل ہوں تو کیا آپ دانا جرنیل کے ساتھ شامل ہونا پسند کریں گے یا بیوقوف جرنیل کے؟

یقیناً عقل مند جرنیل کے ساتھ۔ اس نے کہا۔

اور اگر آپ بیمار پڑ جائیں تو کیا آپ عقل مند معالج سے علاج کروائیں گے یا بے وقوف جاہل شخص سے؟

اس سے جو عقل مند ہو۔

تو کیا خیال ہے کسی عقل مند شخص کا ساتھ خوش قسمتی کی علامت ہے یا احمق شخص کے ساتھ شامل ہونا۔

اس نے کہا: عقل مند کے ساتھ۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ دانائی انسان کو خوش قسمتی عطا کرتی ہے کیونکہ دانائی کی موجودگی میں انسان غلطی سے بچا رہتا ہے اور صحیح عمل کرتا ہے اور یوں کامیاب رہتا ہے ورنہ اس کی دانائی، دانائی کیوں کہلائے!

مختصر یہ کہ ہم کسی نہ کسی طرح اس بیان پر متفق ہو گئے کہ جس کے پاس دانائی جیسی نعمت ہو۔ اسے دنیاوی دولت کی حاجت نہیں ہوتی یعنی خوش قسمتی کی کسی اور نوعیت کی ضرورت نہیں پڑتی۔ میں نے اسے پچھلے سوال میں اُٹھائے گئے نکتے کی یاددہانی کراتے ہوئے کہا، آپ کو یاد ہوگا کہ ہم نے اس سے اتفاق کیا تھا کہ اگر ہمارے تصرف میں بہت سی مفید اشیا ہوں تو خوش قسمت اور خوش حال کہلائیں گے۔ ایسا ہی ہے ناں؟

اس کا ردعمل مثبت تھا۔

اور یہ بتائیے کہ ان اشیا کی ہمارے پاس موجودگی اس صورت میں خوش قسمتی قرار پائے گی جب ہم ان سے فائدہ اٹھائیں یا اس صورت میں بھی کہ ہم ان سے کوئی فائدہ نہ اٹھا پائیں؟ صرف اس صورت میں جب ان سے فائدہ اُٹھایا جا سکے۔ اس نے کہا۔

تو کیا ان کی محض موجودگی اس امر کی ضمانت ہے کہ ان سے فائدہ حاصل ہوگا یا اس کے لیے باقاعدہ ارادتاً فائدہ اُٹھانا ضروری ہے؟ مثال کے طور پر اگر ہمارے پاس خوراک کا انبار ہو مگر ہم کھائیں نہیں۔ مشروبات کا ذخیرہ موجود ہو مگر ہم پی نہ سکیں۔ کیا اس صورت میں فائدہ اُٹھانے کی بات درست ہوگی؟

ہرگز نہیں۔ اس نے کہا۔

یا کسی دستکاری کی مثال لیجیے۔ اس کے پاس تمام ضروری اوزار ہوں، مگر وہ انھیں استعمال نہ کر پائے کیا ان اشیا کی موجودگی کا کوئی فائدہ ہے؟ یا مثلاً کسی بڑھئی کے پاس تمام ضروری اوزار اور ڈھیروں لکڑی ہو مگر وہ کام نہ کرے تو اس کا کیا فائدہ ہوگا؟

کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔

اگر کسی شخص کے پاس دنیاوی دولت اور اس کے متعلق تمام اچھی اشیا موجود ہوں مگر انھیں استعمال نہ کیا جا سکے تو کیا وہ شخص ان اشیا کی ملکیت سے خوشی محسوس کرے گا؟

یقیناً نہیں۔ سقراط۔

تو اس سے یہ حتمی نتیجہ نہیں نکلتا کہ کسی شخص کے پاس اچھی اشیا کی موجودگی کافی نہیں بلکہ ان کا استعمال بھی ضروری ہے۔ محض اشیا کو قبضے میں رکھنا بے معنی ہے۔

بالکل درست۔

تو جناب کلینیس! اگر آپ کے پاس اچھی اشیا بھی ہیں اور آپ انھیں استعمال بھی کرتے ہیں تو کیا خوشی کے لیے اتنا ہی کافی ہوگا؟

میرے خیال میں تو کافی ہوگا۔

چاہے وہ شخص ان کو صحیح طریقے سے استعمال کرے یا غلط طریقے سے؟

نہیں۔ صرف اس صورت میں جب وہ صحیح استعمال کرے۔

درست۔ میں نے کہا۔ غلط استعمال سے کہیں بہتر ہے کہ اشیا کو استعمال ہی نہ کیا جائے کیونکہ عدم استعمال نہ اچھائی ہے نہ بُرائی جبکہ غلط استعمال تو صریح بُرائی ہے۔ کیا خیال ہے؟

آپ درست کہتے ہیں۔ اس نے کہا۔

اب لکڑی کے صحیح استعمال کے لیے بڑھئی کے فن کا علم کیا لازمی نہیں؟

اس کے علاوہ اور کیا ہوگا؟ اس کا جواب تھا۔

اور برتن سازی کے لیے اس فن کا علم لازمی ہے؟

اس کا جواب مثبت تھا۔

اسی طرح دولت، صحت، حسن اور ایسی دیگر اچھائیوں کے ضمن میں یہی اصول لاگو نہیں ہوتا کہ ان کا صحیح استعمال اور ان سے متعلق اپنی پریکٹس میں باقاعدگی لانا لازم نہیں ہے۔

اس نے اس سے بھی اتفاق کیا۔

گویا ہر شے کو دستیابی اور اس کے استعمال کے لیے علم ہی لازمی امر نہیں ٹھہرتا جس سے کہ انسان کو بھلائی اور خوش قسمتی کے علاوہ کامیابی بھی حاصل ہوتی ہے؟

اُس نے اس سے بھی اتفاق کیا۔

میں نے کہا۔ پس مجھے بتایئے! کہ اگر انسان کے پاس معقولیت اور دانائی نہ ہو تو محض اشیا کی ملکیت کیا فائدہ دے گی؟ کیا آدمی دانائی کے بغیر اور محض بہت سی اشیا کی ملکیت سے ہی خوشحال کہلایا جاسکتا ہے؟ سو اس موضوع پر ذرا اور غور و فکر کیجیے! اگر کوئی شخص کم کام کرے گا تو اس سے کم غلطیوں کا ارتکاب ہوگا؟ اور اگر غلطیوں کی تعداد کم ہوگی تو بد قسمتی کا پہلو کمزور تر ہوگا اور اگر اس کی زندگی میں بد قسمتی کا عنصر کم ہو جائے گا تو کیا اس کی مشکلات اور مسائل میں کمی نہیں ہوگی؟

اس نے کہا۔ مجھے آپ کے ایک ایک لفظ سے اتفاق ہے۔

اور ایسی صورت حال پر کون پورا اُترتا ہے، امیر آدمی یا غریب آدمی؟

ایک غریب آدمی۔

ایک کمزور شخص یا طاقتور؟

کمزور شخص۔

ایک شریف آدمی یا گھٹیا شخص؟

ایک گھٹیا شخص۔

اور یہ کہ ایک بزدل آدمی بہادر یا اعتدال ذات کے حامل شخص کے مقابلے میں کم غلطیاں کرے گا؟

جی ہاں۔

اور ایک سست آدمی کم غلطیاں کرے گا یا چالاک اور مستعد آدمی؟

ست یا بینائی اور سماعت کے نقص میں مبتلا شخص، صحت مند اور تیز فہم کے مقابلے میں کم غلطیاں کرے گا؟

ہم دونوں نے ان تمام نکات پر اتفاق کیا۔

ایسی صورت میں، میں نے کہا، کلینیس، اس بحث سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ مذکورہ بالا تمام اچھائیاں اسی صورت میں اچھائیاں ہیں جب ان کے استعمال کے عمل میں علم کا عمل دخل ہو ورنہ فی نفسہٖ یہ اچھائیاں ہیں نہ برائیاں۔ گویا ان کے استعمال کے عمل میں جہالت کا عمل دخل ان کی بُرائی کی شدت میں اضافہ کر دیتا ہے کیونکہ جہالت کی صورت میں بُرائی کے عوامل کھل کھیلتے ہیں اور استعمال کے عمل میں دانائی اور ادراک کا عمل دخل ہو تو ان کی فطرت میں اچھائی کا پہلو قوی تر ہو جاتا ہے۔

ورنہ یہ اپنی ذات میں کچھ بھی نہیں؟

اس نے کہا۔ یہ تو طے شدہ حقیقت ہے۔

سو ہم نے جو کچھ کہا اس کا نتیجہ کیا ہے؟ کیا اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ باقی تمام اشیا معتدل ہیں جبکہ اصل اچھائی دانائی کے وجود سے ہے اور اصل بُرائی جہالت کی بدولت؟

یقیناً

ایک اور نکتے پر بھی غور کر لینا بہتر ہے۔ میں نے کہا، یہ دیکھتے ہوئے کہ ہر شخص خوشی چاہتا ہے اور خوشی ہماری بحث کے مطابق اشیا کے استعمال میں مضمر ہے بلکہ زیادہ مناسب الفاظ میں صحیح استعمال میں ہے اور اشیا کے صحیح استعمال کا دارومدار علم پر ہے۔ سو نتیجہ گفتگو اس کے سوا کیا ہوگا کہ جو بھی خوشی کا خواستگار ہے وہ زیادہ سے زیادہ دانائی کے حصول میں اپنی تمام کوششیں صرف کر دے۔ آپ کیا کہتے ہیں؟

میں آپ سے متفق ہوں۔ اس نے کہا۔

اور ظاہر ہے کہ جب بھی کوئی شخص اس نعمتِ غیر مترقبہ کو اپنی دسترس میں رکھنے کا خواستگار ہو اور وہ بھی مادی دولت سے زیادہ اپنے متعلقین یعنی والدین، سرپرستوں، دوستوں یا اساتذہ (خواہ وہ مقامی ہوں یا غیر ملکی) سے حاصل کرنا چاہے تو اسے ایسے لوگوں سے علم و تعلم کے حصول کی درخواست کرنے میں توہین کا کوئی پہلو نہیں نکلتا۔ سو اگر کسی شخص کا اولین مقصد حصول علم و حکمت ہو تو چاہے وہ کچھ بھی کرے (محبت کرنے والا ہو یا نہ ہو) کوئی شخص ایسی کوشش کو مذموم نہیں کہہ سکتا۔ کیا آپ

اس سے متفق ہیں؟ میں نے پوچھا۔

بالکل متفق ہوں اور آپ کو درست سمجھتا ہوں۔ اُس نے کہا۔

ہاں۔ میں نے کہا، کلینیس، بشرطیکہ دانائی کوئی سکھائی جا سکنے والی شے ہو، کیونکہ یہ نکتہ ابھی زیرِ بحث نہیں آیا اور بحث طلب ہے کہ آیا دانائی کی تعلیم و تدریس ممکن ہے یا یہ کوئی بے اختیار حاصل ہو جانے والی شے ہے! ابھی آپ کا اور میرا اس پر متفق ہونا باقی ہے۔

اس نے کہا۔ مگر میرا خیال ہے سقراط، کہ دانائی کی بھی تربیت دی جا سکتی ہے۔

آپ بہترین فرد ہیں! میں نے کہا۔ مجھے آپ کے منہ سے یہ سُن کر خوشی ہوئی۔ اس لیے کہ ایسا کہہ کر آپ نے مجھے ایک طویل تحقیق وتفتیش کی پریشانی سے بچالیا ہے اور اب جبکہ آپ اس سے متفق ہیں کہ دانائی کی تربیت ممکن ہے اور یہ کہ دانائی ہی خوش بختی اور خوش حالی کا واحد ذریعہ ہے تو گویا آپ اس کی بھی تصدیق کریں گے کہ سب کے لیے دانائی کا حصول لازم ہے اور یہ بھی کہ آپ بھی اپنے لیے ایسا ہی چاہیں گے؟

یقیناً سقراط! اس نے کہا، میں دل و جان سے کوشش کروں گا۔

مجھے یہ سُن کر بڑی طمانیت ہوئی اور میں نے یوتھیڈیمس اور ڈائیونائیسوڈورس سے مخاطب ہو کر کہا کہ یہ ایک سادہ، غیر ماہرانہ اور معمولی سی کوشش ہے۔ مجھے اس اذیت کا بھی احساس ہے جو میری اس کرخت وضاحت کی صورت میں آپ لوگوں نے برداشت کی، تاہم اب میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ کوئی صاحب اسی خام بنیاد کو اپنے مخصوص اور خوبصورت انداز میں آگے بڑھائے اور اپنے مخصوص فنکارانہ انداز سے ہمیں محظوظ ہونے کا موقع دیں۔ خصوصاً اس نوجوان کو یہ بتائیے بلکہ اس پر واضح کیجیے کہ آیا اسے ہر قسم کا علم حاصل کرنا چاہیے یا خوشی اور بھلائی کے لیے کسی مخصوص نوعیت کے علم کی ضرورت ہے اور یہ کہ وہ خاص نوعیت کیا ہے؟ کیونکہ جیسا کہ میں ابتدا میں عرض کر چکا ہوں ہمیں اس نوجوان کلینیس کی زندگی کی بڑی فکر ہے اور یہ ہمیں دل و جان سے عزیز ہے۔

سوکریٹو، میں نے یہ کہا اور اپنی پوری توجہ ان کی آیندہ گفتگو کی طرف مرکوز کر دی۔ میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ میرے سوال کو کس انداز میں اور کس نقطۂ نظر سے لیتے ہیں اور وہ اس نوجوان کلینیس پر کس طرح واضح کرتے ہیں کہ وہ دانائی اور نیکی کو کیسے شعارِ حیات بنائے؟ ڈائیونائیسوڈورس جو بڑا تھا

پہلے گویا ہوا، اور وہاں موجود ہر فرد کی نگاہیں اس پر مرکوز ہو گئیں۔ جیسے انھیں مکمل یقین ہو کہ کچھ ہی دیر بعد کوئی حیرت انگیز صورت حال سامنے آنے والی تھی اور ان کی یہ توقع کچھ بے جا بھی نہیں تھی کیونکہ کریٹو، اس نوجوان سکالر نے جب اپنی گفتگو کا آغاز کیا تو وہ سُننے کے قابل تھی۔ اس کے بیان میں حیرت انگیز تاثر تھا بالخصوص نیکی کے متعلق جذبات کی تشفی کا زبردست سامان تھا۔

مجھے بتایئے سقراط، اس نے کہا، اور باقی لوگ بھی، کہ جب آپ لوگ اس نوجوان کو عقل مند اور دانا بنا دینے کی بات کرتے ہیں تو کیا آپ مذاق کے موڈ میں تھے یا واقعی آپ اپنے مؤقف میں سنجیدہ ہیں؟

مجھے اس جملے سے یہ اندازہ ہوا کہ جب ہم نے ان دونوں، نوجوان سے گفتگو کی دعوت دی تو وہ اسے مذاق سمجھے اور اسی لیے انھوں نے ابتدائی غیر سنجیدہ سوالات میں اسے الجھایا۔ سو اب میں نے اور بھی وضاحت سے ان سے کہا کہ ہم اس ضمن میں بے حد سنجیدہ ہیں۔

ڈائیونائیسوڈورس نے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کہا، غور کر لیجیے سقراط۔ کہیں آپ کو اپنے الفاظ واپس ہی نہ لینا پڑ جائیں۔

میں نے اچھی طرح سوچ لیا ہے۔ اس نے کہا، اور میں اپنے الفاظ سے انکار نہیں کروں گا۔

بہت خوب! اس نے کہا، تو گویا آپ سچ مچ چاہتے ہیں کہ کلینیس ایک دانا شخص بن جائے؟

بے شک۔

تو گویا وہ اس وقت تک دانا نہیں ہے؟

میرا خیال ہے اس کی کسر نفسی کا تقاضا یہ ہے کہ وہ یہی کہے کہ وہ دانا نہیں ہے۔

اور یہ کہ آپ چاہتے ہیں کہ وہ جاہل نہ رہے بلکہ دانا ہو جائے؟

ہاں ہم یہی چاہتے ہیں۔

یعنی آپ یہ چاہتے ہیں کہ وہ ایسا بن جائے جیسا فی الحال نہیں ہے اور جیسا ہے ویسا نہ رہے؟

میں اس جملے سے گویا الجھ کر رہ گیا اور میری اُلجھن کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے اس نے مزید کہا، آپ چاہتے ہیں کہ وہ جو کچھ ہے ایسا نہ رہے یعنی آپ چاہتے ہیں کہ اس کا (کم از کم یہ) وجود ختم ہو جائے؟ آپ کیسے پرستار اور بہی خواہ ہیں کہ سرے سے اس کے وجود کی نفی چاہتے ہیں؟

جب ٹیسی پس نے یہ سُنا تو سٹپٹایا (اس نوجوان کا پرستار ہونے کی حیثیت سے اسے ایسا کرنا ہی

چاہیے تھا) اور بولا۔ تھیورائی کے اجنبیو! اگر آداب مانع نہ ہوتے تو میں کہتا تم پر خدا کی مار! تم نے کیسے سمجھ لیا کہ میں اور اس کے دیگر چاہنے والے اپنے اس محبوب نوجوان کے وجود کے خاتمے کی خواہش کریں گے؟

تو تھیڈیمس نے جواب میں کہا، تو کیا سٹیسی پس آپ سمجھتے ہیں کہ ہم جھوٹ بول رہے ہیں؟

ہاں تو اور کیا؟ سٹیسی پس نے فوراً کہا، میں پاگل ہوں کہ اس کے علاوہ کچھ اور کہوں؟

جب آپ جھوٹ بولتے ہیں تو کیا وہ اس شے کے بارے میں ہوتا ہے جس کے بارے میں آپ گفتگو کر رہے ہوں یا اس شے کے بارے میں جو زیرِ گفتگو ہی نہ ہو؟

آپ اس شے کے بارے میں جھوٹ بولتے ہیں جس کے بارے میں بات کر رہے ہوں۔

اور جو بولتا ہے اس شے کے متعلق بولتا ہے کسی اور شے کے بارے میں نہیں؟

جی ہاں۔ سٹیسی پس نے جواب دیا۔

اور وہ دیگر اشیا سے مختلف کوئی الگ شے ہوتی ہے؟

یقیناً!

اور جو کہتا ہے وہ وہی شے کہتا ہے جو ہے۔

جی ہاں۔

اور وہ شخص جو کسی موجود شے کی موجودگی کی بات کرے سچ کہہ رہا ہوتا ہے اس لیے ڈایوٹائیسوڈورس نے جو کچھ کہا اگر وہ آپ کے متعلق واقعی درست ہے تو پھر اس نے سچ کہا۔

ہاں یوتھیڈیمس مگر ایسا کہنے سے اس کی مراد وہی کچھ ہے جو حقیقتاً نہیں ہے۔

یوتھیڈیمس نے جواب دیا۔ مگر جو کچھ نہیں ہے وہ تو نہیں ہے۔ ہے ناں؟

درست۔

اور جو نہیں کی ذیل میں آئے وہ کہیں نہیں ہوتا؟

کہیں بھی نہیں۔

تو کوئی شخص ایسی شے کے بارے میں کیسے کچھ کہہ یا کر سکتا ہے جس کا کہیں وجود نہ ہو؟ یعنی وہ کلینیس کے بارے میں ایسا کچھ نہیں کر سکتا جس کا وجود نہیں؟

سٹیسی پس نے کہا۔ شاید نہیں۔

کیا جب ماہرینِ خطابت کسی اجتماع میں بولتے ہیں تو وہ کچھ نہیں کر رہے ہوتے؟

جی نہیں، اس نے کہا۔ وہ کچھ نہ کچھ کر رہے ہوتے ہیں۔

کیا کرنا بنانے کے مترادف ہو سکتا ہے؟

جی ہاں۔

اور کچھ کہنا بھی گویا کچھ کرنے اور بتانے کے مترادف ہے؟

اس نے ہاں میں جواب دیا۔

اور جو کچھ نہیں ہے اس کے بارے میں کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ اس کے باوجود جو کوئی یہ کہہ رہا ہو ''کچھ نہیں ہے'' تو وہ بھی کچھ کہہ یعنی کر رہا ہوتا ہے اور آپ پہلے اس کی تصدیق کر چکے ہیں کہ جو کچھ ہو نہیں، اس کے بارے میں کچھ کہنا ممکن نہیں۔ اور آپ کے ہی کہنے کے مطابق کوئی شخص بھی دانستہ غلط نہیں کہتا۔ تاہم ڈائیونائیسوڈورس جو کچھ کہتا ہے وہ حقیقی ہے اور واقعتاً وجود رکھتا ہے۔

جی ہاں۔ یوتھیڈیمس نے کہا، مگر وہ اشیا کے بارے میں ان کی اصل ماہیت کے مطابق نہیں بلکہ بڑے انوکھے اور مختلف انداز میں بات کرتے ہیں۔

تو جناب، سٹیسی پس، کیا آپ سمجھتے ہیں جیسے ڈائیونائیسوڈورس نے کہا: کہ کوئی بھی مختلف اشیا کے بارے میں فقط وہی کچھ کہہ سکتا ہے جیسی کہ وہ ہیں؟

جی ہاں۔ اس نے کہا۔ تمام شرفا اور سچے لوگ یہی کرتے ہیں۔

اور اچھی اشیا اچھی اور بُری، بُری نہیں ہوتیں؟

وہ تو ہے۔

اور آپ یہ کہہ رہے ہیں کہ شرفا اشیا کے بارے میں وہی کچھ کہتے ہیں جیسی وہ اشیا ہیں؟

جی ہاں۔

یعنی اگر اچھے لوگ اشیا کو بعینہٖ ان کے وجود کے مطابق بیان کریں تو بُری شے کو بُرا ہی کہیں گے؟

بالکل ایسا ہی ہوگا۔ اس نے کہا، بلکہ وہ بُرے لوگوں کو بُرا کہتے ہیں اور اگر میں آپ کو نصیحت کرنے کی پوزیشن میں ہوں تو یہ کہوں گا کہ آپ بھی احتیاط برتیں کیونکہ لوگ آپ کو بُرا نہیں کہتے۔ میں آپ کو باور کرا سکتا ہوں کہ اچھے لوگ بُروں کو ہی بُرا کہتے ہیں۔

یوتھیڈیمس نے بحث میں شمولیت کرتے ہوئے کہا۔ کیا آپ کے جملے سے یہ مطلب لیا جائے کہ

لوگ عظیم اشیا کے بارے میں عظیم الفاظ استعمال کرتے ہیں اور گرم کو گرم ہی کہتے ہیں؟

یقیناً کہتے ہیں۔ سٹیسی پس نے کہا، اور بے مزہ اشیا کو بے مزہ اور سرد مہرانہ بات کو سرد مہرانہ کہتے ہیں۔

ارے آپ تو گالیوں پر اُتر آئے سٹیسی پس! ڈائیونا ئیسوڈورس نے کہا۔ آپ اس قدر بدزبان ہیں!!

نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔ اس نے ڈائیونا ئیسوڈورس کو جواب دیتے ہوئے کہا۔ بلکہ میں تو آپ کو پسند کرتا ہوں اور آپ کو مفید مشورہ دینا چاہتا ہوں اور اس کی بھی وجہ ہے کیونکہ آپ کے لیے اپنی پسندیدگی ہی کے ہاتھوں مجبور ہو کر میں سوچتا ہوں کہ آپ کو اس قدر بلند مرتبہ شخص ہو کر ایسی معمولی باتیں نہیں کہنی چاہئیں کہ آپ کسی کے بھی خاتمے کی بات یوں منہ بھر کر کہہ ڈالیں۔

جب میں نے دیکھا کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ اُلجھنے اور ناخوشگوار ہونے لگے ہیں تو میں نے مذاق کا انداز اختیار کرتے ہوئے کہا۔ سٹیسی پس ہمیں اس قدر معقولیت کا حامل تو ہونا ہی چاہیے کہ پردیسیوں کو ان کی زبان میں اظہارِ خیال کا موقع دیں اور لفاظی سے متعلق ان سے جھگڑا نہ کریں۔ البتہ جو کچھ ان سے ہمیں حاصل ہو، اس کے لیے ان کے شکر گزار ہوں۔ شاید وہ جانتے ہیں کہ بُرے لوگوں کی موت (روحانی موت) کا ایک یہ انداز بھی ہے اور اس طرح کے خاتمے سے بھی بُرے لوگوں سے چھٹکارا پایا جا سکتا ہے کہ جب وہ کسی شخص کو اچھا انسان بنا لیتے ہیں تو اس کا بُرا وجود خود بخود ختم ہو جاتا ہے۔ اس طرح بے وقوفوں کو عقل مند بنا کر گویا ان سے چھٹکارا ممکن ہے۔ اب یہ معلوم نہیں کہ یہ اپنی دریافت ہے یا انھوں نے یہ فن کسی اور سے سیکھا ہے کہ کس طرح بڑے لوگوں کی موت اور خاتمہ ایسے بھی ممکن ہے کہ انھیں اچھے اور نیک انسان میں بدل دیا جائے۔ یہ ایک طرح کی روحانی موت اور نئے آدمی کی روحانی زندگی کی بات ہے بشرطیکہ یہ دونوں جانتے ہوں (اور یہ یقیناً جانتے ہیں کیونکہ ابھی انھوں نے یہی تو بتایا ہے کہ یہ ان کا نو دریافت شدہ فن ہے)۔ اس لیے ہمیں ان لوگوں کو اجازت دینا ہوگی کہ وہ نہ صرف اس نوجوان کو بلکہ ہم سب کو بھی روحانی طور پر ختم کر دیں اور پھر سے (روحانی طور پر ہی) دانا لوگوں کی حیثیت سے وجود میں لائیں۔ تاہم اگر آپ نوجوانوں کو خود پر بھروسا نہیں ہے تو میں *fiat experimentum in corpore senis* کے بقول اس کیری باشندے (Carian) کا کردار ادا کرنے کو تیار ہوں جس پر وہ اپنا عمل کر سکیں

اوراس سے قبل کہ میں اپنے بوڑھے وجود کو اپنے دوست ڈائیونا ئیسوڈورس کے حوالے کروں اسے
اختیار ہوگا کہ وہ کولچیین کے میڈیا(Medea the Colchian) کی طرح مجھے برتن میں ڈالے،
مجھے مارڈالے یا اُبال لے(جو کچھ بھی کرے مگر) مجھے اچھا انسان بنادے۔
سٹیسی پس نے کہا کہ وہ بھی اپنے آپ کو اس عمل کے لیے پیش کرتا ہے۔ اس نے کہا، اگر وہ چاہیں تو
جیتے جی میری کھال اُتارلیں (حالانکہ وہ پہلے، باتوں کے ذریعے، خوب میری کھال اُتار چکے
ہیں) بشرطیکہ میری کھال سے مارسیاس(Marsayas) کی کھال سے بنائی جانے والی کھال کی بوتل
کا سلوک نہ ہو بلکہ اس سے ایک اچھا انسان وجود میں آسکے اور یہ ڈائیونا ئیسوڈورس، شریف آدمی
سمجھتا ہے کہ میں اس سے ناخوش ہوں اور اس سے جھگڑنا چاہتا ہوں۔ میری خطا فقط یہ ہے کہ جب
میں نے محسوس کیا کہ وہ میرے (یا میرے کسی عزیز کے متعلق) مناسب الفاظ استعمال نہیں کر رہے
تو میں نے صرف صدائے احتجاج بلند کی (اور اس کا حق تو مجھے حاصل ہونا ہی چاہیے)۔ اب آپ
مہربانی کر کے بدکلامی اور اختلافِ رائے کو غلط ملط تو نہ کریں جناب ڈائیونا ئیسوڈورس کیونکہ
دونوں ایک دوسرے سے قطعی مختلف، ممتاز اور منفرد ہیں۔
اختلاف رائے! ڈائیونا ئیسوڈورس فوراً بول اُٹھا۔ ایسی کوئی شے کبھی ہمارے درمیان پیدا نہیں
ہوئی۔
یقیناً ہوئی ہے۔ اس نے کہا، نہ ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ڈائیونا ئیسوڈورس کیا آپ ثابت کر
پائیں گے کہ ہمارے درمیان اختلاف رائے پیدا نہیں ہوا؟
آپ بھی یہ ثابت نہیں کر سکتے کہ میری جانب سے کسی بھی معمولی سے معمولی اختلاف رائے کا
اظہار بھی ہوا۔
تو اب آپ مجھ سے اختلاف رائے کی بات سننے کو تیار رہیے! سٹیسی پس نے کہا۔
اور آپ یہ بھی چاہیں گے کہ اسے بھی اچھائی میں بدل دیا جائے۔
یقیناً اس نے کہا۔
اچھا یہ بتائیے، دنیا کی ہر شے وضاحت یا تعارف کے لیے مخصوص الفاظ کا تقاضا کرتی ہے؟ کرتی
ہے یا نہیں؟
جی ہاں۔

اور یہ لفاظی ان کے وجود کو ثابت کرنے کے لیے درکار ہے یا عدم موجود کو؟

وجود کو۔

حقیقتاً سٹیسی پس، اور ابھی ابھی ہم نے ثابت کیا ہے کہ اگر آپ کو یاد ہو، کہ کوئی بھی شخص کسی منفی شے کی تصدیق نہیں کر سکتا کیونکہ ایسا کرنا گویا ایسی شے کا وجود ثابت کرنے کی کوشش ہے، جس کا سرے سے کوئی وجود ہی نہ ہو۔

اس سے کیا ثابت ہوتا ہے۔ سٹیسی پس نے کہا۔ اس میں آپ کے اور میرے مابین اختلاف رائے پیدا ہوتا نظر آتا ہے۔

ڈائیونائیسوڈورس بولا، ہم ایک دوسرے سے اختلاف رائے کیسے کر سکتے ہیں جبکہ ایک ہی شے کی وضاحت کے لیے کوشاں ہیں؟

یہ تو ہے۔ اس نے کہا۔

اور اگر ہم میں سے کوئی بھی کسی ایک شے سے متعلق رائے نہیں دے رہا تو گویا اس شے کے متعلق کچھ بھی نہیں کہا جا رہا؟

اس بیان کو بھی اس نے درست قرار دیا۔

اور ایسی صورت میں کہ میں کسی شے کے بارے میں کچھ کہہ رہا ہوں اور آپ کچھ بھی نہیں کہہ رہے، تو یہ کہنا کہاں تک درست ہے کہ ہم میں اختلاف رائے ہے؟

سٹیسی پس اس جملے پر خاموش رہا۔ البتہ میں نے عالم حیرت میں دریافت کیا۔ ڈائیونائیسوڈورس آپ کی اس سے کیا مراد ہے؟ آپ کے اس مؤقف کو میں کئی بار سُن چکا ہوں اور ہر بار میری حیرت میں اضافہ ہوا ہے۔ پروٹاغورس اور ان سے پہلے کے اساتذہ اور ان کے شاگرد بھی اسی کے قائل ہیں۔ میرے لیے یہ بہت حیرت انگیز بات ہے۔ کبھی کبھی مجھے اس پر خودکشی کرنے والے اور تباہ کار ہونے کا گمان ہونے لگتا ہے۔ لہٰذا میں اس کی تفصیل اور تاویل آپ ہی کی زبانی سُننا چاہتا ہوں بظاہر اس میں فلسفہ یہ ہے کہ غلط نام کی کوئی شے دنیا میں وجود نہیں رکھتی یعنی انسان کو یا تو وہ کچھ کہنا چاہیے جو حقیقت ہے یا پھر خاموش رہنا چاہیے۔ کیا آپ بھی یہی نہیں سمجھتے؟

اس نے اثبات میں جواب دیا۔

اگر غلط بولنے پر پابندی ہو تو آپ کیا سمجھتے ہیں کہ غلط سوچ پر بھی پابندی ہو جائے گی۔

نہیں! اس لیے کہ ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔

اس کا مطلب ہوا کہ غلط رائے نام کی بھی کوئی شے وجود نہیں رکھتی؟

نہیں رکھتی۔ اس نے کہا۔

اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ جہالت نام کی بھی کوئی شے وجود نہیں رکھتی؟ نہ ہی جاہل افراد کا وجود ممکن ہے کیونکہ جہالت ہی ناممکن ٹھہری۔ ایسے میں حقائق میں غلطی کا امکان بھی نہیں رہتا۔

اس نے کہا۔ یقیناً۔

تو یہ سب ناممکن ہے؟

وہ بولا۔ ناممکن۔

کیا یہ سب آپ متناقض بالذات (Paradox) طور پر کہہ رہے ہیں ڈائیونائیسوڈورس، یا آپ سنجیدگی سے ثابت بھی کر سکتے ہیں کہ کوئی بھی فرد (مکمل طور پر) جاہل نہیں ہوتا؟

اس نے کہا۔ اگر میں غلط ہوں تو آپ اسے ثابت کریں۔

جب آپ یہ بھی کہہ چکے ہیں کہ غلط ہونا ناممکن ہے تو میں آپ کو کیسے جھٹلا سکتا ہوں۔

یہ آپ نے ٹھیک کہا۔ یوتھیڈیمس نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔

یوں سمجھ لیجیے کہ میں نے آپ سے کہا نہیں کہ مجھے جھٹلا دیجیے، ڈائیونائیسوڈورس نے کہا، کیونکہ میں آپ کو کوئی کام کرنے کو کیوں کہوں گا جس کا وجود نہ ہو۔

ارے بھئی یوتھیڈیمس! میں دراصل دانائی کے ان باریک اور نفیس عناصر کے بارے میں بڑا کمزور اور غیر واضح تصور رکھتا ہوں۔ اس لیے مجھے ڈر ہے کہ میں انھیں مشکل سے سمجھ پاؤں گا۔ سو اگر میں کوئی احمقانہ سوال پوچھ لوں تو بھی آپ مجھ سے درگزر فرمائیے گا، مثلاً جب آپ کہتے ہیں کہ دنیا میں غلطی یا غلط رائے اور نادانی نام کی کوئی شے نہیں تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ انسان کوئی غلط فعل سرانجام نہیں دے سکتا کیونکہ جب آدمی کچھ کر رہا ہوتا ہے (غلط یا صحیح) تو اس کے بارے میں یہ کہنا درست نہیں کہ وہ کچھ نہیں کر رہا۔ یہی آپ کی مراد ہے؟

جی ہاں۔ اس نے کہا۔

اور اب میں اپنا احمقانہ سوال پوچھتا ہوں اور وہ یہ کہ اگر فی الحقیقت غلطی نام کی کوئی شے اعمال، الفاظ اور خیالات کے حوالے سے وجود نہیں رکھتی تو ذرا یہ تو بتائیے کہ آپ اچھائی کے نام پر یہاں

کیا پڑھانے (تعلیم دینے) تشریف لائے ہیں؟ آپ ابھی یہ نہیں فرما رہے تھے کہ آپ نیکی اور اچھائی کی تعلیم دنیا کے تمام انسانوں سے بہتر طور پر دے سکتے ہیں۔ بشرطیکہ لوگ تعلیم حاصل کرنے پر تیار ہوں؟

سقراط آپ اس عمر میں بھی ایسی احمقانہ باتیں کر سکتے ہیں؟ ڈائیونا ئیسوڈورس نے مداخلت کرتے ہوئے کہا، جو بات آپ اس وقت پوچھ رہے ہیں وہ میں گفتگو کے آغاز میں کہہ چکا ہوں۔ حیرت ہے کہ سالہا سال پہلے سُنی ہوئی باتیں تو آپ کو خوب یاد ہیں مگر ابھی کچھ دیر پہلے جو کچھ کہا گیا ہے اسے آپ بھول گئے ہیں۔

میں نے کہا، اس لیے جناب، کہ یہ باتیں معمولی نہیں ہیں اس لیے انھیں سمجھنا اور ذہن میں رکھنا مشکل ہو رہا ہے۔ اب اسی لفظ "non-plussed" کو دیکھیے۔ میں نہیں سمجھ سکا کہ اس سے آپ کیا مراد لیتے ہیں؟ ڈائیونا ئیسوڈورس ذرا اس کا مطلب تو بتایئے! کیا اس سے یہ مراد نہیں کہ میں آپ کے الفاظ اور دلائل کو جھٹلا نہیں سکتا؟ یا اس کے علاوہ کچھ مفہوم ہے تو بھی بیان فرمایئے!

اور کچھ نہیں۔ آپ نے جو کہا وہی اس کا مطلب ہے۔ اس نے کہا، سو اب جواب دیجیے!

میں نے پوچھا۔ کیا آپ کے سامنے ڈائیونا ئیسوڈورس؟

ہاں دیجیے جواب! اُس نے زور دے کر کہا۔

کیا یہ مناسب ہوگا؟

اس نے کہا۔ ہاں بالکل مناسب ہوگا؟

میں نے کہا، کس اُصول کے تحت؟ میں تو بس یہ جانتا ہوں کہ آپ عالم منطق کے ایک عظیم دانشور کی حیثیت سے یہاں موجود ہیں۔ سو آپ کے سامنے کسی کو کیا معلوم کہ کب جواب دینا مناسب ہے اور کب نہیں! اور اب آپ بالکل زبان ہی کھولنے پر تیار نہیں۔ اس لیے کہ آپ جانتے ہیں کہ آپ کو ایسا نہیں کرنا چاہیے۔

آپ تو جواب دینے کی بجائے فضول گوئی پر اُتر آئے ہیں۔ اس نے کہا اور میرے محترم دوست جب آپ مجھے ایک دانا فرد کی حیثیت سے تسلیم کر چکے ہیں تو پھر دیجیے ناں جواب جیسا میں نے کہا ہے!

میرا خیال ہے مجھے آپ کا حکم ماننا ہی چاہیے کیونکہ آپ ماسٹر ہیں مگر سوال تو دہرایئے!

وہ اشیا جو قوتِ احساس رکھتی ہیں، جاندار ہیں یا بے جان؟

وہ جاندار ہیں۔

اور کیا آپ کسی زندہ لفظ کی نشاندہی کر سکتے ہیں؟

میرا خیال ہے کہ نہیں کر سکتا۔

پھر آپ نے مجھے کیوں پوچھا کہ میرے لفظوں میں کیا معقولیت تھی؟

اس کی کہ میں ایک احمق تھا اور مجھ سے غلطی ہو گئی۔ پھر بھی میں سمجھتا ہوں کہ لفظوں میں معقولیت ہوتی ہے۔..........اے دانا شخص آپ اس ضمن میں کیا کہتے ہیں؟ اگر میں غلطی پر نہیں تو آپ بھی مجھے جھٹلانے کی حالت میں نہیں اور اگر میں واقعی غلطی پر ہوں تو پھر آپ نے یہ کیسے کہہ دیا کہ دنیا میں غلطی کا کوئی وجود نہیں؟ اور آپ کے اس جملے کو کوئی سال تو نہیں گزرا۔ تاہم میں سوچنے پر مجبور ہوں۔ ڈائیونا ئیسوڈورس اور یوتھیڈیمس کہ دلائل اسی نکتے پر رُکے ہوئے ہیں جہاں تھے ان میں کوئی پیش رفت نہیں ہوئی۔ یہاں تک کہ منطق میں آپ کی وہ نازک خیالیاں، جن کی اس قدر شہرت ہے بھی کچھ نہیں کر سکتیں۔ اُلٹا دوسروں کو نیچا دکھانے کی بجائے آپ کو خود اپنا دفاع کرنا مشکل ہو رہا ہے اب اگر کوئی نئی شے ہو تو بیان فرمائیے۔

ٹیسی پس نے کہا، چیوس (Chios) کے لوگو! آپ تھیورائی یا جو کچھ کہلاتے ہیں، مجھے آپ پر حیرت ہے کہ آپ کو فضول گوئی پر بھی کوئی اعتراض اور حجاب نہیں۔

اس خطرے کے پیش نظر کہ پھر تلخ نوائی کا آغاز نہ ہو جائے میں نے پھر کلینیس کو نرم کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا، اے ٹیسی پس میں آپ سے بھی وہی بات کہوں گا جو میں اس سے پہلے اپنے دوست کلینیس سے کہہ چکا ہوں اور وہ یہ کہ آپ ان فلسفیوں کے طریق کار سے واقف نہیں۔ یہ ان باتوں میں سنجیدہ نہیں ہوتے بلکہ مصری جادوگر پروٹیس (Proteus) کی طرح مختلف انداز اختیار کرنے کے ماہر ہیں۔ ہمیں وہ اپنے جادو کے جال میں پھانسنا چاہتے ہیں۔ ہمیں بھی مینلاس (Menelaues) کی طرح ان کو اس وقت چھوڑنا نہیں چاہیے جب تک کہ کھل کر سامنے نہیں آتے اور جب یہ اچھی طرح کھل جائیں گے تب ان کو اس وقت چھوڑنا نہیں چاہیے جب تک کہ کھل کر سامنے نہیں آتے اور جب یہ اچھی طرح کھل جائیں گے تب ان کی ذہانت کا اصل حسن آپ کی آنکھوں کو خیرہ کر دے گا۔ آیئے ان سے درخواست کریں کہ یہ اپنے اصل رنگ میں سامنے آ کر

ہمیں مستفید کریں۔ میرا خیال ہے ایک مرتبہ پھر مجھے ان کے سامنے مظاہرہ کرنا پڑے گا کہ ہم کس طرح سے ان کی ذہانت کا مظاہرہ چاہتے ہیں۔ سو میں وہیں سے سلسلہ شروع کرتا ہوں جہاں میں نے چھوڑا تھا۔ میں یہ اس لیے بھی کرنا چاہتا ہوں کہ مجھے امید ہے کہ میری باتیں اور انداز شایدان کے دلوں کو چھو لے اور وہ ہم پر ترس کھانے پر مجبور ہو جائیں اور یوں جب وہ مجھے سنجیدہ اور ان کی باتوں میں میری دلچسپی کی شدت دیکھیں گے تو یقیناً خود بھی سنجیدہ ہو جائیں گے آپ کلینیس، میں نے کہا، مجھے یاد دہانی کرائیے کہ ہم نے بات کو کہاں چھوڑا تھا۔ کیا ہم نے گفتگو اس نکتے تک نہیں پہنچائی تھی کہ فلسفہ بھی سیکھا جا سکتا ہے اور کیا یہی ہمارا حتمی فیصلہ اور گفتگو کا حاصل نہیں تھا؟

''جی ہاں'' اس نے جواب دیا۔

اور یہ کہ فلسفہ علم کا ماحصل ہے؟

جی ہاں اب بھی اس کا یہی جواب تھا۔

اور یہ کہ ہمیں کس نوعیت کا سیکھنا چاہیے؟ اور اگر ہم حقیقت بیانی سے کام لیں تو گویا وہ علم درکار ہوگا جو ہمیں اچھا انسان بنا سکے۔

یقیناً! اس نے کہا۔

اور کیا ایسا ممکن ہوگا کہ ہم زمین میں چھپے سونے کے ذخائر کا سراغ لگانے میں کامیاب ہو جائیں گے؟

شاید ایسا ہی ہو۔ کلینیس نے جواب دیا۔

مگر ابھی تو ہم نے اس سے اتفاق کیا تھا کہ اگر ہم زمین کا سارا سونا کھود نکالیں، اور وہ بلا شرکت غیرے ہماری ملکیت ٹھہرے یا ہم پتھروں کو سونے میں تبدیل کرنے کا فن جان جائیں تب بھی سونے کے حصول کا علم ہمارے لیے بیکار ہے جب تک وہ علم ہماری دسترس میں نہ ہو جس سے سونے کو زیرِ استعمال لانا ممکن ہو۔ آپ کو یاد نہیں ہم نے اس سے مکمل اتفاق کیا تھا۔ میں نے کہا۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ اس نے کہا۔

اسی طرح دوسرے فنون مثلاً رقم بنانے کا فن یا ادویہ سازی کا فن یا ایسے دیگر فنون جو اشیا کو بنانے تک محدود ہوں اور ان کے استعمال کی طرف رہنمائی نہ کریں ہمارے لیے بیکار محض ہوں گے۔ کیا میں نے ٹھیک نہیں کہا؟

بالکل ٹھیک۔
اور اگر کوئی ایسا علم ہو جو انسانوں کو غیر فانی بنا دے مگر غیر فانی ہونے کی صلاحیت کے استعمال کی طرف رہنمائی نہ کرے تو سابقہ نتائج کے مطابق ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس لافانیت کا کوئی فائدہ نہیں۔
اس نے اس سارے بیان سے اتفاق کیا۔
ایسی صورت میں عزیز محترم، میں نے کہا، اصل علم وہ ہے جو نہ صرف بنانے بلکہ استعمال کی صلاحیت بھی عطا کرے۔
آپ درست کہتے ہیں۔ اس نے کہا۔
گویا ہم بانسری ساز یا اس قسم کے فنکار بننا نہ چاہیں گے کیونکہ اس میں جاننے کا یا بنانے کا علم اور ہے اور استعمال کرنے کا اور۔ مقصد چاہے دونوں کا ایک ہی کیوں نہ ہو مگر یہ دونوں دو مختلف نوعیتوں کے حامل ہیں یعنی بنانے کا فن، استعمال کرنے کے فن سے بڑی ممتاز انفرادیت رکھتا ہے یعنی ان کے درمیان بڑا واضح فرق ہے۔ کیا میں نے درست کہا؟
اس نے اتفاق کیا۔
اسی طرح ہم بانسری سازی کے فن کو بھی پسند نہیں کریں گے کیونکہ یہ بھی گزشتہ مثال ہی کی طرح ہے۔
یہ تو ہے۔ اس نے کہا۔
مگر فرض کیجیے، میں نے کہا کہ ہم تقریر لکھنے کا فن سیکھتے ہیں تو کیا اس سے ہمیں مطلوبہ خوشی حاصل ہو جائے گی؟
کلینیس نے کہا۔ میرا خیال ہے کہ نہیں۔
میں نے پوچھا۔ آپ ایسا کس بنا پر کہہ سکتے ہیں؟
اس نے کہا، اس لیے کہ میں ایسے کئی لوگوں کو جانتا ہوں جو تقریر لکھ لیتے ہیں مگر ان کی ادائیگی کے فن سے آگاہ نہیں ہوتے بالکل ایسے ہی جیسے کچھ بانسری ساز ایسے ہیں جو بانسری کے استعمال سے قطعی نابلد ہیں۔ اسی طرح ایسے لوگوں کے وجود سے بھی انکار ممکن نہیں جو تقاریر لکھنے سے قطعی نابلد ہوتے ہیں مگر انھیں کوئی تقریر میسر آ جائے تو اس میں اپنی ادائیگی کے ذریعے یوں رنگ بھر دیتے ہیں کہ شاید اصل مصنف بھی ایسا نہ کر پاتا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ تقریر لکھنے کا فن تقریر

کرنے کے فن سے قطعی مختلف ہے۔

میں نے کہا۔ یہ تو ہے، اور میں آپ کے ان الفاظ کو بھی درست تسلیم کرتا ہوں کہ تقریر لکھنے کا فن جاننا انسان کی مکمل اور اصل خوشی کے لیے ناکافی ہے۔ مگر پھر بھی کلینیس مجھے نجانے کیوں محسوس ہوتا ہے کہ تقریر لکھنے کا فن جسے ہم مدتوں سے اپنائے ہوئے ہیں، اپنے اندر کچھ نہ کچھ غیر معمولی عنصر ضرور رکھتا ہے کیونکہ میں جتنے تقریر نویسوں سے ملا ہوں ان میں مجھے کوئی نہ کوئی غیر معمولی بات ضرور نظر آتی ہے اور ان کا فن بھی بلاشک وشبہ بہت عظیم اور آفاقی ہے کیونکہ یہ فن بھی لوگوں کو مسحور اور مبہوت کر دینے والے فن ہی کا ایک حصہ ہے اگرچہ اس سے قدرے کم مرتبے پر ہو۔ جس طرح ایک ساحر کا علم سانپوں، مکڑیوں اور بچھوؤں کو حلقۂ اثر میں لے سکتا ہے تو تقریر نویسی کے فن سے ماہرینِ قانون کے اطلاق اور ماہرین تعمیر کلیسا کے علاوہ عام انسانوں کے اجسام تک کی تعمیر پر اثر انداز ہوتا ہے اور انھیں لطف اندوز ہونے کا موقع دینے کے علاوہ انھیں بھڑاس نکالنے کا موقع بھی دیتا ہے۔ کیا آپ ان الفاظ کے لیے مجھ سے متفق ہیں؟

ہاں، اس نے کہا، میرے خیال میں آپ بالکل درست فرما رہے ہیں۔

تو کیا اب آگے چلیں یا کسی اور فن کے بارے میں بحث کا آغاز کریں؟

مجھے کچھ سوجھ نہیں رہا۔ فیصلہ کرنا مشکل ہو رہا ہے۔ اس نے کہا۔

مگر مجھے تو راستہ سجھائی دے رہا ہے۔ میں نے کہا۔

آپ کیا سوچ رہے ہیں۔ کلینیس نے پوچھا۔

میرے خیال میں ایک ماہر جرنیل کا علم اور فن باقی تمام فنون میں سرفہرست ہے کیونکہ اس میں (دشمن کے علاقے پر) قبضہ کرنے کا احساس سب سے زیادہ خوشی کا منبع ہو سکتا ہے۔

مجھے آپ سے اتفاق نہیں۔

کیوں نہیں۔ میں نے پوچھا۔

کیونکہ جرنیل کا فن انسانوں کا شکار کھیلنے کا فن ہے۔

اس سے کیا ہوتا ہے؟ میں نے کہا۔

اس لیے کہ شکار کا فن۔ اس نے کہا۔ کسی لحاظ سے بھی شکار کرنے اور پکڑنے کی حدود سے آگے نہیں بڑھتا۔ اور اگر شکار ہاتھ آ بھی جائے تو جانور شکار کرنے والے ہوں یا مچھلیوں کا شکار کرنے والے

خود اپنے شکار کو استعمال نہیں کرتے بلکہ اپنے باورچی کے حوالے کر دیتے ہیں۔ تاہم ماہرینِ ہندسہ، ماہرینِ نجوم اور ماہرینِ شماریات (جن کا تعلق ایک لحاظ سے شکاریوں ہی کے طبقے سے ہے کیونکہ وہ بھی نئی کوئی شکل نہیں بناتے) بس پہلے سے موجود اشکال میں سے مناسب ترین کا انتخاب کر لیتے ہیں۔ وہ بھی ایک لحاظ سے اپنے شکار کو خود استعمال نہیں کرتے یعنی اپنی جدول، ایجادات اور دریافتوں کو زبان کے لچھوں کے ماہرین کے حوالے کر دیتے ہیں تاکہ وہ انھیں استعمال کر سکیں۔ بشرطیکہ وہ ان میں کوئی معقولیت پا سکیں۔

میں نے کہا۔ زندہ باد میرے خوبصورت ترین اور فطین ترین کلینیس۔ کیا آپ سچ کہہ رہے ہیں؟ بالکل، کیونکہ ایک جرنیل بھی جب کسی شہر یا کیمپ پر قابض ہو جاتا ہے تو اسے سیاستدانوں کے حوالے کر دیتا ہے کیونکہ وہ خود نہیں جانتا کہ اس کا کیا کرے (کیونکہ اس کا کام صرف فتح کرنا ہے اس کا نظم ونسق چلانا نہیں) بالکل ایسے ہی جیسے کوئلیں پکڑنے والے انھیں کوئلیں پالنے والوں کے حوالے کر دیتے ہیں۔ سو اگر ہم حقیقی خوشی چاہتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ جو کچھ حاصل کریں اسے کر بھی پائیں تو جناب، اس کے لیے کسی جرنیل ورنیل کا علم کوئی فائدہ نہیں دے گا بلکہ اس کے لیے (یعنی ازلی اور ابدی خوشی کے لیے) کسی اور فن کو تلاش کرنا پڑے گا۔

کریٹو: آپ کا مطلب ہے سقراط کہ اس نوجوان نے یہ سب کچھ کہا؟

سقراط: کیا آپ کو یقین نہیں آ رہا کریٹو؟

کریٹو: ہاں میں یقیناً بے یقینی کے عالم میں ہوں کیونکہ اگر اس نے یہ الفاظ کہے ہیں تو یقین کیجیے اسے حصول علم کے لیے نہ یوتھیڈیمس کی ضرورت ہے نہ کسی اور کی۔

سقراط: ہو سکتا ہے میں بھول رہا ہوں اور یہ الفاظ اس نے نہیں کہے؟

کریٹو: سٹیسی پس؟ نے، ناممکن!

سقراط: جہاں تک مجھے یاد ہے کم از کم یہ الفاظ یوتھیڈیمس یا ڈائیونا ئیسوڈورس میں سے کسی نے نہیں کہے، میں بس یہی کہہ سکتا ہوں میرے دوست کریٹو شاید یہ الفاظ (جس طرح) میرے کانوں میں گونج رہے ہیں کسی دوسرے معمر شخص کی زبان سے نکلے ہوں۔ مگر یہ مجھے یقین ہے کہ میں نے یہی الفاظ سُنے ہیں۔

کریٹو: بالکل، یہی حقیقت بھی ہے سقراط، یہ الفاظ یقیناً کسی کائی معمر شخص نے کہے ہوں گے۔ میرے

ذہن میں تو یہی آتا ہے۔ مگر یہ تو بتائیے کہ کیا آپ نے اپنی جستجو جاری رکھی اور آپ کیا اپنے مطلوبہ فن کا سراغ لگانے میں کامیاب ہو پائے؟

کریٹو: کامیابی! ہرگز نہیں میرے دوست ایسی کوئی بات نہیں ہوئی۔ بلکہ بڑی بدمزگی ہوئی۔ ہماری حالت ان بچوں کی سی تھی جو ابابیلوں کے پیچھے ان کو پکڑنے کے لیے بھاگتے ہیں مگر وہ ہمیشہ ان کے آگے ہی آگے رہتی ہیں۔ ہم بھی آرٹ کو گرفت میں لانے کے لیے ہاتھ پاؤں مارتے رہے مگر وہ ہمیشہ ہم سے دو ہاتھ پرے ہی رہا۔ اب میں تمام کہانی دہرانے سے تو رہا۔ آخری توقع ہماری فن حکمرانی سے متعلق ہے کہ شاید اس میں حصول خوشی و اطمینان کا سراغ مل سکے۔ ہم نے اس موضوع کو خوب خوب کھنگالا اور آخری سرے پر پہنچ کر باہر آئے تو انکشاف ہوا کہ نتائج کے اعتبار سے ہم وہی ہیں جہاں سے چلے تھے۔

کریٹو: یہ کیسے ہوا سقراط!

سقراط: وہ اس لیے کہ حکمرانی کے فن کو ہم نے سیاسی عمل کے ذریعے سے دیکھنے کی کوشش کی۔

کریٹو: تو نتیجہ کیا ہوا؟

سقراط: اس شاہی یا سیاسی فن میں تقریباً تمام فنون کے عناصر موجود ہوتے ہیں اسی لیے ہم نے اس کے ایک عنصر یعنی ایک جرنیل کے فنونِ حرب کو آزمایا کیونکہ یہی ایک ایسا فن ہے جس میں جو کچھ حاصل کیا جاتا ہے اسے استعمال بھی کیا جاتا ہے۔ یہاں ہمیں اپنے مطلوبہ فن کی جھلکیاں نظر آئیں۔ یہ فن اچھی حکمرانی کا منبع ہے اور اسے ایسکی لس (Aeschylus) کی زبان میں بیان کریں تو اس کی حیثیت اس فن (چپو) کی سی نظر آتی ہے جو ایک بڑی کشتی کے ایک کنارے پر بیٹھے یا کھڑے ملاح کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ جس سے وہ کشتی کو کنارے لگانے کا کام لیتا ہے۔

کریٹو: تو اس میں غلطی کہاں ہوئی؟

سقراط: آپ خود ہی غلطی ڈھونڈ نکالیں گے اگر آپ نے وہ گفتگو سن لی جو اس مرحلے کے بعد شرکا کے درمیان ہوئی کیونکہ ہم نے جب دوبارہ بحث کا آغاز کیا تو اس سوال پر سب کی توجہ مرکوز رہی، کیا ایک حکمران اس عظیم حق حکمرانی کی مدد سے جو اسے حاصل ہوتا ہے، ہمارے لیے کیا کرتا ہے؟ اس کا جواب یہ تھا کہ وہ ہمیں یقین کی دولت دیتا ہے (احساس تحفظ کا یقین دیتا ہے)۔ کیا آپ بھی اس سے متفق نہیں؟

کریٹو: ہاں۔ مجھے متفق ہونا ہی چاہیے!

سقراط: اس کے علاوہ آپ کے خیال میں فنِ حکمرانی انسان کو کیا دیتا ہے؟ مثلاً اگر فن ادویہ سازی کو دیگر فنون پر غلبہ حاصل ہوتا یعنی اسے اپنے تابع فنون پر مکمل اعلیٰ اختیار حاصل ہوتا اور میں اس کے متعلق آپ سے یہی سوال پوچھتا تو آپ آسانی سے کہہ سکتے تھے کہ وہ صحت عطا کرتا ہے۔ ہے ناں؟

کریٹو: ہاں میں یہی کہتا۔

سقراط: آپ اپنے فن، فن کاشتکاری کے بارے میں کیا کہتے ہیں۔ فرض کیجیے آپ کے فن کو دیگر متعلقہ فنون پر اختیار حاصل ہو تو یہ ان کے لیے کیا کرے گا؟ کیا یہ زمین کے ثمرات ہم تک پہنچانے کا سبب نہیں ہے۔

کریٹو: ہاں ایسا ہی ہے۔

سقراط: اور جب فنِ حکمرانی کو اقتدارِ اعلیٰ اور قوت نافذہ میسر آ جائے تو وہ (انسان کے لیے) کیا کرے گا؟ شاید آپ اس کا فوراً جواب نہ دے سکیں؟

کریٹو: ہاں سقراط۔ واقعی۔ میں اس کے لیے تیار نہیں ہوں۔

سقراط: اسی طرح کریٹو! ہم میں سے بھی کوئی تیار نہ تھا مگر یہ تو سوچیے اگر ہر کوئی دیوانہ وار اس فن کے حصول کے پیچھے بھاگ رہا ہو تو اس فن کو کچھ نہ کچھ مفید تو ہونا ہی چاہیے۔

کریٹو: یقیناً۔

سقراط: اور اس سے ہمیں یقیناً کچھ اچھائی ہی میسر آنی چاہیے؟

کریٹو: بے شک!

سقراط: کلینیس اور میں اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ایسے کسی بھی مثبت استفادے کے لیے علم ہی واحد ذریعہ ہے۔

کریٹو: بے شک!

سقراط: سیاست کے دیگر تمام نتائج، اور وہ بھی خاصی تعداد میں ہیں مثلاً دولت، آزادی، امن وسلامتی نہ اچھے ثمرات کے ذیل میں آتے ہیں نہ بُرے کے۔ البتہ سیاسیات، علم کے ذریعے ہمیں ان ثمرات سے استفادہ کرنے کی صلاحیت عطا کرتی ہے اور شاید یہی وہ سائنس ہے جو ہمیں خوش اور اچھا

انسان بناتی ہے۔

کریٹو: آپ درست کہتے ہیں۔ آپ نے اپنی گفتگو کی جو روداد مجھے سنائی ہے اس سے میں بھی اسی نتیجے پر پہنچا ہوں۔

سقراط: آپ کے خیال میں کیا فنِ حکمرانی انسان کو دانائی اور نیکی بھی عطا کر سکتا ہے؟

کریٹو: کیوں نہیں سقراط۔

سقراط: تو کیا یہ فن مذکورہ خوبیاں ہر شخص کو عطا کرتا ہے اور کیا دوسرے فنون کے بارے میں بھی رہنمائی دیتا ہے، مثلاً بڑھئی یا جوتے بنانے والے کے کام کے سلسلے میں؟

کریٹو: نہیں سقراط۔ میرا خیال ہے، ایسا نہیں ہے؟

سقراط: تو پھر علم کیا ہے اور ہم اس کے لیے کیا کر سکتے ہیں؟ کیونکہ یہ کسی معتدل کام کا منبع نہیں ہے محض علم ہی کا منبع ہے۔ پھر آخر وہ کیا شے ہے اور ہم اس سے استفادے کے لیے کیا کریں؟ تاہم کریٹو! کیا یہ فقط علم ہی ہے جس کی مدد سے ہم لوگوں کو نیک اور اچھا بنا سکتے ہیں؟

کریٹو: یقیناً۔

سقراط: اور انسانوں کی بھلائی اور فائدہ کے لیے کیا شے درکار ہے جو علم ہی سے دستیاب ہوتی ہے۔ کیا ہمیں یہ دوہرانا پڑے گا کہ مفید ہونے کے لیے صلاحیت اور خاصیت درکار ہے وہ دوسروں کو اچھا انسان بنانے کی صلاحیت ہے؟

کریٹو: بالکل یہی بات ہے۔

سقراط: اور وہ لوگ کس لحاظ سے اچھے اور مفید ہوں گے اس کے لیے ہمیں پھر وہی بات دوہرانا پڑے گی کہ یہ لوگ دوسروں کو اچھائی کی تعلیم دیں گے اور وہ لوگ مزید لوگوں کو اچھا انسان بنانے کی تگ و دو کریں گے خواہ اس امر میں وہ خود پر یقین نہ رکھتے ہوں کہ ان کے زیرِ سایہ اچھائی کی تعلیم پانے والوں کی شخصیت کا کون سا پہلو اچھائی کا رنگ اختیار کرے گا، کیونکہ اس ضمن میں ہم نے سیاسی عمل کے ثمرات کو نظر انداز کر دیا ہے۔ یہ بات پھر اسی پرانی کہاوت جیسی ہو جائے گی اور ہم پھر اسی مقام پر کھڑے ہوں گے جہاں تھے اور خوشی کی سائنس یا فن کے علم سے ہمارا فاصلہ بدستور قائم رہے گا۔

کریٹو: فی الحقیقت سقراط، لگتا ہے کہ آپ ایک زبردست اُلجھن میں گرفتار ہیں۔

سقراط: اس پر، کریٹو، یہ دیکھتے ہوئے کہ معاملہ اب بالکل قابو سے باہر ہونے کو ہے میں نے آواز اُٹھائی

اور بحث میں کود پڑا اور اجنبیوں سے درخواست کی کہ وہ مجھے اور میرے نوجوان ساتھیوں کو بحث کے اس بھنور سے نجات دلائیں ۔ میں نے کہا کہ انھیں ہمارے کیسٹر (Castor) اور پُلاکس (Pollux) کا کردار ادا کرنا چاہیے۔ وہ سنجیدگی اختیار کریں اور پُر وقار انداز میں اس مخصوص علم کی نشاندہی کریں جس کے بل بوتے پر ہماری باقی ماندہ زندگیاں خوشی خوشی گزر پائیں۔

کریٹو: تو کیا یوتھیڈیمس نے اس مخصوص علم کی نشاندہی کردی؟

سقراط: ہاں! بالکل۔ اس نے زبردست تگ ودو کے بعد درج ذیل نتائج اخذ کیے۔

سقراط! بہتر ہے آپ کو اس علم سے روشناس کرا دیا جائے جس کی آپ نے خواہش ظاہر کی ہے۔ اس نے کہا۔

بلکہ یہ کہ جس کے خلاف آپ شکوک وشبہات میں مبتلا ہو چکے ہیں یا پھر میں ثابت کروں کہ وہ علم پہلے ہی آپ کی دسترس میں ہے۔

وہ کیا ہے۔ میں نے پوچھا۔ اور یہ کہ کیا واقعی آپ کو ایسا کرنے کی صلاحیت میسر ہے؟

ہاں۔ اس نے کہا، مجھے وہ صلاحیت حاصل ہے۔

ایسی صورت میں، میں نے کہا، براہِ کرم یہی ثابت کر ڈالیے کہ وہ علم اس وقت بھی میری دسترس میں ہے تاکہ مجھے باقی ماندہ زندگی اس کے حصول میں صرف نہ کرنی پڑے اور میں آج ہی سے اس سے استفادہ کرنا شروع کر دوں۔

اچھا چلیے۔ اس نے کہا۔ مجھے اتنا بتا دیجیے کہ اس وقت آپ کے پاس کسی بھی نوعیت کا علم ہے یا نہیں؟

ہاں۔ میں نے کہا۔ میں بہت سی چیزوں کے بارے میں جانتا ہوں مگر ان میں سے کوئی بھی قابلِ ذکر حد تک اہم نہیں ہے۔

اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس نے کہا۔ اور کیا آپ جانتے ہیں کہ ہر شے اپنے وجود کے حوالے سے ہے بھی اور نہیں بھی؟ یعنی وہ نہیں جس حوالے سے پہچانی جاتی ہے؟

میں اسے تسلیم نہیں کر سکتا۔

ابھی آپ نے کہا ہے کہ آپ بعض چیزوں کے بارے میں کچھ نہ کچھ جانتے ہیں؟

یہ تو میں کہہ چکا ہوں۔

یعنی اگر کچھ چیزیں آپ کے علم میں ہیں تو ظاہر ہے آپ ان کا علم رکھتے ہیں۔

یقیناً! مگر انہی اشیا کے بارے میں جنھیں میں جانتا ہوں۔

اس سے بھی کیا فرق پڑتا ہے اور جب آپ جانتے ہیں تو کیا آپ تمام چیزوں کے متعلق جانتے ہیں؟

ہرگز نہیں۔ میں نے کہا، کیونکہ بے شمار چیزیں ایسی ہیں جن کے بارے میں میں نہیں جانتا۔

اور اگر آپ نہیں جانتے تو مطلب یہ ہوا کہ آپ علم نہیں رکھتے؟

ہاں دوست! مگر انہی اشیا کے بارے میں جو میرے دائرہ علم سے باہر ہیں۔

اس کے باوجود بھی، ابھی آپ نے کہا تھا کہ آپ جانتے ہیں گویا بیک وقت آپ جانتے بھی ہیں اور نہیں بھی جانتے یعنی آپ کی شخصیت میں جاننے کا عنصر ہے بھی اور نہیں بھی۔

یہ تو یوتھیڈیمس، جیسے لوگ کہتے ہیں وہ آپ کی خوبصورت جھلک ہے۔ بہر طور آپ براہ کرم مجھے اس مخصوص علم کی طرف رہنمائی کریں گے جس کے لیے ہم اتنی دیر سے سر پٹک رہے ہیں اور آپ مجھے ان بھول بھلیوں میں الجھا رہے ہیں کہ کوئی شے ہو بھی سکتی ہے اور ہونے کے باوجود نہیں بھی ہو سکتی اور اس لیے اگر میں ایک شے کے بارے میں جانتا ہوں تو گویا تمام اشیا کے بارے میں جانتا ہوں کیونکہ بیک وقت میں جاننے والا اور نہ جاننے والا فرد ہو سکتا ہوں۔ سو لازم ہے کہ میں وہ علم رکھتا ہوں جس کے لیے ہم نے اس قدر مغز ماری کی ہے...... یہ کیا گورکھ دھندا ہے۔ کیا میں یہ سمجھوں کہ یہی آپ کی ماہرانہ رائے ہے؟

ارے سقراط! اس نے کہا۔ آپ نے اپنے منھ سے ہی اعتراف کر لیا۔

خوب! میں نے کہا، مگر یوتھیڈیمس یہ تو بتایئے کہ آپ کے ساتھ ایسا کچھ نہیں ہے کیا۔ یعنی میں تو آپ کے ساتھ ہی ہوں اور اپنے محترم دوست ڈائیونائیسوڈورس کی شکایت بھی نہیں کر سکتا مگر آپ یہ تو بتایئے کہ آپ کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہے کہ آپ بعض اشیا کے بارے میں نہیں جانتے تو گویا کسی بھی شے کے بارے میں نہیں جانتے؟

بالکل نہیں سقراط۔ ہمارے ساتھ ایسا نہیں ہے۔ ڈائیونائیسوڈورس نے کہا۔

کیا مطلب؟ میں نے کہا، کیا آپ کچھ بھی نہیں جانتے؟

نہیں ایسا نہیں، اس نے کہا۔ ہم ''کچھ'' جانتے ہیں۔

اور اپنے ہی قول کے مطابق۔ میں نے کہا، اگر آپ کسی بھی شے کے متعلق جانتے ہیں تو گویا آپ ہر شے کے بارے میں جانتے ہیں۔

جی ہاں، ہر شے کے بارے میں، مزے کی بات ہے کہ یہ ہماری طرح آپ کے لیے بھی سچ ہے۔

ارے واقعی؟ میں نے کہا، کیسی انوکھی بات ہے! یہ تو ایک عظیم نعمت ہوگی اور کیا باقی لوگ بھی سب کچھ جانتے ہیں یا وہ کچھ نہیں جانتے؟

ان کا حال بھی یہی ہے یعنی وہ بعض چیزوں کے بارے میں جان سکتے ہی نہیں اور بعض اشیا کے بارے میں جانتے نہیں لہٰذا ان کا عالم بھی یہ ہے کہ جانتے بھی نہیں اور نہیں بھی جانتے۔

پھر اس سے آپ کیا نتیجہ اخذ کرتے ہیں؟ میں نے پوچھا۔

یہی کہ اگر وہ ایک شے کا علم رکھتے ہیں تو ہر شے کا علم رکھتے ہیں۔

اوہ خدایا! ڈائیونا ئیسوڈورس! میں نے عالم حیرت میں کہا، شکر ہے آپ سنجیدہ تو ہوئے اور اس مرحلے تک لانے کے لیے مجھے کتنے پاپڑ بیلنے پڑے ہیں۔ بس اب یہ بتا دیجیے کہ اگر آپ (ایک شے کا علم رکھنے کی بنیاد پر) ہر شے کا علم رکھتے ہیں یعنی بڑھئی اور چمڑا کاٹنے وغیرہ کے کام تک؟

یقیناً، اس نے کہا۔

آپ گویا سلائی کا کام بھی جانتے ہیں؟

ہاں، دیوتاؤں کے کرم سے ہم جانتے ہیں۔ بلکہ جوتے بنانا بھی جانتے ہیں۔

تو کیا آپ اس قدر چیزیں جانتے ہیں جن کا شمار تاروں اور ریت کے ذرات کی طرح لامحدود ہے؟

یقیناً۔ کیا آپ کا خیال ہے کہ ہم اس سوال کا جواب نفی میں دیں گے؟

زیوس کی قسم، سٹیسی پس نے مداخلت کرتے ہوئے کہا، براہ کرم آپ مجھے اس امر کا ثبوت دے دیجیے کہ آپ درست فرما رہے ہیں۔

آپ کس قسم کا ثبوت چاہتے ہیں؟ اس نے پوچھا۔

کیا آپ بتا سکیں گے کہ یوتھیڈیمس کے کتنے دانت ہیں اور یہ بھی فرمائیں کہ آپ کے کتنے دانت ہیں؟

کیا آپ ہمارے ان الفاظ پر یقین نہیں رکھتے کہ ہم سب کچھ جانتے ہیں؟

بالکل نہیں۔ سٹیسی پس نے کہا، اس ایک شے کا آپ ثبوت دیجیے یعنی آپ ایک دوسرے کے دانتوں کی تعداد بتائیں۔ ہم انھیں واقعتاً شمار کریں گے اگر وہ تعداد درست ثابت ہوئی تو یقیناً ہم آپ کے دیگر دعوؤں کو بھی درست تسلیم کرلیں گے۔

انھیں اندازہ ہوگیا تھا کہ سٹیسی پس ان سے شغل کر رہا تھا۔ سو اس کی بات ماننے سے انھوں نے انکار کردیا مگر اس نے یہی رٹ لگائے رکھی کہ وہ سب کچھ جانتے ہیں۔ آخرکار سٹیسی پس نے بھی تمام شرم بالائے طاق رکھ دی اور کوئی احمقانہ سے احمقانہ سوال بھی ایسا نہ تھا جو اس نے پوچھ نہ لیا ہو۔ وہ ان سے بیہودہ ترین باتوں کے جاننے کے متعلق پوچھتا رہا اور وہ بھی جنگلی سؤروں کی طرح اسے اپنے سینگوں پر اٹھاتے رہے اور بے خوف وخطر یہی کہتے گئے کہ وہ سب کچھ جانتے ہیں، وہ سب کچھ جانتے ہیں۔ آخرکار میں بھی اپنی تشکیک کی عادت کے ہاتھوں مجبور ہوکر ایک سوال پوچھ بیٹھا۔ میں نے یوتھیڈیمس سے پوچھا کہ آیا ڈائیونائیسوڈورس رقص جانتا ہے؟

یقیناً اس کا جواب تیار تھا۔

کیا وہ تلواروں کے درمیان قلابازیاں کھاسکتا ہے؟ اور اس عمر میں جسم کو پہیے کی طرح موڑ سکتا ہے اور کیا وہ واقعی مہارت کے اس معیار پر پہنچا ہوا ہے؟

وہ سب کچھ کرسکتا ہے، جواب ملا۔

اور آپ ہمیشہ سے یہ جانتے آئے ہیں؟

اس نے مستعدی سے جواب دیا۔ ہمیشہ سے۔

جب آپ چھوٹے بچے تھے؟ بلکہ کیا اس وقت سے جب آپ پیدا ہوئے؟

دونوں نے بیک زبان کہا کہ ہاں اسی وقت سے۔ یہ تو ہم کبھی مان ہی نہیں سکتے تھے۔ اور یوتھیڈیمس نے کہا، سقراط، آپ تو ویسے ہی ہمیشہ سے شکی مزاج ہیں۔

ہاں میرا شک اب بھی قائم ہوتا اگر میں آپ کو ایک دانا فرد کی حیثیت سے نہ جانتا ہوتا۔ میں نے کہا۔

لیکن اگر آپ میرے سوالوں کے جواب دیتے جائیں تو میں آپ کو یقین دلادوں گا کہ خود آپ بھی ایسی ہی حیرت انگیز باتیں کرسکتے ہیں۔

بہت خوب۔ اس سے بہتر، میں اپنے لیے اور کیا چاہوں گا کہ خود کو قائل کرنے کی صلاحیت حاصل

کرلوں؟ کیونکہ اگرچ مچ میں ایک دانا آدمی ہوں جس کا کہ مجھے پہلے بالکل احساس اور ادراک نہ تھا، اور اگر آپ ثابت کر سکے کہ میں ہمیشہ سے عالم تھا تو میرے لیے زندگی میں اس سے بڑی کامیابی اور کیا ہو سکتی ہے؟

تب پھر سوالات کا جواب دینے کے لیے تیار ہو جائیے۔

پوچھیے۔ میں نے کہا۔ میں ہر سوال کا جواب دوں گا۔

سقراط، کیا آپ کچھ جانتے ہیں یا کچھ نہیں جانتے؟

کچھ جانتا ہوں۔

اور آپ کے علم کی بنیاد وہی اشیا ہیں جنھیں آپ جانتے ہیں یا وہ کوئی اور شے ہے جس پر آپ کے علم کی بنیاد ہے؟

اس شے پر جو میرے علم میں ہے اور مجھے یقین ہے اس سے آپ کی مراد میری روح ہے؟

آپ کو سقراط، کسی سوال کے جواب میں سوال پوچھتے شرم نہیں آتی؟

بہت اچھا جناب، میں نے کہا۔ میں اور کیا کروں۔ ظاہر ہے میں وہی کروں گا جو آپ نے کہا ہے۔ جب مجھے سمجھ نہیں آ رہی کہ آپ کیا پوچھ رہے ہیں۔ اب آپ پوچھیے اور اب میں جواب دوں گا۔ جواب میں سوال نہیں ٹھونسوں گا۔

میں جو کچھ پوچھ رہا ہوں اس کا کچھ نہ کچھ مفہوم تو آپ کے ذہن میں ہوگا۔

ہاں۔ کچھ نہ کچھ مفہوم تو میں سمجھ ہی لیتا ہوں۔ میں نے جواب دیا۔

سو میرے سوالوں کا جو مفہوم آپ سمجھ پائے ہیں اسی کے مطابق جواب دے دیجیے!

ایسی صورت میں آپ کا رویہ کیا ہوگا؟ کیا آپ خوش ہوں گے جب آپ پوچھیں کچھ اور میں جواب دوں کچھ اور کیونکہ جواب تو مجھے اپنے نقطۂ نظر کے مطابق ہی دینا ہوگا۔ سو اگر جواب برمحل نہ ہوا تو؟

مجھے تو یقیناً خوشی ہوگی مگر کیا آپ کو نہیں ہوگی؟ میں تو سمجھتا ہوں آپ کو بھی ہوگی۔

میں جب تک آپ کی بات سمجھ نہ لوں جواب نہیں دوں گا۔ میں نے کہا۔

آپ اپنے نقطۂ نظر کے مطابق جواب نہیں دیں گے کیونکہ آپ دقیانوسی اور پرانے خیالات کے مالک ہیں۔

اس مرحلے پر مجھے اندازہ ہوا کہ وہ مجھ پر برہم ہونے لگا ہے کیونکہ وہ مجھے اپنے لفظوں کے جال میں پھنسانا چاہتا تھا اور میں الگ اپنی شناخت قائم رکھنے کی کوشش میں تھا۔ یہی بات میں نے کونس (Connus) کے بارے میں بھی محسوس کی تھی کہ جب میں اس کے لفظوں کے پھیر میں نہیں آیا تو وہ مجھ سے کھچا کھچا سا رہنے لگا۔ بالآخر اس نے مجھے مکمل طور پر نظرانداز کرنا شروع کر دیا کیونکہ اس کا خیال تھا کہ میں یوتھیڈیمس کے پاس بطور شاگرد جانے والا ہوں۔ میں نے سوچا کہ کیوں نہ انھیں ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے (اور زیادہ دلچسپی نہ لی جائے) تاکہ وہ مجھے کند ذہن قرار دے کر مجھ سے چھٹکارا پالے۔ سو میں نے اس سے کہا: یوتھیڈیمس، آپ مجھ سے کہیں بڑے اہلِ زبان ہیں کیونکہ میں نے آج تک اس فن کو پیشہ نہیں بنایا۔ سو آپ اس ضمن میں اپنی مرضی کیجیے اور جو بھی چاہیں مجھ سے دوبارہ سوال پوچھیے، میں دلجمعی سے جواب دوں گا۔

تو پھر جواب دیجیے! اس نے کہا۔ میں ایک دفعہ پھر سوال دہراتا ہوں، بتایئے کہ آیا جو کچھ آپ جانتے ہیں وہ ''کچھ'' کے حوالے سے جانتے ہیں یا ''کچھ نہیں'' کے حوالے سے؟

ہاں۔ میں نے کہا۔ میں اپنی روح کے ذریعے جانتا ہوں۔

جو سوال سے زیادہ جواب دے رہا ہو، اسے کیا کہا جائے۔ میں نے یہ تو نہیں پوچھا کہ آپ کس شے کے ذریعے جانتے ہیں۔ میں نے تو پوچھا ہے کہ کس شے کے حوالے سے جانتے ہیں۔

میں نے پھر کہا، معاف کرنا یہ میری جہالت ہے کہ میں جواب دینے میں حد سے تجاوز کر گیا اور اب میں سادہ جواب دیتا ہوں یعنی یہ کہ میں جو کچھ جانتا ہوں ''کچھ'' کے حوالے سے جانتا ہوں۔

اور وہ کیا وہ ''کچھ''، اس نے پوچھا ہمیشہ ایک ہی ہوتا ہے یا کبھی کچھ اور کبھی کچھ اور ہوتا ہے۔

میں جب بھی کچھ جانتا ہوں ''اس'' کے حوالے سے جانتا ہوں۔

آپ اپنے جوابات میں فضولیات کا اضافہ کرنا نہیں چھوڑ سکتے۔

مجھے ڈر ہے کہ یہ لفظ ''ہمیشہ'' ہی دراصل ہمارے مسئلے کے حل میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔

آپ ضرور اس لفظ ''ہمیشہ'' کی بدولت مشکل میں ہیں مگر ''ہمارے'' مسئلے کی بات نہ کریں اور اب جواب دیجیے کہ آپ ہمیشہ ''اس'' کے حوالے سے جانتے ہیں؟

ہمیشہ۔ میں نے کہا۔ کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ لفظ ''جب بھی میں جانتا ہوں'' مجھے ہٹانا پڑے گا۔

کیا آپ ہمیشہ ''اس'' کی مدد سے جانتے ہیں یا یہ جانتے ہوئے کہ آپ کچھ ''اس'' کے حوالے سے

جانتے ہیں اور کچھ کسی اور شے کے حوالے سے یا یہ کہ آپ سب کچھ ہی "اس" کے حوالے سے جانتے ہیں؟

جو بھی میں جانتا ہوں، میں نے کہا، "اس" کے حوالے سے جانتا ہوں۔

آپ نے پھر مبہم اور غیر واضح جواب دے دیا ستراط۔

چلیے۔ میں نے کہا۔ جو بھی میں جانتا ہوں، کے الفاظ بھی حذف ہی کیجیے۔

نہیں حذف کچھ مت کیجیے! مجھے آپ کا تعاون درکار نہیں۔ بس مجھے سوال آگے بڑھانے کا موقع دیجیے۔

اگر آپ تمام اشیا کے بارے میں نہیں جانتے تو کیا (آیندہ) تمام اشیا کے بارے میں جاننے کے اہل ہو جائیں گے۔

ناممکن۔ میں نے کہا۔

اب جبکہ آپ اعتراف کر چکے ہیں کہ سب کچھ جانتے ہیں تو آپ اپنے جوابات میں حسبِ خواہش اضافہ کرنے کے مجاز ہیں۔

میں بھی اسے درست ہی سمجھتا ہوں۔ میں نے کہا، بشرطیکہ میں اس کے بارے میں جانتا ہوں، کے بیان سے میری قابلیت قابلِ قبول نہیں اور پھر بھی میں تمام اشیا کے بارے میں کہہ سکوں کہ جانتا ہوں۔

کیا ابھی آپ نے تسلیم نہیں کیا کہ آپ ہمیشہ ہر شے کو اس شے کے حوالے سے جانتے ہیں جو آپ کے علم میں ہے۔ خواہ "جب جانتے ہیں" کا اضافہ کریں یا نہ کریں۔ کیونکہ آپ تصدیق کر چکے ہیں کہ آپ جانتے ہیں اور اس میں "ہمیشہ سے" کا اضافہ اس امر کی دلیل ہے کہ آپ کسی مخصوص لمحے کے بعد سے ہمیشہ جانتے رہے ہیں۔ اس کا یہ مفہوم بھی لیا جا سکتا ہے کہ بچپن سے، بلکہ وقتِ ولادت سے اور آیندہ کے بڑھوتری کے عمل کے دوران، ہمیشہ اور ہر وقت یہ معاملات آپ کے علم میں رہے ہیں۔ بلکہ زمین و آسمان کی تخلیق سے قبل جب فقط آپ کی روح تھی اور اس کے دائرۂ اختیار میں ہر شے کا علم تھا اور میں قسم کھانے کو تیار ہوں کہ آپ ہمیشہ ہر شے کا علم اپنے سینے میں چھپائے رکھیں گے بشرطیکہ میں آپ کو اس قابل بنا دوں (کہ آپ ان ماضی کی معلومات کو اپنی یادداشت کی گرفت سے نکلنے نہ دیں گے۔)

مگر یوتھیڈیمس میں تو یہی اُمید رکھتا ہوں کہ آپ ذہنی طور پر مستعد ہی نہیں بلکہ بے چین بھی رہیں گے۔ میں نے کہا، اگر آپ سچ بول رہے ہوں، مگر ابھی تک ایک خفیف سا شک میرے ذہن میں ہے کہ کم از کم اپنے بھائی ڈائیونا ئیسوڈورس کی مدد کے بغیر اپنے الفاظ کو عملی جامہ نہیں پہنا سکتے۔ بہ آپ دونوں مجھے بتائیے!.......... اگرچہ مجھے آپ جیسے معتبر اور بلند پایہ داناؤں کی زبان سے سُننے کے بعد یقین آ گیا ہے کہ میں سب کچھ جانتا ہوں...... مگر میں ایسی باتوں کے علم کا اظہار کیسے کروں، میرے دوست یوتھیڈیمس، خصوصاً یہ بات کہ اچھائی کب غیر منصفانہ بات بن جاتی ہے۔ کہیے کیا میرا دعویٰ (ہمہ دانی) درست ہوگا؟

بلاشبہ آپ ان باتوں کے بارے میں بھی جانتے ہیں۔

مثلاً میں کیا جانتا ہوں؟

یہی کہ اچھائی غیر منصفانہ شے نہیں ہے۔

یہ تو حقیقت ہے، میں نے کہا۔ اور یہ بات ہمیشہ سے میرے علم میں بھی رہی ہے مگر اصل سوال یہ معلوم کرنا ہے کہ اچھائی کبھی غیر منصفانہ بات بھی بن سکتی ہے؟ (اور اگر ہاں تو کیسے؟)

کبھی نہیں اور کہیں نہیں۔ ڈائیونا ئیسوڈورس نے کہا۔

اس کا مطلب ہے میں اسے نہیں جانتا!

آپ پوری بحث کا تیا پانچہ کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ یوتھیڈیمس نے ڈائیونا ئیسوڈورس سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ اس امر کو ثابت کیا جا سکتا ہے کہ وہ جانتا ہے مگر اس کے باوجود اس کی حیثیت بیک وقت جاننے والے اور نہ جاننے والے کی رہے گی۔

ڈائیونا ئیسوڈورس اس رائے پر شرمندہ سا ہو گیا۔

میں نے دوسرے بھائی کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ آپ کا کیا خیال ہے ڈائیونا ئیسوڈورس؟ کیا اس لمحے یہ بات ثابت نہیں ہوگی کہ ہمہ دانی کا دعویٰ کرنے والے آپ کے بھائی سے غلطی ہو گئی؟

کیا مطلب؟ ڈائیونا ئیسوڈورس نے سوال پوچھنے کے انداز میں کہا، کیا میں ڈائیونا ئیسوڈورس کا بھائی ہوں؟

اس پر میں نے کہا۔ عزیز دوست، آپ تھوڑی دیر کے لیے مداخلت سے باز رہیں یا ڈائیونا ئیسوڈورس کو یہ ثابت کرنے کی تگ و دو سے باز رکھیں کہ میں اس نیکی سے آگاہ ہوں جو غیر منصفانہ ہو۔ یہ وہ

سبق ہے جسے سیکھنے کی آخرکار آپ کو مجھے اجازت دینا ہوگی۔

سقراط! اب آپ راہ فرار اختیار کر رہے ہیں۔ ڈائیونائیسوڈورس نے کہا۔ جواب سے احتراز نہ کریں!

مجھے کوئی حیرانی نہیں ہوئی۔ میں نے کہا، ظاہر ہے میرا آپ کا کیا مقابلہ! اور فورٹیوری (a Fortiori) کی وجہ سے مجھے آپ دونوں سے فرار ہی کرنا پڑے گا۔ کیونکہ میں ہراکلس (Heracles) نہیں ہوں۔ بلکہ ہراکلس بھی خاتون فلاسفر ہائیڈرا (Hydra) کا مقابلہ نہیں کر سکا تھا۔ کیونکہ اس کے پاس ایک سر کے کٹنے پر دیگر تمام سروں کو مار دینے کی صلاحیت بھی موجود تھی۔ خصوصاً جب وہ ایک اور فلسفی یعنی سمندری کیکڑا (Sea Crab) کی دوسری عفریت تھی اور ابھی ابھی سمندری سفر سے واپس آئی لگتی تھی اور اس وقت جب وہ منہ کھولے کھانے میں مصروف تھی اور اس کے بائیں طرف سے ظاہر ہوئی تھی اور جب وہ عفریت اس کے لیے (ہراکلس کے لیے) تکلیف دہ ہوگئی تو اس نے آیولاس (Iolaus) یعنی اپنے بھتیجے کو مدد کے لیے پکارا جس نے بڑی آسانی اور مہارت سے اسے (ان عفریتوں سے) چھٹکارا دلا دیا لیکن اگر میں اپنے آیولاس یعنی اپنے بھائی پیٹروکلس (Patrocles) کو مدد کے لیے پکاروں تو وہ پہلی صورت حال کو بھی بگاڑ کر رکھ دے گا۔

اب جبکہ آپ اس واقعے کو بیان کر ہی چکے ہیں۔ ذرا یہ تو بتایئے کہ آیولاس فقط ہراکلس کا بھتیجا تھا اور کیا وہ آپ کا بھی اتنا ہی بھتیجا نہیں ہے؟

میرا خیال ہے مجھے آپ کو جواب دے ہی دینا چاہیے۔ میں نے کہا، کیونکہ آپ مسلسل پوچھے جائیں گے اور یہ اعلان بھی دوہراتے جائیں گے کہ میں سب کچھ جانتا ہوں اور اس غصے سے دراصل آپ مجھے یوتھیڈیمس کی دانائی سے استفادہ کرنے سے باز رکھنا چاہتے ہیں۔

تو پھر جواب دیجیے ناں اس نے کہا۔

میرا جواب، بہرحال، یہ ہے کہ آیولاس میرا بھتیجا ہرگز نہیں تھا بلکہ ہراکلس کا تھا۔ کیونکہ میرا بھائی پیٹروکلس اس کا باپ نہیں۔ بلکہ اس کا باپ اِفیکلس (Iphicles) ہے جو اس کے ہم نام ہراکلس کا بھائی ہے۔

اور کیا پیٹروکلس آپ کا بھائی ہے؟ اس نے پوچھا۔

ہاں میں نے کہا۔ وہ میرا سوتیلا بھائی ہے یعنی ماں کی طرف سے میرا بھائی ہے مگر باپ کی طرف

سے نہیں۔

پھر بھی آپ اسے بھائی قرار دیں گے کہ نہیں؟ یا یہ کہ وہ آپ کا بھائی ہے بھی اور نہیں بھی؟

ہاں، باپ کے حوالے سے نہیں کیونکہ اس کا باپ شریڈیمس (Chaeredemus) تھا جبکہ میرا باپ سوفرونیکس (Sophroniscus) تھا۔

لیکن یہ تو طے ہے کہ شریڈیمس بھی ایک باپ تھا اور سوفرونیکس بھی؟

جی ہاں، میں نے کہا۔ اوّل الذکر میرا جبکہ مؤخر الذکر اس کا باپ تھا۔

یہ جملہ بھی درست ہوگا کہ شریڈیمس باپ نہ تھا؟

ہاں اس اعتبار سے کہ میرا باپ نہ تھا۔ میں نے جواب دیا۔

تو کیا وہ جو باپ ہے اور وہ جو نہیں ہے، ایک ہی فرد ہوگا؟ یعنی آپ اور ایک پتھر ایک ہی شے ہیں؟

میں کیسے کہہ سکتا ہوں کہ میں ایک پتھر ہوں؟ میں نے کہا، میں تو ڈر رہا ہوں کہ آپ یہ بھی ثابت کر دیں گے!

کیا آپ پتھر سے مختلف نہیں؟

ہاں، بالکل ہوں!

پتھر سے مختلف ہونے کی بنا پر آپ پتھر نہیں۔ اسی طرح سونے سے مختلف ہونے کی بنا پر آپ سونا نہیں۔

اس میں کیا شک ہے۔

اور اسی اصول کے تحت، اس نے کہا شریڈیمس کیونکہ باپ سے ہٹ کر کچھ ہے، سو باپ نہیں ہے!

ہاں اس اصول کے تحت تو وہ باپ نہ ہونے کے زمرے میں آتا ہے۔ میں نے جواب دیا۔

اسی طرح۔ یوتھیڈیمس نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ اسی اُصول کا سوفرونیکس پر اطلاق کیا جائے تو وہ بھی باپ نہ ہونے کے اطلاق کے سبب باپ نہیں ہے کی ذیل میں آتا ہے؟ تو سقراط کیا تم باپ کے بغیر ہو؟

ٹیسی پس نے اس مرحلے پر بحث میں کودتے ہوئے کہا، اور کیا خود آپ پر اس اُصول کا اطلاق نہیں ہوتا جناب کیونکہ آپ کا جو باپ ہے وہ میرا باپ تو نہیں ہے؟

یقیناً نہیں ہے۔

تو کیا آپ سقراط کے ساتھ اس صورت حال میں شریک ہیں؟

بالکل ہوں۔

مجھے یہ اضافہ پسند نہیں آیا۔مگر کیا وہ صرف میرا باپ ہے یوتھیڈیمس یا وہ باقی تمام لوگوں کا باپ بھی ہے؟

باقی تمام لوگوں کا بھی، یوتھیڈیمس نے جواب دیا۔کیا آپ اس تصور کو تسلیم کرنے لگے ہیں کہ کسی فرد پر باپ ہونے اور نہ ہونے کی بات کا بیک وقت اطلاق ہوسکتا ہے؟

جی ہاں۔ہوسکتا ہے۔میں یہ بات اپنے تصور میں لاسکتا ہوں۔ سٹیسی پس نے کہا۔

تو پھر آپ اس کے بھی قائل ہوں گے کہ سونا سونا نہیں ہے یا یہ کہ آدمی آدمی نہیں ہے؟

سٹیسی پس نے کہا، "in pari materia" تو ایسا ممکن ہے۔یوتھیڈیمس ،مگر آپ کو اپنی قوتیں مجتمع کر لینی چاہئیں کیونکہ ابھی آپ نے اس بڑے دعوے کو ثابت کرنا ہے کہ آپ کا باپ سب کا باپ ہے۔

مگر وہ تو ہے۔اس نے کہا۔

کیا صرف آدمیوں کا، سٹیسی پس نے کہا یا گھوڑوں اور دیگر جانوروں کا بھی ہے؟

سب کا، اس کا جواب مختصر تھا۔

اور آپ کی ماں بھی سب کی ماں ہے؟

ہاں، ہماری ماں بھی!

تو کیا آپ کی ماں بحر زخار کی اولاد ہے؟

ہاں اور آپ کی بھی، اس نے کہا۔

اس طرح تو تازہ پانی کی مچھلی، پلّے اور سؤر وغیرہ آپ کے بھائی ہوئے؟

ہاں اور آپ کے بھی۔

اور آپ کا باپ ایک کتا ہے؟

اور آپ کا بھی ہے۔اس نے فی البدیہہ کہا۔

اگر آپ میرے سوالوں کا جواب دیں گے محترم سٹیسی پس، ڈائیونا ئیسوڈورس نے کہا،تو میں آپ کی زبان سے بھی کہلوا دوں گا، آپ نے بتایا تھا کہ آپ نے ایک کتا پالا ہوا ہے؟

جی ہاں۔ سٹیسی پس نے کہا، وہ ایک اور کتے کا رقیب ہے۔

اس کے بچے بھی ہیں؟

ہاں۔ بالکل اسی کے سے ہیں۔

اور وہ کتا ان کا باپ ہے؟

ہاں، اس نے کہا، ہاں میں نے اس کا اور ان پلوں کی ماں کا ملاپ آنکھوں سے دیکھا تھا۔

اور وہ کتا کیا آپ کا نہیں ہے؟

یقیناً میرا ہے۔

تو خود دیکھ لو وہ کتا بھی ہے اور وہ تمھارا بھی ہے اور باپ بھی۔ (یعنی اس پر تمھارا، باپ اور کتا تینوں باتوں کا اطلاق ہوتا ہے) سو وہ کتا تمھارا باپ ہوا اور پلے تمھارے بھائی!

ڈائیونائیسوڈورس نے کہا۔ میں ایک مختصر سا سوال آپ سے اور بھی پوچھنا چاہتا ہوں۔ اس نے جلدی سے مداخلت کی تھی۔ شاید اس لیے کہ اسے ڈر تھا کہ سٹیسی پس کتے کی اس مثال پر بیچ بیچ سے نہ اکھڑ جائے، اس سے پہلے کہ آپ اس کتے کو پیٹنے لگ جائیں۔

یقیناً میں ایسا ہی کروں گا، سٹیسی پس نے کہا۔ میں پیٹنا چاہتا ہوں مگر آپ کو، کتے کو نہیں۔

پھر تو آپ اپنے باپ کی پٹائی کریں۔

فکر مت کیجیے میرے پاس آپ کے باپ کی پٹائی کے لیے بھی کافی جواز موجود ہے۔ سٹیسی پس نے کہا، آخر اس کے ذہن میں کیا تھا جب اس نے آپ جیسے یگانہ روزگار فرزندوں کو جنم دیا تھا؟ اور یہ تو بتائیے آپ کی اس عظیم دانائی سے آپ کے والد اور آپ کے بھائی بندوں یعنی ان کتوں کو کیا فائدہ حاصل ہوا؟

سٹیسی پس آپ کو اور ان کو کسی خاص اچھائی اور بھلائی کی ضرورت بھی نہیں ہے۔

اس نے کہا۔ اور سٹیسی پس، کیا آپ کو بھی نہیں؟

نہ ہی مجھے اور نہ کسی دوسرے فرد کو، بھلا بتائیے تو جب کوئی بیمار شخص دوائی پینا چاہتا ہو تو آپ اسے دوائی کے حوالے سے اچھائی اور بُرائی کے چکر میں ڈالیں گے؟ یا اگر کوئی جنگ پر جانا چاہے تو اسے ہتھیار بندی کی بجائے بغیر ہتھیاروں کے میدان جنگ میں بھیج دیا جائے؟

خوب! میں نے کہا، مجھے اندازہ ہے کہ آپ دونوں میں سے کوئی نہ کوئی مجھے کسی معمے میں الجھا ہی

لے گا۔ پتہ تو ہے۔ اس نے کہا، آپ پر بعد میں کھلے گا۔ اس نے جواب دیا۔ بشرطیکہ آپ جواب دینا پسند کریں گے اور جیسے ابھی آپ نے تسلیم کیا ہے کہ دوائی پینا انسان (بیمار) کے لیے اس وقت ضروری اور مفید ہے جب وہ چاہے اور اگر دوائی بیماری کے لیے موزوں علاج کی حیثیت نہیں رکھتی تو پھر چاہے اسے جتنی مقدار بھی پلا دی جائے اس کا کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ (مقدار ایسے میں کوئی معنی نہیں رکھے گی بلکہ موزونیت اہم ہوگی۔)

سٹیسی پس نے کہا، ہاں البتہ یوتھیڈیمس اگر مریض ڈیلفی (Delphi) کے مجسمے کی جسامت رکھتا ہوگا تو پھر تو مقدار کچھ نہ کچھ ہوگی ہی۔

اور اسی طرح مقدار کی اچھائی گردانتے ہوئے کیا ایک آدمی کا متعدد نیزے اور ڈھالیں اُٹھالینا مناسب ہوگا؟

بہت اچھی مثال ہے۔ سٹیسی پس نے جواب دیا۔ مگر آپ کیا سمجھتے ہیں کیا اسے لازمی طور پر ایک ہی نیزہ اور ایک ہی ڈھال پر گزارہ کرنا چاہیے؟

میں تو یہی سمجھتا ہوں۔

تو کیا آپ جیریون (Geryon) اور بریاریئس (Briareus) کو بھی اسی انداز میں مسلح کرنا مناسب سمجھتے ہیں چونکہ آپ اور آپ کے ساتھ زرہ بکتر پہن کر لڑنے میں مہارت رکھتے ہیں اسی لیے میں نے آپ سے یہ پوچھا ہے۔ شاید آپ بہتر رائے رکھتے ہوں؟

اس موقع پر یوتھیڈیمس تو خاموش رہا مگر ڈائیونائیسوڈورس اس کے یعنی سٹیسی پس کے جواب کی طرف متوجہ ہو کر بولا۔

اگر آپ کے پاس سونا ہو تو کیا آپ اسے خوشگوار بات قرار دیں گے؟

جی ہاں، سٹیسی پس نے جواب دیا، بلکہ جتنا زیادہ ہوگا اتنی ہی خوش آیند بات ہوگی۔

اور ہر جگہ اور ہر وقت رقم اپنی گرفت میں رکھنا بھی اچھی بات ہے؟

یقیناً اس نے کہا، بہت ہی اچھی بات ہے۔

اور آپ سونے کے اچھی شے ہونے کے قائل ہیں؟

یقیناً ہوں، اس نے کہا۔

جب ہم نے یہ تسلیم کر لیا کہ سونا کہیں بھی کبھی بھی ہو، ہمیشہ اچھا ہی ہے تو ذرا سوچ کر بتائیے کہ کیا یہ

اچھا ہوگا کہ سونے کی ایک مقدار آپ کے معدے میں، کچھ آپ کی کھوپڑی (بھیجے) میں اور کچھ آپ کی آنکھوں میں ڈال دی جائے؟ اور کیا آپ اسے خوشی کی کیفیت سے منسلک کر سکیں گے؟

ہاں..... یقیناً یوتھیڈیمس، سٹیسی پس نے کہا، ساتھی لوگ (Scythians) (ایک خونخوار قوم) اس شخص کو بہت بہادر اور خوشحال ترین فرد سمجھتے ہیں جس کی کھوپڑی میں سونا موجود ہو۔ (ویسے یہ بھی آپ کی کتے اور باپ کی مثال کی طرح کا ئی گنجلک نکتہ ہے) اس سے بھی زیادہ غیر معمولی بات ہے کہ وہ اپنی کھوپڑی کے پیالے میں شراب پیتے ہیں۔ اپنی کھوپڑی میں جھانکنا پسند کرتے ہیں اور سر ہتھیلی پر رکھتے ہیں۔

کیا یہ ساتھی لوگ اس امر کا بھی خیال رکھتے ہیں کہ ان میں سے کون شخص زیادہ اہلِ بصیرت ہے اور کون نہیں؟ یوتھیڈیمس نے پوچھا۔

ہاں ان کے ہاں بھی، بصیرت کی بڑی قدر ہے۔

کیا آپ بھی اس امر کو ملحوظ رکھتے ہیں کہ کون زیادہ صاحب بصیرت ہے؟

ہاں۔ میں بھی ملحوظ رکھتا ہوں۔

اور کیا آپ نے ہمارا لباس دیکھا ہے؟

ارے یہ بصیرت تو ہمارے ملبوسات بھی رکھتے ہیں۔

وہ تو کسی بھی حد تک دیکھ سکتے ہیں، سٹیسی پس نے کہا۔

کیا دیکھ سکتے ہیں؟

کچھ بھی نہیں، سٹیسی پس بولا۔ مگر آپ حضراتِ محترم یقیناً یہ گمان رکھتے ہیں کہ وہ کچھ نہیں دیکھ سکتے اور یوتھیڈیمس، آپ تو جاگتے میں اونگھتے ہوئے لگتے ہیں اور آپ بولتے ہوئے بھی خاموش لگتے ہیں۔

آپ مقرر کی خاموشی سے آگاہ نہیں؟ ڈائیونائیسوڈورس نے استعجاب کے انداز میں پوچھا۔

میں تو اسے ناممکن قرار دیتا ہوں۔ سٹیسی پس بولا۔

تو پھر بولتے ہوئے خاموش شخص یعنی خاموش کی قوتِ گفتار سے بھی آگاہ نہ ہوں گے؟

یہ تو اس سے زیادہ ناممکن بات ہے۔ اس نے جواب دیا۔

لیکن جب آپ پتھروں، لکڑی اور لوہے کی سلاخوں وغیرہ کی بات کرتے ہیں تو کیا خاموش اشیا کی

بات نہیں کرتے؟

یہاں آپ کی شاندار ذہانت مار کھا گئی ہے۔ سٹیسی پس نے کہا۔ البتہ آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ جب لوہار کی بھٹی کے قریب سے گزرتا ہوں تو یقیناً لوہے کی سلاخیں یا دوسری شکلوں کے ٹکڑوں پر جب چوٹ پڑ رہی ہوتی ہے تو ان کے شور سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی۔ خیر! آپ مجھے یہ بتانے جا رہے تھے کہ آپ گفتگو کرتے ہوئے خاموش اور خاموشی کی صورت میں گفتار کا مظاہرہ کیسے کر سکتے ہیں؟ (مجھے لگا کہ سٹیسی پس کسی اور کے عندیے کی تائید کر رہا ہے۔ کیونکہ کلینیس اس کی گفتگو کے دوران وہاں موجود تھا۔)

جب آپ خاموش ہوتے ہیں، یوتھیڈیمس نے کہا تو کیا کائنات کی ہر شے خاموش نہیں لگتی؟

ہاں۔ اس کا جواب تھا۔

اور اگر بولنے والی اشیا کا شمار "تمام" اشیا پر ہوتا ہے تو گویا وہ بھی خاموش ہی ہوئیں۔

کیا مطلب؟ سٹیسی پس نے کہا۔ آپ کا خیال ہے کہ 'ہر شے خاموش ہوتی ہے' والی بات غلط ہے؟

یقیناً یہی بات ہے۔ یوتھیڈیمس نے کہا۔

تو میرے دوست! کیا اس وقت ہر شے آواز نکال رہی ہوتی ہے؟

ہاں۔ وہ جو آواز نکال رہی ہوں۔

نہیں، مگر میں نے جو سوال پوچھا ہے وہ یہ ہے کہ کیا ہر شے آواز نکال رہی ہوتی ہے یا ہر شے خاموش ہوتی ہے؟

ڈائیونائیسوڈورس نے پھر مداخلت کی۔ کوئی بھی نہیں اور دونوں بھی۔ مجھے یقین ہے اس سوال پر بھی آپ برہم ہی ہوں گے۔

اس مرحلے پر سٹیسی پس نے، جیسا کہ اس کا اندازہ ہے، بلند آہنگ قہقہہ لگایا اور کہا، یوتھیڈیمس آپ کا بھائی تو سمجھو اُلجھ گیا ہے۔ اس کے کچھ پلے نہیں پڑ رہا۔ اس بات سے کلینیس بھی خوش ہوا اور اس کے قہقہے نے سٹیسی پس کی خوشی دو چند کر دی۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ ان غیر ملکیوں نے اس قہقہے ہی سے اصل مفہوم اخذ کر لیا ہوگا کیونکہ وہ دانائی کے اعتبار سے اپنے عہد کے یگانۂ روزگار افراد تھے۔ میں نے کہا۔ کلینیس، آپ بھی ہنس رہے ہیں؟ یعنی آپ ایسی خوبصورت نوک جھونک کو سمجھتے ہیں؟

کیوں سقراط۔ڈائیوناٹیسوڈورس نے پوچھا، آپ نے کبھی خوبصورت شے دیکھی ہے؟

ہاں ڈائیوناٹیسوڈورس، میں نے کہا میں نے بہت سی خوبصورت اشیا دیکھی ہیں۔

کیا وہ خوبصورت کے علاوہ تھیں یا خوبصورت تھیں؟

اس سوال کے جواب میں میں اُلجھن میں پڑ گیا اور سوچنے لگا کہ میں نے منہ کھول کر خود ہی مصیبت مول لی ہے۔ تاہم میں نے کہا، اگرچہ ان کی حیثیت حتمی حسن کی سی نہ تھی مگر حسن اور خوبصورتی ان میں موجود تھی۔

تو اگر ایک بیل آپ کے قریب ہو تو کیا آپ بیل ہو جائیں گے یا جیسے اس وقت ڈائیوناٹیسوڈورس آپ کے پاس بیٹھا ہے تو آپ ڈائیوناٹیسوڈورس ہو گئے؟

خدانخواستہ میں کہہ سکا۔

آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ ایک شے کے دوسری شے کے ساتھ یا اس میں ہونے سے دوسری شے پہلی شے کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے؟

کیا یہ آپ کا مسئلہ ہے؟ میں نے پوچھا، دراصل میں بھی انہی کے رنگ ڈھنگ اختیار کرنے لگا تھا اور ذہنی طور پر اس کے لیے خوب آمادہ تھا۔

بے شک، اس نے جواب دیا۔ صرف میں ہی نہیں بلکہ عدم وجود کے مسئلے سے تو پوری دنیا دوچار ہے۔

کیا مطلب ڈائیوناٹیسوڈورس؟ میں نے کہا، کیا معزز، معزز اور کمینہ، کمینہ نہیں ہوتا۔

ایسا تو ہے! اس نے کہا۔

آپ (اس جواب سے) خوش ہیں؟

ہاں۔ اس نے کہا۔

اور یہ بھی آپ تسلیم کریں گے کہ ایک جیسے کو ایک جیسا اور دیگر کو دیگر کہیں گے؟ کیونکہ دیگر لازمی طور پر ایک جیسے سے مختلف ہونا چاہیے۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ ایک بچہ بھی دیگر کو دیگر ہی کہے گا (اور ایک جیسے کو ایک جیسا) مگر ڈائیوناٹیسوڈورس میرا خیال ہے کہ آپ نے جان بوجھ کر گزشتہ سوال نظرانداز کیا ہے کیونکہ بظاہر تو آپ اور آپ کے بھائی اپنے پیشے میں بہت ماہر لگتے ہیں سوالفاظ کے ہیر پھیر میں آپ سے کون جیت سکتا ہے؟

ایک اچھے کارکن (کاریگر) سے آپ کی کیا مراد ہے؟ اس نے کہا۔ پہلے تو مجھے یہ بتائیے کہ ہتھوڑے سے کام کرنے والا کون سا (کاریگر) ہوتا ہے۔

لوہار۔

اور برتن بنانے والا۔

کمہار۔

ذبح کرنے، کھال اُتارنے، قیمہ بنانے، اُبالنے اور تلنے کا کام کس کا ہے؟

باورچی کا، میں نے کہا۔

اور اگر کوئی اپنا پیشہ ورانہ کام کر رہا ہو تو کیا وہ ہر صورت میں اچھا کام کر رہا ہوتا ہے؟

یقیناً!

اور آپ نے تسلیم کیا ہے کہ باورچی کا کام ذبح کرنا اور کھال اُتارنا ہے؟

ہاں میں نے تسلیم کیا ہے، مگر آپ مجھ پر یوں چڑھائی تو نہ کریں۔

آپ کا کیا خیال ہے جو خود باورچی کو ذبح کر کے کھال اُتار کے بھون لے تو کیا وہ اپنا پیشہ ورانہ کام کر رہا ہوگا۔ اسی طرح وہ شخص بھی پیشہ ورانہ کارروائی میں مصروف سمجھا جائے جو خود لوہار کو ہتھوڑوں پر رکھ لے اور کمہار کو برتن کی شکل دے ڈالے؟

ارے واہ، بھئی یہ تو دانائی کی معراج ہے۔ کیا کبھی میں بھی ایسی دانائی کا مالک بن سکوں گا؟

اور جب یہ دانائی آپ کی اپنی شخصیت کا حصہ بن چکی ہوگی تو کیا کیا اسے پہچان پائیں گے سقراط؟

یقیناً، میں نے کہا، بشرطیکہ آپ مجھے اس کی اجازت دیں۔

آپ کا کیا خیال ہے؟ اس نے پوچھا، کہ جو کچھ آپ کا اپنا ہے آپ اسے جانتے ہیں؟

ہاں، بشرطیکہ آپ میری رہنمائی کرتے رہیں کیونکہ اس صلاحیت کی اصل بنیاد تو آپ ہی ہیں۔ اور آپ کا بھائی یوتھیڈیمس اس کی انتہا ہے۔ میری تمام دانائی کی انتہا۔

کیا آپ کے نزدیک وہی کچھ آپ کا نہیں ہے۔ اس نے کہا، جس کے بارے میں آپ سمجھتے ہوں کہ وہ آپ کی دسترس میں ہے اور یہ کہ آپ جس طرح چاہیں اسے استعمال کر سکتے ہیں، مثلاً کوئی بیل یا بھیڑ اسی وقت آپ کا ہوگا جب آپ انھیں اپنی مرضی سے بیچ سکیں یا چاہیں تو انھیں کسی بھی دیوتا کی بھینٹ چڑھا دیں؟ اور کسی شے کے ساتھ آپ ایسا کچھ نہیں کر سکتے تو اسے اپنا کہنا آپ کو

زیب نہیں دیتا؟

ہاں۔ میں نے کہا۔ (مجھے اندازہ تھا کہ اس سوال کے نتیجے میں کوئی خوبصورت نکتہ سامنے آئے گا اور میں اسی کے لیے بے چین تھا) وہی اشیا میری تصور ہوں گی جو مکمل طور پر میری دسترس میں ہوں۔

ہاں، اس نے کہا۔

اور یہ بھی کہ آپ کے نزدیک جانور زندہ اشیا یعنی ذی روح ہوتے ہیں؟

ہاں، میں نے کہا۔

تو گویا آپ اس سے متفق ہیں کہ وہ تمام جانور آپ کے شمار ہوں گے جن کے ساتھ وہ سب کچھ کر سکیں جس کا ابھی میں نے ذکر کیا تھا؟

ہاں، میں اس سے متفق ہوں۔

وہ چند لمحے خاموش رہا۔ لگتا تھا وہ اس مکالمے کے نتیجے میں کوئی خوبصورت اور حیرت انگیز نکتہ سامنے لانے کے لیے اپنے خیالات کو مجتمع کر رہا ہو۔ پھر وہ بولا۔ سقراط ذرا مجھے بتایئے، آپ کے اجداد میں سے زیوس بھی تھا؟

میری حالت جال میں پھنسے ہوئے ایسے جانور کی سی تھی جو رہائی کے لیے تڑپتا پھڑکتا ہے۔ بہر طور میں نے کہا نہیں۔ ایسا تو کوئی نہیں۔

تب آپ کس قدر قابلِ رحم آدمی ہیں! اس نے کہا، اگر آپ کے سلسلے میں کوئی عبادت گاہ، کوئی دیوتا یا شرافت کی کوئی ایسی علامت موجود نہیں تو آپ کے ایتھنز کا باسی ہونے میں شک ہے۔

نہیں ڈائیونائیسوڈورس، میں نے کہا، اس قدر تلخ کلامی مناسب نہیں۔ ایتھنز کے تمام مذہبی لوگوں طرح میرے بھی ہیں نہ صرف جدید بلکہ آبائی سلسلے سے مجھ تک پہنچنے والی عبادت گاہیں اور قربان گاہیں ہیں۔

تو ایتھنز کے دوسرے لوگوں کے اجداد میں کوئی دیوتا زیوس نام کا نہیں رہا؟

یہ نام یون لوگوں (Ionians) میں تو موجود نہیں۔ خواہ وہ مقامی رہے ہوں یا آباد کار البتہ ہمارے اجداد میں اپالو کا نام آتا ہے جو آیون کا باپ تھا (جس سے یون لوگوں کی پوری نسل چلی جس کا ایک حصہ ایتھنز میں آباد ہے۔) ان میں سے ایک کنبہ البتہ ایک کنبہ زیوس کا بھی تھا کہ زیوس اس

ذیلی خانوادے کا جداعلیٰ سمجھا جانا چاہیے۔ اسی طرح اتھین (Athene) ایک اور قبیلے کا سربراہ تھا (یا ذیلی نسل کا جداعلیٰ تھا) مگر اعلیٰ ترین اجداد میں سے ہم کسی زیوس کے نام سے واقف نہیں۔

کوئی بات نہیں۔ کم از کم آپ نے اعتراف کیا کہ اپالو، زیوس اور اتھین آپ کے اجداد میں سے ہیں؟

ہاں، میں نے کہا، اس کا مجھے اعتراف ہے۔

اور وہ آپ کے دیوتا بھی ہیں؟ اس نے پوچھا۔

ہاں ہیں۔ میں نے جواب دیا۔ وہ ہمارے سردار اور اجداد ہیں۔

بہرصورت وہ آپ کے ہیں اس کا تو آپ اعتراف کر چکے ہیں؟ اس نے پوچھا۔

ہاں میں نے اعتراف کیا ہے۔ میں نے کہا، اس سے مجھے کیا فائدہ ہوگا؟

کیا وہ تمام دیوتا جانور (بمعنی جاندار) نہیں کیونکہ خود آپ نے تسلیم کیا ہے کہ ہر زندہ شے جانور (جاندار) ہوتی ہے۔

یہ کہیے کہ اس کو زندگی حاصل تھی۔ میں نے کہا۔

تو کیا وہ جانور یعنی جاندار نہ ہوئے؟

اس لحاظ سے تو جانور کہلائیں گے کیونکہ زندہ تھے۔ میں نے کہا۔

اور آپ یہ بھی کہہ چکے ہیں کہ وہ جاندار (جانور) جنھیں آپ اپنی مرضی سے بیچ سکیں، ذبح کر سکیں اور ان کی قربانی دے سکیں وہی آپ کے ٹھہریں گے؟

ہاں یوتھیڈیمس، میں نے یہ کہا اور شاید میرے پاس فرار کی کوئی راہ نہیں۔

اور جب آپ کہتے ہیں کہ زیوس اور اس جیسے کئی دیگر دیوتا آپ کے ہیں تو کیا آپ ان کو ذبح کر کے ان کی قربانی دے سکیں گے یا انھیں بیچ کر اپنی ضرورت پوری کر سکتے ہیں، جیسا کہ آپ اپنے جانوروں کے ساتھ کر سکتے ہیں؟

میں تو یہ سُن کر گنگ ہی رہ گیا، کریٹو اور انھوں نے مجھے واقعی چت کر دیا تھا کہ ٹیسی پس میری مدد کو آیا۔

واہ! واہ! ہراکلس! کیا بات ہے! اس نے کہا۔

شاباش! ہراکلس کہنا مناسب ہے یا آپ کو ہراکلس شاندار ہے، کہنا چاہیے تھا؟ ڈائیونا ئیسوڈورس

نے کہا۔

ارے، تو اس میں فرق کیا ہے؟ اور میں کیا کہوں۔ یہی دو لفظ کافی ہیں۔

اس پر تو عزیزم کریٹو ایک بلند آہنگ قہقہہ پڑا اور لوگوں نے تالیاں بجا بجا کر دونوں غیر ملکیوں کی تعریف و توصیف کی۔ حالانکہ اس سے پہلے ہر موقع پر صرف ان کے حواری ہی داد دیتے رہے تھے مگر اس دفعہ پورے گروہ نے آسمان سر پر اُٹھایا ہوا تھا اور ان کے قہقہوں کی گونج تھیٹر کے ستونوں سے ٹکرا ٹکرا کر لوٹ رہی تھی جیسے ستون بھی ان کی خوشی میں شریک رہے ہوں۔ ایسے عالم میں مجھ سے یہی ہو سکا کہ میں نے ایک بھرپور تقریر کی جس میں، میں نے ان کے علم، ذہانت و فطانت اور دانائی کو دل کھول کر سراہا۔ میں ان کا پرستار بن چکا تھا اور ان کی تعریف و توصیف میں رطب اللسان تھا۔ ذہانت اور سرعتِ فہم کا کیا خوبصورت مظاہرہ ان لوگوں نے کیا تھا۔ میں نے پوچھا، آخر وہ کون سی شخصیت تھی جس کی مدد سے اتنی کم عمری میں وہ اتنا کچھ سیکھ گئے تھے؟ آپ کی لفاظی کی تعریف میں بہت کچھ کہا جا سکتا ہے جناب یوتھیڈیمس اور جناب ڈائیونا ئیسوڈورس! مگر سب سے بڑا کمال، آپ کے ہاں، کسی بھی رائے کی کوئی اہمیت نہیں یعنی آپ کہیں سے بھی شروع کریں اور کتنی بڑی مسلمہ حقیقت کو تجزیہ کے عمل میں سے گزاریں آپ اپنے مطلب کا نتیجہ برآمد کر سکتے ہیں اور مجھے پختہ یقین ہے آپ کے پائے کے لوگ کم ہی ہوں گے جو اس طرح کی مدلل بحث کر سکیں۔ اکثریت تو خود اپنی صلاحیتوں سے اس قدر بے بہرہ ہے کہ کسی کی کمزور سے کمزور دلیل کو رد کرنے کی کوشش میں خود اپنی ہی دلیل کی نفی کر ڈالتے ہیں۔ اس کے علاوہ آپ کی جس دوسری خوبی کی تعریف مجھ پر قرض ہے کہ آپ عوامی مقام پر عوام کی اختلافِ رائے کے خلاف بہت سجھ ہوا ردعمل ظاہر کرتے ہیں۔ چاہے وہ اختلاف رائے اسی کا ہے کہ باقی سب کی زبانیں گنگ ہو چکی ہیں اور کسی کے پاس آپ کی رائے کو تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں۔ گویا آپ نے پورے کو صاف کر دیا ہے۔ مگر ان تمام باتوں سے بڑھ کر جو بات اس وقت میرے پیش نظر ہے، کہ آپ کا یہ نیا فنِ تعلیم کس قدر مؤثر ہے کہ آپ جو کچھ چاہتے ہیں چند لمحوں میں اپنے مخاطب کے ذہن میں بلکہ اس کے دل میں اُتار دیتے ہیں۔ میں خود دیکھ رہا تھا کہ دیکھتے ہی دیکھتے سٹیسی پس اس قابل ہو گیا کہ آپ ہی کے لب و لہجے اور انداز میں آپ سے بحث کرنے لگا تھا۔ اکتساب کی یہ سرعت بے شک فقید المثال ہے۔ البتہ (ان تمام مثبت خصائص کے باوصف) میں آپ کو مشورہ دوں گا کہ عوام کے

سامنے ان کمالات کا مظاہرہ مت کیا کیجیے۔ ورنہ وہ حسبِ عادت اسے سہل الحصول قرار دے کر اس کی قدر و قیمت گھٹا دیں گے۔ اوّل تو آپ دونوں ایک دوسرے سے بحث کیا کیجیے اور اگر آپ سمجھیں کہ سامعین بھی ضروری ہیں تو فقط ان کو اجازت دیں جو معقول فیس ادا کر سکیں (تاکہ داخلہ محدود کیا جا سکے)۔ اس کی آپ کو خصوصی احتیاط کرنا پڑے گی۔ اس کے علاوہ اسے بھی ملحوظ رکھنا ہوگا کہ آپ کے شاگرد بھی عوامی جگہوں پر عالمانہ باتیں نہ کریں بلکہ زیادہ مناسب تو یہی ہے کہ وہ آپس میں یا آپ کے ساتھ علمی گفتگو کیا کریں۔ کیونکہ قیمتی وہی شے سمجھی جاتی ہے، جس کا حصول آسان نہ ہو۔ جیسے پنڈر (Pindar) اپنی تخلیق اشیا میں کہتا ہے کہ پانی جس قدر کثرت سے موجود ہے اسی قدر سستا ہے اور اب آخری درخواست، کہ آپ کلینیس کو اور مجھے اپنے حلقۂ تلمذ میں شامل کیجیے!

یہ مکمل بحث تھی کریٹو! اس کے علاوہ چند ادھر اُدھر کی باتوں کے بعد ہم منتشر ہو گئے۔ اب مجھے اُمید ہے کہ آپ بھی میرے ساتھ ان کے ہاں چلیں گے کیونکہ ان کا کہنا ہے کہ جو کوئی بھی (بلالحاظ عمر) ان کی فیس ادا کرے وہ اسے پڑھا سکتے ہیں۔ عمر کے علاوہ انھیں شاگرد کی صلاحیت کار سے بھی کوئی غرض نہیں۔ ان کی کہی ہوئی ایک اور بات کو دہرانا البتہ ضروری ہے اور وہ بھی آپ کے خصوصی مفاد میں اور وہ یہ کہ ان کی تعلیمات سے انسان کے کمائی کے ذریعے پر کوئی منفی اثر نہیں پڑے گا (البتہ اس میں اضافہ ہوگا)۔

کریٹو! سچ سقراط، اگرچہ میں سیکھنے پڑھنے کا بے حد شائق ہوں مگر مجھے ڈر ہے کہ ذہنی طور پر میں یوتھیڈیمس سے مطابقت نہیں رکھتا۔ میں دراصل مختلف قسم کی سوچ رکھنے والا فرد ہوں جو، آپ کے قول کے مطابق دوسروں کی رائے کی نفی کی بجائے اپنی رائے بدلنے پر تیار ہو جاتا ہے اور اگرچہ آپ کو نصیحت کرنا یا مشورہ دینا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے مگر آپ کو اتنا ضرور یاد دلاؤں گا کہ ایک آدمی نے میرے بارے میں کیا الفاظ کہے تھے اور سوچ سمجھ کر کہے تھے۔ وہ صاحب قانون بحث و مباحثہ کے ایک اُستاد تھے۔ جب میں یہاں گھوم رہا تھا تو وہ آپ کے پاس سے ہو کر آ رہے تھے۔ انھوں نے مجھے مخاطب ہو کر کہا تھا۔

کریٹو! آپ ان نوجوان مفکرین کی طرف کیوں متوجہ نہیں ہوئے؟

نہیں بھئی، میں نے کہا۔ اتنے بڑے ہجوم میں مجھے کیا سنائی دیتا اور کیا سمجھ آتی؟

تاہم اگر آپ وہاں ہوتے تو یقیناً آپ نے بعض قابل قدر باتیں سُن پائی ہوتیں۔

مثلاً کون سی باتیں؟ میں نے پوچھا۔

آپ نے لسانیات کے ماہر ترین افراد کی تقریر سُنی ہوتی۔

میں نے پوچھا۔ خود آپ کا ان کے بارے میں کیا خیال ہے؟

میں نے کیا سُنا؟ اس نے کہا۔ بس یہی کہ وہاں ایسی ایسی تقریریں ہو رہی تھیں جو معمولی اور احمقانہ گفتگو میں سُننے کو نہیں مل سکتیں۔ نہ ان محفلوں میں ان کا گزر ہوتا ہے جہاں قول ہی قول ہوتا ہے فعل سرے سے ہی معدوم ہوتا ہے۔ یہ وہ تاثر تھا جو اس شخص نے دیا۔

یقیناً، میں نے کہا، اس میں شک نہیں کہ فلسفہ ایک بے حد پُر لطف شے ہے۔

آپ اسے پُر لطف کہتے ہیں۔ اس نے کہا، آپ بھی کیا سادہ شخص ہیں۔ فلسفہ کچھ بھی نہیں ہے۔ صفر! اور اگر آپ وہاں موجود ہوتے تو مجھے یقین ہے کہ وہاں آپ اپنے دوست (سقراط) کا انداز دیکھ کر بہت شرمندہ ہوتے۔ اس شریف آدمی نے اجنبیوں کے سامنے خود کو اس قدر گرا کر پیش کیا کہ کچھ کہا نہیں جا سکتا اور اس پر مستزاد یہ کہ وہ ایسے لوگ تھے کہ لفظوں کے اصول کے بارے میں کسی اصول کو ملحوظ نہیں رکھتے تھے بلکہ لگتا تھا کہ وہ تو الفاظ مخاطب کے منہ پر مار دیتے ہیں اور جن لوگوں سے وہ مخاطب تھے وہ اپنے وقت کے شہرۂ آفاق پروفیسر ہیں۔ یقین کرنا کریٹو! وہ لوگ اور ان کا مطالعہ سب کچھ غیر معقول تھا۔

سو جناب سقراط! جو باتیں مجھ سے کہی گئیں خواہ کسی جانب سے تھیں، مناسب نہیں تھیں۔ بہر حال جہاں تک اس کا یہ اعتراض ہے کہ ایسی محافل عوام کے درمیان منعقد نہیں ہونی چاہئیں اس سے میں پوری طرح متفق ہوں۔

سقراط: ارے کریٹو! وہ بہت شاندار لوگ ہیں...... میں کیا کہہ رہا تھا...... ہاں! سب سے پہلے تو اس شخص کے انداز و اطوار پر بات ہو جائے جو یہاں آپ کے پاس اپنے خیالات سمیت آیا تھا جس نے فلسفے کی یوں تردید کی۔ کیا (آپ کے بقول) وہ ایک ماہر الکلام تھا اور عدالت میں پریکٹس اس کا کام تھا یا وہ فنِ خطابت کی تعلیم دیتا ہے۔ اس کی تقریریں ہمیشہ اپنے مخالفین کے ساتھ رہتی ہوں گی؟

کریٹو: وہ عملی طور پر تو خطیب نہ تھا اور مجھے شک ہے کہ کبھی وہ عدالتوں میں گیا ہو۔ مگر لوگ کہتے ہیں کہ وہ

اس فن پر دسترس رکھتا ہے [illegible] بلکہ [illegible] ہوتا ہے [illegible]

[illegible] حاصل ہے۔

میں سمجھ گیا۔ اس کا تعلق غالباً ان دونوں میں سے کسی ایک سے ہے جن میں نے بات

سقراط: کرنے والا تھا۔ یہ ایسے لوگ ہیں جن کے متعلق پروڈیکس کا قول ہے کہ یہ فلسفی

اور سیاستدانوں کے درمیان کی چیز ہیں۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ تمام لوگوں سے زیادہ دانا ہیں۔ وہ یہ بھی

سمجھتے ہیں کہ اس معاشرے میں واقعی ذہین ترین لوگوں کا مقام حاصل ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ

فلسفہ کی رقابت بہرحال ان کی راہ روکتی ہے۔ ان کی اپنی دانست میں اگر کبھی وہ فلسفیوں کو شکست

ثابت کر پائے تو ان کی دانائی میں کسی کو کلام نہ ہوگا کیونکہ ان کی دانائی میں شک نہیں رہ جاتا اگر

انھیں ایک مرتبہ یوتھیڈیمس یا دانائی کے دعویداروں کا سامنا کرنا پڑے تو وہ انھیں شکست دے دیں

گے۔ تاہم ان کا اپنی دانائی کا دعویدار بننا بڑی فطری بات ہے اور ایک خاص حد تک سیاسی

اور انھیں میسر بھی ہوتا ہے ہو کسی حد تک ان کی ان باتوں کا جواز ہے۔ فی الحقیقت وہ جن دو

گروہوں کی درمیانی مخلوق سمجھے جاتے ہیں، ان سے الگ (اپنے زعم میں ممتاز) رہ کر

اپنی (محدود) دانائی کا فائدہ خوب اٹھاتے ہیں۔

کریٹو: ان کے بارے میں آپ اور کیا کہتے ہیں؟ آپ کی باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ ان کے بارے میں ابھی اور کچھ خاص باتیں جانتے ہیں۔

سقراط: ہاں، کریٹو! ان کے بارے میں مخصوص باتیں حقیقت سے مطابقت نہیں رکھتیں۔ انھیں یہ سمجھ نہ کہ درمیانی کیفیت اشیا کی حقیقت کیا ہوتی ہے کیونکہ جتنے انسان اور اشیا دیگر دو کے درمیان معتدل ہوتی ہیں اور (کسی حد تک) دونوں کے وظائف فطرت میں حصہ لیتی ہیں۔ اگر اس صورت میں ان دونوں میں سے ایک شے اچھی اور دوسری بُری ہو تو ان معتدل اشیا کی حیثیت ایک سے بُری اور دوسری سے بدترین ہوتی ہے اور اگر وہ دو اچھی کے درمیان اوسط کے طور پر ہوں تو مقاصد کے حصول میں ان کی حیثیت دونوں انتہاؤں سے کم تر رہتی ہے۔ صرف اس صورت میں جب دونوں انتہاؤں پر موجود اشیا میں سے کسی کا مقصد بھی اچھا نہ ہو تب ان درمیانی اشیا کی حیثیت دونوں سے قدرے بہتر رہتی ہے۔ سو اگر فلسفے اور سیاست دونوں کو مثبت اور اچھا قرار دیا گیا ہو مگر ان کے مقاصد مختلف ہوں اور یہ درمیانی اشیا دونوں کے ساتھ ملوث بھی ہوں بلکہ دونوں کے درمیان اوسط

کی حیثیت رکھتی ہیں تو سمجھ لو ان کی باتیں فضول ہوں گی کیونکہ ان کی حیثیت دونوں سے کمتر ہے۔ البتہ ان دونوں (سیاست اور فلسفہ) میں ایک کو اچھا اور دوسرے کو بُرا مانا جا چکا ہے تو وہ ایک سے بہتر اور دوسری کے حوالے سے بدترین سمجھے جائیں گے۔ البتہ دونوں (سیاست اور فلسفہ) بُرائی قرار پائیں تب ان درمیانی اشیا کی باتوں میں کچھ وزن یقیناً ہوگا۔ مجھے یقین نہیں کہ وہ اپنے دونوں نقطہ ہائے نظر کو مکمل یا خالص بُرائی قرار دیں گے مگر سچائی یہ ہے کہ یہ فلسفی نما سیاستدان جن کا نشانہ دونوں میدان ہوں، ناکام ہی رہتے ہیں اور تیسرے عنصر کی حیثیت سے باقی رہتے ہیں۔ اگر چہ وہ خود کو درجۂ اوّل پر رکھنے کے شدت سے خواستگار رہیں گے۔ البتہ ان کے اس مطمحِ نظر پر ناراض ہونے کی ضرورت نہیں۔ یہ قابلِ معافی ہے کیونکہ ہر شخص جس کے کام میں کسی بھی لحاظ سے دانائی کا عمل دخل رہا ہو فطرتاً اس بات کو پسند کرتا ہے کہ اسے چاہا جائے اور اس کے وجود کی شناخت (شناختِ ذات) ہو۔ تاہم ہمارا فرض ہے کہ ہم انھیں ان کی حقیقی حیثیت سے ہی پہچانیں۔

کریٹو: سقراط! میں نے آپ کو پہلے بھی کئی بار بتایا ہے کہ میں اپنے دونوں بیٹوں کے لیے بے حد پریشان ہوں۔ میں ان کا کیا کروں؟ چھوٹے کے بارے میں اگر چہ جلدی نہیں ہے کہ وہ ابھی بچہ ہے مگر بڑا یعنی کریٹوبولوس اب بڑا ہو رہا ہے اور اسے کسی ایسے آدمی کی ضرورت ہے جو اس کی شخصیت کی بڑھوتری کے عمل کی دیکھ بھال کر سکے۔ آپ سے باتیں کر کے مجھے اندازہ ہوا ہے کہ اپنے بچوں کے بارے میں ہماری بہت سی پریشانیاں محض احمقانہ ہوتی ہیں۔ البتہ ان میں سے اہم ترین کسی اچھے خاندان میں ان کا رشتہ طے کرنا ہوتا ہے۔ پھر ان کے لیے معقول رقم کا اکٹھی کر چھوڑنا ہے مگر ہم یہ سب کرتے ہیں اور نہیں کرتے تو ان کی تعلیم و تربیت کے لیے کچھ نہیں کرتے۔ پھر جب میں ان لوگوں پر نظر ڈالتا ہوں جو دوسروں کے بچوں کو تعلیم دینے کے حوالے سے شہرت رکھتے ہیں تو میری حیرت دو چند ہو جاتی ہے۔ میں اگر حقیقت کا اعتراف کرنا چاہوں تو اس کے سوا کچھ نہیں کہہ سکتا کہ انھیں فلسفیانہ بحث میں الجھے دیکھ کر اپنے بچوں کو یہ مشورہ دینے کی جرأت نہیں ہوتی کہ وہ فلسفہ پڑھیں۔

سقراط: ڈیئر کریٹو! کیا آپ کو معلوم نہیں کہ ہر پیشے میں عام اور کم تر لوگوں کی تعداد بہت زیادہ ہوتی ہے جبکہ بلند مرتبہ لوگوں کی اگر چہ تعداد کم ہوتی ہے مگر وہ انمول ہوتے ہیں۔ مثلاً جمناسٹک، علم البیان، فن سکہ سازی اور سپہ سالاری سب قابلِ قدر فنون نہیں؟

کریٹو: یقیناً قابلِ قدر ہیں۔ کم از کم میں تو یہی سمجھتا ہوں۔

سقراط: اور آپ یہ بھی جانتے ہوں گے کہ ان پیشوں کے اکثر لوگ کسی کام کے نہیں ہوتے؟

کریٹو: ہاں ہاں۔ ان میں سے اکثریت بس ایسے ہی ہوتی ہے۔

سقراط: تو اس وجہ سے آپ ان تمام پیشوں کو رد کر کے ان تمام کے دروازے اپنے بیٹے پر بند کر دیتے؟

کریٹو: نہیں سقراط! یہ بات تو نامناسب ہوگی۔

سقراط: تب پھر پریشان ہونے کی ضرورت نہیں اور اس چکر میں بھی مت پڑیئے کہ فلاسفہ اچھے ہوتے ہیں کہ بُرے۔ بلکہ خود فلسفے پر توجہ دو۔ البتہ خود فلسفے کو خوب پرکھو اور اگر واقعی اسے بُرا پاؤ تو پھر صرف اپنے بیٹے ہی کو نہیں سب کو اس سے دور کر دو لیکن اگر فلسفہ میرے (اچھے) خیالات کے مطابق ہو تو اس کی اتباع کرو اور اس کی خدمت، جیسا کہ کہاوت ہے، اپنے گھر والوں سمیت کرو۔ یہ آپ کو مستقل خوشی کی بھرپور ضمانت دے گا۔

کریٹائیلس

(Cratylus)

شرکائے گفتگو:

سقراط(Socrates)؛ **ہرموجینس**(Hermogenes)؛

کریٹائیلس(Cratylus)

ہرموجینس: آیئے سقراط کو اپنی بحث میں شامل کر لیتے ہیں۔

کریٹائیلس: آپ ایسا چاہتے ہیں تو ٹھیک ہے۔

ہرموجینس: سقراط۔ میں ذرا آپ پر واضح کر دوں کہ میرے دوست کریٹائیلس ناموں کے بارے میں دلائل دے رہے تھے۔ ان کا خیال ہے کہ نام قدرتی ہوتے ہیں نہ کہ لوگوں کی باہمی رضامندی سے تشکیل پاتے ہیں۔ بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ انسان کی زبان سے نکلنے والی آوازوں کا ایک ایک جزو حرف اور صدا فطری اور قدرتی ہوتی ہے اور یہ تصور صرف یہیں نہیں بلکہ یونانیوں اور غیر یونانیوں (Hellenes and barbarian) کے ہاں بھی ہے اور میں نے اس سے جب یہ پوچھا کہ اس کا خود اس کے نام کریٹائیلس کے بارے میں کیا خیال ہے؟ کیا وہ بھی حقیقی ہے تو اس نے ہاں میں جواب دیا ہے۔ اسی طرح 'سقراط' کو بھی وہ حقیقی اور فطری نام قرار دیتا ہے۔ اس پر جب میں نے مزید استفسار کرتے ہوئے کہا کہ ہر شخص کو جس کسی بھی نام سے پکارا جائے وہی اس کا حقیقی اور فطری نام ہو جاتا ہے تو اس کے جواب میں اس نے کہا:

"اگر پوری دنیا تمھیں ہرموجینس کہنے لگے تو یہ تمھارا نام نہیں ہوگا۔"

اور اگر میں اس کے اس جملے کی مزید وضاحت چاہتا ہوں تو ان کا جواب خلافِ معمول اور پیچیدہ ہوتا ہے اور ایسا لگتا ہے کہ جیسے ان کا اس ضمن میں خاص نقطۂ نظر ہے۔ اگر وہ واقعی چاہتے ہیں کہ

ان کی بات سمجھی جائے تو انھیں اس کی مزید وضاحت کرنا پڑے گی۔ اس ضمن میں سقراط، آپ ہی کچھ رہنمائی کیجیے کہ اس فرمان کی اصل کیا ہے اور اگر آپ کا اس ضمن میں اپنا کوئی الگ نقطۂ نظر ہو تو وہ بھی بیان کر دیجیے۔ بالخصوص میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ ناموں کی حقیقت اور صحت کے بارے میں (ایسے نام جو مستقبل قریب میں میری سماعت کے حلقے میں آئیں گے) آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟

سقراط: اے ہپونیکس کے بیٹے! ایک قدیم کہاوت ہے کہ خیر اور بھلائی کا علم حاصل کرنا بہت کٹھن کام ہے اور علم الاسما بھی عمومی علم کا ایک قابل قدر حصہ ہے۔ البتہ اگر میں نے پروڈیکس کا پچاس ڈریکما (یونانی سکہ یعنی پچاس روپے) کا کورس کیا ہوتا (اور یہ اس وقت ممکن ہوتا اگر میں مفلس نہ ہوتا) جو خود اس کے بقول گرامر اور زبان دانی کی تعلیم پر مشتمل بہترین کورس ہے، تو میں اسماء الرجال کی صحت کے بارے میں آپ کے سوال کا بآسانی جواب دے سکتا۔ مگر میں نے تاوقت ان صاحب کا ایک ڈریکما (یونانی سکہ یعنی روپے) کا کورس ہی سنا ہے۔ لہٰذا میں ایسے معاملات کی حقیقت سے پردہ اٹھانے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ البتہ آپ اور کریٹائیلس اس ضمن میں کوئی تحقیق و تدقیق کرنا چاہیں تو میں آپ کی معاونت کے لیے حاضر ہوں۔ کریٹائیلس کا یہ جملہ کہ آپ کا نام فی الحال ہرموجنیس نہیں، محض مذاق نہیں ہو سکتا۔ درحقیقت اس کا مطلب یہ ہے کہ تم ہرمیس (Hermes) کے بیٹے (ہرموجنیس) اس اعتبار سے نہیں ہو کہ تم اس عظیم شخص کی عادت کے برخلاف قسمت پر بھروسا کرنے کی بجائے دولت کے پیچھے مارے مارے پھرتے ہو مگر میں جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں اس علم کے حصول کی راہ میں بہت مشکلات آتی ہیں۔ اس لیے مناسب ہوگا کہ جب تک ہم دونوں طرف کے نظریات واضح طور پر سن نہ لیں کسی فیصلے کا اعلان کرنے سے اجتناب کریں۔

ہرموجنیس: میں نے کریٹائیلس کے علاوہ دیگر افراد کے ساتھ بھی اس موضوع پر کافی گفتگو کی ہے مگر اس وقت تک خود کو اس ضمن میں مطمئن نہیں کر سکا کہ اسماء الرجال کی صحت سے متعلق روایت یا سمجھوتے کے حوالے سے کوئی واضح اصول موجود ہے کیونکہ میرے خیال میں آپ کوئی بھی نام مثال کے طور پر لیں وہ درست ہوگا بلکہ اگر آپ اسے بدل کر کوئی دوسرا نام رکھ لیں تو وہ بھی پہلے نام ہی کی طرح درست اور حقیقی ہوگا۔ ہم اکثر خود اپنے نام بدلتے ہیں اور ہر مرتبہ حاصل ہونے والا نیا نام پہلے جیسا حقیقی اور درست ہی محسوس ہوتا ہے کیونکہ خود فطرت نے کسی بھی شے کا کوئی مخصوص نام نہیں رکھا۔

بلکہ یہ تو اشیا کو استعمال کرنے والے ہیں جو ان کو نام دیتے ہیں۔ میرا تو اس ضمن میں یہی نقطۂ نظر ہے۔ اب اگر کریٹائیلس یا کوئی اور صاحب اس نظریے سے اختلاف رکھتے ہیں تو میں ان کا نقطۂ نظر جاننے کے لیے بے چینی سے منتظر ہوں۔

سقراط: میرا خیال ہے ہرموجینس، کہ آپ درست کہہ رہے ہیں۔ آیئے اس صورت حال کا ذرا وضاحت سے جائزہ لیں، مثلاً آپ کے خیال میں کسی شے کا نام وہی ہے جس سے کوئی اس شے کو پکارنے پر (دوسروں سے) متفق ہوتا ہے۔

ہرموجینس: ہاں میرا نقطۂ نظر یہی ہے۔

سقراط: چاہے یہ نام کسی فرد کی طرف سے دیا گیا ہو یا پورے شہر کی جانب سے؟

ہرموجینس: جی بالکل۔

سقراط: بہت اچھا، اس ضمن میں ایک مثال قابل توجہ ہے۔ فرض کیجیے کہ میں کسی انسان کو گھوڑا کہتا ہوں یا گھوڑے کو آدمی کہہ دیتا ہوں تو کیا آپ سمجھتے ہیں کہ اس شخص کو ایک فرد کی طرف سے گھوڑا کہنے کا جواز ہے یا پورے شہر کی جانب سے ایسا کہنا درست ہوگا؟ اسی طرح گھوڑے کو انسان کہنا صرف میری زبان سے درست ہوگا یا پورے شہر کی طرف سے ایسا کہنا جائز ہوگا؟ آپ کا اصل خیال اس ضمن میں کیا ہے؟

ہرموجینس: میرے خیال میں تو دونوں صورتوں میں درست ہے۔

سقراط: مگر سچائی کے بارے میں آپ کیا کہیں گے؟ کیونکہ جہاں تک ظاہری الفاظ کا تعلق ہے ان میں بھی غلط اور درست دونوں صورتوں کے لیے الفاظ موجود ہیں۔

ہرموجینس: ہیں تو۔

سقراط: اور مفروضوں میں بھی درست اور غلط دونوں کی گنجائش ہوتی ہے۔

ہرموجینس: یقیناً ایسا ہے۔

سقراط: ایسی صورت میں درست مفروضے کا مطلب ہے کہ جیسا فرض کیا گیا تھا ویسا ہی ہے جب کہ مفروضہ غلط ہونے کا مطلب یہ ہے کہ جیسا فرض کیا گیا تھا ویسا نہیں ہے یعنی مفروضہ ثابت نہیں ہوا۔

ہرموجینس: بالکل درست۔ اس کا اس کے علاوہ اور کوئی جواب ممکن ہی نہیں ہے۔

یعنی ایک مفروضے میں صحیح اور غلط دونوں کا امکان برابر برابر موجود ہوتا ہے؟

سقراط:

ہرموجنیس: یقیناً۔

سقراط: ایسے امکان کے بارے میں کیا خیال ہے جب مفروضہ اگرچہ کلی حیثیت میں درست ہو مگر اس کے بعض اجزا غلط ہوں؟

ہرموجنیس: میں تو اسی مفروضے کو درست مانوں گا جو کلی طور پر درست ہو اور اس کے چھوٹے سے چھوٹے اجزا کی صحت سے بھی انکار ممکن نہ ہو۔

سقراط: کیا کسی مفروضے میں نام ہی سب سے چھوٹا عنصر ہے، جس کا حل مطلوب ہوتا ہے یا اس سے چھوٹا کوئی مسئلہ بھی مفروضے کا حصہ ہو سکتا ہے۔

ہرموجنیس: نام ہی سب سے چھوٹا عنصر ہو سکتا ہے۔

سقراط: اس کا مطلب ہے کہ نام صحیح مفروضے کا حصہ ہو سکتا ہے۔

ہرموجنیس: بالکل ہو سکتا ہے۔

سقراط: اور اگر صحیح مفروضے کا حصہ ہو تو نام بھی صحیح ہی ہوگا۔ خود آپ نے یہی کہا ہے۔

ہرموجنیس: جی ہاں!

سقراط: اور جیسا کہ ہم طے کر چکے ہیں کہ مفروضہ درست بھی ہو سکتا ہے اور غلط بھی، تو ایسی صورت میں اس میں موجود اسما کی صحت اور عدم صحت دونوں کا امکان موجود ہونا چاہیے۔

ہرموجنیس: ہماری ابتدائی بحث سے تو یہی منطقی نتیجہ برآمد ہوتا ہے۔

سقراط: اور کسی شے کا نام وہی ہوگا جس سے عام حالات میں پکارنے والے اس شے کو پکارتے ہیں یا جس نام سے کہ وہ شے پہچانی جاتی ہو۔

ہرموجنیس: جی ہاں۔

سقراط: کیا ایک ہی شے کو مختلف ناموں سے پکارے جانے کی صورت میں بوقتِ اعلان اس کے تمام نام درست تصور ہوں گے۔

ہرموجنیس: جی ہاں جناب سقراط! میرے خیال میں یہی ناموں کی درست صورت ہو سکتی ہے کیونکہ آپ کسی شے کو ایک نام سے پکارتے ہیں تو ممکن ہے میں اسے دوسرے نام سے پکاروں۔ اسی طرح مختلف شہروں اور خطوں میں ایک ہی شے کے مختلف نام ہو سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر یونانیوں اور

غیر یونانیوں کے ہاں اشیا کے نام مختلف ہوتے ہیں۔ بلکہ ہیلینائی (یونانی)(Hellenic) قبائل کے اندر بھی مختلف قبیلے ایک ہی شے کو مختلف ناموں سے پہچانتے ہیں۔

سقراط: مگر ہرموجینس، کیا اس سے تم یہ مطلب لے سکتے ہو کہ نام بدلنے سے اشیا بدل جاتی ہیں؟ اور کیا پروٹاغورس کے بقول اس کا اطلاق افراد پر ہوتا ہے؟ کیونکہ اس کے بقول مختلف اشیا کی اصلیت کا پیمانہ بھی انسان ہی ہے اور یہ کہ اشیا میرے لیے میری نظر کے مطابق اور آپ کے لیے آپ کی نگاہ کے مطابق حیثیت رکھتی ہیں۔ کیا آپ پروٹاغورس سے مکمل طور پر متفق ہیں یا اس سلسلے میں آپ کا آزادانہ نقطۂ نظر ہے؟

ہرموجینس: سقراطِ محترم، ایک زمانہ تھا جب اپنی ذہنی الجھنوں کے باعث مجھے پروٹاغورس کے افکار میں پناہ ڈھونڈنا پڑی تھی، مگر اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ میں اس سے کلی طور پر متفق ہوں۔

سقراط: وہ کون سی خاص بات ہے، جس کے بارے میں آپ یہ سوچنے پر مجبور ہوئے کہ اس کا وجود بُرے سے بُرے آدمی میں بھی نہیں ہوتا؟

ہرموجینس: سقراط ایسی کوئی خاصیت تو میرے علم میں نہیں البتہ میں نے اکثر سوچا ہے کہ بُرے آدمیوں کا نہ صرف وجود ہے بلکہ ان کی تعداد بہت زیادہ ہے۔

سقراط: درست! مگر تمھیں اپنے ماحول میں بہت سے اچھے لوگ نظر آتے ہیں؟

ہرموجینس: ہاں، مگر بہت ہی کم تعداد میں۔

سقراط: خیر، تمھیں اچھے انسان دکھائی تو دیتے ہیں؟

ہرموجینس: ہاں، یہ تو ہے۔

سقراط: اور کیا تمھارے ذہن میں یہ بات بھی کبھی آئی ہے کہ بہت اچھے لوگ بہت ہی دانا افراد ہوتے ہیں جبکہ بہت ہی بُرے لوگ بہت احمق ہوتے ہیں۔ تمھارا اس ضمن میں کیا خیال ہے؟

ہرموجینس: میں کسی حد تک آپ کی اس بات سے متفق ہوں۔

سقراط: اور اگر پروٹاغورس کی بات درست ہے اور اشیا کی حقیقت مختلف لوگوں کی نظر میں مختلف ہوسکتی ہے تو یہ کیسے ممکن ہوا کہ ہم میں سے کچھ عقلمند ہوتے ہیں تو کچھ کند ذہن اور احمق؟ کیا ایسا ممکن ہے؟

ہرموجینس: بالکل ممکن نہیں۔

سقراط: اور اس کے برعکس، جیسے آپ نے کہا، دانائی اور کج فہمی دو قطعی مختلف کیفیتیں ہیں اور ان کا باہمی

رابطہ تضاد کا ہے تو آپ کو ماننا پڑے گا کہ پروتا غورس کا نظریہ درست نہیں کیونکہ اگر کوئی چیز ہر شخص کے لیے اس کے اپنے نقطۂ نظر سے درست ہوتی ہے تو ہم دانائی کی بنیاد پر مختلف لوگوں کی درجہ بندی کیسے کر سکتے ہیں؟

ہرموجنیس: نہیں کر سکتے!

سقراط: میں سمجھتا ہوں کہ آپ یوتھیڈیمس کے نظریے سے بھی متفق نہیں ہو سکتے جو کہتا ہے کہ تمام اشیا بیک وقت اور ہمیشہ تمام لوگوں سے متعلق ہوتی ہیں۔ چنانچہ اس کے نقطۂ نظر سے بھی اشیا کی بُری اور اچھی اشیا کے طور پر تقسیم ناممکن رہتی ہے کیونکہ حسنِ عمل اور برائی بیک وقت تمام انسانوں پر مساوی اور ایک جیسا تاثر قائم کریں گی (بقول یوتھیڈیمس) تو پھر ایسی تقسیم کیونکر ممکن ہو سکتی ہے۔

ہرموجنیس: آپ صحیح کہتے ہیں ایسی صورت میں اچھی اور بری اشیا میں تمیز ناممکن رہتی ہے۔

سقراط: اور اگر اس صورتِ حال اور نظریے کو درست قرار نہ دیا جائے اور اشیا کا تعلق، بیک وقت اور ہمیشہ، تمام لوگوں سے ممکن نہ ہو تو ایک کیفیت کی اہمیت پیدا ہوتی ہے اور وہ یہ کہ ایسی صورت میں ہر شے کی اپنی منفرد خاصیتوں کے وجود پر ایمان لانا پڑے گا۔ اس لحاظ سے یہ اشیا نہ براہِ راست ہم سے متعلق رہتی ہیں نہ ہماری سوچ، خواہشات اور تصورات کا ان پر کوئی اثر مرتب ہوتا ہے بلکہ یہ قوانینِ فطرت کے مطابق اپنی اندرونی ساخت و کیفیات اور اردگرد کے ماحول سے تعلق کو متعین کرنے میں آزاد ہیں۔

ہرموجنیس: جناب سقراط! میرا خیال ہے آپ درست فرما رہے ہیں۔

سقراط: جو کچھ میں اشیا کے بارے میں کہہ رہا ہوں کیا اس کا اثر صرف اشیا تک ہی محدود رہتا ہے۔ یا ان اشیا سے متعلق افعال بھی اس سے متاثر ہو سکتے ہیں کیونکہ افعال و اعمال بھی وجود ہی کا حصہ ہیں۔

ہرموجنیس: اعمال و افعال بھی اشیا کی طرح حقیقی ہوتے ہیں۔ اور وجود کے حامل۔

سقراط: اس طرح یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ افعال و اعمال کی بھی ایک ساخت اور فطری حیثیت و حقیقت ہوتی ہے جو ہماری انفرادی رائے سے متاثر نہیں ہوتی۔ کاٹنے ہی کی مثال لیجیے۔ ہم اپنی مرضی یا اپنی پسند کے اوزار سے کٹائی نہیں کر سکتے بلکہ مناسب ہتھیار اور کٹائی کے فطری طریقے کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے کیونکہ فطری طریقہ ہی کامیاب ہوگا۔ دوسرا کوئی بھی طریقہ ناکام اور بے سود ثابت ہوگا۔

جی ہاں میں آپ سے اتفاق کروں گا کہ فطری طریقہ ہی صحیح طریقہ ہوتا ہے۔

ہرموجنیس: جی ہاں میں آپ سے اتفاق کروں گا کہ فطری طریقہ ہی صحیح طریقہ ہوتا ہے۔

سقراط: اسی طرح جلنے کی مثال لی جاسکتی ہے اس میں فطری طریقہ ہی صحیح طریقہ ہے اور جلانے کا فطری ہتھیار یا ذریعہ ہی مناسب ترین شمار ہوگا۔

ہرموجنیس: سقراط! مجھے آپ سے اتفاق ہے۔

سقراط: کیا اس اصول کا اطلاق تمام اعمال وافعال پر ہونا چاہیے؟

ہرموجنیس: جی ہاں، یقیناً۔

سقراط: اور گفتگو کو بھی آپ فعل ہی سمجھتے ہیں۔

ہرموجنیس: بالکل۔

سقراط: تو کیا جو شخص اپنی پسند کے مطابق گفتگو یا تقریر کرے گا اسی کو صحیح مانا جائے گا؟ یا ایک کامیاب مقرر کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی پسند کی بجائے فطری انداز اختیار کرے اور اس میں اگر کوئی اوزار یا ذریعہ استعمال کرنا مطلوب ہے تو وہ بھی فطری ہی ہو۔ میرے خیال میں اس کے علاوہ تقریر کا ہر انداز اور ذریعہ غلط اور ناکام ہوگا۔

ہرموجنیس: میں اس سے بالکل متفق ہوں۔

سقراط: اور کیا اشیا کا نام پکارنا گفتگو ہی کے زمرے میں نہیں آتا، کیونکہ نام پکارتے وقت بھی تو بولنا ہی پڑتا ہے۔

ہرموجنیس: سقراط یہ تو ہے۔

سقراط: اور اگر گفتگو کو فعل قرار دے کر اسے انسان سے براہ راست متعلق قرار دیا جاسکتا ہے تو اس لحاظ سے اشیا کا نام لینا بھی فعل ہی قرار نہیں پاتا؟

ہرموجنیس: بالکل درست، نام لینا بھی فعل ہی ہے۔

سقراط: اور یہ ہم طے کر چکے ہیں کہ افعال سو فی صد ہمارے تابع نہیں بلکہ ان کی اپنی ایک فطری ساخت ہوتی ہے۔ ایسا ہی ہے ناں۔

ہرموجنیس: بالکل یہی بات ہے۔

سقراط: اس سے تو یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ مختلف اشیا کو نام دیتے وقت فطری انداز وذرائع اختیار کرنے کی ضرورت ہوگی۔ ہم اپنی خوشی اور مرضی سے ایسا نہیں کر سکتے ورنہ فطری نتائج برآمد نہ ہوں گے۔

سقراط، آپ صحیح فرما رہے ہیں۔
ہرموجنیس:
سقراط: یہاں ایک اور نکتہ توجہ طلب ہے اور وہ یہ کہ مثلاً کاٹنے کے عمل کو لیں تو کٹنے والی شے کے ساتھ ساتھ کوئی ایسی شے بھی درکار ہوگی جو کاٹنے کا کام کرے؟
ہرموجنیس: یقیناً درکار ہوگی۔
سقراط: اسی طرح بنائی اور چھدائی کے لیے بھی کسی اوزار کی ضرورت ہوگی۔
ہرموجنیس: یقیناً ہوگی۔
سقراط: اور جس شے کو نام دیا جانا مطلوب ہو تو کیا نام دینے کے لیے بھی کسی اوزار یا ذریعے کی ضرورت ہو گی؟
ہرموجنیس: ہونی تو چاہیے۔
سقراط: چھدائی کے لیے کس شے کی ضرورت پڑتی ہے؟
ہرموجنیس: ایک شٹل کی ضرورت پڑتی ہے۔
سقراط: اور بنائی کے لیے؟
ہرموجنیس: ایک شٹل کی۔
سقراط: اور نام دینے کے لیے؟
ہرموجنیس: ایک نام کی۔
سقراط: خوب! تو گویا نام ایک اوزار بھی ہے؟
ہرموجنیس: یقیناً ہے۔
سقراط: فرض کیجیے میں پوچھوں کہ ایک شٹل کیسا یا کس مقصد کے لیے آلہ درکار ہے تو آپ کا جواب یقیناً یہ ہوگا کہ بنائی کے لیے۔
ہرموجنیس: جی ہاں۔
سقراط: اور اگر میں پوچھوں کہ بنائی سے قبل ہم کیا کرتے ہیں؟ تو آپ کا جواب ہوگا کہ پہلے اون کی دھنائی کرتے ہیں یعنی اس کے ریشوں کو الگ الگ کرتے ہیں کیوں! ایسا ہی ہے ناں؟
ہرموجنیس: بالکل صحیح۔
سقراط: اب میں ناموں کے سلسلے میں اسی نوعیت کا ایک سوال پوچھتا ہوں۔ کیا آپ جواب دیں گے؟

سوال یہ ہے کہ اگر نام کو (جیسے پہلے طے ہوا ہے) بطور آلۂ کار استعمال کریں تو نام رکھنے یا دینے سے قبل کیا کریں گے؟ (جیسے ہم بنائی سے پہلے دھنائی کرتے ہیں)۔

ہرموجنیس: اس کے جواب میں، میں کیا کہہ سکتا ہوں۔

سقراط: کیا اس کے لیے ہم باہمی بحث اور مشورے سے اشیا کو ان کی ساخت کے اعتبار سے ترتیب نہیں دیں گے۔

ہرموجنیس: بالکل یہی کرنا پڑے گا۔

سقراط: گویا نام تعلیم کا ایک ذریعہ ہے جس سے ہم اشیا کو ان کی فطری ساخت کے اعتبار سے الگ الگ کرتے ہیں بالکل ایسے ہی جیسے بنائی سے قبل دھنائی کے دوران اون کے ریشے الگ الگ کیے جاتے ہیں۔

ہرموجنیس: یہی بات ہے۔

سقراط: اور شٹل نورباف کا ہتھیار ہوتا ہے؟

ہرموجنیس: یقیناً۔

سقراط: اس کا مطلب ہوا کہ ایک نورباف کے لیے شٹل کا بہترین استعمال وہ ہوگا جب وہ اسے نورباف کی پیشہ ورانہ مہارت کے ساتھ کرے۔ اسی طرح ایک استاد کے اسما کا عمل بھی اسی وقت درست سمجھا جائے گا جب اسما کا استعمال ایک استاد کی پیشہ ورانہ مہارت کے ساتھ کیا جائے؟

ہرموجنیس: جی ہاں!

سقراط: اور نورباف جس شٹل کو استعمال کر رہا ہوگا وہ کس شخص کے فن کا نتیجہ ہوگی؟

ہرموجنیس: ایک بڑھئی کے فن کا!

سقراط: اور کیا ہر شخص بڑھئی ہونے کا دعویٰ کر سکتا ہے یا محض وہی شخص جو اس فن پر دسترس رکھتا ہوگا؟

ہرموجنیس: صرف وہی شخص جو اس فن میں مہارت کا حامل ہو۔

سقراط: اور جب چھدائی کرنے والا شخص ستھری استعمال کرے گا تو وہ ستھری کی صورت میں کس شخص کی کاریگری کے نتیجے کو استعمال کرے گا؟

ہرموجنیس: سقراط! ایک لوہار کی مہارت کے نتیجے کو!

سقراط: اور کیا ہر شخص لوہار کہلا سکتا ہے یا فقط وہ شخص جو اس فن پر دسترس رکھتا ہو۔

ہرموجینس: لوہے سے اشیا بنانے کے فن کا ماہر ہی لوہار کہلانے کا مستحق ہے۔

سقراط: اور جب استاد مختلف اشیا کو نام دینے کے حوالے سے لوگوں کو تعلیم دے رہا ہوگا تو (ناموں کا ہتھیار استعمال کرتے ہوئے) کس کا فن استعمال کر رہا ہوگا؟

ہرموجینس: ایک بار پھر الجھن میں پڑ گیا ہوں کہ اس کا کیا جواب دوں!

سقراط: کیا تم اس فرد کی نشاندہی نہیں کر سکتے جو ہمیں اشیا کے نام بتاتا ہے؟

ہرموجینس: نہیں!

سقراط: کیا یہ علم قانون نہیں ہے جو ہمیں اشیا کے ناموں سے آگاہی دیتا ہے؟

ہرموجینس: ہاں یہ تو ہے۔

سقراط: تب پھر استاد اشیا کے ناموں کی تفصیل، ترتیب اور گروہ بندی کی تعلیم کے دوران ایک قانون ساز کے علم اور مہارت کو استعمال کر رہا ہوتا ہے۔

ہرموجینس: سقراط! بات سمجھ میں آتی ہے۔

سقراط: تو کیا ہر شخص قانون ساز ہو سکتا ہے یا فقط وہ جو اس فن میں مہارت تامہ رکھتا ہے۔

ہرموجینس: وہی جو اس فن میں ماہر ہو۔

سقراط: تو گویا عزیزم ہرموجینس! اشیا کے ناموں کی تحقیق و تدقیق ہر فرد کا کام نہیں بلکہ یہ فن ایک قانون ساز کا ہے اور قانون ساز تمام انواع کے ماہرین کے مقابلے میں سب سے کم تعداد میں پائے جاتے ہیں۔

ہرموجینس: میں بھی یہی سمجھتا ہوں۔

سقراط: اور یہ کہ ایک ماہر قانون یا قانون ساز کس اصول کے تحت اشیا کا نام دیتا ہے یعنی وہ اس عمل میں کس بات کو ملحوظ رکھتا ہے؟ اس کے لیے آپ گزشتہ مثال پر ایک دفعہ پھر توجہ مبذول اور مرکوز کرنا ہوگی۔ یعنی ایک بڑھئی جب شٹل بناتا ہے تو کس شے کو ملحوظ رکھتا ہے۔ کیا اسے اس امر پر غور نہیں کرنا پڑتا کہ آخر اس ضرورت پر کون سی اور کیسی چیز فطری طور پر پوری ہو سکتی ہے؟

ہرموجینس: بالکل کرنا پڑتا ہے۔

سقراط: اور فرض کیجیے ایک شٹل تشکیل کے مرحلے ہی کے دوران ٹوٹ جائے اور بڑھئی دوسری شٹل بنانے لگے تو کیا اس ٹوٹی ہوئی ادھوری شٹل کو دیکھ کر نئی شٹل تشکیل دے گا یا اس کی طرف دیکھنے کی بجائے

اس مکمل ترین نمونے کی طرف غور کرے گا جو اس کے دماغ میں اس کے فن اور تجربے کی روشنی میں موجود ہوگا؟

ہرموجینس: وہ یقیناً اپنے ذہن میں موجود تجربے کو مدنظر رکھے گا۔

سقراط: تو کیا وہ شٹل جو اس کے ذہن میں (فن اور تجربے کے نتیجے میں) محفوظ ہے وہی اصل اور آئیڈیل کہلائے گی؟

ہرموجینس: میرا یہی خیال ہے۔

سقراط: جب مختلف مواد استعمال کر کے مختلف اشیا بُنی جا رہی ہوں تو اس عمل میں استعمال ہونے والی ہر شٹل کو اس بنیادی آئیڈیل نمونے کے مطابق ہی ہونا چاہیے یعنی ہر صورت میں اس کی شکل، لمبائی اور موٹائی وغیرہ ایک ہی رہے گی یا ان خصائص میں مواد اور مطلوبہ شے کی ساخت کے مطابق فرق آسکتا ہے؟

ہرموجینس: بالکل! فرق آنا قدرتی بات ہے۔

سقراط: اور اس اصول کا اطلاق دیگر اوزاروں اور آلات پر بھی ہوتا ہے۔ مثلاً جب کوئی شخص کسی کام میں استعمال ہونے والے اوزار کو (فطری ساخت کے حوالے سے) دریافت کرے تو اسے اس کے اسی استعمال پر زور دینا چاہیے جو فطری طریقے میں موزوں ہو نہ کہ وہ اپنے تصورات اور خیالات سے اس میں اختراعات کرے، مثلاً جب کوئی لوہار لوہے کے ٹکڑے کو شٹل میں ڈھالنے کی کوشش کرے تو اس کی شکل وصورت طے کرنے کے لیے فطرت کا مشاہدہ کرے کہ قدرت اپنے مظاہر کے ذریعے ایسے معاملات میں کیسے اوزار استعمال کرتی ہے۔ کیا خیال ہے؟

ہرموجینس: آپ درست فرما رہے ہیں۔

سقراط: اور لکڑی کے ٹکڑے کو شٹل کی شکل دینے کے لیے فطرت کے استعمال کیے گئے طریقے کو کیسے محلِ نظر رکھا جائے گا؟

ہرموجینس: درست!

سقراط: کیونکہ مختلف قسم کے ریشوں کے لیے مختلف قسم کی شٹل درکار ہوں گے اور اسی اصول کا اطلاق دیگر اوزاروں پر بھی بالعموم کیا جاسکتا ہے؟

ہرموجینس: جی ہاں!

سقراط: اسی اصول کے تحت اشیا کے ناموں کے معاملے کو لیں۔ کیا ایک قانون ساز کے لیے ضروری نہیں کہ وہ یہ جانتا ہو کہ مختلف ناموں کو قدرتی آوازوں اور صوتی اشاروں کی مدد سے تشکیل دے اور یوں مختلف اشیا کو نام دیتے وقت ایک فطری اور آئیڈیل نام اس کے ذہن میں موجود ہو؟ اسی صورت میں اسے نام دینے کے فن میں ماہر مانا جاسکتا ہے۔ ہمیں یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ مختلف قانون سازوں کے لیے ایک جیسے صوتی اشارے کے ذریعے الفاظ یا نام بنانا لازم نہیں۔ بالکل ایسے ہی جیسے مختلف کارخانوں میں بیٹھے لوہار بے شک ایک ہی شے بنانا چاہتے ہوں مگر ان کے لیے یقینی نہیں کہ وہ لوہے کی برابر مقدار کو صد فی صد ایک ہی شکل میں ڈھالیں گے یہ تو ممکن ہے کہ تیار ہونے والی شے کی ظاہری شکل وصورت، مختلف جگہوں اور کارخانوں میں، ایک ہی ہو مگر اس میں استعمال ہونے والے لوہے کی مقدار اور ساخت مختلف ہوسکتی ہے۔ اگرچہ اس معمولی امتیاز کے باوجود اصل مقصد کے حصول کے لیے دونوں اشیا برابر کامیابی سے استعمال کی جاسکتی ہوں۔

ہرموجینس: بالکل درست!

سقراط: اور جہاں تک قانون ساز کا تعلق ہے چاہے وہ یونانی (Hellenian) ہو یا غیر یونانی (Barbarian) جب تک وہ صحیح اور مناسب نام متعلقہ اشیا کو دیتا رہے گا اسے بُرا قانون ساز نہیں کہا جاسکتا۔ اس میں ناموں میں استعمال ہونے والے صوتی اشارے سے کوئی فرق پڑتا ہے نہ اس کے خطے اور ملک سے۔

ہرموجینس: یہ تو صحیح ہے!

سقراط: مگر شٹل کے ضمن میں یہ فیصلہ کون کرے گا کہ وہ مناسب شکل میں بنی ہے یا نہیں؟ کیا یہ فیصلہ کرنے کا حق بڑھئی کو ہے جس نے اسے بنایا ہے یا نوربافی کو جس نے اسے استعمال کرنا ہے۔

ہرموجینس: محترم سقراط! میرا خیال ہے کہ یہ فیصلہ کرنے کا حق استعمال کرنے والے کو حاصل ہے۔

سقراط: ذرا بتایئے تو، کہ ایک بانسری ساز کے کام کو کون استعمال کرتا ہے؟ کیا وہ شخص جو جانتا ہے کہ کام کے دوران بہترین کارکردگی کے لیے رہنمائی کس سے لی جاتی ہے یا وہ شخص جو یہ بتا سکے کہ کام بالآخر کس قدر کامیابی سے ہوا ہے؟

ہرموجینس: وہ جو بتا سکے کہ کام کس قدر کامیابی سے ہوا ہے؟

سقراط: اور ایسا شخص کون ہو سکتا ہے؟

ہرموجنیس: بانسری کو استعمال کرنے والا!

سقراط: اور بحری سفر سے متعلق ہدایات کون دے گا۔

ہرموجنیس: ایک ناخدا!

سقراط: اور ایک قانون ساز کے کام کے معیار کی پرکھ اور اسے اس کام کی بہترین تکمیل کے لیے کون ہدایات جاری کر سکتا ہے؟ کیا قانون ساز کے کام کو استعمال کرنے والا ایک عام انسان نہیں ہوتا؟

ہرموجنیس: بالکل ایک عام انسان ہی ہوتا ہے۔

سقراط: اور یہی وہ فرد ہے جو سوالات پوچھنے میں مہارت رکھتا ہے؟

ہرموجنیس: جی ہاں!

سقراط: اور ان سوالات کے جوابات بھی وہی مہیا کر سکتا ہے؟

ہرموجنیس: یقیناً۔

سقراط: اور وہ شخص جو جانتا ہے کہ سوالات پوچھے کیسے جائیں اور ان کے جوابات کیسے مہیا کیے جائیں اسے آپ لہجوں کا ایک ماہر کہیں گے۔ ہیں ناں؟

ہرموجنیس: جی ہاں! یہی اس کا نام ہونا چاہیے۔

سقراط: گویا ایک چپو کو تو بڑھئی بنائے گا مگر اسے کیسے بہترین اور موثر شکل دی جائے، یہ ہدایات ناخدا ہی جاری کر سکے گا۔ کیا خیال ہے؟

ہرموجنیس: درست!

سقراط: اسی طرح نام تو (مختلف اشیا و کوائف کو) ایک قانون ساز دے گا مگر ایسا بہتر انداز میں کرنے کے لیے ہدایات اسے لہجوں کے ماہر کی طرف سے جاری کی جائیں گی۔

ہرموجنیس: ہاں ایسا ہی ہے!

سقراط: ایسی صورت میں، عزیزم ہرموجنیس! مجھے کہنے دیجیے کہ آپ کے خیال کے برعکس اشیا کو نام دینا کوئی معمولی کام ہرگز نہیں ہے اور کوئی معمولی آدمی جیسا کہ اس کے ذہن میں اشیا کو نام نہیں دے پاتا بلکہ ایسا کام کرنے کے لیے خصوصی صلاحیت درکار ہوگی، خصوصاً ایسی صلاحیت جس سے ایک فرد، کریٹائیلس کے بقول، قدرت کی طرف سے دیئے گئے نام کی روشنی میں اشیا کو شناخت کرنے

یا سامنے کی اشیا کے خصائص اور ظاہری صورت کے مطابق فطری ناموں کا تعین کر سکے۔ گویا یہ کام عام آدمی کا نہیں ہے کیونکہ فطری نام کو آوازوں اور حروف کی شکل دینا ایک پیچیدہ عمل ہے۔ آپ اس ضمن میں کیا کہتے ہیں؟

ہرموجینس: آپ کے اس سوال کا جواب، جناب سقراط، بظاہر میرے پاس نہیں مگر مجھے ایک دقت کا سامنا ہے اور وہ یہ کہ چاہے میرے سامنے کتنے ہی پختہ دلائل کیوں نہ ہوں میں اپنی رائے کو فوری طور پر بدل نہیں پاتا۔ میرا خیال ہے کہ مجھے قائل کرنے کے لیے آپ کو بالوضاحت بتانا پڑے گا کہ آپ ناموں کی بہترین موزونیت سے کیا مراد لیتے ہیں؟

سقراط: عزیزم ہرموجینس! میرے پاس ثابت کرنے کو کچھ نہیں۔ کیا میں نے ابھی ابھی آپ کو بتایا نہیں ہے کہ اس ضمن میں میرا علم ناقص اور نامکمل ہے اور یہ حقائق جاننے کے لیے میں آپ لوگوں کی تحقیق وتدقیق میں شمولیت چاہتا ہوں آپ اتنی جلدی میرا بیان بھول گئے؟ البتہ میری اور آپ کی موجودہ گفتگو کے نتیجے میں ایک بات تو طے ہوگئی ہے کہ اسما قدرتاً ایک حقیقت ہیں اور یہ بھی کہ مختلف اشیا اور کوائف کو مناسب اور فطری نام دینا ہر کسی کا کام نہیں۔

ہرموجینس: بہت خوب!

سقراط: اس حقیقت یعنی اسما کی صحت کی ہیئت کیا ہے؟ کیا ہمارا اگلا موضوع بحث یہی نہیں؟

ہرموجینس: بالکل یہی ہونا چاہیے اور میں اس بحث کا نتیجہ جاننے کے لیے بیقرار ہوں۔

سقراط: ایسا ہے تو کوشش کیجیے!

ہرموجینس: مگر کیسے؟

سقراط: اس کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ ان لوگوں کی مدد اور رہنمائی حاصل کی جائے جو جانتے ہیں، چاہے اس کے لیے آپ کو مالی طور پر شکریہ کی صورت میں باقاعدہ قیمت ہی کیوں نہ ادا کرنا پڑے۔ خود آپ کے بھائی کالیئس (Callias) نے بھی بعض فلاسفہ کی دانائی کو کافی مشتہر کیا ہے۔ ایک آپ ہی ہیں جس نے خاندانی علم سے فائدہ نہیں اٹھایا۔ لہٰذا مناسب یہ ہے کہ اپنے بھائی کے پاس جائیے، اور اسے کسی بھی طرح اس پر قائل اور مائل کیجیے کہ وہ پروتاغورس سے حاصل شدہ علم کی روشنی میں آپ کو ناموں کی اصلیت اور موزونیت کے بارے میں کچھ بتائے۔

ہرموجینس: مگر یہ تو خود نامعقولیت کی دلیل ہوگی کہ ایک طرف تو میں پروتاغورس اور اس کی مشہور تصنیف

''حقیقت'' (Truth) کو جھٹلاؤں اور پھر اسی کی کتاب کے مندرجات کو اپنی تحقیق کے دوران اہمیت بھی دوں!

سقراط: اگر آپ اسے نظرانداز کرنے پر ڈٹے ہوئے ہیں تو پھر ہومر اور دوسرے شعرا سے استفادہ کیجیے!

ہرموجینس: مگر ہومر نے اسما کے بارے میں کب اور کیا کہا ہے؟

سقراط: اس کے کلام میں اکثر ایسی باتیں ملتی ہیں، خصوصاً ان اقتباسات میں، جہاں اس نے انسانوں اور دیوتاؤں کی جانب سے مختلف اشیا کو دیے گئے ناموں میں امتیاز سے بحث کی ہے۔ کیا اس کے ان بیانات سے اشیا کی موزونیت کے حوالے سے کافی رہنمائی حاصل نہیں ہوتی؟ کیونکہ دیوتا تو کم از کم اشیا کو موزوں ترین اور فطرت کے عین مطابق ہی نام دیں گے۔ کیا آپ ایسا نہیں سمجھتے؟

ہرموجینس: کیوں نہیں! اگر دیوتاؤں نے واقعی اشیا کو نام دیئے ہیں تو وہ واقعی موزوں ترین ہی ہوں گے۔ مگر کیا آپ کے ذہن میں کچھ خاص اسما ہیں؟

سقراط: کیا آپ کو معلوم نہیں کہ اس نے ٹرائے میں موجود اس دریا کو کیا نام دیا تھا جس کی ایک جھڑپ ہیفسٹس (Hephaestus) سے ہوئی تھی۔

''دیوتا اسے زینتھس (Xanthus) جبکہ انسان اسے سکیمنڈر (Scamander) کہتے ہیں''۔

ہرموجینس: ہاں مجھے یاد ہے؟

سقراط: خوب! ایسی صورت میں یہ طے کرنے سے کہ اس دریا کا نام فی الحقیقت زینتھس ہی ہونا چاہیے نہ کہ سکیمنڈر، ایک مقدس سبق حاصل نہیں ہوتا؟ یا اس پرندے کو لیجیے جس کے بارے میں اس نے کہا ہے۔

''دیوتا اسے چیلسس (Chalcis) جبکہ انسان اسے سائمنڈس (Cymindis) کہتے ہیں۔''

اس سے اگر یہ ادراک ہو پائے کہ سائمنڈس کے مقابلے میں چیلسس کس قدر زیادہ مناسب اور موزوں نام ہے آپ اس امر کو معمولی کیسے قرار دے سکتے ہیں؟ یہی حال بیٹیا (Batieia) اور مائیرینا (Myrina) کا ہے۔ اسی طرح ہومر کے علاوہ دیگر شعرا کے کلام میں ایسی بے شمار مثالیں دستیاب ہیں۔ میرے خیال میں یہ بات میری طرح آپ کی سمجھ سے بھی بالاتر ہے مگر یہ حقیقت ہے کہ سکیمنڈرس (Scamandrius) اور استیانیکس (Astyanax)، جنھیں اس (ہومر) نے ہیکٹر (Hector) کے بیٹے کے ناموں کی حیثیت سے ذکر کیا ہے، درحقیقت انسانی صلاحیتوں کی علامات

کی حیثیت رکھتے ہیں اور شاعر جسے ناموں کی موزونیت قرار دیتا ہے ان کی وضاحت ان اشعار میں ہو جاتی ہے جن کا میں نے حوالہ دیا ہے۔ آپ کو وہ اشعار یاد ہوں گے۔

ہرموجنیس: ہاں مجھے یاد ہیں۔

سقراط: اب آپ مجھے بتایئے کہ ہومر کے خیال میں ہیکٹر کے بیٹے کے لیے دو ناموں استیانیکس اور سکیمنڈرس میں سے کون سا زیادہ موزوں ہے؟

ہرموجنیس: میں کچھ کہہ نہیں سکتا!

سقراط: اور اگر آپ سے پوچھا جائے کہ دانا اور نادان لوگوں میں درست نام دینے پر کون بہتر اور موثر انداز میں قادر آ سکتا ہے، تو آپ کیا جواب دیں گے؟

ہرموجنیس: ظاہر ہے کہ دانا لوگ ہی اس زمرے میں آتے ہیں۔

سقراط: اور کیا ایک ہی شہر میں مردوں یا عورتوں کو صنفِ مخالف کے مقابلے میں زیادہ دانا قرار دیا جا سکتا ہے؟

ہرموجنیس: جی ہاں! میرے خیال میں یہ امتیاز مردوں کو حاصل ہے۔

سقراط: اور جیسا کہ تمھیں معلوم ہے ہومر یہ کہتا ہے کہ ٹروجن مردوں نے اسے استیانیکس یعنی شہر کے بادشاہ کا نام دیا اور اگر یہ درست ہے تو قرینِ امکان ہے کہ دوسرا نام یعنی سکیمنڈرس اسے اس شہر کی عورتوں نے دیا ہوگا۔

ہرموجنیس: ہاں اس صورتِ حال سے تو یہی نتیجہ نکلتا ہے۔

سقراط: کیا اس سے یہ نتیجہ بھی نہیں نکلتا کہ ٹروجن مرد اپنی عورتوں کے مقابلے میں زیادہ دانا تھے؟

ہرموجنیس: یقیناً یہ نتیجہ بھی برآمد ہوتا ہے۔

سقراط: ایسی صورت میں ہومر نے ایک لڑکے کے لیے سکیمنڈرس کی بجائے استیانیکس کو ہی موزوں نام قرار دیا ہوگا۔

ہرموجنیس: ظاہر ہے۔

سقراط: آخر اس کی وجہ کیا ہو سکتی ہے۔ ذرا غور کیجیے! کیا اس نے اس جملے میں وجہ کی خود نشاندہی نہیں کر دی۔

"کیوں! کیا وہی تنہا ان کے شہر اور شہر پناہ کا دفاع کرنے والا نہ تھا؟"

اس اعتبار سے شہر کے محافظ بیٹے کے لیے یہی نام موزوں ہے (جس کا مطلب شہر کے بادشاہ کا بیٹا

ہے) کیونکہ یہ ہومر کے مشاہدے سے بھی مطابقت رکھتا ہے۔

ہرموجینس: اب بات میری سمجھ میں آئی ہے۔

سقراط: کیوں؟ عزیزم ہرموجینس! میں تو سمجھ نہیں پایا۔ آپ کیسے سمجھ گئے؟

ہرموجینس: سچ تو یہ ہے کہ میں بھی نہیں سمجھ سکا۔

سقراط: مگر میرے دوست کہیں خود ہیکٹر کا نام بھی ہومر ہی کا تجویز کردہ تو نہیں ہے؟

ہرموجینس: سقراط، وہ کیسے!

سقراط: کیونکہ یہ نام بھی مجھے استیانیکس کے مشابہ لگتا ہے۔ دیکھیے ناں! دونوں قدیم یونانی (Hellenic) نام ہیں اور یوں بھی حکمران مقتدر اور قابض غاصب دونوں کا مفہوم تو ایک ہی ہے اور دونوں ناموں سے بادشاہی کا مطلب نکلتا ہے کیونکہ کوئی فرد جس خطے پر قابض ہوگا اسی کا حکمران تو کہلائے گا۔ شاید تم اسے بھی میری حماقت ہی قرار دو مگر نجانے کیوں مجھے ایسا لگتا ہے جیسے میں ناموں کی موزونیت کے حوالے سے ہومر کے اشاروں کو کچھ کچھ سمجھنے لگا ہوں۔ اگرچہ میں خود بھی اس کیفیت کی مزید وضاحت کرنے سے قاصر ہوں۔

ہرموجینس: یقین کیجیے میری رائے اس سے مختلف ہے کیونکہ مجھے یقین ہے کہ آپ صحیح راہ پر چل نکلے ہیں۔

سقراط: میرا خیال ہے کہ ہمارے پاس شیر کے بچے کو شیر اور گھوڑے کے بچے کو گھوڑا کہنے کا جواز ہے۔ میں دراصل فطری پیدائش کی بات کر رہا ہوں جس طرح سے کہ جانور اپنی نسل کشی کرتے ہیں۔ غیر فطری پیدائش کی یہاں بات نہیں ہو رہی کیونکہ ایک گھوڑے کے ہاں بچھڑا پیدا ہو جائے تو انسانوں کے ہاں کوئی غیر انسانی مخلوق پیدا ہو جائے تب البتہ اصول ٹوٹ جائے گا۔ اسی لیے ہم فطری پیدائش کے اصول کو ہی (بحث کے دوران) ملحوظ رکھیں گے۔ یہی اصول نباتات پر بھی صادق آتا ہے۔ آپ اس سے متفق ہیں؟

ہرموجینس: یقیناً متفق ہوں۔

سقراط: بہت خوب! بہتر ہے آپ خود خوب دیکھ بھال کر لیں کہ میں آپ کے ساتھ کوئی چالاکی تو نہیں کر رہا کیونکہ اسی اصول کے تحت ایک بادشاہ کا بیٹا کہلائے گا۔ یوں بھی چاہے نام کا صوتی اشتراک یکساں ہو یا نہ ہو بشرطیکہ مفہوم ایک ہی ہو۔ اسی طرح اگر مفہوم باقی رہتا ہے تو ناموں میں سے ایک آدھ حرف ہٹانے یا اضافہ کرنے سے بھی کوئی فرق نہیں پڑے گا۔

ہرموجنیس: اس توضیح سے آپ کیا نتیجہ اخذ کرنا چاہتے ہیں؟

سقراط: بہت سادہ امیں حروف کے ناموں کی مثال سے نتیجے کی نشاندہی کیے دیتا ہوں۔ مثلاً مندرجہ ذیل چار حروف (E, V, O, W) کے استثنا کے ساتھ، حروف کے نام خود ان کی ذات سے ادا نہیں ہوتے کیونکہ مزید حروف (چاہے حروف علت ہوں یا کنسونیٹ ترتیل) ان دیگر حروف سے بنتے ہیں جو ہم ان میں جمع کرتے ہیں، مگر جہاں تک مفہوم کا تعلق ہے اس میں مندرجہ بالا امتیاز سے فرق نہیں پڑتا اس لحاظ سے حروف کے نام پھر بھی درست رہتے ہیں۔ مثلاً بیٹا (Beta) کا حرف لیجیے! اسے آواز دینے کے لیے اس میں جمع کرنے سے اس ذات میں نقص پیدا نہیں ہوتا اور یوں اصل حروف کو بھی وہی مفہوم حاصل رہتا ہے جو اسے قانون ساز دینا چاہتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ حروف کو نام کیسے دیے جاتے چاہئیں۔

ہرموجنیس: میرا خیال ہے آپ کی بات درست ہے۔

سقراط: کیا یہی بات بادشاہ کے متعلق نہیں کہی جاسکتی؟ کیونکہ بادشاہ عموماً بادشاہ ہی کی اولاد ہوتا ہے، یا کم از کم کسی اچھے باوقار (سردار) کی اچھی اور باوقار اور معزز اولاد ہوسکتا ہے اور فطری اصول کی روشنی میں کسی بھی نوع کی اولاد بھی اسی نوع ہی کے متعلق ہوگی۔ لہٰذا اسی کا ہی نام بھی حاصل کرے گی۔ البتہ بعض صوتی حرکات کے مختلف ہونے کے باعث کم علم لوگ غلط فہمی میں مبتلا ہو سکتے ہیں اور ان سے ناموں کی پہچان میں غلطی بھی سرزد ہوسکتی ہے حالانکہ ان کی اصل ایک ہی ہو گی، بالکل ایسے ہی جیسے ہم بعض جڑی بوٹیوں یا ادویات کو رنگ اور بو کے متفرق ہونے کے باعث شناخت کرنے میں دقت محسوس کرتے ہیں حالانکہ ایک طبیب جو ان کے خواص اور قوتِ علاج سے آگاہ ہے اس کی باریک بین نظروں سے یہ چھپی نہیں رہ سکتیں اور وہ بعض اجزا کے اضافے کے باعث ان کی ظاہری حالت سے دھوکا کھائے بغیر ان کے اصل جوہر سے فائدہ حاصل کرسکتا ہے۔ یہی حال ایٹیمالوجسٹ (Etymologist) کا ہے۔ اس کے لیے بھی الفاظ اور ناموں میں کسی حرف یا صوتی حرکت کی کمی بیشی یا ایسے معمولی تغیر وتبدل سے ان الفاظ کے اصل مفاہیم اس کی نظروں سے پوشیدہ نہیں رہ سکتے۔ جیسا کہ ابھی مثال دی گئی تھی ہیکٹر اور استیانیکس میں ایک حرف یعنی مشترک ہے مگر پھر بھی یہ ہم معانی ہیں اور ان کے ناموں کا کوئی حصہ بھی آرکی پولس (Archepolis) (شہر کا حکمران) (Ruler of the city) سے مشترک نہیں مگر معانی کے اعتبار سے

قریب تر ہیں۔ اسی طرح اور بھی بہت سے الفاظ ہیں جن سے بادشاہ کا مفہوم حاصل ہوتا ہے۔ یہی حال لفظ جنرل کا ہے۔ مثلاً ایجس (Agis) کا مطلب ہے سردار۔ اسی طرح پول مارکس (Polemarchus) کا مطلب جنگ میں قیادت کرنے والے کے ہیں اور یو پولیمس (Eupolemus) کا مطلب بہترین جنگجو ہے (اس لحاظ سے یہ تینوں الفاظ کسی نہ کسی حد تک ایک ہی مفہوم بیان کرتے ہیں)۔ ایسی ہی مثالیں طبیب کے لیے بھی دستیاب ہیں مثلاً ایٹروکلس (Iatrocles) بمعنی بہترین معالج اور ایسمبروٹس (Acesimbrotus) کا مطلب ہے فانی لوگوں (نہ کہ دیوتاؤں) کا معالج۔ ایسی ہی بہت سی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں جن میں اگرچہ حروف اور اصوات مختلف استعمال ہوئی ہیں مگر الفاظ مترادف ہیں اس سے تو آپ متفق ہوں گے؟

ہرموجینس: جی ہاں۔ میں اس سے اتفاق کرتا ہوں۔

سقراط: گویا یہ امر ممکن ہے کہ فطری اوصاف میں مشابہ اشیا کو مشترک نام دیے جا سکتے ہیں۔

ہرموجینس: یقیناً دیے جا سکتے ہیں۔

سقراط: اور ان ناموں کے بارے میں کیا خیال ہے جو فطری خواص کے اعتبار سے متماثل نہیں ہیں۔ اور مختلف ہیں، مثلاً کسی اچھے اور مذہبی شخص کا بیٹا اگر لامذہب ہو تو اسے اپنے باپ کا نام استعمال کرنے کا حق نہیں بلکہ اسے اس گروہ کا نام اپنانا چاہیے جس سے وہ تعلق رکھتا ہے۔ اس ضمن میں گزشتہ مثال قابل توجہ ہے جس میں ہم نے گھوڑے کی اولاد کا نام بچھڑا ہونے کا حوالہ دیا تھا (جو فطرتاً ناممکنات میں سے ہے)۔

ہرموجینس: بالکل صحیح!

سقراط: یعنی ایک مذہبی باپ کے ملحد بیٹے کو ملحد ہی کہا جائے گا۔

اسے تھوفائیلس (Theophilus) (خدا کا محبوب) اور نیسی تھیئس (Mnesitheus) (خدا کے بارے میں غور کرنے والا) نہیں کہا جا سکتا اور اگر نام اصل مفہوم ہی میں استعمال کیے جائیں تو ایسے ملحد بیٹے کے لیے مندرجہ بالا اسما جیسا کوئی بھی نام دیا نہیں جا سکتا۔ کیونکہ ملحد ایسے تمام ناموں کا الٹ ہے۔

ہرموجینس: بالکل سقراط محترم!

سقراط: اور عزیزم ہرموجینس! اسی طرح کی صورتِ حال اوریسٹس (Orestes) کے ساتھ ہے جس کا

مطلب ''پہاڑوں کا انسان'' یا ''پہاڑی انسان'' ہے۔ یہ نام بہت ہی موزوں ہے چاہے یہ فطرت نے عطا کیا ہو یا کسی شاعر نے، اپنے ہیرو کی شخصیت کی سخت کوشی، مردانگی اور سنگلاخ طبیعت کی علامت کے طور پر رکھا ہو۔

ہرموجینس: ہاں سقراط! آپ کی بات قرین قیاس ہے۔

سقراط: اور اس کے باپ کا نام بھی بڑی حد تک فطری ہی لگتا ہے۔

ہرموجینس: ظاہر ہے!

سقراط: ہاں! بلکہ اس کا نام تو اس کی فطرت کی بہترین توضیح ہے آگا میمنون (Agamemnon) یعنی باقی مخلوق کا پسندیدہ فرد۔ اس نام سے اس کی شخصیت کے جن پہلوؤں کی نشاندہی ہوتی ہے ان میں صبر و ضبط، دُھن کا پکا ہونا اور مستقل مزاجی شامل ہیں۔ یہ صفات گویا اس کے کردار کا حصہ ہیں اور ٹرائے (Troy) کے میدان میں ان گنت فوجیوں کے سامنے ڈٹے رہنے والے افراد کی شخصی خوبیوں کی بڑی خوبصورت تجسیم لفظ آگا میمنون سے ہوتی ہے۔ اسی طرح ایک اور موزوں نام ایٹریس (Atreus) ہے، اس لفظ کی تشکیل سے بھی اس کے شخصی خصائص جن میں اس کا قاتل (Chrysippus) کا قاتل) ہونا، اس کی حد سے بڑھی ہوئی سفاکی جس کا شکار زیادہ تر تھیس ٹس (Thyestes) ہوئے، کا پتا چلتا ہے۔ یہ وہ خصوصیات ہیں جنھوں نے اس کی شخصیت کو گہنانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ اگرچہ معمولی سی تبدیلی سے یہ نام عام لوگوں کی نظر میں اس قدر ناپسندیدہ اور بدنام نہیں رہا مگر ایٹیمالوجسٹ (etymologist) کی نگاہوں سے اس کی سفاکی چھپی نہیں رہ سکتی کیونکہ اس کے نام کی تینوں کیفیتیں مثلاً ضدی، تباہ کن یا بے خوف، ہر لحاظ سے یہ بدنام اس کی شخصیت پر موزوں ہوتا ہے۔ ایک اور مثال جو موزوں ترین ناموں کے زمرے میں آتی ہے۔ پیلوپس (Pelops) کی ہے۔ کیونکہ اس کا مطلب ہے کوتاہ بین۔

ہرموجینس: وہ کیسے!

سقراط: کیونکہ مائرٹیلس (Myrtilus) کے قتل کے ضمن میں جیسا کہ مشہور ہے اس سے اس قدر کوتاہ اندیشی اور عدم مصلحت کوشی سرزد ہوئی کہ وہ قطعی اندازہ نہیں کر پایا کہ اس سے اس کی آئندہ نسل پر کس قدر خوفناک اثرات مرتب ہونے والے ہیں۔ اس نے صرف دستی اور فوری نتائج پر نظر رکھی یا دوسرے الفاظ میں قریب کے کیونکہ وہ اپنی دلہن کے لیے ہپوڈیمیا (Hippodamia) کو کسی بھی قیمت پر فتح

کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے اس پر کم ظرف کا لیبل مناسب نظر آتا ہے۔ اسی طرح اس سے بھی انکار کی گنجائش نہیں کہ ٹینٹالوس (Tantalus) بھی عین فطری نام ہے، بشرطیکہ اس کے بارے میں مشہور روایات درست ہوں۔

ہرموجینس: سقراط! وہ روایات کیا ہیں؟

سقراط: مشہور ہے کہ اسے زندگی بھر بہت تکلیف دہ بدقسمتی کا سامنا رہا اور اسے بے شمار حادثات وسانحات پیش آئے اور آخری بدقسمتی تو اس کے ملک کی تباہی پر منتج ہوئی اور اس کی موت کے بعد اس کی قبر پر جس نام کا کتبہ سجا رہا وہ تھا "مصیبت زدہ" اور یہ اس کے حالاتِ زندگی کی بلیغ ترین لفظی تصویر ہے۔ آپ تصور کر سکتے ہیں کہ جس نے اس کا نام ٹینٹالوس یعنی بدقسمتی کے بوجھ تلے دبا، رکھنا چاہا اس نے معمولی سی تلبیسِ لفظی سے اسے ٹینٹالوس کہہ دیا اور بعض روایتی غلطی کے باعث وہ اسی مفہوم ہی سے یاد کیا جانے لگا۔ اسی طرح زیوس، جسے اس کا باپ ہونے کا الزام دیا جاتا ہے، کے بھی بہت دلچسپ مگر مشکل معانی ہیں، اس نام کے دو حصے ہو گئے ہیں اور جیسے دو حصوں میں بٹے ہوئے جملے میں مفہوم ناقابلِ فہم ہو جاتا ہے، اس نام کے حصے بھی الگ ہو کر ادھورا مفہوم دیتے ہیں۔ ویسے دونوں حصے یعنی زینا(Zena) اور ڈایا(Dia) مل کر (God) یعنی دیوتاؤں کے دیوتا کے معنی دیتا ہے اور یہ اس کے نام کی سچی تشریح ہے کیونکہ زیوس یعنی دیوتاؤں کے دیوتا سے زیادہ مخلوق کی آسائشات عطا کرنے والا اور کوئی نہیں، گویا ہم زیوس کو زینا اور ڈایا کہنے میں حق بجانب ہیں خواہ یہ دو حصوں میں تقسیم ہی کیوں نہیں، کیونکہ ان حصوں کا مجموعی مفہوم "God" "دیوتا" کا ہے جو ہر مخلوق کو زندگی عطا کرتا ہے۔ جب ہم اسے کرونوس (Cronos) کا بیٹا کہتے ہیں تو اسی سے ہی اس کے نام میں پوشیدہ بے حرمتی جھلکنے لگتی ہے کیونکہ اس کا مطلب ہے "احمق کی اولاد" حالانکہ زیوس کے نام کے ساتھ "فطین فرد کی اولاد" کا تصور ابھرتا ہے جو قطعی ایک حقیقت ہے کیونکہ اس باپ کے نام کا یہی مطلب ہے، یعنی "معتدل مزاج" اور ہر شے کو فتح کر لینے والا"، نہ صرف شباب کے نقطۂ نظر سے بلکہ صبیغ کا مفہوم (یعنی خالص اور سجا سنورا ذہن۔ اسے واضح کرنے کے لیے بھی یہی نام موزوں ہیں۔ جیسا کہ روایات سے پتا چلتا ہے اسے پیدا ہی یورانوس (Uranus) یعنی "بلند نگاہ" کے طور پر کیا گیا تھا لہٰذا یہ نام بھی اس پر صادق آتا ہے۔ اگر مجھے ہیزیوڈ کا علم الانساب یاد ہوتا تو میں یقیناً دیوتاؤں کے دور کے اجداد پر، ایسے ہی معاملات کے اثرات کا مطالعہ کرنے کی

کوشش کرتا۔ اسی صورت میں مجھے معلوم ہو پاتا کہ موجودہ دانائی جو مجھے آنِ واحد میں دستیاب ہو گئی ہے آخر تک اچھے نتائج برآمد بھی کرے گی یا نہیں۔

ہرموجینس: ارے! آپ کی ان باتوں سے تو یوں لگتا ہے کہ آپ کوئی پیامبر ہیں اور ازلی وابدی کلام کی آیات غیب سے آپ کے قلب پر اتر رہی ہیں۔

سقراط: ہاں عزیزم ہرموجینس! مجھے یقین ہے کہ یہ فیضان مجھے پروس پیلٹیا (Prospaltian) کے یوتھی فرو (Euythyphro) کے صبح صادق کے وقت دیئے گئے ایک لیکچر کے نتیجے میں حاصل ہوا ہے۔ جب وہ بول رہا تھا تو میں یوں سن رہا تھا کہ اس کے الفاظ ایک وجد آفرین کیفیت سے نہ صرف میرے کانوں میں رس گھول رہے تھے بلکہ میری روح تک میں سرایت کرتے محسوس ہو رہے تھے۔ آج پھر میں اس کی ماورائے فطرت صلاحیت کو استعمال کر کے ناموں کے اس فلسفے کی حقیقت کو پا لینے کی کوشش کروں گا اور اگر آپ کی دلچسپی برقرار ہے، تو ہم اس سے درخواست کریں گے کہ وہ مزید ہمیں اپنے خیالات سے نوازے البتہ اس مقصد کے لیے ہمیں کوئی مذہبی بزرگ یا سوفسطائی مل جائے جو اس قسم کے تزکیہ نفس کا ماہر ہو تو سونے پر سہاگہ والی بات ہوگی۔

ہرموجینس: میں تو دل و جان سے یہ چاہوں گا کیونکہ ناموں کے بارے میں مزید تحقیق کے نتائج جاننے کے لیے میں مرا جا رہا ہوں۔

سقراط: تو آؤ چلیں، مگر تم بحث کا آغاز کہاں سے کرو گے؟ تمھارے خیال میں کیا ہماری موجودہ بحث اس مجوزہ بحث کے لیے بنیاد فراہم کرنے کے لیے کافی ہے؟ کیا تمھارے ذہن میں کچھ ایسے نام ہیں جو اگرچہ بظاہر بغیر سوچے سمجھے رکھے گئے ہیں مگر موسوم کی شخصیت کے فطری خصائص سے سو فی صدی مطابقت رکھتے ہیں؟ ہیروؤں یا عام افراد کے ناموں میں ایک قباحت ہے کیونکہ یہ نام عموماً ان کے والدین یا بزرگوں نے رکھے ہوتے ہیں اور ان ناموں میں ان بزرگوں کی خواہشات (کہ وہ نومولود کو آئندہ زندگی میں کیسا دیکھنا چاہتے ہیں) شامل ہوتی ہیں۔ مثالیں آپ کے سامنے ہیں، مثلاً خوش بخت اولاد، اینگچیڈس (Eatgchides) محافظ، سوسیاس (Sosias) محبوب خدا، تھیوفائیلس (Theophilus) وغیرہ وغیرہ۔ مگر میرا خیال ہے کہ ان ناموں کو ہم چھوڑتے ہیں اور بعض غیر منقلب ارواح کے ناموں کی مثالوں کو محلِ نظر رکھتے ہیں کیونکہ ایسی ارواح کے نام رکھتے وقت چونکہ انسانی ذہن اور خواہشات سے زیادہ بعض ماورائے فطرت قوتوں کا ہاتھ ہونا زیادہ

قرین ازامکان ہے۔لہٰذاان کے نام رکھتے وقت خاصی احتیاط برتی گئی ہوگی۔

ہرموجینس: ہاں! میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔

سقراط: میرا نظریہ کچھ اس طرح سے ہے: میرا خیال ہے کہ سورج، چاند، ستارے، زمین، آسمان اور بہشت (آفاق) وہ بنیادی دیوتا ہیں جنھیں آج بھی غیر یونانی (Barbarian) اپنا معبود مانتے ہیں۔ یہی قدیم اور نامعلوم زمانوں سے یونانیوں (Hellenes) کے بھی معبود رہے ہوں گے۔ ظاہر ہے کہ مسلسل سفران، معبودوں، کی فطرت ہے لہٰذا اسی مسلسل تحرک کی بنا پر انھیں دیوتا یا محرک ومدبر کہا جانے لگا اور جب انسان نے ان کے علاوہ معبود تلاش کر لیے تو ان کے نام بھی ان سے ملتے جلتے یا انھی ناموں میں سے رکھ لیے۔ کیا خیال ہے، ایسا ہی ہے ناں!

ہرموجینس: جی ہاں، بالکل ایسا ہی ہے۔

سقراط: "Gods" یعنی دیوتاؤں کے بعد کس کی باری آتی ہے؟

ہرموجینس: میرا خیال ہے دیوتاؤں کے بعد شیاطین (Demons)، ہیروؤں اور عام انسانوں کا نمبر آتا ہے۔

سقراط: "Demons" یعنی شیاطین! چلو اسی لفظ "Demon" ہی کی مثال لے لیتے ہیں۔ کیا خیال ہے؟

ہرموجینس: سقراط۔ میں ہمہ تن گوش ہوں!

سقراط: کیا آپ جانتے ہیں کہ ہیزیوڈ اس لفظ کو کیسے استعمال کرتا ہے؟

ہرموجینس: نہیں، مجھے معلوم نہیں۔

سقراط: کیا تمھیں اس کے وہ الفاظ یاد نہیں جن میں وہ ابتدائی انسانوں کے سنہری دور کا تذکرہ کرتا ہے؟

ہرموجینس: ہاں وہ مجھے یاد ہے۔

سقراط: وہ ان کے بارے میں کہتا ہے:

''اب جبکہ قدرت نے اس دوڑ کو ختم کر دیا ہے،

زمین پر مقدس شیاطین (دندناتے پھرتے) ہیں۔

جو مددگار، بدی کو بدل دینے والے اور فانی انسانوں کے سرپرست ہیں''۔

ہرموجینس: ہاں مگر اس سے کیا اصل مفہوم برآمد ہوتا ہے؟

سقراط: کیا نتیجہ نکلتا ہے! یہی کہ جب وہ "Golden men" یعنی ''سنہرے انسان'' کی اصطلاح استعمال کرتا ہے تو اس کی اس سے مراد سونے سے بنے ہوئے لوگ نہیں بلکہ اس کا مطلب ہے اچھے اور

شرایف انسان اور مجھے بھی اس میں شک نہیں۔ اس کے حق میں دلیل کے طور پر اس کا وہ جملہ لیا جا سکتا ہے جس میں وہ کہتا ہے کہ ہم تو کچے لوہے کی نسل ہیں۔

ہرموجنیس: یہ تو ہے!

سقراط: کیا یہ نہیں سمجھا جا سکتا کہ وہ آج کی نسل کے عمدہ اور شریف نفوس کو بھی سنہری نسل ہی کہے گا؟

ہرموجنیس: ممکن ہے!

سقراط: اور کیا اچھے لوگ دانا کہلائیں گے؟

ہرموجنیس: ہاں اچھے لوگ یقیناً دانا ہوتے ہیں۔

سقراط: اور اسی لیے میری فہم یہی کہتی ہے کہ وہ ڈیمن کو اس نام سے اس لیے پکارتا ہے کہ انھیں وہ عقلمند یا جاننے والا سمجھتا ہے۔ یہی لفظ ہمارے قدیم اٹیک (Attic) لہجے میں بھی موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ (ہیزیوڈ) اور دیگر شعرا یہی سمجھتے ہیں کہ جب کوئی دانا شخص مر جاتا ہے تو اسے اپنے علم کی بنا پر دوسروں پر جو فوقیت حاصل ہوتی ہے اس کے باعث وہ دانا بن جاتے ہیں۔ میں خود بھی یہی سمجھتا ہوں کہ دانا شخص اگر کردار کے لحاظ سے بھی شریف ہو تو اسے نہ صرف اس زندگی میں بلکہ بعد از موت بھی انسانوں پر فوقیت حاصل ہوتی ہے یعنی اس کا نام انسانوں سے بلند تر ہوتا ہے اور وہ اسی وجہ سے دانا کا درجہ حاصل کر لیتے ہیں۔

ہرموجنیس: یہاں تک تو میں آپ سے متفق ہوں، مگر اسی اعتبار سے لفظ "Hero" کے معانی کیا ہیں؟

سقراط: میرا خیال ہے اس لفظ کی تشریح آسان ہے کیونکہ اس میں کوئی ردّ و بدل نہیں ہوا۔ اس کا مطلب ہے محبت کی پیداوار۔

ہرموجنیس: کیا مطلب!

سقراط: ایسے لوگ یا تو دیوتاؤں کی عام عورتوں سے محبت یا عام مردوں کی دیویوں سے محبت کے نتیجے میں جنم لیتے ہیں۔ ذرا ایتھنز کی قدیم زبان میں موجود لفظ ایروس (Eros) پر غور کرو۔ آج کا لفظ ہیرو اسی کی معمولی سی بدلی ہوئی شکل ہے اور ہیرو زیادہ تر ایروس ہی کی اولاد ہیں۔ اوّل تو یہی اس کے معنی ہیں ورنہ وہ لوگ یقیناً ماہرینِ فنِ خطابت یا زبانوں کے لہجوں کے ماہرین کی حیثیت سے مہارت رکھتے ہوں گے اور سوالات پوچھنے کی صلاحیت رکھتے ہوں گے کیونکہ فصیح و بلیغ گفتگو کرنے والے دراصل اسی کا متبادل ہے۔ اسی لیے قدیم ایتھنز کی زبان کے اٹیک لہجے میں ہیرو

ان لوگوں کو کہتے ہیں جو سوالات پوچھنے کا فن جاننے والے یا ماہرینِ علم الکلام ہوتے ہیں۔ اس بات کی وضاحت بے حد آسان ہے۔ دراصل آج کے فلاسفہ اور ماہرین علم الکلام دراصل ہیروؤں ہی کی ایک شریف نسل پر مشتمل قبیلہ ہے۔ مگر کیا آپ بتا سکیں گے کہ بعض لوگوں کو ہیرو کیوں کہا جاتا ہے؟ شاید یہ ایک مشکل سوال ہے۔

ہرموجنیس: مجھے اس سوال کا جواب معلوم نہیں اور اگر معلوم ہوتا تو بھی میں نہیں بتاتا کیوں کہ میرے خیال میں آپ اس کا جواب زیادہ آسانی سے دے سکتے ہیں۔

سقراط: اس کا مطلب یہ ہوا کہ میری طرح آپ بھی یوتھی فرو کے تصور سے متفق ہیں؟

ہرموجنیس: بالکل ہوں!

سقراط: آپ کا اعتماد لاحاصل نہیں ہے کیونکہ اسی لمحے میرے ذہن میں ایک اچھوتا خیال آیا ہے اور اگر کل علی الصبح کی متوقع بحث سے قبل میں احتیاط سے اٹھالوں تو یہ زیادہ دانشمندانہ بات ہوگی۔ اب ذرا میری بات توجہ سے سنیے! آپ نے دیکھا ہوگا کہ ہم عموماً ناموں کے الفاظ میں سے ایک آدھ حرف خارج یا داخل کر کے لفظ کا لہجہ اور تلفظ بدل ڈالتے ہیں۔

[نوٹ: مثالوں میں درج شدہ یونانی الفاظ پر مشتمل حصے کو تکنیکی وجوہات کی بنا پر حذف کر دیا گیا ہے۔ حذف شدہ حصے کو ☆☆☆☆ کی علامت سے واضح کیا گیا ہے۔]

☆☆☆☆

ہرموجنیس: بالکل ایسا ہی ہوتا ہے۔

☆☆☆☆

سقراط: میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ لفظ "man" ، میں یہ مفہوم پوشیدہ ہے کہ انسان دیگر حیوانات کے برعکس مختلف اشیا کو محض دیکھتا نہیں بلکہ ان کا مشاہدہ کرتا اور ان پر غور و خوض بھی کرتا ہے۔

ہرموجنیس: میں ایک اور لفظ کے بارے میں متجسس ہوں۔ کیا اس کا تجزیہ بھی اسی طرح کر دیں گے؟

سقراط: یقیناً کیوں نہیں!

ہرموجنیس: اس بحث میں فطری ترتیب کے لحاظ سے اس کے بعد آنے والے الفاظ ''جسم'' اور ''روح'' ہیں اور میں چاہتا ہوں کہ آپ ان دونوں کے درمیان خط امتیاز کھینچ دیں۔

سقراط: میں کوشش کرتا ہوں۔

ہرموجنیس: میں چاہتا ہوں کہ جس طرح ہم نے اس سے پہلے کے الفاظ کا تجزیہ کیا ہے اسی طرح ان دو الفاظ (جسم اور روح) کا تجزیہ بھی کریں۔

سقراط: کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ سب سے پہلے میں لفظ روح (Soul) اور جسم (Body) کی فطری موزونیت پر روشنی ڈالوں؟

ہرموجنیس: یہی مناسب ہوگا۔

سقراط: جہاں تک میں سمجھتا ہوں کہ اوّل اوّل جس کسی نے بھی یونانی لفظ استعمال کیا اس کی اس سے مراد یہ تھی کہ روح وہ شے ہے کہ جسم میں موجود رہے تو جسم زندہ رہتا ہے اور اس سے سانس لینے اور نسل/بقا کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔ اور یہی صلاحیت جب ختم ہوتی ہے تو جسم موت کا شکار ہو کر ضائع ہو جاتا ہے۔ اگر میں غلطی پر نہیں تو اس صلاحیت کو سائیکی (Psyche) کہتے ہیں مگر ذرا ٹھہرو میں اس کی ایک ایسی وضاحت تلاش کرتا ہوں جو یوتھی فرو کے شاگردوں کی سمجھ میں آ سکے ورنہ میری موجودہ توضیح سن کر تو وہ میرا جلوس نکال دیں گے۔ کیا خیال ہے کوئی توضیح ڈھونڈی جائے؟

ہرموجنیس: میں منتظر ہوں۔

سقراط: آخر وہ کیا شے ہے جو جسم کو قائم رکھتی ہے، اٹھائے پھرتی ہے اور جسم کے پورے نظام کو زندگی عطا کرتی ہے؟ وہ روح نہیں تو اور کیا ہے؟

ہرموجنیس: ہاں وہ روح ہی ہے۔

سقراط: تو کیا تم اینگزاغورث (Anaxagoras) کے اس خیال سے متفق ہو کہ جسم اور ذہن وجود کے وہ حصے ہیں جن میں باقی وجود قرار پاتا ہے اور یہ وجودِ انسانی کے افعال کو کنٹرول بھی کرتا ہے؟

ہرموجنیس: ہاں! میں اس سے اتفاق کرتا ہوں۔

سقراط: یعنی آپ اس قوت کو جو اعمال و افعال انسانی کو جسمانی اعتبار سے کنٹرول کرتی ہے جو مجموعی طور پر فطرتِ انسانی کا مظہر بھی ہے اور یہ کہ اس کی مزید تطہیر بھی ہو جاتی ہے؟

ہرموجنیس: بالکل! اور یہ وضاحت میرے خیال میں پہلی وضاحت کے مقابلے میں زیادہ منطقی اور سائنسی ہے۔

سقراط: یہ تو ہے لیکن اگر ناموں کی یہی مناسب توضیح ہے تو میں ہنسنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتا۔

ہرموجنیس: اب اگلے لفظ کی وضاحت کیجیے!

سقراط: آپ کا مطلب ہے جسم!

ہرموجینس: ہاں۔

سقراط: اس کی وضاحت بھی مختلف طریقوں سے کی جاسکتی ہے اور اگر تھوڑی سی جمع تفریق کی اجازت دیں تو اس کی وضاحت کے ممکنہ تنوع میں اور بھی اضافہ ہوسکتا ہے۔ بعض لوگوں کے نزدیک جسم ہماری روح کی قبر ہے جس میں موجودہ زندگی کے دوران روح دفن رہتی ہے، بعض اسے روح کا عکس بھی کہتے ہیں کیونکہ روح اپنی بعض کیفیات کو جسم کے ذریعے منعکس کرتی ہے۔ یہ نام اورفی (Orphic) شعرا کا دیا ہوا لگتا ہے جو اس تصور کے حامل تھے کہ روح کو گزشتہ دورِ حیات کے گناہوں کی سزا کے طور پر مقید کیا گیا ہے اور اس کا قید خانہ دراصل جسم ہی ہے۔ بعض کے نزدیک روح کو حفاظت کی غرض سے جسم کے قلعے میں رکھا گیا ہے۔ پہلے تصور کے مطابق جسم اس وقت تک مقید رہتا ہے جب تک کہ اس کے جرم کے مطابق سزا پوری نہیں ہو جاتی۔ اگر یہ تصور درست قرار دیا جائے تو اس کے نام میں ترمیم و تخفیف کی ذرا بھی گنجائش نہیں۔

ہرموجینس: محترم سقراط! میرا خیال ہے اس قسم کے الفاظ پر ہم کافی روشنی ڈال چکے ہیں۔ کیا دیوتاؤں (Gods) کے ناموں کے بارے میں مزید کچھ کہنا ممکن ہے جیسا کہ آپ زیوس کے نام کے بارے میں کہہ چکے ہیں؟ کیا ان کے بارے میں ایسا ہی کوئی موزونیت کا اصول کارفرما ہے؟

سقراط: جی ہاں۔ ایسا ہی ہے۔ اس کے علاوہ ایک دلچسپ اور شاندار اصول ہے جو ہر ذی شعور شخص کے پیشِ نظر ہونا چاہیے اور وہ یہ کہ اوّل gods یعنی دیوتاؤں کے بارے میں ہمارا علم محدود ہے دوسرے یہ کہ ہمیں نہیں معلوم کہ ان کے اصل نام بھی وہی ہیں جن سے انھیں پکارا جاتا ہے۔ البتہ اتنا یقین ضرور ہے کہ جن ناموں سے دیوتا خود کو پکارتے ہیں وہ درست ہیں۔ یہی بہترین اصول بھی ہے۔ البتہ دوسرا بہترین اصول یہ ہے کہ ہم دیوتاؤں کو اصلی ناموں کے علاوہ ان ناموں سے پکاریں جو خود انھیں پسند ہوں اور ویسے بھی اس کے علاوہ کوئی صورت ممکن بھی نہیں ہے۔ ویسے یہ ایک اچھی ریت ہے اور میں خود بھی اس ریت کی پاسداری کروں گا۔ ہاں یہ ضرور ہے (اگر تم مناسب سمجھو) کہ ہم دیوتاؤں کو یہ یقین دلائیں کہ ہم ان کے حقائق اور خصائص کے متعلق جستجو میں نہیں ہیں بلکہ ہم تو ان کے نام پکارنے کے سلسلے میں انسانی رویوں پر تحقیق کرنا چاہتے ہیں۔ اسی طرح ہم کسی بھی طرح کے الزام سے بچ سکتے ہیں۔

ہرموجینس: محترم سقراط! آپ یقیناً درست فرما رہے ہیں اور میں آپ کے حکم پر سرِ تسلیم خم کردوں گا۔

سقراط: تو کیا حسب روایت ہم ہیسٹیا(Hestia) کے نام سے شروع کریں۔

ہرموجنیس: یہی مناسب ہوگا۔

سقراط: جس کسی نے بھی یہ نام ہیسٹیا رکھا ہے، بھلا اس کے ذہن میں کیا مطلب ہوگا؟

ہرموجنیس: یہی تو اصل اور مشکل ترین سوال ہے۔

سقراط: عزیز القدر ہرموجنیس! اوّل جن لوگوں نے نام رکھے ہیں وہ یقیناً بہت اہم لوگ ہوں گے، میرے خیال میں وہ ابتدائی زمانوں کے فلسفی ہوں گے جن کے پاس کہنے کو بہت کچھ ہوتا تھا۔

ہرموجنیس: بہت خوب! ان کے بارے میں کچھ اور بھی فرمایئے!

سقراط: ایسے لوگ ہی دراصل اشیا اور افراد کے ناموں کے تعین کے ذمہ دار ہیں۔ خواہ مقامی نام ہوں یا غیر مقامی، اب بھی ناموں کے تجزیے سے ان میں موجودہ حکیمانہ مفہوم کا اندازہ ہوتا ہے۔ ☆☆☆☆ ہم اپنے محدود علم کی مدد سے اس پر اسی قدر روشنی ڈال سکتے ہیں۔ ہیسٹیا کے بعد علی الترتیب جو دو نام آتے ہیں وہ ریا(Rhea) اور کرونوس(Cronos) ہیں البتہ کرونوس کے نام کی پہلے ہی کافی وضاحت ہو چکی ہے۔ نجانے کیوں اب بھی میں یہی سمجھتا ہوں کہ میں ٹامک ٹوئیاں مار رہا ہوں۔

ہرموجنیس: مگر کیوں حضرتِ سقراط!

سقراط: عزیز دوست! میں نے دانائی کے نہایت دقیق مسائل میں ایسے ہاتھ ڈال دیا ہے جیسے شہد کی مکھیوں کے چھتے کو چھیڑ رہا ہوں۔

ہرموجنیس: کس نوعیت کے چھتے کو۔

سقراط: یہ اگرچہ مضحکہ خیز سلسلہ ہے مگر اس کا اپنا ایک حسن ہے۔

ہرموجنیس: کیسا حسن!

سقراط: دیکھو ناں، میں اس وقت اپنے تصور میں ہراکلیٹس (Heracleitus) کے وہ بیانات دہرا رہا ہوں جو اس نے کرونوس اور ریا کے زمانوں جیسی قدیم روایات کے بارے میں دیئے ہیں۔ ہومر نے بھی اس موضوع پر اظہار خیال کیا ہے۔

ہرموجنیس: آپ یہ مطلب کیسے اخذ کر سکتے ہیں؟

سقراط: ہراکلیٹس دراصل یہ کہتا ہے کہ ہر شے متحرک ہے اور زندگی میں ساکن نام کی کوئی شے نہیں۔ وہ اشیا

کو دریا سے مثال دیتا ہے جس کی روانی میں کبھی تعطل پیدا نہیں ہوتا۔ اسی لیے وہ کہتا ہے کہ کوئی دریا کے دھارے میں ایک جگہ کے پانی میں دوبارہ غوطہ نہیں لگا سکتا۔

ہرموجینس: سقراط! اس میں تو حقیقت ہے۔

سقراط: تب ہم یہ نتیجہ نکالنے پر مجبور ہیں کہ جن لوگوں نے بھی دیوتاؤں کے اجداد کرونوس اور ریا کے نام رکھے ہوں گے انھوں نے ہراکلیتس ہی کے اصول کی پاسداری کی ہوگی۔ لہٰذا ان دونوں ناموں پر ندیوں کے نام رکھنا محض اتفاق کیسے ہو سکتا ہے؟ ذرا ان سطور (مصرعوں) پر غور کیجیے جن میں ہومر اور میرے خیال کے مطابق ہیزیوڈ نے بھی ایسے ہی خیالات کا اظہار کیا ہے۔

''سمندر وہ ہے جو دیوتاؤں اور ماں تیتھیس (Tethys) کا اصل منبع ہے''۔

اور پھر اورفیس (Orpheus) کہتا ہے کہ:

''سب سے پہلے سمندر کے خوبرو دریا نے ازدواج کا رشتہ جوڑا اور اپنی بہن تیتھس کو جو اس کی ماں کی بیٹی تھی اپنی زوجیت میں لیا۔''

یہ اگرچہ عجیب اتفاق ہے مگر اس سے ہراکلیتس کے خیالات کی تصدیق بہر صورت ہوتی ہے۔

ہرموجینس: اگرچہ مجھے آپ کی باتوں میں بہت کچھ مفہوم اور حقیقت نظر آتی ہے مگر مجھے تیتھیس کا نام نہیں سمجھ آیا۔

سقراط: ارے! یہ نام تو خود اپنی وضاحت کرتا ہے۔ یہ دراصل ایک چشمے کا نام ہے اور ذرا سی تبدیلی کے ساتھ باقی ہے کیونکہ جو شے بھی حسب نسب کی دیکھ بھال کے بعد اور چھن کر آنے والی ہوگی اس کی چشمے کے ساتھ مشابہت لازم ہے اور یہ جو نام تیتھیس ہے یہ انھی دو ناموں کا مرکب ہے۔

ہرموجینس: جناب سقراط! یہ تصور غیر معقول ہے۔

سقراط: یقیناً۔ مگر اس کے بعد کون سا نام آتا ہے؟ زیوس کے نام پر تو ہم پہلے سیر حاصل بحث کر چکے ہیں۔

ہرموجینس: ہاں یہ تو ہے۔

سقراط: چلیں اب ہم ان کے دونوں بھائیوں پوزیڈان (Poseidon) اور پلوٹو (Pluto) کو لیتے ہیں۔ اگرچہ مؤخر الذکر اس کے علاوہ بھی کچھ ناموں سے پکارا جاتا ہے۔

ہرموجینس: ہاں! بہر صورت میں ہمیں اسے زیر بحث لانا ہے۔

سقراط: پوزیڈان جس کا مطلب ہے پاؤں کی زنجیر (یا راستے کی رکاوٹ) ایسا لگتا ہے کہ جس کسی نے بھی

یہ نام اوّل اوّل رکھا اس کی سیر کے دوران پانی کی کوئی گزرگاہ اس کی راہ میں حائل ہوگئی ہوگی۔ چنانچہ اس نے ندی کے اس حصے کا نام پوزیڈان رکھ دیا اور اس طرح اس کا مطلب سب کچھ جاننے والا رہا ہوگا۔ دوسرا تصور یہ ہے کہ خدا یا دیوتا زمین کو ہلا ڈالتے ہیں قرار دیا ہوگا۔ پلوٹو دولت عطا کرنے والا دیوتا ہے اس لیے اس کا نام یعنی زمین کے اندر کے خزانوں کی شکل میں دولت عطا کرنے والا رکھا گیا۔ عموماً لوگوں کا یہی خیال ہے کہ ہیڈز (Hades) کی اصطلاح غیر مرئی اشیا کے لیے استعمال ہوتی ہے اور اسی لیے انھوں نے اپنے دیوتا کو پلوٹو کہنا شروع کردیا۔

ہرموجنیس: مگر اس سے اصل مطلب کیا نکلتا ہے؟

سقراط: اس قوت (دیوتا) کے بارے میں غلط فہمیوں اور اس کے بارے میں اس بے جا خوف میں مبتلا رہے کہ مرنے کے بعد انھیں مسلسل اس دیوتا کی نگرانی میں رہنا ہوگا اور یہ کہ انسانی روح اس جسم کے لباس کے بغیر ہوگی، میں یہی عقیدہ رکھتا ہوں کہ لوگوں کا خدا یا دیوتا کے دربار اور اس کے نام کے بارے میں جو تصورات ہیں وہ حقیقت پر مبنی ہیں۔

ہرموجنیس: وہ کس طرح؟

سقراط: میں آپ کو صرف اپنی رائے بتا سکتا ہوں۔ مگر اس سے قبل میں آپ سے ایک بنیادی سوال پوچھنا چاہتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ خواہش اور ضرورت میں سے کون سا بندھن زیادہ مضبوط ہے جو انسان کو کسی مقصد کے ساتھ مضبوطی سے باندھے رکھنے میں کامیاب ہوسکے۔

ہرموجنیس: میرا خیال ہے جناب سقراط کہ خواہش سب سے زیادہ مضبوط بندھن ہے۔

سقراط: اور کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ ہیڈز (Hades) اگر لوگوں کو اس مضبوط ترین بندھن سے باندھے رکھنے میں کامیاب نہ ہو تو وہ اس سے کنارہ کش ہوجائیں گے۔

ہرموجنیس: ہاں وہ دور ہوجائیں گے۔

سقراط: اور یہ بندھن ہوگا ہی خواہش کا نہ کہ بندھن کا۔ کم از کم میرا یقین یہی کہتا ہے۔

ہرموجنیس: یہ تو حقیقت ہی ہے۔

سقراط: اور خواہشات بھی متعدد اور متنوع ہوسکتی ہیں؟

اور یہ بھی طے ہے کہ جس قدر شدید اور بنیادی خواہش ہوگی، بندھن اسی قدر مضبوط ہوگا؟

ہرموجنیس: یہ بھی درست ہے۔

سقراط: اور دوسروں کے ساتھ اختلاط کے ذریعے شخصیت کی تکمیل (حصول کمال) سے بڑی بھی کوئی خواہش ہوگی؟

ہرموجینس: نہیں! یہی سب سے بڑی خواہش ہے۔

سقراط: اور جناب ہرموجینس! کیا یہی وجہ تو نہیں ہے کہ جو ایک بار اس کی طرف جاتا ہے لوٹ کر نہیں آتا (یا نہیں آنا چاہتا) یہاں تک کہ سائرنز (Sirens) بھی دیگر مخلوق کی طرح اس کے جادو کے زیر اثر آ گئے۔ مجھے یقین ہے کہ ایسی کشش تو صرف خدا کے کلام میں ہی ہو سکتی ہے اور اگر یہ نقطۂ نظر قابل قبول ہے تو ظاہر ہے کہ وہ (پلوٹو) ایک مستند اور کامل سوفسطائی ہے جو دوسری دُنیا کے ساکنین کے لیے مہربان ہے بلکہ اس کے خزانے چونکہ دوسری دنیا کی ضرورتوں سے بڑھ کر ہیں اس لیے وہ ہماری زمین کی مخلوق کی ضرورتوں کا بھی خیال رکھتا ہے۔ اور چونکہ اس کے خزانے لامتناہی ہیں اس لیے اسے پلوٹو یا (Rich) کہا جاتا ہے۔ یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ جب تک انسانی روح جسم کی قید اور اس سے مخصوص خواہشات اور برائیوں سے چھٹکارا نہیں پا لیتی پلوٹو کے حضور سے کچھ حاصل نہیں کر پاتی۔ اس تصور میں بھی زبردست فلسفہ کارفرما ہے اور وہ یہ کہ جسم کی قیود سے آزادی کے بعد ہی انسانی روح کو دیوتا نیکی کی ڈور سے باندھ کر رکھ سکتے ہیں ورنہ جب تک اس پر جسمانی خواہشات کا غلبہ رہتا ہے تو کرونوس خداؤں کا خدا (دیوتاؤں کا دیوتا) عروسہ ہائے بحری بھی ان کو اپنے اثر سے منسلک نہیں رکھ سکتا۔

ہرموجینس: آپ کی باتوں میں سچائی کی خوشبو ہے!

سقراط: اور عزیزم ہرموجینس، قانون سازوں نے جو اسے ہیڈز کا نام دیا ہے وہ محض اس کی غیر مرئی کیفیت کے باعث نہیں ہے بلکہ اس کا مطلب تمام اعلیٰ و ارفع اشیا و معاملات کا علم رکھنے والا بھی ہے۔

ہرموجینس: بہت خوب! اب کچھ روشنی دیگر دیوتاؤں مثلاً ڈیمیٹر (Demeter)، ہائیرے (Here)، اپالو (Apollo)، ایتھینی، اریس (Ares)، اور ہیفسٹس (Hephaestus) وغیرہ بھی اسی زاویے سے ڈالیے!

سقراط: ڈیمیٹر دراصل وہ ہے جو ماں کی طرح مخلوق کی پرورش کرتا ہے اور رزق دیتا ہے۔ ہائیرے حسین و جمیل اور قابل محبت ہے۔ کیونکہ زیوس نے حسب روایات اس سے شادی کی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ نام دیتے وقت قانون ساز کے ذہن میں بہشت کا تصور ہو اور جو دراصل ہوا کا مترادف ہے۔ اگر

آپ ہائزے کے حروف کو بار بار دہرائیں تو میرے جملوں کی صداقت آپ پر خود بخود واضح ہو جائے گی۔ لوگ اپالو کے نام کی طرح فیریفاٹا (Pherephatta) کے نام سے بھی خوف کھاتے ہیں اور مجھے ان کے خوف کی سمجھ نہیں آتی شاید اس کی وجہ ان ناموں کی حقیقت سے ان کی عدم واقفیت کے سوا کچھ نہیں۔ اس پر بھی وہ نام کو بدل کر فیرسفون (Pheresphone) کر دیتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ اب یہ ایسی دیوی کا نام ہے جو خردمند ہے اور یقین رکھتے ہیں کہ کائنات کی ہر شے متحرک ہے گو اصل اصول جوان کے دل و دماغ کو چھو کر گزرتا ہے۔ (جس کے باعث دیوتاؤں کا وجود قابلِ تقلید ہے) دانائی ہی ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی دیوی کو فیریفاٹا یا اس سے ملتے جلتے نام ہی سے موسوم ہونا چاہیے کیونکہ وہ ہر متحرک شے کو چھوتی ہے۔

اور اس طرح اپنی دانائی کا اظہار کرتی ہے اور ہیڈز جو حکیم و دانا ہے اس سے اسی لیے رغبت رکھتا ہے کہ وہ بھی دانائی کا پیکر ہے۔ آج اس دیوی کا نام بدل کر فیریفاٹا ہو گیا ہے کیونکہ آج کی نسل صداقت کی بجائے خوش نوائی کی پرستار ہے۔ اگلا نام اپالو ہے جو میرے گزشتہ بیان کے مطابق بعض خوفناک خصائص کا حامل ہے۔ کیا آپ نے اس حقیقت کا ادراک نہیں کیا؟

ہرموجینس: سقراط! ہاں میں کچھ کچھ سمجھا تو ہوں، مگر آپ اس پر مزید روشنی ڈالیے!

سقراط: میرے خیال میں یہ لفظ دیوتا کی قدرت کا بہترین ترجمان ہے۔

ہرموجینس: وہ کیسے؟

سقراط: میں اس کی مزید وضاحت کی کوشش کرتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ دیوتا کی قدرت کے مختلف عوامل کی ممکنہ وضاحت کے لیے اپالو سے بڑھ کر کوئی لفظ واحد نہیں ہو سکتا کیونکہ اس میں چاروں عظیم الشان اور اہم ترین شعبے مثلاً موسیقی، مستقبل بینی (غیب گوئی)، طب اور تیر اندازی شامل ہیں۔

ہرموجینس: پھر تو یہ تحیر انگیز نام ہوا۔ مجھے اس کی مزید وضاحت سننے کا اشتیاق ہے۔

سقراط: یہ ایک متوازن نام ہے۔ بلکہ اسے خدائے توازن کہنا چاہیے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ طبیب ہوں یا روحانی پیشوا وہ جس طرح جلاب یا تزکیہ نفس وجزم کے ذریعے یا دھونی وغیرہ یا دم درود وغیرہ کی مدد سے انسانی وجود کو جس طرح چمکاتے دمکاتے ہیں، اس تمام عمل کا اوّلین مقصد انسان کو جسمانی اور روحانی اعتبار سے مصفّٰی بنانا ہے۔

ہرموجینس: اس میں کوئی شک نہیں۔

سقراط: کیا اپالو کا نام صفائی، دھلائی یا طہارتِ جسم و روح ہی کے حوالے سے شہرت نہیں رکھتا؟

ہرموجینیس: ایسا ہی ہے۔

سقراط: اس لحاظ سے اس کی غسل کرنے کی خاصیت کی بدولت، جس کا وہ دیوتاؤں کے طبیب کی حیثیت سے اہتمام کرتا ہے، وہ تزکیہ کرنے والا کہلاتا ہے۔ علاوہ ازیں اپنی آفاقی صلاحیتوں سچائی اور خلوص کے باعث اسے صحیح طور پر اپالو کہا جاتا ہے جو مخلص کے معنی دیتا ہے۔ اس کا ماخذ دراصل تھیسالی لہجہ ہے کیونکہ تھیسالی لوگ(Thessalians) ہمیشہ سے اسے اپالو کہتے آئے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ مسلسل تیراندازی کرنے والا بھی ہے کیونکہ وہ ایسا تیرانداز ہے جس کا نشانہ کبھی خطا نہیں ہوتا۔ اس طرح یہ نام اپنی موسیقی کی خوبی (صوتیاتی ہم آہنگی) کی وجہ سے بھی مشہور ہے۔ ایسے سارے ناموں میں a ہم جا کے معنی دیتا ہے۔ چنانچہ اپالو کا مطلب ہے یک جہت متحرک چاہے یہ صفت بہشت کائنات کی پہنائیوں میں ہو یا موسیقی کے آہنگوں کے درمیان۔ یہی وجہ ہے کہ ستارہ شناس اور موسیقار دونوں اسے اس نام سے پکارنے میں حق بجانب ہیں اور اپالو وہ ہے جو ہم آہنگی کا باعث ہے اور اس کی یہ صلاحیت دیوتاؤں میں بھی اور انسانوں کے معاملات میں بھی برابر جاری وساری ہے۔ ☆☆☆☆ اس نام میں موجود تباہی کے عنصر کے بارے میں اب بھی بعض لوگوں کے ذہنوں میں شکوک وشبہات پائے جاتے ہیں کیونکہ اس سلسلے میں جیسا کہ میں نے کہا ہے اس نام میں تمام خدائی (دیوتائی) صفات موجود ہیں جو واحد ہے، مستقل نشانہ باز ہے، تزکیہ کرنے والا ہے اور ساتھ ساتھ چلنے والا ہے۔(Muses & Music) میوسس (موسیقی کی دیوی) اور موسیقی کے نام فلسفیانہ تحقیق کا نتیجہ معلوم ہوتے ہیں۔ لیٹو(Leto) نام ایسا اس لیے ہے کہ وہ بے حد مہربان اور مخلوق کی مدد کرنے کو ہر وقت تیار رہتی ہے۔ اجنبی لوگ اسے لیتھو(Letho) بھی کہتے ہیں۔ جو شاید اس کی ہر دلعزیزی اور ہر کام سیدھے سبھاؤ سے کرنے کی عادت کے باعث پڑ گیا ہے۔ آرٹیمس (Artemis) کا نام اس کی صحت مندانہ اور منضبط فطرت کے باعث پڑ گیا ہے۔ اس کی دوشیزگی کی محبت بھی اس کی وجہ ہو سکتی ہے اور یہ بھی کہ وہ نیکیوں کو پسند کرتی ہے۔ اور جسمانی (جنسی) اختلاط کے خلاف ہے۔ جس کسی نے بھی اس دیوی کو یہ نام دیا ہے اس نے ان تمام یا ان میں سے ہی کسی ایک کو مدنظر رکھا ہوگا۔

ہرموجیلس: ڈائیونائیسس(Dionysus) اور ایفروڈائٹ(Aphrodite) کا کیا مطلب ہے؟

سقراط: اے ہپونیکس کے بیٹے! آپ نے ایک اہم سوال پوچھا ہے۔ان دونوں ناموں کی سنجیدہ اور مزاحیہ وضاحت پیش کی جاسکتی ہے۔تاہم سنجیدہ وضاحت مجھ سے ممکن نہیں البتہ ایسی ہی مزاحیہ وضاحت اگر آپ مجھ سے سن لیں تو کوئی حرج نہیں کیونکہ دیوتا بھی مذاق کو پسند کرتے ہیں۔اس کا سادہ سا مطلب یعنی ساقی ہے۔☆☆☆☆ کیونکہ شراب پینے کے بعد اکثر لوگ اس خوش فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ وہ زبردست ذہنی صلاحیت کے مالک ہیں حالانکہ صورتِ حال اس کے برعکس ہوتی ہے۔ایفروڈائٹ کے نام سے، جھاگ سے پیدا ہونے والی کا مفہوم ہیزیوڈ کی تصدیق کے ساتھ اخذ کیا گیا ہے۔

ہرموجنیس: مگر ابھی اتھین (Athene) کا نام باقی ہے اور محترم سقراط! ایتھنز کا فرد ہونے کے باعث یہ نام تو آپ بھول ہی نہیں سکتے۔ویسے تو ہیفسٹس اور اریس (Ares) کے نام بھی باقی ہیں۔

سقراط: میں ان کو بھولا نہیں ہوں۔

ہرموجنیس: سچ!

سقراط: اتھین کے دوسرے عنوان کی وضاحت کوئی مشکل کام نہیں۔

ہرموجنیس: دوسرے عنوان! کیا مطلب؟

سقراط: ہم اسے پلاس (Pallas) کہتے ہیں۔

ہرموجنیس: آپ کو یقین ہے؟

سقراط: اور مجھے یہ بھی یقین ہے کہ یہ نام ہتھیار بند ڈانس سے حاصل ہوا ہے۔ کیونکہ اپنے آپ کو زمین سے بلند تر کرنے یا ہاتھوں کو ایسی حرکت کے استعمال کرنے کی حرکت کو تحریک (Shaking) یا رقص (dancing) کہا جاتا ہے۔

ہرموجنیس: ہاں یہ تو ٹھیک ہے۔

سقراط: کیا یہ پلاس کے نام کی درست توضیح نہیں ہے؟

ہرموجنیس: ہاں! مگر دوسرے نام کے بارے میں بھی تو کچھ کہیے۔

سقراط: آپ کی مراد اتھین کے نام سے ہے؟

ہرموجنیس: جی ہاں!

سقراط: یہ معاملے ذرا گھمبیر ہیں اور اس ضمن میں قدیم نظریات کی آگاہی کے لیے ہومر کے شارحین کی

مددرکار ہوگی کیونکہ ان میں سے اکثر نے اس پر زور دیا ہے کہ اتھینا کے معنی ذہن اور ذہانت کے ہیں اور نام رکھنے والے فرد کو اس پر اس قدر یقین ہے کہ وہ اسے محض ذہانت کی بجائے ارفع ذہانت کہتا ہے۔ گویا وہ کہنا چاہتا ہے کہ یہ وہ دیوی ہے جو دیوتا کے دماغ کی حیثیت رکھتی ہے۔ ☆☆☆☆☆ اگر بعد میں اصل نام دینے والے یا اس کے کسی پیروکار نے اس نام کو مزید نفاست دی تو اس کی صورت اتھینا کی شکل میں نکل آئی۔

ہرموجینس: آپ ہیفسٹس کے بارے میں کیا کہیں گے؟

سقراط: کیا شہزادہ نور کی بات کر رہے ہیں؟

ہرموجینس: یقیناً!

سقراط: ☆☆☆☆ ایسی کشش کا باعث ہے جس سے کوئی دامن بچا نہیں سکتا۔

ہرموجینس: یہ ممکن ہے بشرطیکہ کچھ اور امکانات بھی آپ کے ذہن میں نہ رہے ہوں۔

سقراط: اس سے بچنے کے لیے تو آپ صرف یہ کہہ دیتے کہ ایریس سے کیا مفہوم اخذ ہوتا ہے؟

ہرموجینس: ایریس کیا ہے؟

سقراط: ایریس کو اگر آپ مردانگی یا مردانہ پن کے معنی میں لیں اور اس کی ٹھوس، ناقابلِ فہم ترمیم و تخفیف فطرت کو اس کی بنیاد بنائیں تو یہ مفہوم سے اخذ ہوتا ہے۔ اس طرح اخذ ہونے والے نام کا بڑا واضح مطلب ہے "جنگ کا دیوتا"۔

ہرموجینس: بالکل درست!

سقراط: میرا خیال ہے اب دیوتاؤں کی فہرست کو ایک طرف رکھنا چاہیے کیونکہ اب میں دیوتاؤں سے خوف کھانے لگا ہوں اب اس کے علاوہ کچھ پوچھیے! پھر دیکھیے کہ یوتھی فرو کے گھوڑے کیسے دوڑنے لگتے ہیں۔ (عقل کے گھوڑے)۔

ہرموجینس: صرف ایک دیوتا اور! میں دراصل ہرمیس (Hermes) کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں جس کا کہ میں غیر حقیقی بیٹا سمجھا جاتا ہوں۔ اس کے مطلب پر غور کرتے ہیں تاکہ میں جان پاؤں کہ کریٹائیلس نے جو کچھ کہا ہے۔ اس میں کس قدر صداقت ہے!

سقراط: میرے تصور میں یہ بات آتی ہے کہ ہرمیس کا مطلب تقریر یا گفتگو کے قریب ہے۔ اس کے مفاہیم میں مترجم یا ترجمان، پیغام رساں، چور، دروغ گو، مول تول کرنے والا یا سودا بازی کرنے والا بنتا

ہے۔ظاہر ہے ان تمام کا تعلق زباندانی سے ہے۔میں نے پہلے بھی عرض کیا ہے کہ لفظ زباندانی کے اصولوں کو گفتگو یا تقریر میں استعمال کرنے کا مفہوم دیتا ہے اور ہومر کے کلام میں اس سے مشابہ ایک لفظ کثرت سے استعمال ہوا ہے، جس کا مطلب ہے "اس نے منصوبہ بندی کی" انھی دو الفاظ کے اختلاط سے قانون ساز نے دیوتا کا ایسا نام اخذ کیا جس کا مطلب ہے زبان و بیان کا خالق اور ہم تصور کر سکتے ہیں کہ وہ اس کے ذریعے کیسے احکام پہنچاتا ہے مثلاً جب وہ کہتا ہے، "اے میرے دوستو! یہ جانتے ہوئے کہ وہ مختلف داستانوں کی منصوبہ بندی کرنے والا ہے، تم بجا طور پر اسے کہہ سکتے ہو" اور ہرمیسِ کا موجودہ نام اس کی پالش کی ہوئی (بہتر بنائی ہوئی) شکل ہے۔ایرس Iris کا نام اس فعل سے اخذ ہے، جس کا مطلب ہے بتانا کیونکہ اس کا کام ہی پیغام رسانی تھا۔

ہرموجینس: اس کا مطلب ہے کہ کریٹائیلس کا یہ کہنا کہ میں ہرمیس کا حقیقی معنوں میں سپوت نہیں ہوں کیونکہ میں فن خطابت پر کوئی خاص دسترس نہیں رکھتا۔

سقراط: میرے دوست پین (Pan) میں ہرمیس کے دہرے طریقے سے فرزند ثابت ہونے کی دلیل موجود ہے۔

ہرموجینس: یہ نتیجہ آپ نے کیسے نکال لیا؟

سقراط: آپ کو معلوم ہی ہے کہ کلام کے دائرہ اثر میں ہر شے آ جاتی ہے اور اس میں اتنے چکر ہوتے ہیں کہ یہ غلط اور صحیح دونوں کا احاطہ کر لیتی ہے۔

ہرموجینس: لگتا تو کچھ ایسا ہی ہے!

سقراط: کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ صورت تو نازک اور نفیس اور مقدس ہے جو دیوتاؤں اور ان کے اوپر کے مدارج کے لیے ہے اور اس کی ایک شکل جھوٹ، داستان طرازی کی صورت میں ہے جو دیوتاؤں سے نیچے یعنی انسانوں کے لیے ہے کیونکہ داستان طرازی سانحات کے بیان کے لیے مخصوص ہے اور سانحات و حادثات انسانوں ہی کا مقدر ہیں۔

ہرموجینس: بالکل درست!

سقراط: چنانچہ یہ طے ہے کہ پین یعنی ہر چیز کا اعلان کرنے والا اور ہر شے کو ہمہ وقت متحرک رکھنے والا ہے اسے بکریوں کا گلہ کہنا بجا ہے۔دونوں پہلوؤں سے ہرمیسِ کا بیٹا ہے یعنی اوپر سے بکری کی پشت کی پشم کی طرح نرم اور نیچے سے اس کی جلد کے کھردرے بالوں کی طرح سخت ہے اور ہرمیس کے بیٹے

کی حیثیت سے وہ کلام یا کلام کا بھائی متصور ہوگا اور بھائی کے بھائی سے مشابہ ہونے میں حیرت کی کیا بات ہو سکتی ہے! جیسا کہ میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں عزیز ہرموجنیس اب دیوتاؤں کو ایک طرف رکھو۔

ہرموجنیس: ہاں اس قسم کے دیوتاؤں کے تذکرے کو تو بس بند ہی سمجھیے مگر جناب سقراط! دوسری قسم کے دیوتاؤں مثلاً سورج، چاند، ستاروں، زمین ایتھر، ہوا، آگ، پانی، موسموں اور سال وغیرہ کے بارے میں بحث کرنے میں کیا حرج ہے؟

سقراط: آپ مجھ سے بڑا سنگین تقاضا کر رہے ہیں لیکن پھر بھی میں حاضر ہوں۔

ہرموجنیس: میں آپ کا ممنون ہوں گا۔

سقراط: آپ کیا چاہتے ہیں کہ کہاں سے شروع کروں؟ کیا اس دیوتا سے شروع کروں جس کا آپ نے سب سے پہلے نام لیا ہے یعنی سورج سے؟

ہرموجنیس: یہی مناسب ہے۔

سقراط: سورج دیوتا کی اصلیت اور حقیقت کی وضاحت ڈوری (Doric) دستاویزات کی مدد سے بہتر انداز میں ہوتی ہے اسے یہ نام اس لیے دیا گیا ہے کہ جب یہ طلوع ہوتا ہے تو لوگوں کو ایک جگہ مجتمع کر دیتا ہے یا شاید اس لیے کہ یہ زمین کے گرد ایک مخصوص راستے پر لڑھکتا جاتا ہے یا پھر اس نام کا مطلب رنگ وروپ بدلنا ہے کیونکہ اسی کی بدولت زمین متنوع نباتات اگاتی ہے۔

ہرموجنیس: چاند کیا ہے؟

سقراط: یہ نام اینگزاغورث (Anaxagoras) کے لیے بدقسمتی کا باعث ہے۔

ہرموجنیس: یہ کیسے کہا جا سکتا ہے؟

سقراط: کیا چاند سورج سے روشنی اخذ نہیں کرتا؟

ہرموجنیس: وہ تو صحیح مگر یہ اس لفظ سے کیسے ثابت ہوتا ہے۔

سقراط: دو الفاظ چمک دمک اور روشنی تقریباً ہم معنی ہیں۔ کیا خیال ہے؟

ہرموجنیس: بالکل صحیح!

سقراط: اگر اینگزاغورث کے شاگردوں کا خیال درست ہے تو یہ روشنی اور چمک بیک وقت نئی بھی ہے اور پرانی بھی۔ کیونکہ سورج اپنے ہر چکر میں چاند کو نئی روشنی عطا کرتا ہے جبکہ گزشتہ ماہ کی روشنی پرانی

ہو جاتی ہے۔

ہرموجنیس: یہ تو صحیح ہے!☆☆☆☆

ہرموجنیس: جناب سقراط! یہ تو بڑا جذباتی اور جوشیلی مناجات قسم کا نام ہے۔ چلیے ماہ یعنی مہینے اور ستارے کے ناموں کی توضیح بھی کر ہی ڈالیے۔

سقراط: ماہ کا نام کم ہونے سے ماخوذ ہے۔ جس کا مطلب ہے گھٹنا اور چاند چونکہ گھٹتا بڑھتا ہے اس لیے اس کا یہ نام پڑا اور ستاروں کا مطلب نگاہوں کو خیرہ کرنا ہے۔

ہرموجنیس: آپ آگ اور پانی کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟

سقراط: میں آگ کی وضاحت کرنے میں دقت محسوس کر رہا ہوں۔ پتا نہیں یوتھی فرو کی سوچ اس میں حائل ہے یا کوئی اور رکاوٹ ہے تاہم ذرا نوٹ کیجیے گا اس لفظ کی دقت کے باوجود میں اس سے نمٹنے کی کیا تدبیر کرتا ہوں۔

ہرموجنیس: وہ کیا تدبیر ہے؟

سقراط: کیا ان الفاظ کی حقیقت کے بارے میں، میں آپ کو اپنے شبہات سے آگاہ نہ کر دوں؟ میرا اندازہ ہے کہ یہ دوسری زبانوں کے الفاظ ہیں کیونکہ ہیلینا والے (یونانی) جب بربروں (غیر یونانیوں) کے زیر تسلط تھے تو انھوں نے ان سے بھی بہت سے الفاظ مستعار لیے تھے۔

ہرموجنیس: اس سے آپ کیا نتیجہ نکالتے ہیں؟

سقراط: یہ تو آپ کو معلوم ہی ہوگا کہ غیر یونانی زبان کے الفاظ کا مفہوم اور اس کی بنیادوں کا کھوج اگر یونانی زبان میں کیا جائے تو عموماً غلطی ہی سرزد ہوتی ہے۔

ہرموجنیس: ہاں میں یہ سمجھتا ہوں!☆☆☆☆

سقراط: میرا خیال ہے الفاظ کی توضیح کے سلسلے میں ہمیں واضح اصولوں سے انحراف کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ ان سے متعلق حقائق بہر صورت دستیاب ہو جاتے ہیں۔ اس طرح میں ان سے تو فی الحال پیچھا چھڑاتا ہوں۔ البتہ ہوا کو ایسے عنصر کی حیثیت حاصل ہے جو مختلف نباتات کو زمین سے اگاتا یا مسلسل بہنے والی شے ہے۔ یا یہ سمجھیے کہ ہوا جب دباؤ کے زیرِ اثر آتی ہے تو wind یعنی جھکڑ (آندھی) کہلاتی ہے۔ لہٰذا جو کوئی ان الفاظ کو صحیح مفہوم میں استعمال کرنا چاہے تو اسے ہوا کے دباؤ کے لیے اور جھکڑوں کے دباؤ کے لیے الفاظ استعمال کرے گا تاہم چلتی ہوا کے تحرک کے لیے وہ

کسی بھی کیفیت کا ذکر کرے گا تو ان سے ہوا کا بنیادی لفظ ہی استعمال کرنا پڑے گا۔ جہاں تک ایتھر کا تعلق ہے اس کی تشریح میں کروں گا۔ یہی صحیح بھی ہے کیونکہ یہ عنصر بھی ہوا کے ساتھ ساتھ فضا میں رواں دواں رہتا ہے۔ لفظ (زمین) کا اصل مفہوم تب واضح ہوگا جب اسے "mother" (یعنی ماں) کی صورت میں لیا جائے کیونکہ زمین کو بھی ماں کہتے ہیں۔

ہرموجینس: بہت خوب!

سقراط: اب بتائیے کس موضوع پر گفتگو کی جائے؟

ہرموجینس: اب موسم اور سال کے دو نام باقی رہ گئے ہیں۔

سقراط: اگر ہم موسموں کے ناموں کے بارے میں جو صحیح مفہوم میں سمجھنا چاہیں تو انھیں قدیم ایک (Attic) لہجے میں لکھنا پڑے گا۔ کیونکہ یہ سردیوں، گرمیوں اور ان سے متعلقہ سبزیوں اور پھلوں میں خطِ امتیاز کھینچ دیتے ہیں۔ اسی طرح ایک دوسرے سے مشابہت رکھتے ہیں اور تقریباً مترادف ہیں، کیونکہ پودوں اور دیگر نباتات پر روشنی ڈالتے ہیں اور ان کا تفصیلی جائزہ لیتے ہیں۔ یہ دو الفاظ میں تقسیم ہوتے ہیں۔☆☆☆☆

ہرموجینس: ارے جناب سقراط، آپ حیرت انگیز طریقے سے ہر شے کی وضاحت کر دیتے ہیں۔

سقراط: دراصل میں متعلقہ خیالات کی رو میں بہ جاتا ہوں۔

ہرموجینس: بات تو سمجھ میں آنے والی ہے!

سقراط: ابھی تک میں نے اپنی اصل رفتار سے گفتگو نہیں کی۔

ہرموجینس: اس کے بعد میں چاہتا ہوں کہ آپ اعمالِ صالحہ یعنی "Virtues" پر بات کریں اور یہ بھی کہ دانائی، فہم و فراست، عدل و انصاف اور ایسے دیگر خوب صورت اور پُرکشش الفاظ کی صحت کے کیا اصول ہیں؟

سقراط: یہ ناموں کا ایک خوبصورت گروہ ہے جس میں آپ نے دلچسپی کا اظہار کیا ہے اور اب جبکہ میں نے شیر کی کھال پہن لی ہے تو دل میں کمزوری کا اظہار کرنا مجھے زیب نہیں دیتا۔ اب میں دانائی، فہم و فراست، قوتِ فیصلہ اور علم اور آپ کے بقول دیگر پُرکشش الفاظ پر توجہ مبذول کرتا ہوں۔

ہرموجینس: جی ہاں! میں بھی چاہتا ہوں کہ ان کا مفہوم سمجھنے سے پہلے بحث ترک نہ کریں۔

سقراط: ابوالہول (Dog of Egypt) کی قسم! اسی لمحے میرے ذہن میں آنے والا خیال جیسا کوئی مستقل

تصور میرے دل میں نہیں ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ازمنۂ قدیم میں اشیا کو نام دینے والے لوگ بھی ہمارے دور کے جدید فلاسفہ ہی کی مانند تھے جو اشیا کی حقیقت مطلقہ کو جاننے کی کھوج کے بعد جب ذہنی غنودگی کی منزل پر پہنچتے ہیں کیونکہ وہ مستقلاً بعض حقائق کے گرد گھوم رہے ہوتے ہیں اور یہی کیفیت انھیں احساس دلاتی ہے (یا التباسِ نظر میں مبتلا کر دیتی ہے) کہ کائنات کی ہر شے متحرک ہے۔ دراصل یہ ان کی اپنی اندرونی (ذہنی قلابازیوں) کیفیت کا نتیجہ ہوتا ہے بہرطور وہ کائنات کی ہر شے کو عارضی اور متحرک تصور کر کے اس پر قائم ہو جاتے ہیں۔ یوں پوری کائنات انھیں حرکت اور تبدیلی کی زد میں نظر آنے لگتی ہے۔ یہ تصور اسما کی اسی بحث کے نتیجے میں پیدا ہوا ہے جو کچھ دیر سے ہمارے درمیان جاری ہے۔

ہرموجنیس: ایسا کیونکر؟

سقراط: شاید آپ نے غور نہیں کیا کہ ابھی جن ناموں کو ہم زیرِ بحث لا رہے تھے، ان تمام میں تحرک کسی نہ کسی اعتبار سے ضرور کارفرما ہے۔

ہرموجنیس: ارے نہیں! اس پر تو میں نے غور نہیں کیا!

سقراط: ان میں سے پہلا ہی لفظ جس کا آپ نے تذکرہ کیا ہے۔ یہی بڑے واضح انداز میں تحرک کی نشاندہی کرتا ہے۔

ہرموجنیس: کون سا نام؟

سقراط: یہ دانائی (Wisdom) ہے، جو یا تو حرکت اور دباؤ کے تصور کی علامت ہے یا حرکت کی برکات لو ظاہر کرتی ہے مگر ہر لحاظ سے حرکت سے منسلک نظر آتی ہے، اور جہاں تک قوتِ فیصلہ کا تعلق ہے اس میں سے بھی کسی نہ کسی حد تک جنریشن (بمعنی پیدایش) کا تصور ابھرتا ہے انہی الفاظ ”The desire of the new“ ہی کو لیجیے کہ ابھی ان کا ذکر تھا جس کا مطلب جدت کی طلب ہے۔ اس لیے ان الفاظ کا واضح مطلب یہ ہے کہ کائنات مسلسل تخلیق کے عمل سے گزر رہی ہے۔ نام دینے والے کے پیش نظر روح کی ابدیت کا تصور تھا۔ دراصل اسی دانائی کی نجات ہے جس کا ہم مسلسل تذکرہ کر رہے ہیں۔ اب رہا "Knowledge" یعنی علم بھی اسی قبیل سے تعلق رکھتا ہے۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ روح چاہے جس قدر معمولی معیار پر ہو اشیا کے تحرک کا ادراک رکھتی ہے یہ بات ضرور ہے کہ اگر وہ تحرک کے بارے میں کوئی پیش گوئی کی صلاحیت نہیں رکھتی تو اس کے ساتھ

ساتھ چلنے میں بھی ناکام نہیں ہوتی۔ ایسی ہی صورت لفظ "to know" کے ساتھ ہے جس کا مطلب ''جاننا'' ہے اور اس سے فطری ماحول کے ساتھ روح کی بالیدگی کا اظہار بھی ہوتا ہے۔ لفظ "wisdom" (دانائی) اس لحاظ سے تاریک لفظ ہے کہ ظاہری بالیدگی کے پیمانے پر اسے ماپنا ممکن نہیں تاہم اس کا مطلب حرکت یا اشیا کے بہاؤ کے قریب تر ہے۔ آپ جانتے ہی ہیں کہ کسی شے کی مسلسل اور تیز رفتار حرکت کے لیے شعرا عموماً جو لفظ استعمال کرتے ہیں وہ "Rush" ہے یعنی لپکنا۔ آپ مشہور لیسی ڈیمون کے باسی سے تو واقف ہی ہیں اسے اسی کے نام سے موسوم کیا گیا تھا اور اسی لفظ ہی کی بدولت تیز رفتار حرکت علامت بن گیا ہے اس لفظ سے یہ ظاہر کیا جاتا ہے کیونکہ ہر شے کا متحرک ہونا مسلّم ہے۔ "Good" وہ لفظ ہے جس سے کسی شے کی قابلِ تعریف خصوصیت کا اظہار مطلوب ہو کیونکہ حرکت اگرچہ ہر شے سے براہ راست منسلک ہے مگر حرکت کے معیار و مقدار میں فرق ہوتا ہے۔ بعض کی حرکت سست ہوتی ہے بعض کی تیز رفتار اور جو اشیا تیز رفتاری سے متحرک ہیں ان کی اس خوبی کو ظاہر کرنے کے لیے "Good" کا لفظ بولا جاتا ہے۔ اب آیئے عدل کی طرف۔ جس کا مطلب ''جائز بات کا فہم'' ہے۔ مگر اصل لفظ زیادہ مشکل ہے۔ ایک حد تک لوگ عدل سے اتفاق کرتے ہیں پھر اس کے بعد اختلاف کرنے لگتے ہیں۔ کیونکہ وہ لوگ جو ہر شے کے متحرک ہونے پر یقین رکھتے ہیں، ان کے خیال میں کائنات کا بیشتر حصہ سوراخ دار ہے اور ایک ایسی پار گزر جانے والی قوت ہے جو اس سوراخ میں سے گزر جاتی ہے اور یہی قوت دراصل قوتِ تخلیق کی حیثیت رکھتی ہے اور اسی لحاظ سے یہ ایک عیار ترین اور بہت سریع الحرکت عنصر ہے کیونکہ اگر اس قوت/عنصر کو عیاری سے عاری اور سریع الحرکتی کے برعکس تصور کیا جائے تو یہ نہ ساکن اشیا کے درمیان سے گزر سکتی ہے اور نہ کائنات میں تخلیق کا عمل جاری وساری رہتا ہے اور یہی عنصر ہے جو تمام معاملاتِ کائنات کو کنٹرول کرتا ہے اور انھیں حقائق کی سوئی سے چھید ڈالتا ہے اور یوں یہ عنصر جسے میں حرف K محض خوش آہنگی کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ یہاں تک میرے پہلے بیان کے مطابق عدل کے مفہوم سے متعلق اتفاق رائے پایا جاتا ہے۔ مگر عزیز القدر ہرموجینس (بنی ہرمیس) میں جو ایک پر جوش مرید ہوں، مجھے بڑے پراسرار انداز میں بتایا گیا ہے کہ عدل وجوہاتِ تخلیق کائنات بھی ہے یہاں باعث اس شے کو کہیں گے جس کی بدولت کوئی شے تخلیق کائنات کے عمل میں جاری وساری ہے اور اس کے فطری عوامل وعناصر میں شامل ہے۔ مگر میں

اپنے اس نادیدہ دوست کو آواز دے کر کہنا چاہتا ہوں،

''اے میرے مہربان دوست!! اگر یہ سب درست بھی ہے تب بھی میری پیاس بجھی نہیں اور میں عدل کے متعلق مزید جاننے کے لیے بے چین ہوں۔''

میرے اس رویے اور مجسسانہ طبیعت کے باعث لوگوں کا خیال ہے کہ میں ضرورت سے زیادہ سوالات کرتا ہوں اور اس ضمن میں بعض اوقات تمام حدیں پھلانگ جاتا ہوں۔ لوگ میرے سوالوں کے جوابات فراہم کرتے بھی ہیں اور مجھے مطمئن کرنے کی بھی پوری کوشش کرتے ہیں مگر جب توجیہات کے تسلسل کے باوجود وہ میری تشفی نہیں کر پاتے اور دیکھتے ہیں کہ میرے ذوقِ تجسس کی تسکین نہیں ہو پاتی تو وہ مجھ سے جھگڑنے لگتے ہیں۔ ان کرمفرماؤں میں ایک ایسے ہیں جن کا فرمان ہے کہ عدل سورج ہے جو پوری عادلانہ تقسیم کے ساتھ روشنی پھیلاتا ہے۔ اس کی روشنی اندھیروں کو چھیدتی اور اشیا کو جلاتی ہے اور یہی کارخانہ قدرت کا نگران بھی ہے اور جب میں متبسم انداز میں پوچھتا ہوں:

''تو گویا جب سورج غروب ہو جائے تو عدل کی توقع فضول ہے''۔

تو مجھے طنز و تنقید کا نشانہ بنایا جاتا ہے اور جب میں اپنے سوال کے سنجیدہ جواب کے لیے درخواست کرتا ہوں تو مجھے جواب ملتا ہے کہ سورج کی (غیاب) غیبت میں آگ محدود حد تک عدل کا فریضہ سرانجام دیتی ہے۔ ان صاحب کا جواب مجھے مطمئن نہیں کرتا تو دوسرے صاحب فرماتے ہیں کہ آگ نہیں بلکہ آگ کا فقط وہ حصہ جسے حرارت کہتے ہیں وہ سورج کی نمائندگی (عدل کے لیے) کرتا ہے ایک صاحب ان دونوں توجیہات پر ہنستے ہوئے فرماتے ہیں کہ بقول اینگزاغورث عدل ذہن ہے اسی کے پاس عدل کی حتمی صلاحیت اور قوت ہے اسے اپنا وظیفہ عدل ادا کرنے کے لیے کسی دیگر قوت سے اشتراک کی ضرورت نہیں پڑتی، یہی ہر شے کی حقیقت کی شناخت کی صورت میں گویا اشیا اور کوائف کے اندر سے گزر جاتا ہے۔ میرے دوستو! سچ تو یہ ہے کہ ساری بحث مجھے ایک زبردست پراگندگی میں مبتلا کر دیتی ہے اور میں خود کو علم کے حصول کا آغاز کرنے کے لمحے کے مقابلے میں بھی کہیں زیادہ کم علم اور عدل کے فلسفے سے نابلد محسوس کرنے لگتا ہوں۔ تاہم میری رائے میں عدل کے نام کے حوالے سے جو توضیحات میں نے پیش کی ہیں، ان کی صحت سے انکار

ممکن نہیں۔

ہرموجینس: جناب سقراط! مجھے تو ایسے محسوس ہوتا ہے کہ آپ یہ سب کچھ فی البدیہہ نہیں فرما رہے بلکہ یہ سب آپ نے کسی سے سنا ہے۔ (یعنی یہ کسی اور کی کہی ہوئی باتیں ہیں)

سقراط: اور باقی باتیں!

ہرموجینس: ان میں سے شاید ہی کوئی بات آپ کی اپنی نہ ہو۔

سقراط: بہت اچھا۔ تب مجھے اپنی بات جاری رکھنی چاہیے۔ شاید اس طرح میں اپنی باتوں کو اپنی ہی ثابت کرنے میں کامیاب ہو جاؤں۔ اب بتایئے عدل(Justice) کے بعد کس نیکی پر روشنی ڈال جائے؟ میرا خیال ہے ابھی جرأت(Courage) پر بحث نہیں کی۔ ناانصافی (عدمِ عدل) جو اصل نفوذ میں موجود ایک رکاوٹ کے سوا کچھ بھی نہیں لہٰذا اسے زیرِ بحث لانے کی ضرورت نہیں اب ذرا اس کے نام پر غور کیجیے! یہ جھڑپ کے معنی دیتا ہے جو عالمِ وجود میں (خیر و شر کی صورت میں) ہر وقت جاری و ساری رہتی ہے اور اس سے مشہور نظریہ عمل اور ردِ عمل کا فلسفہ سمجھ میں آتا ہے۔ ☆☆☆☆ اسی طرح لفظ مرد اور آدمی کے درمیان بھی ایک عجیب اور اسی نوعیت کا التباس نظر پایا جاتا ہے جس سے ہمارا واسطہ "upward flux" کے اصول کے ضمن میں پڑا تھا۔ (عورت) لفظ پیدائش کے قریب تر ہے۔ اسی طرح لفظ مادہ(Female) دراصل لفظ پستان کا مترادف ہے کیونکہ پستان کی حیثیت بارش کی سی ہے جو ہر شے کی نمو کی ذمہ دار ہوتی ہے۔

ہرموجینس: یہ بات کافی حد تک قریب امکان ہے۔

سقراط: اور اسی لفظ "to flourish" (پھلنا پھولنا) کو دیکھ لیجیے! یہ عہد شباب کی نمو کے مترادف ہے جو ریع اور اچانک ہوتی ہے اسی لیے اسے قانون ساز نے ایسے نام سے ظاہر کیا ہے جو دوڑنا(running) اور چھلانگ لگانا(Leaping) سے مل کر بنا ہے۔ غور تو کیجیے کہ جیسے ہی مجھے میدان ہموار ملتا ہے میں اپنی بحث اور توضیح میں بھی دوڑنے لگتا ہوں۔ ایسے ہی بہت سے اہم الفاظ میں جو ابھی تک تشنہ تشریح ہیں۔

ہرموجینس: بالکل ٹھیک!

سقراط: مثلاً لفظ فن! آرٹ کے مفہوم ہی کو لیجیے!

ہرموجینس: آپ فرمایئے! ☆☆☆☆

سقراط: بے شک، میرے دوست! مگر آپ کو یہ بھی معلوم ہی ہوگا کہ امتدادِ زمانہ نے مختلف الفاظ کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے! ان کی صورتیں بدل گئی ہیں۔ لوگوں نے ان کے صوتی تاثر میں بہتری کی جھونک میں حروف کی کمی بیشی کا سلسلہ جاری رکھا ہے۔ بعض الفاظ کثرتِ استعمال سے گھس کر اپنی شکل بدل چکے ہیں۔ یعنی ان میں تبدیلی کئی پہلوؤں سے جاری رہی ہے۔ یہ یقیناً کسی ایسے فرد کی کارستانی ہے جسے لفظ کے حقیقی مفہوم سے کہیں زیادہ اس سے غرض تھی کہ لفظ کی ادائیگی کے وقت اس کے منھ کی شکل نہ بگڑنے پائے۔ اسی طرح کے بے شمار اضافے ایسے ہیں کہ عام لوگ تو بے چارے ان الفاظ کی حقیقت میں جھانکنے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتے۔ ☆☆☆☆

ہرموجنیس: محترم سقراط! ان باتوں میں وزن ہے۔

سقراط: اب یہ صلائے عام ہے کہ جو چاہے اور جس حرف کو چاہے شامل کرے اور جس کو چاہے ہٹا دے اس طرح تو کسی بھی شے کو کوئی بھی نام دیا جاسکتا ہے۔

ہرموجنیس: یہ سچ ہے!

سقراط: ہاں یہ سچ ہے! اور اسی لیے میرے دوست، آپ جیسے دانا کو چاہیے کہ وہ اس ضمن میں اعتدالیت اور امکانات احتمالات کے اصول کو ملحوظ خاطر رکھے۔

ہرموجنیس: میں خود بھی یہی چاہتا ہوں۔

☆☆☆☆

سقراط: یہ لفظ بھی "mind" (ذہن) ہی کا ایک مظہر ہے۔

ہرموجنیس: وہ کس طرح؟

سقراط: میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ آخر اشیا و کوائف کے نام کے پیچھے کیا فلسفہ ہوتا ہے؟ کیا وہی نام کی توجیہ نہیں دے دیتا یعنی یہ بھی کسی وجہ ہی کا نتیجہ ہوتا ہے۔

ہرموجنیس: یقیناً!

سقراط: تو کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ یہ لفظ دیوتا یا انسان کے یا دونوں کے ذہن کی علامت ہو؟

ہرموجنیس: ہو تو سکتا ہے!

سقراط: کیا یہ ذہن ہی نہیں ہے جو اشیا کو ان کے ناموں سے پکارنے کے فلسفے کو کنٹرول کرتا ہے اور یہی ذہن کا حسن نہیں ہے؟

ہرموجینس: یہ تو ظاہر ہے۔

سقراط: کیا دانائی اور ذہن کے وظائف قابلِ تعریف نہیں ہیں اور ان کی نفی کرنے والے اعمال وافعال قابلِ مذمت نہیں؟

ہرموجینس: یقیناً!

سقراط: اور یہ بھی صحیح ہے کہ طبیعات ماہرین طبیعات کے کام آتی ہے جبکہ بڑھئی پن بڑھئی کا کام کر دیتا ہے؟

ہرموجینس: یقیناً!

سقراط: اور اصول حسن کاری حسن کار کا کام کرتا ہے۔

ہرموجینس: بے شک!

سقراط: اور وہ اصول ذہن کے علاوہ کچھ نہیں؟

ہرموجینس: بے شک!

سقراط: گویا ذہن ہی حقیقتِ حسن ہے کیونکہ اسی کے ذریعے وہ افعال سرانجام پاتے ہیں جو تحسین حاصل کر پاتے ہیں۔

ہرموجینس: ظاہر ہے! ☆☆☆☆

سقراط: "expedient" یعنی قرینِ مصلحت کا مطلب ہے متحرک یا رفتار کار میں اضافہ کرنے والا اور میں سمجھتا ہوں کہ گزشتہ مثالوں کی مدد سے آپ خود بھی اس کی توضیح کر سکتے ہیں۔☆☆☆☆

ہرموجینس: یہ قرین قیاس لگتا ہے۔

سقراط: اسی طرح "gainful" (مفید اور ثمر بار) "Gain" سے حاصل ہوا ہے جس کا مطلب یعنی نفع، پھل یا فائدہ ہے۔☆☆☆☆

ہرموجینس: کچھ لفظ "Profitable" (مفید، فائدہ مند) کے بارے میں بتایئے!

سقراط: عزیزم ہرموجینس! میں سمجھتا ہوں کہ لوگ جب مفید، فائدہ بولتے ہیں تو اس سے مراد وہ نفع ہرگز نہیں ہوتا جو وہ دکاندار کو خرید کے وقت ادا کرتے ہیں اور اس طرح یہ سوفی صد مفید کی جگہ نہیں لے سکتا اس لیے وہ اس سے تیز رفتار کا مطلب لیتے ہیں۔ یعنی آپ مفید کو عالمِ وجود میں آنے والی تیز رفتار ترین شے سے (یا تیزی سے عالمِ وجود میں آنے والی شے) قرار دے سکتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں اس کی حرکت میں کہیں وقفہ یا رکاوٹ نہ آئے یہاں تک کہ جب کہ ایک

بار فنا ہو تو بغیر کسی وقفے کے دوبارہ عالمِ وجود میں آ جائے اس طرح وہ حرکت کو غیر فانی بناتی ہے۔

☆☆☆☆ یہ آخری لفظ ہومر نے بے تحاشا استعمال کیا ہے۔اس کے خصائص بھی بدیسی الفاظ سے ہیں۔

ہرموجنیس: اب ان الفاظ کے متضادات پر بھی روشنی ڈال ہی دیجیے!

سقراط: خالصتاً الٹ الفاظ کے بارے میں میرا خیال ہے کہ کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔

ہرموجنیس: مثلاً کون کون سے لفظ؟

سقراط: مثلاً خلاف مصلحت، بے جا یعنی غیر منفعت بخش، غیر مفید اور وہ جس سے کچھ حاصل نہ ہو (لاحاصل)۔

ہرموجنیس: میں بھی یہی سمجھتا ہوں!

سقراط: البتہ دو الفاظ ایسے ہیں جن پر بات ہونی چاہیے اور وہ نقصان دہ اور تکلیف دہ ہیں۔

ہرموجنیس: سقراط، بہت خوب!

سقراط: ان میں سے لفظ "hinder" or "harm" کا مطلب ہے ندی یا بہاؤ میں رکاوٹ ڈالنے والا اور تکلیف پہنچانے والا اور دراصل یعنی رکاوٹ یا پابندی لگانے پر مائل۔

ہرموجنیس: جناب سقراط! آپ بہت احتیاط سے نتائج اخذ کرتے ہیں۔خصوصاً ناموں کے اعلان کے ضمن میں آپ کا انداز بے حد پیارا ہے۔جیسا کہ آپ کے منہ سے سیٹی سی بج رہی ہے۔گویا آپ ایتھین کا افتتاحیہ الاپ رہے ہوں۔

سقراط: اس میں میری کیا خطا ہے عزیزم ہرموجنیس یہ تو نام رکھنے والے کا ''قصور'' ہے۔

سقراط: .... پہلے مجھے یہ کہنے دیجیے عزیزم ہرموجنیس، کہ میرا یہ نظریہ کس قدر درست تھا کہ محض بعض حروف کے ہٹانے اور شامل کرنے سے الفاظ کے مفاہیم میں کس قدر زبردست تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں! بعض اوقات تو ایک معمولی سی کمی بیشی سے الفاظ کے معانی برعکس ہو جاتے ہیں۔اس سے میری یادداشت میں وہ مثالیں تازہ ہوتی ہیں جن کا میں آپ سے ذکر کر چکا ہوں اور جن میں، میں نے یہ واضح کرنے کی کوشش کی تھی کہ جدید دور کی فیشن ایبل زبان میں الفاظ کو یوں توڑا مروڑا گیا ہے اور ان کی شکل اس طرح بگڑی ہے کہ معانی کہیں سے کہیں جا پہنچے ہیں۔

☆☆☆☆

ہرموجنیس: یہاں تک تو آپ نے ان الفاظ کی وضاحت کا فریضہ خوب نبھایا ہے البتہ اگر آپ سے کوئی پوچھے کہ ان الفاظ کی موزونیت کیسے ثابت کی جاسکتی ہے تو آپ کیا کہیں گے؟

سقراط: گویا آپ چاہتے ہیں کہ میں آپ کو بتاؤں کہ میں ان کو کیسے مطمئن کروں گا؟

ہرموجنیس: جی ہاں!

سقراط: ایک طرح کا جواب تو میں پہلے ہی دے چکا ہوں۔

ہرموجنیس: وہ کون سا!

سقراط: وہ یہ کہ جو الفاظ ہماری عمومی فہم کے دائرے میں نہیں آتے دراصل بدیسی زبانوں سے ہماری زبان میں در آئے ہیں۔ اور یہ جواب بڑی حد تک درست بھی ہے۔ البتہ ایک وجہ یہ بھی ہے کہ امتدادِ زمانہ نے بھی ان الفاظ کی شکل وصورت اور مفہوم کی ترمیم وتخفیف میں بھی بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔ لفظوں اور ان کی شکلوں کو ہر لحاظ سے یوں توڑا مروڑا گیا ہے کہ اگر قدیم زبان کو موجودہ زبان کے ساتھ رکھ کر دیکھا جائے تو قدیم زبان گویا بربروں (غیر یونانیوں) کی زبان لگے گی۔

ہرموجنیس: میں بھی یہی محسوس کرتا ہوں۔

سقراط: یہ تو ہے مگر اس مرحلے پر تحقیق ہماری پوری توجہ کی طالب ہے اور میرا خیال ہے ہمیں اس سے اجتناب نہیں کرنا چاہیے، کیونکہ یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ اگر کوئی محقق ناموں کے الفاظ کا تجزیہ جاری رکھتا ہے اور الفاظ کی ترکیب میں مستعمل عناصر کی جستجو میں ہے اور اصل عمل کو مسلسل دہرائے تو ایک مرحلہ ایسا آتا ہے کہ جواب دینے والا ہتھیار ڈالنے پر آجاتا ہے۔

ہرموجنیس: یہ تو سچ ہے۔

سقراط: اور آپ کے خیال میں وہ مرحلہ کون سا ہے؟ کیا وہ نہیں جہاں ایسے ناموں سے بحث کی جارہی ہو جو خود دوسرے ناموں اور جملوں کے عناصر ہوں (کہ اس طرح آسانی سے بات میں سے بات نکلتی جاتی ہے) اس طرح ان کا کچھ دوسرے اسما سے وجود میں آنا زیادہ قرینِ امکان نہیں ہوتا۔

☆☆☆☆

ہرموجنیس: مجھے یقین ہے کہ آپ کا خیال درست ہے۔

سقراط: اور فرض کیجیے آپ اب جس لفظ کے بارے میں دریافت کررہے ہیں وہ بنیادی لفظ ثابت ہوا تو اس کا تجزیہ کسی نئے اصول یا طریقے سے ممکن ہے یا نہیں؟

ہرموجنیس: یہ تو سوچنا پڑے گا۔

سقراط: یہی بات ہے عزیزم ہرموجنیس! ہماری بحث کا یہی نتیجہ ہی برآمد ہو سکتا تھا اور اگر آپ کو میرے اس بیان سے اتفاق ہے تو آیئے میری مدد کیجیے تاکہ میں الفاظ کی بنیاد کی کھوج کے ضمن میں کوئی فاش غلطی نہ کر ڈالوں۔

ہرموجنیس: میں ہمہ تن گوش ہوں اور حسب موقع آپ کی مدد کے لیے بھی مستعد رہوں گا۔

سقراط: میرا خیال ہے کہ آپ بھی اس امر کی تصدیق کریں گے اور مجھ سے متفق ہوں گے کہ الفاظ اگر فقط خالص نام ہوں تو چاہے بنیادی الفاظ ہوں یا ثانوی، ان پر ایک ہی اصول کا اطلاق ہوگا۔

ہرموجنیس: جی ہاں۔ ایسا ہی ہے۔

سقراط: ہم نے اب تک جتنے ناموں پر بھی بحث کی ہے مختلف اشیا کے ناموں کی ساخت اور ہیئت سے متعلق تھے۔

ہرموجنیس: یقیناً۔

سقراط: اور یہ اصول بنیادی اور ثانوی دونوں طرح کے ناموں سے متعلق درست ہے اور ناموں ہی کی اصلیت آشکار کرنے کا کام کرتا ہے۔

ہرموجنیس: یقیناً۔

سقراط: مگر میں جیسے کہ پہلے عرض کر چکا ہوں، ثانوی نام ابتدائی ناموں ہی سے اخذ ہوتے ہیں۔

ہرموجنیس: یہ تو ظاہر ہے۔

سقراط: خوب! مگر ابتدائی نام اگر حقیقی نام ہی ہیں تو ان کے تجزیے کے ذریعے ان اشیا کی حقیقت کو پانا کیسے اور کس طریقے سے ممکن ہو سکتا ہے جن کے یہ نام ہیں؟ اور یہاں ایک اور سوال بھی میرے ذہن میں پیدا ہوتا ہے جو میں آپ سے پوچھنا چاہتا ہوں۔ فرض کیجیے کہ ہم زبان نہ جانتے ہوں یا قوت گویائی سے محروم ہوں تو کیا گونگے بہروں کی طرح ہم ہاتھوں اور سر کی جنبش یا جسم کے دیگر حصوں کے ذریعے حسب ضرورت اشارے نہیں کریں گے؟

ہرموجنیس: اس کے سوا کیا چارہ ہوگا! سقراط۔

سقراط: یعنی ہم اشیا کی حقیقت میں مشابہت (نقل) پیدا کریں گے، مثلاً اپنے ہاتھوں کو اوپر اٹھانے سے ہم اشیا کے ہلکے پن اور بلندی کا اشارہ کر سکتے ہیں اور اسی طرح ہاتھوں کو زمین کی طرف گرانے

سے گویا اشیا کے بھاری پن اور نیچا ہونے کا اشارہ کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح ہم گھوڑے یا کسی دوسرے جانور کی دوڑ کی جانب اشارہ کرنے کے لیے بھی جسم کے متعلقہ حصوں کی حرکات وسکنات سے کام لیں گے۔

ہرموجینس: ہاں! اس کے علاوہ اور کیا کیا جا سکتا ہے۔

سقراط: کچھ بھی نہیں، کیونکہ کسی شے کی جسمانی حرکت کے اظہار کے لیے تو لامحالہ جسم ہی کی حرکات سے کام لینا ہوگا۔

ہرموجینس: بالکل صحیح!

سقراط: اور اگر ہم کسی شے کا اظہار آواز، زبان یا منھ اور ہونٹوں کی حرکت سے کرنا چاہیں تو یہ بھی اس شے کی نقل ہی ہوگی جس کا ہم اظہار چاہتے ہیں؟

ہرموجینس: شاید آپ ٹھیک کہتے ہیں۔

سقراط: اس کا مطلب ہے کہ نام دراصل اس شے کی صوتی نقل ہے جس کا اظہار مطلوب ہو۔

ہرموجینس: جی ہاں شاید ایسا ہی ہے۔

سقراط: نہیں میرے دوست، میرا خیال ہے کہ ابھی تک ہم اصل حقیقت تک پہنچ نہیں پائے۔

ہرموجینس: کیوں نہیں جناب!

سقراط: اس لیے کہ اگر ہم اسی کو درست مان لیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ جو لوگ بھیڑ کی، مرغ کی یا کسی بھی دوسرے جانور کی نقل کریں تو گویا اس کا نام لے رہے ہوں گے؟

ہرموجینس: جی ہاں!

سقراط: یعنی میں جو کہہ رہا تھا وہ درست تھا؟

ہرموجینس: میری رائے میں تو درست نہیں ہے۔ مگر محترم سقراط! میں چاہتا ہوں کہ آپ ہی مجھے بتائیں کہ کس نوع کی نقل کو نام قرار دیا جا سکتا ہے؟

سقراط: پہلی بات تو یہ ہے کہ میں میوزیکل اظہار کی سفارش نہیں کروں گا حالانکہ یہ بھی زبانی اور صوتی اظہار ہی ہے۔ نہ ہی اس طرح کی نقل مناسب ہوگی جیسی کہ موسیقار کرتے ہیں کیونکہ میری رائے کے مطابق ایسی آواز نام نہیں کہلا سکتی۔ میں اس بات کو کچھ اس طرح لیتا ہوں کہ تمام اشیا کی شکل ہوتی ہے، آواز ہوتی ہے اور رنگ بھی ہوتا ہے۔ ایسا ہی ہے ناں؟

ہرموجینس: جی ہاں۔ بالکل یہی بات ہے۔

سقراط: جہاں تک اشیا اور کوائف کو نام دینے کا تعلق ہے یہ کوئی نقل (Imitation) جیسی شے نہیں ہے بلکہ اس سلسلے میں جن فنون کا کوئی عمل دخل ہے وہ آرٹ اور موسیقی ہیں۔ آپ کا کیا خیال ہے؟

ہرموجینس: میں آپ سے متفق ہوں۔

سقراط: کیا رنگ اور آواز کی طرح ہر شے کا کوئی مخصوص جوہر نہیں ہوسکتا؟ اور کیا خود رنگ اور آواز اور ایسی دیگر اشیا کا جوہر بھی ممکن الوجود نہیں ہے؟

ہرموجینس: میرے خیال میں ممکن ہے۔

سقراط: اور اگر کوئی فرد اسی جوہر کو حروف اور صوتی حرکت میں واضح کر دے تو کیا وہ ان اشیا کی فطری ساخت بیان نہیں کر رہا ہوگا؟

ہرموجینس: بالکل یہی بات ہے۔

سقراط: ہم نے جو دو قسم کے دوسرے نقالوں کا ذکر کیا تھا وہ موسیقار اور نقاش ہیں۔ ایسے نقالوں کو کیا کہیں گے؟

ہرموجینس: میرا خیال ہے، جناب سقراط، کہ یہی وہ لوگ ہیں جو موسیقی اور آرٹ کو اس کے ثمرات کے نام دینے کے اہل ہیں اور انھی کی ہمیں تلاش تھی۔

سقراط: اگر یہ بات درست ہے تو ہم بآسانی اس مقام پر ہیں کہ ندی، بہاو یعنی "جانا" اور قیام پذیری کے ناموں کو زیر بحث لا سکتے ہیں۔ اسی صورت میں ہم جان پائیں گے کہ آیا ان الفاظ نے حروف اور سلیبس کی مدد سے (جو اشیا یا کوائف کے نام ہیں) متعلقہ اشیا کی فطری کیفیت کی کماحقہ ترجمانی کی ہے یا نہیں۔

ہرموجینس: بہت اچھی تجویز ہے!

سقراط: مگر کیا فقط یہی نام ہی ابتدائی نام ہیں یا کچھ اور بھی ہیں؟

ہرموجینس: اور بھی یقیناً ہوں گے!

سقراط: مجھے توقع تھی کہ آپ کا جواب یہی ہوگا۔ مگر ہم کہاں تک مزید ان کا تجزیہ کریں گے اور نقال کی نوبت کہاں پر آئے گی؟ نقل کا جوہر حروف اور آوازوں سے متشکل ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں کیا ضروری نہیں ہے کہ ہم ایسے حروف کو الگ کر لیں جو صوتی ہم آہنگی رکھتے ہوں، بالکل ان لوگوں کی

طرح جو (شاعری وغیرہ کی غرض سے) پہلے ہم آواز و ہم آہنگ الفاظ کو الگ کرتے ہیں۔اس ضمن میں پہلے وہ بنیادی یا مفرد حروف کو لیتے ہیں اور پھر مرکب حروف کو ملحوظ رکھتے ہیں۔اس کے بعد ہی وہ حروف کی ہم آواز تراکیب تشکیل دیتے ہیں؟

ہرموجینس: بالکل ضروری ہے۔

سقراط: کیا ہم اسی طریقے سے حروف کے ساتھ آغاز نہ کریں؟ آیئے پہلے حروف کو لیتے ہیں اور اس کے بعد صوتی حروف یا خاموش حروف کو لیں گے۔ پھر ان کی گروہ بندی کر لیتے ہیں۔اس ضمن میں ہم علما کی جانب سے طے شدہ اصولوں کو ملحوظ رکھیں گے۔اس ضمن میں ہم نیم حروفِ علت کو بھی لیں گے جو نہ مکمل حروف علت ہیں اور مکمل طور پر خاموش ہی ہیں۔ بلکہ ہر قسم کے حروف علت کی بھی گروہ بندی کر لیتے ہیں اور جب ہم اشیا کی گروہ بندی کر چکیں گے (جیسے کہ ہم نے حروف کے ضمن میں کی ہوگی) تب ہم ان اشیا کو نام دیں گے اور یہ مشاہدہ کریں گے کہ (حروف کی گروہ بندی کی طرح) کون سے ایسے ممکنہ گروہ ہو سکتے ہیں جن سے ان اشیا کو منسوب کر دیں۔اسی مرحلے پر ہم اشیا کی فطری ساخت کا مطالعہ کرتے ہوئے جائزہ لیں گے کہ آیا ان کی اس حوالے سے گروہ بندی ممکن ہے جیسا کہ حروف کی صورت میں تھی اور جب ہم یہ سب مراحل طے کر چکیں گے تب ہمیں معلوم ہو سکے گا کہ اشیا کو کن کن حروف کی گروہوں کے ساتھ منسلک کر دیں جن کے ساتھ وہ مشابہت رکھتے ہوں؟ کیا ایک حرف ایک شے کے اظہار کے لیے کافی ہے یا ایک سے زیادہ حروف کی مناسب ترکیب اس کے لیے ضروری ہوگی؟ اس کی مثال ایک مصور کے کام کی سی ہے، جسے بعض اوقات ایک رنگ استعمال کرنے کی ضرورت ہوتی ہے اور اسی سے اس کا کام مکمل ہو جاتا ہے لیکن بعض اوقات جب اسے انسانی جلد یا ایسی کسی دوسری زندہ شے کا رنگ ظاہر کرنا ہو تو پھر ایک رنگ ناکافی ہوتا ہے اور مطلوبہ رنگ کے لیے اسے متعدد رنگوں کو بڑی مہارت اور مناسب تناسب کے ساتھ ملانا پڑتا ہے۔اسی طرح اگر کسی شے کی شکل وصورت اور وجود کے لیے محض ایک ہی حرف درکار ہے تو ٹھیک، ورنہ مختلف حروف ملا کر پہلے صوتی اکائیاں ترتیب پاتی ہیں، اس کے بعد مختلف صوتی اکائیاں مل کر الفاظ بناتی ہیں جن میں افعال اور اسما وغیرہ ہوتے ہیں اور آخر میں مطلوبہ افعال اور اسما کی مناسب ترکیب سے زبان وجود میں آتی ہے جو ظاہر ہے حروف اور صوتی اکائیوں کے مقابلے میں وسیع تر اور مکمل تر شے ہے۔سو جیسے مصور رنگوں سے منظر کشی میں کامیاب

ہوا اسی طرح نام دینے والے، لسانی ماہرین اور بعض دوسری قسم کے لوگ اپنے اپنے فن کو مجتمع کر کے زبان کی ترکیب کے عمل میں حصہ لیتے ہیں اور ان کا کام تقریر سازی کہلاتا ہے۔ یہاں میں اپنے کسی کمال کا ذکر نہیں کرنا چاہتا بلکہ فی الحقیقت یہ قدیم لوگوں کی بات ہے جن لوگوں نے اوّل اوّل زبانوں کی ساخت میں حصہ لیا اور اگر ہم پورے موضوع کا سائنسی نقطۂ نظر سے تجزیہ کرنے اور اس تدوینی عمل کو جامعیت کے ساتھ سمجھنا چاہتے ہیں تو جیسے ٹکڑے کر کے انھوں نے زبان کی تشکیل کی اسی طرح ایک ایک جزو کو الگ الگ کر کے سمجھنے ہی سے مسئلہ حل ہو سکتا ہے اور اس کی صورت یہ ہوگی عزیزم ہرموجنیس! کہ ہم جان پائیں کہ آیا ان قدیم لوگوں نے ابتدائی اجزا اور ثانوی اجزا کی ترکیب مثبت سمت میں کی ہے یا نہیں کیونکہ اگر ایسا نہیں کیا گیا تو ظاہر ہے کہ ان کے کام کا نتیجہ کسی خوشگوار صورت میں برآمد نہیں ہوگا اور نہ ہی اس کی سمت ہی صحیح قرار پائے گی۔

ہرموجنیس: اس پر تو جناب سقراط! میں بھی یقین رکھتا ہوں۔

سقراط: مگر کیا آپ الفاظ یا لسانی اکائیوں کا مذکورہ بالا طریقے سے تجزیہ کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں؟ کیونکہ اپنے بارے میں تو مجھے یقین ہے کہ میں ایسا نہیں کر سکوں گا۔

ہرموجنیس: مگر میری صلاحیتیں تو آپ کی صلاحیتوں سے بھی کم ہیں۔ سو مجھ سے اس کی توقع کیسی!

سقراط: کیا اس مسئلے کو یہیں چھوڑ دیا جائے؟ یا ہم اپنی استطاعت کے مطابق حقیقت مطلقہ کی تلاش کی کوشش جاری رکھیں۔ البتہ جہاں تک دیوتاؤں کی کارگزاری اور مذکورہ میدانوں میں ان کے کردار کا تعلق ہے اس ضمن میں ہم کچھ کہنے کی حالت میں شاید ہی ہوں مگر انسانوں کی کارکردگی کا جائزہ تو لیا ہی جا سکتا ہے اور اس موجودہ تحقیق کے سلسلے میں ہمیں خود اپنے آپ سے یہ سوال کر لینا چاہیے۔ (قبل اس کے کہ بات کو آگے بڑھائیں) کہ آیا بہترین طریق کار وہی ہے جسے ہم یا زبان کا تجزیہ کرنے والے دوسرے افراد کسی اچھے مقصد کے لیے اپنائیں۔ مگر کم از کم (جیسا کہ لوگ کہتے ہیں) ہمیں اس اچھائی کا آغاز تو کر ہی ڈالنا چاہیے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟

ہرموجنیس: مجھے آپ کی بات سے پورا پورا اتفاق ہے۔

سقراط: میں سمجھتا ہوں کہ اشیا کو حروف اور صوتی اکائیوں کی صورت میں ظاہر کر کے کسی موثر اظہار کی توقع رکھنا فضول ہے مگر عزیزم ہرموجنیس اس کے بغیر چارہ کار بھی تو نہیں کیونکہ پہلے ناموں (سرناموں) کی حقیقت کو جانچنے کا اس کے علاوہ کوئی طریقہ بھی نہیں۔ ہاں اس کے علاوہ ایک

صورت اور ہے اور وہ یہ ہے کہ جزئیہ شعرا کا کلام۔ مجھے لگتا ہے کہ ان شعرا کے موصوف دیوتا کہیں فضا سے اتریں گے اور ہمارا مسئلہ حل کرنے میں ہماری مدد کریں گے مگر وہ بھی اس کے سوا کیا کہہ سکیں گے کہ:

''سرنامے چونکہ دیوتاؤں نے طے کیے ہیں لہٰذا ان کی صحت میں کوئی کلام نہیں''۔

لہٰذا یہی سوچ درست ہے بلکہ بعض دوسری سوچیں بھی مفید ہو سکتی ہیں، مثلاً بربروں کے ذرائع سے استفادہ کیا جائے کیونکہ بربر بہر طور ہم سے قدیم تر تہذیب سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان پر صرف ان کی قدامت ہی کا ایک پردہ سا پڑا ہوا ہے جو پچھلے بہانے کی طرح ایک بہانہ ہو سکتا ہے، مکمل جواز نہیں مگر یہ الفاظ سے متعلق کوئی معقول جواز نہ رکھنے کا بھی ایک معقول بہانہ قرار دیا جا سکتا ہے اور ظاہر ہے کہ جب ابتدائی حقیقی ناموں سے عدم واقفیت کا بہانہ قابل قبول ٹھہرے گا تو ثانوی ناموں سے عدم واقفیت کا جواز خود بخود پیدا ہو جائے گا کیونکہ ان کی توجیہ کی بنیاد تو بالآخر بنیادی ناموں ہی پر ہو سکتی ہے۔ اس لیے ظاہر ہے کہ زبان دانی کا کوئی پروفیسر جب الفاظ کی حقیقت منکشف کرنے کی کوشش کرے گا تو فقط ایک نامعقول سی وضاحت ہی کر پائے گا ورنہ اس کی ساری گفتگو بے کار محض شمار ہوگی۔ کیا آپ کو اس وضاحت کی حقانیت میں شبہ ہے؟

ہرموجینس: ہرگز نہیں محترم سقراط!

سقراط: ناموں سے متعلق میری پہلی رائے بڑی احمقانہ اور کم علمی پر مبنی ہے۔ تاہم اگر آپ چاہیں تو میں اسے اس امید پر دہرائے دیتا ہوں کہ اس کے جواب میں آپ کوئی بہتر بات کہہ سکیں گے۔

ہرموجینس: اگر چہ کچھ بہتر پیش کرنے کا مجھے دعویٰ تو نہیں ہے تاہم میں اس کی بھرپور کوشش کروں گا کہ آپ کی خواہش کی تکمیل ہو سکے۔

سقراط: سب سے پہلی بات تو یہ حرف میرے نزدیک ہر طرز کی حرکت کو ظاہر کرنے کا بنیادی ذریعہ ہے مگر ابھی موخر الذکر لفظ کا مفہوم واضح انداز میں، میں نے بیان کیا جو فی الحقیقت جانا ہے کیونکہ قدیم زمانے کے ماہرین لسانیات حرف کا استعمال نہیں کرتے تھے انہوں نے حرف E کا اضافہ کیا تھا جبکہ باقی لفظ دراصل کسی بدیسی زبان سے ہماری زبان میں آیا ہے جس کی ایک مثال بھی موجود ہے۔ ☆ ☆ ☆ ☆ ایسا لگتا ہے کہ قانون ساز نے تمام بکھیڑوں کو حروف اور صوتی اکائیوں تک محدود کر کے اور ان میں بعض دیگر موثر علامات شامل کر کے اشیا کے نام تخلیق کیے ہیں۔ عزیزم

ہرموجنیس! یہ تو ناموں کی اصلیت کے بارے میں میرے خیالات ہیں اب میں جاننا چاہتا ہوں کہ کریٹائیلس اس ضمن میں کیا کہتے ہیں؟

ہرموجنیس: مگر جناب سقراط! کریٹائیلس ہمیشہ مجھے الجھن میں ڈال دیتا ہے، یہ میں آپ کو پہلے بھی بتا چکا ہوں۔ مثلاً کہتا ہے کہ ناموں کی ایک موزونیت ضرور ہے مگر اس نے ایسی کسی معقولیت یا موزونیت کی وضاحت یا نشاندہی نہیں کی۔ اب میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ آیا وہ ایسا ابہام جان بوجھ کر چھوڑتا ہے یا صورتِ حال اس کے برعکس ہے۔ سوائے کریٹائیلس آپ خود ہی جناب سقراط کی موجودگی میں واضح کر دیجیے کہ آیا جناب سقراط نے جو کچھ کہا ہے خصوصاً ناموں کی اصلیت کے بارے میں، آپ اس سے متفق ہیں یا آپ کے پاس اس سے بہتر وضاحت موجود ہے؟ تا کہ اندازہ ہو سکے کہ آپ جناب سقراط سے سیکھتے ہیں یا سقراط اور میں آپ سے استفادہ کر سکتے ہیں۔

کریٹائیلس: اچھا تو محترم ہرموجنیس۔ فوری طور پر یہ کہنا مشکل ہے کہ آپ مجھ سے کچھ سیکھ پائیں گے کیونکہ زبان جیسے وسیع ترین موضوع پر ذرا سی دیر میں آپ کی توقعات کے مطابق روشنی ڈالنا اس قدر سادہ اور آسان بات نہیں ہے۔

ہرموجنیس: یقیناً نہیں ہے۔ مگر جیسا کہ ہیزیوڈ کا قول ہے (اور میں بھی اس سے متفق ہوں) کہ کم شے میں آپ کم ہی سہی، اضافہ کریں گے تو یہ قابلِ قدر بات ہوگی۔ لہٰذا اگر آپ کے پاس اس موضوع پر کہنے کو معمولی سی بات ہی کیوں نہ ہو آپ کہہ ڈالیے۔ آپ کو زحمت ضرور ہوگی مگر اس سے سقراط اور میرے علم میں اضافہ ہوگا۔ آخر سقراط کا اور میرا آپ پر اتنا تو حق ضرور ہے۔

سقراط: جناب کریٹائیلس، اس موضوع پر ہرموجنیس اور میرے درمیان جو کچھ گفتگو ہوئی ہے میں اس سے ہرگز مطمئن نہیں ہوں۔ لہٰذا آپ نے جو کچھ کہنا ہے آپ کہہ ڈالیے۔ اگر ذرا سا بھی، اس میں سے، میرے لیے نیا ہوگا تو میں دل و جان سے اسے قبول اور تسلیم کرلوں گا اور آپ سے بعض بہتر تصورات کے بارے میں سن کر مجھے ہرگز حیرت نہیں ہوگی کیونکہ آپ نے اس موضوع پر بڑے بلیغ نظریات بیان کیے ہیں اور آپ کو اچھے اساتذہ سے استفادہ کرنے کا موقع بھی ملا ہے۔ سو اگر ناموں کے نظریے میں آپ ذرا بھی اضافہ کر پائے تو آپ مجھے اپنے شاگردوں میں پائیں گے۔

کریٹائیلس: جناب سقراط، اس حد تک تو آپ کا بیان درست ہے کہ میرا اس موضوع پر خاصا مطالعہ رہا ہے اور میں اپنے علم کی بنیاد پر آپ کو اپنا شاگرد بنا بھی سکتا ہوں، مگر مجھے خطرہ ہے کہ کہیں صورت حال

الٹ ہی نہ ہو جائے اور میں پہلے ہی محسوس کر رہا ہوں کہ میں آپ سے وہی الفاظ کہوں جو ایکلس (Acilles) نے اپنی استدعا (دعا) میں ایجیکس (Ajax) سے کہے ہیں:

''قابلِ احترام ایجیکس ولد ٹیلامون، آقائے عالم یوں دکھائی دیتا ہے کہ تمام چیزوں کے بارے میں آپ نے جو کچھ کہا ہے وہ میرے ذہن سے مطابقت رکھتا ہے۔''

سقراط: اور جناب آپ کی باتیں تو میرے لیے نوائے سروش ہیں۔ مجھے اس سے غرض نہیں کہ آپ کے یہ خیالات خالص آپ کے ہیں یا آپ نے یہ علم یوتھی فرو سے حاصل کیا ہے یا کوئی اور میوسس (Muses) آپ کے قلب و دماغ میں اتنی خاموشی سے آن بسا ہے کہ آپ کو علم ہی نہیں ہو پایا۔

سقراط: بہت خوب کریٹائیلس! میں خود اپنی ذہانت کے بارے میں ایک زمانے سے متحیر ہوں مگر میں اس پر یک طرفہ طور پر بھروسا نہیں کر سکتا۔ اس لیے کبھی کبھی مجھے خیال آتا ہے کہ اپنے علم کے اظہار کو روک کر خود سے سوال کروں کہ آخر میں کہنا کیا چاہتا ہوں؟ کیونکہ خود کو دھوکا دینے اور خود سے دھوکا کھانے سے بدتر اور کوئی بات نہیں ہو سکتی۔ ایسی صورت میں دھوکا دینے والا ہر لمحے آپ کے ساتھ موجود رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں اپنے ہر فکر و عمل کے پس منظر اور ممکنہ نتائج کی کھوج میں رہتا ہوں۔ یہ ہومر کے الفاظ ہیں ''آگے اور پیچھے دیکھو'' (Look fore and after) اور اب آیئے پہلے یہ دیکھیں کہ ہم (بحث کی راہ میں) کہاں تک پہنچے تھے؟ کیا ہم یہ طے نہیں کر رہے تھے کہ صحیح اور موزوں نام اشیا کی فطرت کا مظہر ہوتے ہیں۔ کیا ہم اس مفروضے کو درست ثابت کرنے میں کامیاب ہو سکے ہیں؟

کریٹائیلس: جی ہاں جناب سقراط، یہ جو آپ کہتے ہیں کہ میں سوچوں میں گم رہتا ہوں، تو یہ بات کافی حد تک درست ہے۔

سقراط: گویا آپ کے خیال کے مطابق ناموں کے ذریعے اشیا کے متعلق رہنمائی حاصل ہوتی ہے؟

کریٹائیلس: یقیناً۔

سقراط: گویا اشیا کو نام دینا ایک فن ہے اور ایسا کرنے والے لوگ فنکار ہیں؟

کریٹائیلس: بالکل درست!

سقراط: اور وہ کون لوگ ہو سکتے ہیں؟

کریٹائیلس: یہ لوگ قانون ساز ہیں، جن کا ذکر آپ گفتگو کے آغاز میں کر چکے ہیں۔

سقراط: کیا یہ فن بھی لوگوں کے درمیان دیگر فنون کی طرح ہی پروان چڑھتا ہے؟ مثلاً جیسے کہ مصور ہیں جن میں سے کچھ اچھے مصور ہوتے اور کچھ کم اچھے۔

کریٹائیلس: جی ہاں!

سقراط: اچھے مصور اس لیے اچھے ہیں کہ تصویر اچھی بناتے ہیں اور جو اچھے نہیں وہ تصویر اچھی نہ بنا پانے کے باعث اچھے نہیں۔ اسی طرح ماہرین تعمیرات کی بھی یہی مثال ہے یعنی جو اچھی اور خوبصورت عمارت بنا لیتے ہیں وہ اچھے (ماہر تعمیرات) کہلاتے ہیں اور جو اپنی عمارتیں اچھی نہیں بنا پاتے اچھے ماہر تعمیرات نہیں سمجھے جاتے۔

کریٹائیلس: بالکل یہ بات ہے۔

سقراط: یہی بات قانون ساز ان پر بھی صادق آنی چاہیے (کیونکہ ان کی حیثیت بھی فنکاروں جیسی ہے) یعنی بعض کا کام اچھا اور بعض کا برا ہوتا ہے؟

کریٹائیلس: مجھے افسوس ہے کہ میں اس بات پر آپ سے متفق نہیں ہو سکتا۔

سقراط: گویا آپ اس بات پر بھی یقین نہیں رکھتے کہ کچھ قوانین اچھے ہوتے ہیں اور کچھ برے؟

کریٹائیلس: نہیں، میں اس سے بھی متفق نہیں ہوں۔

سقراط: اور اس کے بارے میں کیا خیال ہے کہ کچھ نام دوسروں کے بارے میں بہتر (زیادہ موزوں) ہوتے ہیں؟

کریٹائیلس: ہاں! اگر وہ نام ہیں تو موزوں ہی ہوں گے۔

سقراط: تو آپ ہمارے دوست ہرموجینس (ہرمیس کی نسل سے) کے نام کے بارے میں کیا کہیں گے، جس پر ہم پہلے ہی اظہار کر چکے ہیں؟ کیونکہ اس میں ہرمیس والی کوئی بھی خوبی موجود نہیں ہے تو اس کا یہ مطلب ہوگا کہ یہ غلط نام ہے یا یہ سرے سے اس کا نام ہی نہیں ہے؟

کریٹائیلس: میں اس کے جواب میں یہ کہوں گا کہ یہ اس کا نام ہرگز نہیں ہے بس لگتا ہے کہ یہ اس کا نام ہے اور یہ کہ یہ دراصل کسی اور شخص کا نام ہے جس میں اس نام کی مناسبت سے خوبیاں موجود ہوں۔

سقراط: تو گویا اگر کوئی شخص ہمارے دوست ہرموجینس کو اس نام سے پکارے گا تو وہ غلطی پر ہوگا؟ کیونکہ یہ بات تو مشکوک ہی رہے گی کہ جسے آپ ہرموجینس کے نام سے پکار رہے ہیں، اس میں ہرموجینس

والی کوئی بات نہیں؟

کریٹائیلس: اس جملے سے آپ کا کیا مطلب ہے؟

سقراط: کیا اب بھی آپ کی رائے یہی ہے کہ ناموں میں غلطی کا کوئی امکان نہیں؟ کیونکہ اگر یہ درست ہے تو اس کا مطلب ہے کہ ہر عہد میں بیشمار لوگ جھوٹ بولتے رہے ہیں۔ (یعنی لوگوں کو ایسے ناموں سے پکارتے رہے جو فی الحقیقت ان کے نام ہی نہ تھے؟)

کریٹائیلس: یہ کیسے ہو سکتا ہے جناب سقراط کہ کوئی ایسی بات کہے جو حقیقتاً وجود نہ رکھتی ہو۔ گویا وہ کسی شے کا نام بھی لے رہے ہیں اور نہیں بھی لے رہے؟ کیونکہ غلطی یا جھوٹ تو ایسی ہی بات کو کہیں گے کہ جو بھی کہی جا رہی ہو، ویسی نہ ہو۔

سقراط: میرے دوست! آپ کی دلیل میری عمر کے شخص کے لیے بے حد کمزور ہے۔ پھر بھی میں یہ جاننا چاہوں گا کہ کیا آپ کا شمار بھی ان فلاسفہ میں ہے جن کے خیال میں غلط بات کہہ بھی دی جائے تو اس کا مطلب غلط نہیں ہوتا؟

کریٹائیلس: میں تو سمجھتا ہوں کہ غلط بات نہ ہی کہی جاتی ہے اور نہ ہی ایسا کسی شے کا مطلب ہو سکتا ہے۔

سقراط: گویا "nor uttered nor addressed" مثال کے طور پر اگر کسی غیر ریاست میں کوئی اجنبی شخص اچانک ظاہر ہو اور وہ آپ کو سلام کر کے اور آپ کا ہاتھ پکڑ کر (بڑی تکلفی سے) مخاطب کرے اور کہے۔ جناب ایتھنز کے ہرموجنیس ابن سمیکریون (Smicrion) تو وہ شخص، جو یہ الفاظ زبان سے ادا کرے گا، بولے گا یا بڑبڑائے گا (یعنی چاہے جس انداز میں بھی اظہار کرے) تو کیا وہ آپ سے مخاطب ہو رہا ہوگا یا ہمارے ہرموجنیس کے ساتھ، کیا آپ کے خیال میں اس کا تخاطب کسی فرد سے بھی نہیں ہوگا؟

کریٹائیلس: میرا خیال ہے جناب سقراط، کہ وہ شخص محض بکواس کر رہا ہوگا۔

سقراط: مگر میں فقط یہ جاننا چاہتا ہوں کہ جو بھی بکواس وہ کر رہا ہوگا وہ درست ہوگی یا غلط؟ یا اسے آپ جزوی طور پر درست اور جزوی طور پر غلط کہہ سکتے ہیں؟ وہ سب کیا ہوگا؟ یہی میں معلوم کرنا چاہتا ہوں۔

کریٹائیلس: میں تو یہ کہوں گا کہ وہ جو کچھ بھی کر رہا ہوگا، اس کی ایک ایک حرکت بے مصرف ہوگی اور اس کے الفاظ بامعنی بات کی بجائے محض شور ہوں گے جیسا کہ تانبے کے برتن بنانے والوں کی ہتھوڑیوں

سے ہوتا ہے۔

سقراط: مگر کریٹائیلس، کیا ہم اس بحث میں وہ درمیانی نقطہ (meeting point) دریافت کر سکتے ہیں جہاں آپ کم از کم اتنا تو اعتراف کر لیں کہ نام اور جس شے کا نام رکھا گیا ہو، وہ مختلف چیزیں ہوں گی؟

کریٹائیلس: ہاں، ایسا ممکن ہے۔

سقراط: آپ یہ بھی تسلیم کریں گے کہ نام، فی الحقیقت، اصل شے کی نقل ہوتا ہے؟

کریٹائیلس: یقیناً۔ یہ درست ہے۔

سقراط: اور آپ اس کی بھی تصدیق کریں گے کہ تصویر میں بھی اصل شے کی نقل ہی ہوتی ہیں مگر ناموں سے ذرا مختلف قسم کی؟

کریٹائیلس: جی ہاں، میں اس کی تصدیق کرتا ہوں۔

سقراط: مجھے یقین ہے کہ آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں مگر میں آپ کو صحیح معنوں میں سمجھ نہیں پایا۔ آپ براہ کرم یہ بتا دیجیے کہ آیا نام اور تصویریں اصل اشیا کی نمائندگی برابر برابر یعنی ایک ہی طرح بھرپور انداز میں کر سکتی ہیں؟

کریٹائیلس: ہاں، کیوں نہیں کر سکتیں!

سقراط: اچھا پہلے ذرا اس نکتے پر غور کیجیے۔ آپ یہ تو محسوس ہی کرتے ہوں گے کہ آدمی، آدمی سے مشابہ ہوتا ہے۔ اور عورت، عورت سے؟ اور اسی طرح ہر شے اپنی قبیل سے مشابہت رکھتی ہے۔

کریٹائیلس: یقیناً۔

سقراط: مگر اسی کے ساتھ آپ کو مرد کی عورت سے اور عورت کی مرد سے مشابہت کا بھی اعتراف ہو گا (کیونکہ بعض خصائص یقیناً ہر دو اصناف جنس میں ایک جیسے ہوتے ہیں)؟

کریٹائیلس: بالکل ہے!

سقراط: مگر ان مشابہتوں میں سے کون سی زیادہ درست ہے، پہلی یا دوسری؟

کریٹائیلس: پہلی!

سقراط: یعنی آپ کی نظر میں ہر شے کی اپنی صنف ہی سے مشابہت حقیقی مشابہت ہوتی ہے۔

کریٹائیلس: یہی میرا نقطۂ نظر ہے۔

چاہیے سو میں اپنا نقطہ نظر آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ جب ایک صنف کے افراد

سقراط: میں سمجھتا ہوں کہ دوست ہونے کے ناطے ہمیں ایک دوسرے کی دلیل کو سمجھنے میں آسانی ہونی چاہیے سو میں اپنا نقطہ نظر آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ جب ایک صنف کے افراد کی مشابہت کی بات کریں تو پہلی نوعیت، اگر شکل وصورت اور نام دونوں کے حوالے سے ہو تو میں اسے صحیح قرار دیتا ہوں اور اگر نام کے حوالے سے ہو تو یہ درست بھی ہے اور حقیقی بھی اور اس کے برعکس اگر نام اور صورت دونوں غیر مشابہ ہوں تو میں اس توجیہ (assignment) کو نقطہ غلط قرار دیتا ہوں اور اگر صرف نام غیر مشابہ ہیں تو یہی صورت حال غلط بھی ہے اور غیر حقیقی بھی کہلائے گی۔

کریٹائیلس: عالی جناب سقراط۔ یہ بات تصویروں کے حوالے سے تو غلط ہو سکتی ہے مگر ناموں کی صورت میں ہمیشہ صحیح ہو گی۔

سقراط: کیوں اس فرق کی کیا وجہ ہے؟ کیا میں کسی شخص یا عورت کے سامنے کوئی تصویر لے جا کر اور انھیں دکھا کر یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ آپ کی تصویر ہے؟

کریٹائیلس: ایسا ممکن ہے۔

سقراط: اور اگر میں ان کے سامنے جا کر یہ کہوں کہ جناب یہ ہے آپ کا نام، کیونکہ نام اور تصویر دونوں ہی افراد کی نقل ہی ہوتے ہیں۔ گویا میں جا کر کہہ دوں کہ حضرت یہ ہے آپ کا نام اور اس طرح ان کی حسِ سماعت ان کے وجود کی نقل کا احساس دلائے یا کسی کے بارے میں کہا جائے کہ یہ آدمی ہے یا عورت (جیسی بھی صورت ہو) تو کیا یہ سب کچھ قطعی ممکن نہیں ہے؟

کریٹائیلس: میرے پاس آپ سے متفق ہونے کے سوا کوئی چارہ کار نہیں۔ سو میں یہی کہوں گا کہ سرِ تسلیم خم ہے!

سقراط: اگر میں صحیح کہہ رہا ہوں تو یہ بڑی اچھی بات ہے کیونکہ موجودہ نہج پر عدم اختلاف کی ضرورت بھی نہیں مگر میں اشیا کو نام دوں تو اگر میں صحیح نسبت سے نام دوں گا تو اسے درست کہا جائے گا اور اگر میں غلط نسبت سے نام دوں گا تو یہ غلطی ہو گی۔ سو اگر اسما کے ضمن میں غلط نسبت ہو سکتی ہے تو افعال کے حوالے سے بھی ایسا ممکن ہے اور اسما اور افعال دونوں کی صورت میں جملے کی نسبت میں بھی غلطی کا امکان موجود ہو گا کیونکہ افعال و اسما ہی تو جملوں کی بنیاد ہیں۔ آپ اس ضمن میں کیا کہتے ہیں عزیزم کریمائیلس؟

کریٹائیلس: میں متفق ہوں اور سمجھتا ہوں کہ جو کچھ آپ نے فرمایا ہے قطعی درست ہے۔

سقراط: اب اگر آپ قدیم زبان کے اسما کو تصویر کی صورت میں ظاہر کرنا چاہیں تو جہاں یہ ممکن ہے کہ آپ مطلوبہ شے کی شکل و صورت اور رنگوں کو پوری جامعیت سے ظاہر کر رہے ہیں وہاں یہ بھی ممکن ہے کہ ان میں کمی رہ جائے یا ضرورت سے زیادہ ظاہر ہو جائیں۔ کیا ایسا ہو نہیں سکتا؟

کریٹائیلس: یقیناً ایسا ممکن ہے۔

سقراط: جو شخص تصویر کو تمام توضیحات اور رنگ دے تو گویا اس نے مکمل تصویر پیش کی مگر جس نے کم یا زیادہ عناصر ظاہر کر دیے تو بھی اس کی تصویر کہلائے گی تو تصویر ہی اگر چہ اسے نامکمل یا کم اچھی تصویر کہا جا سکتا ہے۔

کریٹائیلس: آپ درست فرماتے ہیں۔

سقراط: سو جو کوئی حروف یا صوتی اکائیوں کے ذریعے اشیا کی حقیقت کا اظہار کرے اور اگر اس نے تمام مطلوبہ تفاصیل حسب ضرورت پیش کر دیں تو گویا انتہائی مکمل تاثر (متعلقہ اشیا کا) پیش کر دیا یعنی بالفاظ دیگر اس نے صحیح نام دے دیا اور اگر وہ مطلوبہ تاثر میں کچھ کمی بیشی کر دے تو بھی تاثر تو رہے گا اگر چہ ادھورا ہی ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ حقیقی صورت حال میں بعض نام انتہائی موزوں ہوتے ہیں اور بعض سخت ناموزوں، کم از کم میں تو اس دلیل سے یہی نتیجہ نکالتا ہوں۔

کریٹائیلس: آپ کا یہ خیال بھی درست ہی معلوم ہوتا ہے۔

سقراط: گویا ناموں کے فن کار پر بھی اچھے یا برے ہونے کی دونوں صورت کے صادق آنے کا امکان ہے؟

کریٹائیلس: جی ہاں!

سقراط: اور ناموں کے اسی فنکار کو ہم قانون ساز کہتے ہیں؟

کریٹائیلس: جی ہاں! بالکل درست!

سقراط: سو اگر ہمارا سابقہ مفروضہ درست ہے تو ناموں کے فنکار یعنی قانون ساز (Legislator) کا بھی دیگر فنکاروں کی طرح اچھا یا برا ہونا ممکن ہو سکتا ہے۔

کریٹائیلس: بالکل درست سقراط! مگر زبان کے معاملے میں صورت حال مختلف ہے کیونکہ جب ہم مختلف اشیا یا کیفیتوں کے ناموں کے ضمن میں حسب ضرورت الف اور ب وغیرہ استعمال کرتے ہیں تو بعد میں اگر ان میں سے کچھ حروف ہٹا لیں یا کچھ حروف زائد کر دیں تو نہ صرف یہ کہ نام درست نہیں ہوگا

بلکہ جو کچھ لکھا ہوا ظاہر ہوگا اسے سرے سے نام ہی نہیں کہا جا سکے گا کیونکہ جو کچھ اس عمل کے بعد حاصل ہوگا وہ ان ناموں کی بجائے کچھ اور ہوگا۔

سقراط: مگر کریٹائیلس میرے خیال میں آپ کا نقطۂ نظر بالکل درست نہیں ہے۔

کریٹائیلس: وہ کیسے جناب؟

سقراط: مجھے یقین ہے کہ آپ جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ صرف نمبروں کے حوالے سے درست ہو سکتا ہے کیوں کہ اگر اصل وجود کی ایک ایک تفصیل کا مظہر ہو تو وہ عکس کیوں کہلائے گا؟، وہ تو اصل ٹھہرے گا! فرض کیجیے ہمارے سامنے دو وجود ہیں جن میں سے ایک کریٹائیلس ہے اور دوسرا اس کی نقل، عکس یا تصویر۔ ہم مزید فرض کرتے ہیں کہ کسی (دیوتا) نے پہلے ایک مصور کے ابتدائی کام کی طرح ایک شبیہ ایک خاکہ بنایا اور اس میں رنگ بھرے اور تصویر مکمل کر دی اس کے بعد اس نے بالکل ویسے ہی خاکے میں بالکل ویسے رنگ بھرنے کے بعد نہ صرف اس کو زندگی کا رنگ عطا کیا بلکہ اسے حرکت کی قوت دے کر اس میں روح پھونک کر جیتا جاگتا انسان بنا دیا۔ اب آپ بتائیے کہ وہ دونوں تخلیقات (یعنی جیتا جاگتا کریٹائیلس اور اس کا عکس) ایک ہی شے کی دو صورتیں اور ایک ہی وجود کے دو رنگ ہیں یا دونوں الگ الگ وجود مانے جائیں گے؟

کریٹائیلس: میرا خیال ہے کہ وہ دونوں الگ الگ وجود ہیں۔

سقراط: اس کا مطلب ہے کہ ہمیں سایے یا عکس کے وجود کی حقیقت دریافت کرنے کے لیے کوئی اور اصول وضع کرنا پڑے گا۔ اسی اصول کا اطلاق ناموں پر بھی ہوگا اور اسی پر یقین کیے جائیں گے کہ کسی عکس میں اگر کچھ ردوبدل یا جمع تفریق کر دی جائے تو وہ (اصل کا ہو بہو) عکس نہیں رہتا۔ کیا آپ یہ محسوس نہیں کرتے کہ تخیلات (Images) چاہے جس قدر مکمل ہوں وہ اصل اشیا کی بے شمار خاصیتوں سے عاری رہتے ہیں؟

کریٹائیلس: ہاں، یہ فرق تو میں پہچان سکتا ہوں۔

سقراط: یعنی نام چاہے موسوم شے کی حقیقت سے جتنے بھی منطبق کیوں نہ ہوں ان کا اصل شے پر اثر ناقابل فہم ہوگا کیونکہ اس طرح صرف اشیا کا دہرا وجود ذہن میں آئے گا بلکہ شاید یہ ابہام بھی باقی رہے کہ ان میں سے کون سی اصل ہے اور کون سی نقل؟

کریٹائیلس: یہ تو ہے!

سقراط: تب پھر گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ ہمت کیجیے، اور اعتراف کر لیجیے کہ دو نام ایسے ہو سکتے ہیں کہ ان میں سے ایک (شے کی حقیقت کی مطابقت سے) زیادہ موزوں مگر دوسرا کم موزوں ہو، اور اس پر اصرار کیجیے کہ نام سو فی صد شے کی ماہیت کے مطابق ہی ہوگا۔ بلکہ اس امکان کی گنجایش سے اتفاق کیجیے کہ بعض اوقات نام میں اور بالخصوص اسما کے حوالے سے ایک آدھ حرف غیر ضروری یا غیر مناسب ہو سکتا ہے، اسی طرح بعض جملوں میں ایک آدھ لفظ کا زائد یا غیر مناسب ہونا بھی ممکن ہے اور اسی اعتبار سے بعض اوقات پوری توضیح میں ایک آدھ جملے کے نامناسب ہونے کے امکان کو بھی رد نہیں کیا جا سکتا اور آپ کو اعتراف کرنا چاہیے کہ نام سمیت پوری وضاحت محض اشیا کی ظاہری کیفیات کی ہی تشریح (عموماً) کر پاتی ہے اور آپ کو یاد ہوگا کہ حروف کے ناموں کی وضاحت کے دوران ہرموجینیس اور میں نے اسی امر پر کافی سیر حاصل گفتگو کی تھی۔

کریٹائیلس: ہاں۔ مجھے یاد ہے۔

سقراط: خوب! اور ایسا بھی ہوتا ہے کہ بعض اوقات ایک آدھ مناسب ترین حرف کی غیر موجودگی (کمی) کے باوجود نام اس شے کی شناخت کے لیے کافی ثابت ہوتا ہے (حالانکہ بظاہر نام ناقص محسوس ہو گا) البتہ نام کے زیادہ حروف کے غلط اور کم کے صحیح ہونے کی صورت میں یہ مقصد حاصل نہ ہو پائے گا۔ میرا خیال ہے کہ ہم اس حقیقت کو تسلیم کر لیں کہیں ہمارا حال بھی ایجینا کے مسافروں جیسا نہ ہو جو نصف شب تک گلی میں بھٹکتے رہے اور اور پھر خود حقیقت کے انکشاف پر ہی یہ بات ان کی سمجھ میں آئی کہ انھیں تاخیر ہو گئی تھی ایسا نہیں تو آپ ناموں کی تصحیح کے لیے کوئی اور نظریہ وضع کیجیے۔ مگر ایسی صورت میں آپ کو (اپنی ہی پیش کردہ) یہ تعریف ترک کرنا پڑے گی کہ نام تو حروف یا صوتی اکائیوں سے ترتیب پاتے ہیں، کیونکہ اگر آپ نے حروف اور صوتی اکائیوں، دونوں کا ذکر کیا تو گویا آپ خود اپنی ہی بات کی نفی کر رہے ہوں گے۔

کریٹائیلس: جناب سقراط! مجھے اعتراف ہے کہ آپ جو کچھ کہہ رہے ہیں اس میں بڑی معقولیت ہے۔

سقراط: ایسی صورت میں، جیسا کہ ہم دونوں متفق ہیں، کیا ہمیں خود سے یہ سوال نہیں پوچھنا چاہیے کہ نام جو انتہائی موزوں صورت میں (کسی شے کو) دیا گیا ہے، مناسب ترین حروف ہی ہونے چاہئیں؟

کریٹائیلس: بالکل درست!

سقراط: اور موزوں حروف وہی ہوں گے جو (موسوم) اشیا ہی کی مانند ہوں گے؟

کریٹائیلس: جی ہاں!

سقراط: یعنی مناسب ناموں سے متعلق تو بات طے ہو گئی۔ البتہ ناموزوں ناموں سے متعلق یہ سمجھ لینا چاہیے کہ ان کے حروف کی اکثریت درست اور شے کی مطابقت میں ہو گی۔ (ورنہ وہ نام ہی کیوں ٹھہرتے) البتہ کم تعداد حروف کی صورت پہ ایسی ہو سکتی ہے جن کی شے سے مناسبت مشکوک ہو یا غلط قرار دی جا سکے، اس سے تو آپ متفق ہی ہوں گے؟

کریٹائیلس: میرا خیال ہے سقراط، کہ میری آپ سے کج بحثی فضول ہے کیونکہ میں اس کیفیت کو پتا نہیں کیوں، ہضم نہیں کر پاتا کہ غلط طور پر دیئے گئے نام سرے سے نام ہی نہیں (میں انھیں نام ہی نہیں سمجھ سکتا)۔ ہاں، اس سے تو مجھے اتفاق ہے۔

سقراط: مگر اس بات سے آپ کہاں تک اتفاق کریں گے کہ بعض نام قدیم اور بنیادی ہوتے ہیں جبکہ بعض دوسرے اسماء مشتق اور ماخوذ ہوتے ہیں۔

کریٹائیلس: ہاں میں یہاں تک اتفاق کرتا ہوں۔

سقراط: اگر آپ اس سے اتفاق کر لیں کہ قدیم اور ابتدائی نام اشیا کی نمایندگی کرتے ہیں تو پھر یہ طے کرنا ضروری ہے کہ ناموں کی اشیا کے ساتھ زیادہ سے زیادہ مماثلت پیدا کرنے سے بہتر نمایندگی کی ضرورت نہیں۔ یا پھر آپ کو ہرموجینس اور دوسروں سے متفق ہونا پڑے گا اور ان ناموں میں خود لوگوں کی پسند کا دخل بھی ہوتا ہے ورنہ زیادہ تر ان کا انحصار رواج پر ہے۔ یا کیا آپ ہمارے ہاں مروج جدید نظریے کو اوّلیت دیتے ہیں یا اس کے برعکس کوئی اور نظریہ قائم کرنے کے موڈ میں ہیں جس کے مطابق آپ معمولی کو عظیم اور عظیم کو معمولی قرار دے سکیں۔ کیونکہ اگر آپ مطمئن ہیں تو لوگوں (ہرموجینس اور دوسروں) کو اس پر کوئی اعتراض نہ ہو گا۔ آپ ان دونوں نقطہ ہائے نظر میں سے کس کو اوّلیت دیں گے۔

کریٹائیلس: سقراط محترم، میری نظر میں مشابہت کے ذریعے نمایندگی کا اصول محض اتفاقیہ نمایندگی کے مقابلے میں کہیں زیادہ درست اور قابل بھروسا ہے۔

سقراط: بہت خوب! مگر یہ تو سوچیے کہ اگر نام کو موسومہ شے جیسا ہونا چاہیے تو تھوڑی مماثلت اشیا کے ساتھ ان حروف کی بھی ہو جن سے ناموں کے الفاظ ترتیب پاتے ہیں۔ اب آیئے اشیا کی تصویروں یا عکس کی طرف۔ اس حوالے سے میں آپ سے یہ پوچھنا چاہوں گا کہ اگر فطرت میں اصل شے

کے خدوخال کی جامع تشکیل دینے کے لیے تصویر میں رنگ بھرنے کو کوئی مناسب شے ہی دستیاب نہ ہو تو تصویر کی جامعیت کی ضمانت کیسے دی جاسکتی ہے۔

کریٹائیلس: ایسی صورت میں تو کسی طرح کی ضمانت ممکن نہیں۔

سقراط: یہی صورت حال ناموں کے ساتھ بھی ہے یعنی جب تک شے کو نام دینے والے حروف میں شے کی ساخت سے متماثل خواص کما حقہ موجود نہ ہوں تب تک وہ نام شے کی مکمل ترین نمائندگی کیونکر کر پائے گا کیونکہ حروف ہی سے تو نام کی تشکیل ہوگی۔

کریٹائیلس: سوفی صد درست!

سقراط: اب مجھے ہرموجینس اور اپنے متفقہ ان نظریات کے اظہار کی اجازت دیجیے جو ہم نے آوازوں کی مماثلت کے حوالے سے قائم کیے ہیں۔ کیا آپ اس تصور سے اتفاق کریں گے کہ حرف سریع الحرکتی اور سختی کا مظہر ہے؟ کیا ہمارا یہ بیان درست ہے یا نہیں؟

کریٹائیلس: میرا خیال ہے کہ آپ کا بیان درست ہے۔

☆☆☆☆

کریٹائیلس: اس میں تو شک نہیں۔

سقراط: مگر کیا حروف P اور O بالکل ایک جیسے ہیں؟ اور کیا P کی جگہ لینے کے لیے دونوں کی اہمیت یکساں ہے۔ یا یہ کہ O کی اہمیت ہم میں سے صرف ایک کی نظر میں زیادہ ہے؟

کریٹائیلس: نہیں۔ میرا خیال ہے ہم دونوں کے لیے برابر اہم ہے۔

سقراط: کیا یہ اہمیت مشابہت کے حوالے سے ہوگی یا عدم مشابہت کے حوالے سے؟

کریٹائیلس: مشابہت کے حوالے سے۔

سقراط: کیا یہ بالکل ہی (تمام زاویوں سے) مشابہ ہیں؟

کریٹائیلس: ہاں، کم از کم جہاں تک حرکت کی کیفیت کا تعلق ہے، ایسا ہی ہے۔

سقراط: اور الفاظ میں کے اضافے سے متعلق آپ کے کیا اثرات ہیں؟ کیونکہ یہ حرف سختی کی نہیں نرمی کی علامت ہے۔

کریٹائیلس: کیوں؟ میرے خیال سے، جناب سقراط، کہ حرف کا اضافہ درست نہیں بلکہ جیسا کہ آپ ہرموجینس کے ساتھ گفتگو کے دوران کبھی کبھار حسب توقع حروف کی کمی بیشی کے حوالے سے کہہ

چکے ہیں، اس کی جگہ P آنا چاہیے۔

سقراط: خوب! مگر یہ لفظ آپ کے اور میرے، دونوں کے لیے قابلِ فہم ہے کیونکہ آپ کو معلوم ہی ہے؛ جب میں لفظ "hard" (سخت) کا حوالہ دیتا ہوں تو اس سے میری کیا مراد ہے۔

کریٹائیلس: جی ہاں میرے دوست اور مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ اس لفظ کی وضاحت بھی معمول کی بات ہے۔

سقراط: اور یہ معمول بلکہ متفقہ رائے کی حیثیت رکھتا ہے مثلاً، میں کوئی قابلِ فہم آواز نکالوں اور آپ بھی سمجھ رہے ہوں کہ میں اس آواز سے کیا مفہوم ظاہر کرنا چاہتا ہوں تو اس کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے؟ کیا آپ بھی یہی کہنا چاہتے ہیں؟

کریٹائیلس: بالکل یہی بات!

سقراط: اور اگر صورتِ حال یہ ہو کہ میں جب کہوں کہ آپ میری بات کا مفہوم سمجھتے ہیں، تو اس میں میری طرف سے آپ کے لیے کوئی اشارہ مضمر ہو؟

کریٹائیلس: ایسی صورت میں بھی میرا ردِ عمل وہی رہے گا۔

سقراط: یہ اشارہ مشابہت اور عدم مشابہت دونوں صورتوں میں قابلِ اطلاق ہوگا اور اگر یہ سچ ہے تو آپ نے گویا اپنے لیے ایک ضابطہ مقرر کیا ہے (جو مروّجہ کی طرح اہمیت رکھتا ہے) اور ظاہر ہے کہ اگر آپ اس تصور پر کاربند رہیں گے تو اس سے متفق ہونے کے پابند ہیں کہ الفاظ اور صحت کا تعلق بھی رواج سے ہے کیونکہ رواج ہی کے مطابق اگر مستعمل ہیں تو مشابہت پیدا کرنے والے اور عدم مشابہت کا باعث، دونوں حروف لفظ کی شکل کی تشکیل میں اپنا کردار ادا کرتے ہیں اور اگر آپ رواج اور روایت کو مختلف صورتِ حال قرار دیں تب بھی آپ کو کہنا پڑے گا کہ الفاظ کی اہمیت کی بنیاد رواج پر ہے نہ کہ (حروف اور شے) مشابہت پر کیونکہ رواج میں تو مشابہت رکھنے یا نہ رکھنے والے امتزاجات برابر برابر چل جاتے ہیں۔ اور عزیزم کریٹائیلس جیسا کہ ہم یہاں تک متفق ہو گئے ہیں (کیونکہ آپ کی خاموشی کو میں اتفاقِ رائے سے تعبیر کرتا ہوں)، تب یہ ماننا پڑے گا کہ رواج اور روایت دونوں ہمارے خیالات کو متاثر کرتے ہیں، اس ضمن میں ہم اعداد کی مثال لیتے ہیں۔ اس ضمن میں آپ کہہ سکتے ہیں میرے دوست، کہ آپ کو ہر عدد سے متعلق مشابہ لفظ (نام) مل جائے گا، جب تک کہ آپ روایت اور ناموں کی تصحیح کے ضمن میں اس کی جواز کو تسلیم نہ کر لیں؟ یہاں تک تو میں آپ سے متفق ہی ہوں کہ الفاظ (اسما) کو حتی الامکان اشیا سے مشابہ ہونا

چاہیے مگر مجھے ڈر ہے کہ ہرموجینس کے بقول مشابہت کی شرط کو زبردستی گھسیٹ لانے سے معاملہ اور گڑبڑ ہوگا کیونکہ اس طرح بھی حروف کی تصحیح کے ضمن میں روایت کی مصنوعی اور میکانیاتی مدد کی ضرورت پڑتی ہے کیونکہ مجھے یقین ہے کہ اگر ہم (الفاظ اور اشیا) کی مشابہت کے اصول کو اکثر استعمال کریں تو یہ زبان کی صحت میں زبردست حد تک ممد ثابت ہوتا ہے اور اس کے برعکس صورت میں جامعیت بھی نہ ہونے کی حد تک رہ جاتی ہے مگر میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ ناموں میں کون سی قوت پوشیدہ ہے اور اس کا فائدہ کیا ہے؟

کریٹائیلس: میں سمجھتا ہوں سقراط، کہ نام ایک طرح کی اطلاع ہیں یعنی جب کوئی شخص کسی شے کا نام جانتا ہے تو گویا وہ اس شے کے بارے میں جانتا ہے جس کا وہ نام ہے۔

سقراط: میرا خیال ہے کہ آپ کا اس سے یہ مطلب ہے جیسے نام ہے ویسے ہی اس سے موسوم شے ہے اور جو شخص نام سے واقف ہوگا وہ گویا شے سے بھی واقف ہوگا کیونکہ دونوں چیزیں ملتی جلتی ہیں اور اسی لیے دونوں ایک ہی سائنس (علم) یا آرٹ (فن) میں آتی ہیں اور اسی بنیاد پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ جو ناموں کو سمجھتا ہے وہ اشیا کو بھی اچھی طرح سمجھتا ہے۔

کریٹائیلس: بالکل یہی میں بھی کہنا چاہتا ہوں۔

سقراط: ہمیں اس امر کو بھی ملحوظ رکھنا چاہیے کہ نام اشیا سے متعلق ہمیں کونسی اور کہاں تک معلومات بہم پہنچا سکتے ہیں؟ کیا یہ معلومات سب سے زیادہ جامع اور مکمل ہو سکتی ہیں؟ یا کچھ ایسی اطلاعات و معلومات بھی ہیں جو اشیا سے متعلق درکار ہوتی ہیں؟ آپ کی کیا رائے ہے؟

کریٹائیلس: میں تو یہ کہوں گا کہ جتنی معلومات نام سے حاصل ہو سکتی ہیں، اتنی کسی اور ذریعے سے ممکن نہیں۔

سقراط: کیا آپ کا اس سے یہ مطب ہے کہ جو شخص کسی شے کا نام دریافت کرتا ہے وہ گویا شے کی حقیقت کو دریافت کر لیتا ہے۔ یا یہ فقط تعلیم دینے کا ذریعہ ہے اور حقائق کی دریافت اور تحقیق کے لیے ذرائع بھی درکار ہوتے ہیں۔

کریٹائیلس: مجھے یقین ہے کہ تعلیم دینے اور تحقیق و تدقیق کے لیے ایک طریقہ مستعمل ہوتا ہے۔

سقراط: اگر آپ یہ کیوں نہیں سمجھتے کہ جو تحقیق و تدقیق کے لیے فقط ناموں ہی کا سہارا لیتا ہے وہ اکثر حقائق تک پہنچنے سے پہلے بھٹک جاتا ہے۔

کریٹائیلس: وہ کیسے جناب!

سقراط: اس وجہ سے کہ اشیا کو جس کسی نے بھی اوّل اوّل نام دیے اس نے اپنی فہم کی حدود میں مقید رہ کر (اپنی طرف سے اشیا کے خصائص کے مطابق) نام رکھے۔ ایسا ہے کہ نہیں؟

کریٹائیلس: یہ تو ہے!

سقراط: اور اگر اس شخص کے نام رکھنے کے ضمن میں، تصور میں کوئی خامی رہ گئی ہوگی تو خود اندازہ لگائیے کہ ہم جو محض اس کی اتباع کر رہے ہیں، ہماری حیثیت کیا ہوگی؟ کیا ہمارے دھوکا کھا جانے کا امکان نہیں ہے؟

کریٹائیلس: وہ تو ٹھیک ہے جناب سقراط مگر میرے خیال میں وہ شخص اشیا سے متعلق کچھ زیادہ نہیں جانتا ہو گا اور یوں اس نے نام کے طور پر جو الفاظ استعمال کیے ہوں گے میں کم از کم انھیں نام قرار نہیں دے سکتا اور یوں تو آپ بھی یہی رائے رکھتے ہیں کہ نام رکھنے والے لوگ حقائق سے نابلد نہیں ہو سکتے اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ نام رکھنے کا سلسلہ جاری رہتا رہا ہے۔ کیا آپ نے دورانِ گفتگو بھی محسوس نہیں کیا کہ آپ جو کچھ زبان پر لاتے ہیں ان میں ایک مخصوص مقصدیت ہوتی ہے؟

سقراط: مگر عزیزم کریٹائیلس، یہ تو کوئی جواب نہیں! کیونکہ جو شخص اپنے کام کا آغاز ہی غلطی سے کرے تو وہ آیندہ بھی بنیادی غلطی سے بے نیاز نہیں رہ سکتا۔ یہ تو بڑی ریاضیاتی حقیقت ہے، جس طرح جیومیٹری کے کسی تصور میں بنیادی غلطی، جیسے جیسے پراسیس آگے بڑھتا ہے، بڑی ہوتی جاتی ہے۔ اس لیے یہ قریب امکان ہے کہ ہر شخص کو اپنی ہر سوچ اور توجہ کی بنیاد متعلقہ تصور کے بنیادی اصولوں پر رکھنی پڑے گی چاہے وہ درست ہیں یا نہیں۔ پھر جب وہ اصولوں کی چھان پھٹک کر لیتا ہے تو آگے بڑھتا ہے مگر یوں کہ آیندہ تحقیق اپنی بنیادوں پر آگے بڑھتی ہے۔ سو ایسے میں جب ہم ناموں کو مربوط پائیں تو حیرت ہوتی ہے۔ یہاں میں اپنی گزشتہ بحث کا حوالہ ضرور دوں گا۔ جہاں ہم اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ ہر شے کو حرکت، بڑھوتری اور دباؤ کا سامنا ہے اور یہ کہ ایسی حرکت بھی ناموں سے ظاہر کی جا سکتی ہے اور وہی اظہار دراصل ان اشیا کا نام ٹھہرتا ہے کیوں ہے ناں، یہی بات؟

کریٹائیلس: ہاں یقیناً موزوں نام ہی میں اشیا کا حقیقی مفہوم پوشیدہ ہوتا ہے۔ ☆☆☆☆

سقراط: چنانچہ گزشتہ مثالوں کے الفاظ سے ظاہر ہے کہ ان کو جب ہم اسی اصول (کمی بیشی) کے مطابق ترتیب دے لیں گے تو ان کے بدترین معنی بہترین معانی میں بدل جائیں گے اور اگر محقق تھوڑی

سی زحمت کرے تو یقیناً سے بہت سے دوسرے ایسے الفاظ مل جائیں گے جن سے حرکت کا نہیں بلکہ سکون کا مفہوم برآمد ہوتا ہے جو کہ ظاہر ہے حرکت کا الٹ ہے۔

کریٹائیلس: بالکل درست جناب سقراط، مگر یہ بھی دیکھیے کہ بہت سے اعداد سے حرکت کا تاثر ملتا ہے۔

سقراط: کیا مطلب؟ کیا ہم دونوں کی حیثیت سے نمبروں کو لیں، یعنی اس طرح کہ اگر کسی نام کے بارے میں اکثریت کی رائے صحت کی جانب ہو تو اسے صحیح قرار دے دیا جائے اور اگر کسی کے بارے میں اکثریت کہے کہ یہ غلط یا غیر موزوں ہے تو ہم بھی یہی کہیں کہ وہ موزوں نام نہیں ہے؟

کریٹائیلس: نہیں یہ توضیح معقول نہیں۔

سقراط: یقیناً یہ توضیح درست نہیں ہے۔ مگر فی الحال اس سوال کو یہیں چھوڑ کر ہمیں ایک اور سوال کی طرف متوجہ ہونا ہوگا اور مجھے امید ہے کہ آپ اس ضمن میں میرے ہم خیال ہی ہوں گے۔ کیا ہم پہلے ہی سے اس امر کا اعتراف نہیں کر چکے ہیں کہ جن لوگوں نے اوّل اوّل اشیا کے نام رکھے انھیں قانون ساز کہا جائے گا اور ان کا نام قانون سازی کا فن؟ اور یہ کہ یہ یونانی اور غیر یونانی (Hellenes and Barbarous) دونوں ریاستوں کے لیے درست ہے؟

کریٹائیلس: آپ کا کہنا بجا ہے!

سقراط: ایسی صورت میں آپ مجھے بتائیں گے کہ وہ اوّلین لوگ جنھوں نے اشیا کو نام دیے، کیا وہ ان اشیا اور ان کی حقیقت و ماہیت سے آگاہ تھے جن کے کہ انھوں نے نام تجویز کیے؟

کریٹائیلس: یہ ضروری ہے کہ وہ ان اشیا سے بخوبی واقف ہوں گے۔

سقراط: کیوں نہیں! ہمیں یقین ہے کہ وہ لوگ جاہل نہ رہے ہوں گے۔

کریٹائیلس: میں بھی یہی کہوں گا کہ ان لوگوں کے جاہل ہونے کا کوئی جواز نہیں۔

سقراط: ہمیں اسی نقطے کی طرف لوٹنا چاہیے جہاں سے ہم نے گریز کیا تھا۔ اگر آپ کو یاد ہو تو آپ یہ کہہ رہے تھے کہ جن لوگوں نے اوّل اوّل اشیا اور کوائف کو نام دیے وہ یقیناً ان اشیا اور کوائف کی ماہیت سے آگاہ رہے ہوں گے۔ کیا اب بھی آپ کی رائے وہی ہے؟

کریٹائیلس: جی ہاں۔ میں اپنی رائے پر قائم ہوں۔

سقراط: اور آپ گویا یہ کہہ رہے ہیں کہ نام دینے والے اشیا کی ماہیت اور ساخت وغیرہ کا علم بھی رکھتے تھے؟

کریٹائیلس: اس میں کیا شک ہے!

سقراط: لیکن اس عہد میں، جب ابھی اشیا کو نام دیے ہی گئے تھے لوگ ان اشیا کو کیسے پہچانتے ہوں گے؟ کیونکہ ہماری گفتگو سے اس تصور کو تقویت ملتی ہے کہ لوگ اشیا کے ناموں کے بارے میں یا تو اپنی تحقیق و جستجو کے ذریعے جان پاتے تھے یا دوسروں سے سیکھ کر۔

کریٹائیلس: میرا خیال ہے سقراط کہ آپ کی بات میں اچھا خاصا وزن ہے!

سقراط: اور اگر ہم اپنے اس نظریے پر قائم رہیں کہ ناموں کے ذریعے اشیا کے بارے میں حصول معلومات ممکن ہے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ نام دینے والے اوّلین لوگ اشیا کے بارے میں کیسے جان سکتے تھے جبکہ اس وقت اشیا کے نام موجود ہی تھے (کہ نام تو خود انھوں نے رکھے تھے۔)

کریٹائیلس: اس معاملے میں، میرے خیال کے مطابق اہم ترین حقیقت تو یہ ہے کہ ابتدائی نام بعض ماورائے انسان ہستیوں نے دیئے ہوں گے۔ یہی وجہ ہے کہ ان ناموں کی صحت پر کلام کرنے کا ہمیں حوصلہ نہیں ہوتا۔

سقراط: ایسی حالت میں نام دینے والا اگر الوہی علم رکھتا تھا یا وہ کوئی دیوتا تھا تو پھر اس نے خود اپنے دیئے ہوئے ناموں سے اختلاف کیوں کیا؟ کیونکہ ابھی ابھی ہم یہ کہہ چکے ہیں کہ نام دینے والے یا والوں نے بعض ناموں کو ایسا بنایا کہ ان سے سکون کی کیفیت جھلکتی ہے اور بعض الفاظ کی تحریک کی کیفیت عیاں ہوتی ہے کیا اس سلسلے میں ہم کسی غلطی کے مرتکب تو نہیں ہو گئے؟

کریٹائیلس: مگر میں اب بھی اس بات پر قائم ہوں کہ مذکورہ بالا دونوں اقسام میں سے ایک قسم کے نام کہلانے کی مستحق نہیں۔

سقراط: تب پھر یہ طے کرنا باقی رہ جائے گا کہ حقیقی قانون ساز نے کیا وہ نام رکھے ہوں گے جن سے سکون اور حرکت سے عاری ہونے کو ظاہر کرتی ہے یا وہ جو حرکت کے مظہر ہیں؟ یہ وہ نقطہ ہے جو میرے پہلے بیان کے مطابق محض ان کی تعداد بنانے سے واضح نہیں ہو سکتا۔

کریٹائیلس: ہاں سقراط، اس طریقے سے تو واقعی بات واضح نہیں ہوتی!

سقراط: مگر یہ تو ناموں کی جنگ ہے۔ بعض ہیں کہ ان سے شدت کے ساتھ اظہار ہوتا ہے کہ وہ حقیقت یا اس کے قریب سے اور بعض دیگر نام اس کے برعکس کیفیت کے مظہر معلوم ہوتے ہیں۔ سو ہم ان کے مابین درست یا غلط کے حوالے سے فیصلہ کیونکر کریں؟ کیونکہ ایسے معتدل نام موجود نہیں جن

کے ذریعے یہ مسئلہ حل ہو یا پھر کوئی اور معیار ہونا چاہیے جس کے ذریعے ناموں کو ملحوظ رکھے بغیر مذکورہ بالا کیفیتوں کو صحیح یا غلط قرار دیا جا سکے اور یہی معیار درحقیقت اشیا کی حقیقت ہم پر آشکار کر سکتا ہے۔

کریٹائیلس: میں آپ سے متفق ہوں۔

سقراط: اور اگر اس پر یقین کرنے کا جواز ہے تو مجھے کہنے دیجیے کہ اشیا ناموں کے بغیر بھی جانی اور پہچانی جا سکتی ہیں۔

کریٹائیلس: ظاہر ہے۔

سقراط: مگر اس طرح اشیا کے جانے پہچانے جانے کا اور کون سا امکان ہے۔ یعنی ناموں کے بغیر اشیا کو جاننے اور پہچاننے کی بنیاد کس عنصر یا عامل پر رکھی جائے؟ کیا اس کے لیے فطری طریقہ شناخت اپنایا جائے یعنی ہر شے کی محدودیت اور دیگر اشیا سے ان کے اشتراکِ خصائص کو بنیاد بنایا جائے؟ اس طرح مختلف اشیا کی شناخت خصائص میں اختلاف کی بنیاد پر بھی ہو سکتی ہے کیونکہ یہ اختلاف گویا ان کی اپنی اپنی انفرادیت کی علامت ہوتا ہے۔

کریٹائیلس: میرے خیال میں آپ جو کچھ کہہ رہے ہیں، درست ہے۔

سقراط: خوب! یاد رکھیے ہم نے قبل ازیں متعدد بار طے کیا تھا کہ موزوں ترین ناموں کی اشیا کے ساتھ زبردست مشابہت پائی جاتی ہے گویا یہ اشیا کے عکس ہوتے ہیں۔ ایسا ہی ہے ناں؟

کریٹائیلس: جی ہاں۔

سقراط: آیئے فرض کریں کہ ناموں کے ذریعے ہمیں اشیا سے جزوی واقفیت حاصل ہوتی ہے اور ان کے بارے میں معتدبہ حصہ معلومات ہمیں خود اشیا کے مشاہدے سے حاصل ہوتا ہے اور یہ درحقیقت حصول معلومات کا معقول اور واضح ترین ذریعہ ہے بلکہ اشیا اور ان کے عکس کی حقیقت بذریعہ عکس سے واقفیت کی بنیاد بھی اس امر پر ہے کہ عکس کس قدر جامعیت کا حامل ہے اور یہ کہ عکس اور شے میں مماثلت کا معیار کیا ہے۔

کریٹائیلس: میں بھی یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہوں کہ جامع تر معلومات کے حصول کے لیے اشیا کا ذاتی مطالعہ بہرحال ضروری ہے۔

سقراط: اگرچہ آپ کے اور میرے دائرہ دسترس سے باہر بے شمار اشیا ایسی ہیں جن کے بارے میں حقائق

حال کی جستجو اور تحقیق کی ضرورت ہے تاہم یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اشیا کی حقیقت و ماہیت محض ناموں کے علم کے ذریعے ہی مکمل طور پر ممکن نہیں بلکہ اصل اشیا کا مشاہدہ اور مطالعہ بھی لابدی اور لازمی ہے۔

کریٹائیلس: یقیناً جناب سقراط!

سقراط: ایک اور نکتہ بھی قابلِ غور ہے۔ ہمیں یہ فرض نہیں کر لینا چاہیے کہ ہمارے آس پاس ناموں کا جتنا بڑا ذخیرہ موجود ہے ان کا مطالعہ ہمیں ایک ہی سمت میں رہنمائی مہیا کرے گا کیونکہ میں اس حقیقت سے انکار کی جسارت نہیں کر سکتا کہ اوّلین نام رکھنے والوں کا یہ تصور کہ ہر نام حرکت اور دباؤ پر مبنی ہے، اگرچہ مخلصانہ کوشش تھی مگر سو فی صد حقیقت پر مبنی نہ تھی اور اس میں غلطی کا عنصر موجود تھا۔ وہ خود غلطی کے باعث غلط تصورات کے جس گرداب میں پھنس گئے تھے، چاہتے ہیں کہ ہم بھی ان کی پیروی میں اسی گرداب میں جا پھنسیں۔ اس سے متعلق اُستاد کریٹائیلس، ایک اور مسئلہ بھی ہے جس کے مطابق میں اکثر عجیب و غریب تصورات اور خوابوں میں کھو جاتا ہوں اور اب میں اس سے متعلق آپ کی رائے معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ کیا آپ بتا سکیں گے کہ (کائنات میں کہیں کسی) خیرِ مطلق یا حسنِ مطلق یا ایسی کسی کائناتی حقیقت کا وجود ہے بھی یا نہیں؟

کریٹائیلس: میرا ذاتی خیال ہے، جناب سقراط، کہ ایسی کوئی حقیقت مطلقہ یقیناً وجود رکھتی ہے۔

سقراط: تب پھر آیئے حسنِ مطلق کے وجود کی جستجو کریں! اس ضمن میں ہم چہروں کے حسن یا ظاہری حسن کے ایسے دیگر مظاہر کو اہمیت نہیں دیں گے کیونکہ ایسی تمام اشیا کسی نہ کسی قسم کے دباؤ کے زیرِ اثر ہوتی ہیں (اور وقت کے ساتھ ان کی کیفیت تبدیلی سے دوچار ہونے پر مجبور ہے) ہمارا سوال یہ ہونا چاہیے کہ آیا حقیقی حسن، حسنِ لازوال یا ازلی و ابدی حسن نہیں ہوگا؟

کریٹائیلس: یقیناً یہ سوال ہماری تحقیق کی بنیاد ہے۔

سقراط: یہ سوال بھی اہم ہے کہ جو شے تبدیلی سے مملو ہے حقیقی اور ازلی کیسے ہو سکتی ہے؟ کیونکہ اگر کوئی شے جیسی ہے، گزرتے وقت کے ساتھ بھی ویسی ہی رہتی ہے تو گویا وہ تبدیلی سے ہمکنار نہیں ہو رہی اور ظاہر ہے کہ ان کی کیفیت اور ہیئت میں تبدیلی نہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ ابدیت کی طرف مائل ہیں اور کسی نوع کی حرکت یا تبدیلی ان پر اثر انداز نہیں ہوتی۔

کریٹائیلس: یقیناً۔ ایسے میں انھیں تبدیلی سے بے نیاز ہی سمجھا جائے گا۔

سقراط: اس مرحلے تک بھی اشیا لوگوں کے لیے انجانی ہی رہیں گی (ایک لحاظ سے) کیونکہ جب کوئی مشاہدہ کار مطلوبہ اشیا کے قریب جاتا ہے تو وہ مختلف ثابت ہوتی ہیں اور قریب جائیں تو زیادہ متفرق لگیں گی یہاں تک کہ ان کی ہیئت اور ساخت کے بارے میں معلومات کے ضمن میں اس سے مزید آگے جانا ممکن نہ رہے کیونکہ ایسی اشیا جن کی کوئی کیفیت ہی نہ ہو۔اس کے بارے میں معلومات کا حصول کیسے ممکن ہے؟

کریٹائیلس: آپ درست فرماتے ہیں۔

سقراط: ہم معقول دلیل کے ساتھ یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ علم ہر کیفیت اور صورت میں وجود رکھتا ہے کیونکہ علم کے وجود کے لیے یہ شرط لازم ہے کہ وہ مسلسل اور قیام پذیر ہو اور ظاہر ہے کہ جب ہر شے عارضی صورت میں ہو تو قیام پذیر تو کچھ بھی نہ ہوگا۔یعنی اس صورت حال سے یہ تاثر ملتا ہے کہ جب تک اشیا تغیر پذیر ہیں، علم تغیر پذیر ہے اور علم کو ہم تغیر پذیری کی صورت میں علم قرار دینے سے اجتناب کرتے ہیں۔لہٰذا اس سے تو ایسا لگتا ہے کہ کائنات میں نہ کہیں علم کا وجود ہے اور نہ ہی ایسی کوئی شے وجود رکھتی ہے جس کے جاننے کے بارے میں کوئی دعویٰ کر سکے۔لیکن اگر جاننے والے افراد اور جانی جانے والی اشیا کا وجود ہمیشہ سے رہا ہے تو فطری بات ہے کہ ایسی اشیا کا اوپر بیان کیے گئے دباؤ کے حوالے سے بتائی جانے والی اشیا سے کوئی تطابق ناممکن ہوگا۔آیا اشیا میں ابدیت کا پہلو موجود ہے یا ہراکلیٹس اس کے پیروکاروں اور دیگر حکما کا قول (کہ ہر شے فانی ہے) درست ہے؟ یہ وہ سوال ہے جس کا جواب آسانی سے مہیا نہیں کیا جاسکتا کیونکہ اس طرح کوئی بھی ذی شعور شخص خود کو اور اپنی ذہنی تہذیب و تعلیم کو ناموں کی تفصیل میں الجھانا پسند نہیں کرے گا اور نہ ہی کوئی شخص اس صورت حال میں ناموں پر، جبکہ ایسے علم پر بھروسا کرنا مناسب نہ ہوگا جو نہ صرف خود اپنی نفی کرتا ہے بلکہ باقی اشیا کے وجود کو بھی عدم حقیقت کے ناخوشگوار نام سے یاد کرتا ہے، انحصار کیسے کر سکے گا۔کوئی کیسے یقین کر سکتا ہے کہ ہر شے اس ٹوٹے برتن کی طرح ہو جس میں سے پانی رستا رہتا ہے یا کائنات ایک ایسے فرد کی طرح ہو جس کی ناک ہر وقت بہتی رہتی ہے؟ یہ بات ایسی ہے کہ اس کے صحیح اور غلط ہونے کا امکان برابر ہے اس لیے آپ کو اس پر قائل کرنا آسان نہیں چونکہ آپ نوجوان ہیں اور سیکھنے کی عمر میں ہیں، لہٰذا آپ کے لیے یہ اور بھی ضروری ہے کہ آپ کسی ایسے فلسفے کو آنکھیں بند کر کے تسلیم نہ کرلیں جس کی آپ ٹھوس بنیادوں پر قائل نہیں ہو جاتے اور اگر

(اس دوران) آپ کو حقیقت کا ادراک ہو جائے تو مہربانی کر کے مجھے آ کر ضرور آگاہ کیجیے گا۔

کریٹائیلس: میں آپ کی ہدایت پر ضرور عمل کروں گا۔ اگرچہ میں پہلے ہی اس موضوع پر کافی غور کر چکا ہوں اور سچ تو یہ ہے کہ اس تمام غور و فکر نے مجھے ہراکلیٹس کی پیروی پر مائل کر دیا ہے۔

سقراط: کوئی بات نہیں، میرے دوست، کسی اور دن جب آپ ملک کے دورے/سفر سے، جس کا آپ نے ارادہ ظاہر کیا ہے، واپس آ جائیں تو مجھے اپنے خیالات سے استفادے کا موقع ضرور دیجیے گا۔ میرا خیال ہے کہ ہر موجنیس صحیح معنوں میں آپ کو راہ پر لگا دے گا۔

کریٹائیلس: بہت خوب، جناب سقراط! میری خواہش ہے کہ (جب تک میں سفر پر ہوں) آپ خود بھی اس مسئلے پر اپنے طور پر غور و فکر جاری رکھیں۔

فیڈرس

(Phaedrus)

شرکائے گفتگو:

سقراط (Socrates) **اور فیڈرس** (Phaedrus)

منظر: دریائے **الیسس** (Ilissus) کے کنارے **ایک چنار کے درخت** (Plane-tree) کے نیچے بیٹھے ہوئے۔

سقراط: عزیزم فیڈرس، آپ کب آئے اور اب کدھر کا ارادہ ہے؟

فیڈرس: میں سی فیلس (Cephalus) کے بیٹے لائسیاس (Lysias) کے ہاں سے آ رہا ہوں اور شہر پناہ کے باہر سیر کرنے جاؤں گا کیونکہ وہاں ہم نے پوری صبح گزار دی ہے اور وہیں میرے دوست اکیومینس (Acumenus) نے مجھے بتایا کہ کسی کمرے میں گھس کر بیٹھے رہنے کی بجائے کھلی ہوا میں سیر کرنا انسان کو تازہ دم بنا دیتا ہے۔

سقراط: وہ ٹھیک کہتا ہے۔ آہا تو کیا لائسیاس ہمارے قصبے میں آیا ہوا ہے؟

فیڈرس: ہاں، وہ گزشتہ شب اپی کریٹس (Epicrates) کے ہمراہ موریکس (Morychus) کے ہاں ٹھہرا تھا۔ آپ کو تو معلوم ہی ہے اس کا (موریکس) کا گھر اولمپین زیوس (Olympian Zeus) کی عبادت گاہ کے قریب ہی ہے۔

سقراط: اور اس نے آپ کی آؤ بھگت کیسے کی؟ مجھے یقین ہے کہ اس نے بھرپور بحث و مباحثے سے آپ کی خاطر مدارت کی ہوگی۔

فیڈرس: اگر آپ سننا چاہتے ہیں تو میرے ساتھ چلیے، میں آپ کو بتاؤں گا کہ ہمارے مابین کیا گفتگو ہوئی؟

سقراط: میں آپ کی دوسروں سے بحث کو کیسے نظر انداز کر سکتا ہوں جو پنڈر (Pindar) کے بقول "ہر

کاروبارِ حیات سے زیادہ اہم" ہو سکتی ہے۔

فیڈرس: تو کیا آپ چل رہے ہیں؟

سقراط: تو کیا آپ گفتگو جاری رکھنا پسند کریں گے؟

فیڈرس: سقراط، میری کہانی بھی آپ کے لیے دلچسپ ہوگی کیونکہ ہمارا کام تھا محبت! محبت، جو آج کل فیشن بن چکی ہے۔ لائسیاس دراصل نوجوانوں کا لکھاری ہے اور یہی وہ طبقہ ہے جو محبت سے سب سے زیادہ متاثر ہوتا ہے اور لطف کی بات یہ کہ یہ طبقہ محبت سے تو متاثر ہوتا ہے لیکن چاہنے والے سے نہیں اور اس نے بجا طور پر ثابت کیا ہے کہ محبت کرنے والوں کے مقابلے میں محبت سے بچنے اور پرہیز کرنے والے لوگ زیادہ قابل قدر ہوتے ہیں۔

سقراط: ارے یہی تو اس کی معقولیت ہے۔ بلکہ میں تو سمجھتا ہوں کہ اسے اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہنا چاہیے تھا کہ جوانوں کے مقابلے میں معمر لوگ اور امرا کے مقابلے میں مفلس لوگ زیادہ قابل بھروسہ ہو سکتے ہیں۔ اگر وہ یہ کہتا تو نہ صرف میری بلکہ میرے جیسے بہت سے دوسروں کی حمایت بھی اسے حاصل ہوتی اور وہ معاشرے کا محسن سمجھا جاتا اور جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے میں اس کی تقریر سننے کے لیے اتنا کر سکتا ہوں کہ میگارا (Megara) تک آپ کے ساتھ چلوں۔ البتہ میں چاہوں گا کہ وہاں سے آپ اندر داخل ہوئے بغیر واپس لوٹ آئیں (جیسا کہ ہیروڈیکس (Herodicus) سفارش کرتا ہے) ایسی صورت میں، میں آپ کا ساتھ دے سکتا ہوں۔

فیڈرس: آپ کا مطلب کیا ہے؟ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ میرے جیسے عام آدمی کی معمولی یادداشت اس قابل ہے کہ وہ لائسیاس جیسے ماہر علم الکلام کی تمام باتوں کو کما حقہ دہرانے میں مددگار ثابت ہو سکتی ہے۔ جنھیں مرتب کرنے میں انھوں نے عمریں بتا دیں؟ پھر بھی میں کوشش کروں گا کہ جہاں تک ممکن ہے لائسیاس کی باتوں کو تفصیل سے آپ کے سامنے بیان کر دوں!

سقراط: مجھے یقین ہے کہ میں فیڈرس کو اتنا ہی جانتا ہوں جتنا میں خود کو جانتا ہوں اور میں اپنی چشمِ تصور سے وہ منظر بھی دیکھ سکتا ہوں جب فیڈرس کے اصرار پر لائسیاس کو بار بار اپنی تقریر دہرانا پڑی ہوگی کیونکہ فیڈرس نے بعض حصوں کو بار بار سننا پسند کیا ہوگا اور لائسیاس نے بھی اسے خوش کرنے کے لیے اس کی فرمائش پوری کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا ہوگا اور ظاہر ہے جب اور کوئی صورت ممکن نہ رہی ہوگی تو اس نے کتاب ہاتھ میں لی ہوگی اور پسندیدہ حصوں کو پڑھنا شروع کر دیا!

ہوگا اور اپنی پوری صبح اس کارروائی میں صرف کرنے کے بعد تھک کر وہ اُٹھا ہوگا تو اس نے سیر پر کمر باندھ لی اور مجھے یہ بھی یقین ہے کہ اب تک اسے اس تقریر کا (بشرطیکہ وہ ضرورت سے زیادہ طویل نہ رہی ہو) ایک ایک لفظ زبانی یاد ہوگا اور اب سیر کے بہانے وہ اپنا سبق دہرانے کے لیے شہر پناہ کے ساتھ ساتھ کئی چکر لگائے گا۔ ایسے میں وہ ایک ایسے شخص کو دیکھتا ہے جو اسی کی طرح بحث و تمحیص کا شیدائی ہے۔ سو اسے دیکھتے ہی فیڈرس کی باچھیں کھل گئی ہوں گی کہ چلو ایک ہم ذوق شخص تو ملا۔" اب مجھے اپنے سبق کی دہرائی میں کسی کا ساتھ بھی میسر ہوگا۔ سو وہ اس شخص کو سیر اور یوں بحث میں شرکت کی دعوت دیتا ہے اور اس پر مستزاد یہ کہ وہ شخص خود ہی (جو بحث کا پجاری ہے) اس سے متعلقہ تقریر کو دہرانے کی درخواست کر بیٹھتا ہے لو جناب اب فیڈرس خوشی سے پھول جاتے ہیں اور فرماتے ہیں۔ میں ایسا نہیں کر سکتا! گویا اس کے اصل ارادے کا کسی کو علم نہ ہوگا حالانکہ ایسے میں اگر سُننے والا ہی سُننے سے انکار کر دے تو فیڈرس اسے سُننے پر مجبور کرنے لگیں گے اور وہ چاہے سُننا چاہے یا نہیں، اس کا چھٹکارا مشکل ہوگا آخر میں ہوگا یہ کہ فیڈرس خود ہی اپنی گفتگو کا آغاز اس اُمید پر کر دے گا کہ مخاطب ہر صورت میں اس کی باتیں توجہ سے سُنے!

فیڈرس: مجھے معلوم ہے کہ میں جب تک کسی نہ کسی طرح اس تقریر کو دہرا نہ دوں آپ میری جان چھوڑنے والے نہیں۔ سو میں نے خود تہیہ کر لیا ہے کہ جیسے بھی ہو میں پوری روداد آپ کو سُنا ڈالوں۔

سقراط: ارے۔ یہ کی ہے، آپ نے، پتے کی بات!

فیڈرس: میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ میں آپ کی فرمائش پوری کروں گا۔ البتہ میں یہ بتائے دیتا ہوں کہ مجھے لائسیاس کی باتیں لفظ بہ لفظ یاد نہیں ہیں۔ سو میں اپنے سادہ لفظوں میں اس کی گفتگو کا خلاصہ بیان کیے دیتا ہوں، خصوصاً اس موضوع پر کہ محبت کرنے اور نہ کرنے والے کیونکر ایک دوسرے سے متفرق ہو سکتے ہیں؟ لیجیے میں شروع سے بیان کرتا ہوں۔

سقراط: بہت اچھا، جانِ من! مگر پہلے مجھے وہ شے دکھایئے جو آپ کے بائیں ہاتھ میں ہے اور جسے آپ اپنے چوغے کے نیچے چھپانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ مجھے شک ہے کہ یہ پلندا لائسیاس کی تقریر کے نوٹس پر ہی مشتمل ہوگا۔ اب مجھے سو فی صد آپ کی یادداشت پر بھروسا کرنے کی ضرورت نہیں۔ ارے آپ تو اس تحریر کی صورت میں گویا خود لائسیاس ہی کو ساتھ لے آئے ہیں۔

فیڈرس: یہ تو اس لیے ہے کہ مجھے توقع نہیں کہ اپنی قوت بیان اور فن گفتگو کا رعب آپ پر ڈالنے میں کامیاب

ہوسکوں گا! تاہم اگر مجھے بہر صورت یہ تحریر آپ کے سامنے پڑھنا ہی ہے تو ہم بیٹھیں کہاں؟

سقراط: آیئے مڑکر الیسس کے کنارے چلیں۔ آگے کسی پُرسکون گوشے میں بیٹھ جائیں گے۔

فیڈرس: خوش قسمتی سے میں نے اس وقت اپنے سینڈل نہیں پہن رکھے اور آپ تو ویسے بھی برہنہ پائی ہی کو پسند کرتے ہیں۔ سو آیئے چشمے کے کنارے بیٹھ کر اپنے پاؤں پانی میں لٹکا کر انھیں ٹھنڈک پہنچائیں۔ میرے خیال میں یہی آسان ترین طریقہ ہے کہ اس طرح ہم موسم گرما کی دوپہر کی شدت میں بھی کمی کر سکیں گے۔

سقراط: آگے چلیے اور بیٹھنے کے لیے کوئی مناسب سی جگہ منتخب کیجیے!

فیڈرس: وہ دور، آپ کو بلند ترین چنار کا درخت دکھائی دے رہا ہے؟

سقراط: ہاں!

فیڈرس: وہاں چھاؤں بھی ہے اور خنک ہوا کے جھونکے بھی اور وہاں نرم سبز گھاس پر نہ صرف بیٹھ سکیں گے بلکہ اگر چاہیں تو لیٹ بھی سکتے ہیں۔

سقراط: تو آئیں چلیں!

فیڈرس: جناب سقراط: میں جاننا چاہتا ہوں کہ کیا وہ جگہ بھی یہیں کہیں ہے جہاں سے بوریاؤس (Boreas) کی ایک روایت کے مطابق اوریتھیا (Orithyia) کو دریائے الیسس کے کنارے سے جیت کر لے گیا تھا؟

سقراط: روایت تو یہی ہے؟

فیڈرس: اور کیا وہ یہی یہ جگہ نہیں ہے، یہاں شفاف اور کرنوں کو منعکس کرتی خوش خرام ندی کے کنارے؟ مجھے ایسا لگتا ہے کہ وہ خادمائیں یہیں اٹھکیلیوں میں مصروف رہی ہوں گی۔

سقراط: میرا خیال ہے کہ یہ وہ جگہ نہیں بلکہ وہ دراصل یہاں سے کوئی چوتھائی میل نیچے کی جانب ہے جہاں سے آپ ندی پار کرکے آرٹیمس (Artemis) کی عبادت گاہ کی طرف جاتے ہیں۔ وہیں قریب ہی بوریاؤس کی قربان گاہ آج بھی موجود ہے۔

فیڈرس: ارے! وہ جگہ (قربان گاہ) میری نظر سے تو نہیں گزری! خیر! آپ مجھے یہ بتایئے کہ کیا آپ اس داستان کو حقیقت سمجھتے ہیں یا محض افسانہ؟

سقراط: جتنے بھی عاقل اور سمجھ دار لوگ ہیں ان سب کو اس داستان کی صداقت میں شبہ ہے۔ لہٰذا میں اس

میں شک کرنے والا اکیلا نہیں ہوں۔ میرے پاس اس واقعے کی ایک معقول توجیہ موجود ہے اور وہ یہ ہے کہ اوریتھیا اس جگہ پر اپنی سہیلی فارمیکیا (Pharmacia) کے ساتھ کھیل میں مگن تھی کہ اچانک تیز ہوا کا ایک جھکڑ آیا اور اس نے اوریتھیا کو چٹانوں کے اوپر سے نیچے کھائی میں پھینک دیا اور یار لوگوں نے یہ ہوائی اُڑا دی کہ اسے بوریا اُٹھا لے گیا۔ جگہ کے بارے میں بھی زبردست اختلاف پایا جاتا ہے بعض لوگوں کے خیال کے مطابق یہ واقعہ اس جگہ پر نہیں بلکہ اریوپیگس (Areopagus) کے مقام پر پیش آیا تھا۔ البتہ اس تمثیل کے مصنف کی مہارت اور ذہانت کی داد دینا پڑتی ہے کیونکہ کوئی ایسی داستان گھڑنا جس پر لوگوں کو اتنی آسانی سے یقین آ جائے، بڑی مہارت اور تجربے کا متقاضی ہوتا ہے اور جب کوئی ایک مرتبہ کوئی داستان گھڑتا ہے تو پھر اسے سچ ثابت کرنے کے لیے بھی ایڑی چوٹی کا زور لگا دیتا ہے۔ بلکہ انھیں مزید طلسماتی اور دہشت ناک بنانے کے لیے خیالی گھوڑے دوڑاتا رہتا ہے۔ اس کی داستانوں میں جابجا گورکان اور اُڑن گھوڑے لمحوں میں ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچ جاتے ہیں اور ایسے ہی عقل کو حیران کرنے والے دوسرے واقعات کی تفاصیل نظر سے گزرتی رہتی ہیں۔ ہاں کبھی کبھی جب وہ خود ان کی افادیت سے مشکوک ہو جائے تو ان کی شدت میں کمی کر کے ان کو امکان کے دائرے میں لانے کی اپنی سی کوشش کرتا ہے مگر اس دور از کار فلسفے میں بھی اسے حقیقت تک آنے میں عرصہ لگ جاتا ہے۔ اب اتنا وقت کوئی کہاں سے لائے کہ ان داستانوں میں سے سچ کو کھوج نکالے۔ بھلا کیوں؟ اس لیے کہ ڈیلفی کے باشندے (Delphian) کے قول کے مطابق وہ معاملات جن سے میری ذات کا کوئی تعلق نہیں ان کے بارے میں متجسس ہونا انتہائی احمقانہ بات ہے۔ اس سے تو کہیں بہتر ہے کہ انسان خود اپنی ذات کا کھوج لگائے تاکہ خود آگاہ ہو سکے۔ سو میں ان تمام بکھیڑوں سے جان چھڑاتے ہوئے عوام کی رائے کے سامنے سر جھکا دیتا ہوں کیونکہ جیسا میں نے ابھی کہا، میری اصل دلچسپی ان خرافات کی بجائے اپنی ذات کے ادراک میں ہے کیونکہ میں ایک انسان ہوں جو بذاتِ خود ایک عظیم الشان اور پیچیدہ تخلیق ہے اور انسان ہی ہونے کے باعث میں جذبات کے ہاتھوں میں کھلونا ہوں اور اس ضمن میں ٹائیفو کے نام سے موسوم اژدھا سے بھی بڑھ کر ہوں اگر دیگر معاملاتِ علم و دانش میں میری یعنی انسان کی کیفیت زیادہ نرم خوئی کی جانب مائل ہے مگر حتمی طور پر انسان کے لیے اعلیٰ مقام کا مژدہ موجود ہے۔ اوہ! میرے دوست۔ ہم اس چنار کے

درخت کی جگہ پر پہنچ نہیں گئے جہاں آپ مجھے لے جانا چاہتے تھے؟

فیڈرس ہاں! یہی وہ درخت ہے؟

سقراط ہائرے (Here) کی قسم، یہ ایک آرام دہ جگہ ہے جہاں موسم گرما کی گھنی چھاؤں اور نمی ہے
پاکیزگی و خوشبو کا احساس موجود ہے۔ کیا منظر ہے۔ یہ گھنے اور بلند و بالا چنار کے درخت کے علاوہ
بلند و بالا ایگنس کاسٹس (Agnus Castus) کے جھنڈ کے جھنڈ جو پھولوں سے لدے ہیں اور ان
کی خوشبو سے فضا مہک رہی ہے اور نیچے بہتی ندی کس قدر ٹھنڈی ہے کہ پاؤں کو راحت محسوس ہو
رہی ہے۔ واہ! اس مقام کے حسن کی دیگر کیفیات ہی سے اندازہ ہو رہا ہے کہ یہ اکیلاؤس
(Achelous) اور جل پریوں کے لیے بھی پسندیدہ ترین جگہ رہی ہوگی۔ ٹھنڈی ٹھنڈی تازہ ہوا کس
قدر دلفریب ہے۔ علاوہ ازیں یہاں، دیکھو تو سہی، اور موسم گرما کے پرندوں کی مخصوص چہچہاہٹ
اور سر سبز و شاداب پتوں کی سرسراہٹ جو کسی قدر جھینگروں کی سائیں سائیں سے مشابہ ہے اور ان
سب سے بڑھ کر یہ نرم گھاس۔ ذرا لیٹ کر دیکھو! لگتا ہے سر کسی نرم و گداز تکیے پر رکھ دیا ہے۔ یار
فیڈرس، آپ واقعی ایک قابل تعریف گائیڈ ہیں۔

فیڈرس: سقراط! آپ بھی کبھی کبھی تو بالکل ناقابل فہم ہو جاتے ہیں۔ بھلا ذرا باہر دیہات میں آ جائیں تو
بالکل اجنبیوں کی طرح آپ کو گائیڈ کی ضرورت پڑ جاتی ہے۔ آپ کبھی سامنے سرحد سے آگے بھی
گئے ہیں۔ ایسا معرکہ آپ نے کب کیا ہوگا۔ مجھے تو لگتا ہے کہ آپ شہر کے دروازوں سے باہر بھی
گئے ہی نہیں۔

سقراط: آپ کا اندازہ بالکل درست ہے میرے دوست! اور اگر آپ وجہ سُنیں گے تو مطمئن ہو جائیں گے
اور مجھے معاف کر دیں گے۔ وجہ یہ ہے کہ میں ایک طالب علم ہوں اور شہر کے عقل مند لوگ میرے
اُستاد ہیں۔ دیہاتوں کے درخت اور پودے، مجھے کیا بتا سکتے ہیں؟ ہاں البتہ یہ بات درست ہے
کہ اب آپ نے مجھے جادوئی انداز میں شہر سے باہر دیہات کی جانب ملتفت اور متوجہ کر دیا ہے۔
تمھاری جادو بیانی کے باعث میری حالت اس سادہ لوح گائے کی سی ہو رہی ہے کہ جس کے
سامنے سبز گھاس کا گٹھا یا تازہ پھلوں کا گچھا لہراتے ہوئے اسے جہاں مرضی لے جائیں۔ میرے
سامنے کوئی خوبصورت سی کتاب لہراتے ہوئے مجھے اٹیکا (Attica) تو کیا پوری دنیا میں گھماتے
پھریے، مجھے عار نہ ہوگی۔ اب یہاں پہنچ کر میں تو لیٹے بنا نہیں رہ سکتا۔ آپ البتہ جس طرح آرام

محسوس کریں (لیٹ کر، بیٹھ کر یا پہلو کے بل) بس اب پڑھنا شروع کر دیجیے!

ٹیڈرس: بیٹے! آپ تو جانتے ہی ہیں کہ میرا ان معاملات کے بارے میں کیا رویہ ہے؟ مجھے اس کا بھی خیال رکھنا ہے کہ میرے اور آپ کے، دونوں کے لیے کیسے مفید ہو اور مجھے یہ یقین ہے کہ میں اپنے مقصد میں کامیاب رہوں گا۔ اس لیے کہ میں آپ کا چاہنے والا نہیں ہوں۔ یہ کمزوری چاہنے والوں میں ہوتی ہے کہ محبت سے دستبردار ہو کر پشیمان ہوتے ہیں۔ نہ چاہنے والا چونکہ اظہار جذبات میں سچا اور آزاد ہوتا ہے اور اس پر محبت کی کوئی بندش نہیں ہوتی اس لیے اس کی رائے بھی بے لوث اور بے لاگ ہوتی ہے اور اسی کے نتیجے میں وہ خالصتاً صلاحیتوں کی بنیاد پر مفادات کے حصول کی کوشش کرتے ہیں اور یہی طریقہ ان کے ذاتی مفادات کے لیے سازگار بھی ہوتا ہے۔

محبت کرنے والوں کے ساتھ ایک مشکل یہ بھی ہوتی ہے کہ وہ اپنے مفادات کو دوسروں (محبوب) کی خواہش پر قربان کرنے میں آسودگی ڈھونڈتے ہیں اور یوں ان کے مفادات نظر انداز ہو جاتے ہیں اور انجام کار ان کی یہی محرومی انھیں محبوب کی بے اعتنائی کی صورت میں نظر آنے لگتی ہے حالانکہ اپنے لیے حالات انھوں نے خود منتخب کیے ہوتے ہیں۔ محبت کرنے والوں کے لیے نہ ایسا کوئی مسئلہ ہوتا ہے اور نتیجتاً نہ ہی انھیں تکلیف دہ یادوں سے سابقہ پڑتا ہے کیونکہ اس نے اپنی بہبود کو بھی کبھی پسِ پشت نہیں ڈالا ہوتا چنانچہ وہ خوشحال زندگی گزارتا ہے اور ایسے وسائل اس کی دسترس میں رہتے ہیں جن کے ذریعے وہ بآسانی اپنے محبوب کی ہمدردیاں بھی جیت سکتا ہے (گویا محبت کیے بغیر اسے محبت میسر آ جاتی ہے)۔

اور اگر آپ یہ کہیں کہ محبت کرنے والے شخص کے پاس وہ حوصلہ اور ہمت ہوتی ہے کہ محبوب سے وہ کچھ بھی کہہ ڈالے جو دوسرے کہنے کی جسارت نہیں کر سکتے۔ اس لیے اس کی محبت عظیم سمجھی جانی چاہیے۔ اس کے لیے آپ کو یہ امکان بھی ملحوظ رکھنا پڑے گا کہ اس کا جرأت مندانہ انداز ہی اس امر کی دلیل ہے کہ وہ اس کی بنا پر کسی بھی نئی محبت کے اظہار سے نہیں ہچکچائے گا اور یوں نئی محبت کے لیے پُرانی محبت کو اور پُرانے محبوب کے جذبات کو مجروح کرنے کا خطاوار ٹھہرے گا۔ ایسے میں، ایسے اہم ترین معاملے میں کوئی ایسے فرد پر کیسے بھروسا کر سکتا ہے جسے کوئی ایسا روحانی مرض لاحق ہو جس کا کوئی علاج نہ کر سکتا ہو اور کرے بھی کیونکر جب کہ مریض خود اعلان کرے کہ وہ اپنے حواس میں نہیں ہے اور یہ کہ وہ اپنی بد پرہیزیوں پر قابو پانے پر قادر آ ہی نہیں سکتا اور فرض کیجیے کہ وہ کبھی

اپنے ہوش وحواس میں آ ہی جائے تو اس کی کیا ضمانت ہے کہ عالمِ دیوانگی میں اپنے دل میں پالی ہوئی خواہشات کو وہ شناخت کر سکے گا دوسری بات یہ کہ ''زندہ ہیں کتنے لوگ، محبت کیے بغیر!'' بلکہ محبت نہ کرنے والوں کی تعداد (یعنی عام لوگوں کی) محبت کرنے والوں سے کہیں زیادہ ہوتی ہے اور اگر آپ کبھی محبت کرنے والوں میں سے بہترین کا انتخاب کرنا چاہیں تو اپ کے پاس انتخاب اور گنجایش کا وسیع دائرہ دستیاب ہوگا اور آپ اس کے اندر رہ کر بھی بہترین دوست کا انتخاب کر سکتے ہیں اور اگر آپ رائے عامہ سے خوفزدہ ہونے والے شخص ہیں اور آپ کو مذمت یا ملامت بھی پسند نہیں ہے تو بھی ہر لحاظ سے محبت کرنے والے (جو دراصل دوسروں سے رشک کرتا ہے اور سمجھتا ہے وہ اس سے رشک کر رہے ہیں) ایسے اظہار کو عادت بناتا ہے جن سے مذکورہ دونوں ناپسندیدہ عوامل سے سابقہ پڑنے کا خدشہ موجود رہتا ہے۔ اس کے برعکس محبت نہ کرنے والے کو یہ آسانی حاصل ہوتی ہے کہ وہ خود اپنی مرضی کا مالک ہوتا ہے اور اسے ٹھوس بھلائی میں دلچسپی ہوتی ہے۔ اسی لیے اسے عوامی رائے خوفزدہ نہیں کرتی۔ اس کے برعکس محبت کرنے والے کو ہر کوئی محبوب کے پیچھے پیچھے پھرتے دیکھتا ہے (کیونکہ یہی اس کی زندگی کا معمول بن چکا ہوتا ہے) اور جب کبھی وہ آپس میں ملتے ہیں تو انھیں ہی دیکھ کر لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ وہ کسی غیر اخلاقی گفتگو میں مصروف ہیں خواہ وہ چند الفاظ ہی کا تبادلہ کیوں نہ کریں۔ اس کے برعکس محبت نہ کرنے والے اشخاص کو گھنٹوں ایک دوسرے سے باتیں کرتے ہوئے دیکھیں تو بھی کوئی انگلی نہیں اُٹھاتا کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ باہمی گفتگو انسانوں کا فطری عمل ہے۔ خواہ وہ گفتگو دنیاوی معاملات میں ہو یا دوستی کے موضوع پر یا محض خوش گپیاں ہی میں کیوں نہ رہی ہوں۔

اور سُنیے! اگر آپ کو دوستی میں تلون مزاجی کا خدشہ ہو تو اس امر کو ملحوظ رکھنا ہوگا کہ محبت نہ کرنے والے لوگوں کی صحبت میں دوستی کی خرابی سے دونوں فریقوں کو برابر دکھ پہنچتا ہے مگر اس صورت میں جب ایسی خرابی کا سامنا محبت کرنے والے کسی فرد کو ہو تو صرف وہی اس کا عذاب سہتا ہے کیونکہ وہ اپنی محبت کی جھونک میں پہلے ہی اپنا سب کچھ داؤ پر لگا چکا ہوتا ہے۔ اسی لیے محبت کرنے والے کی اذیتوں کا اندازہ آسانی سے لگایا جا سکتا ہے۔ اسے ہر وقت یہی محسوس ہوتا ہے جیسے تمام لوگوں نے اس کے خلاف ایک محاذ بنا لیا ہو۔ ایسے عالم میں وہ چاہتا ہے کہ اس کا محبوب اس کے لیے پوری دنیا سے قطع تعلق کر لے۔ خصوصاً اس کی کوشش ہوتی ہے کہ پڑھے لکھے اور دولت مند لوگوں کا تو اس

کے محبوب پر سایہ بھی نہ پڑے۔ درحقیقت اسے اندر ہی اندر یہ خوف کھائے جاتا ہے کہ ایسے لوگ اپنی دولت یا علم کی بنیاد پر اس کے محبوب کو متاثر نہ کر ڈالیں اور یوں اس سے محبوب کو چھین نہ لے جائیں۔ گویا وہ اپنے محبوب کو دوسروں کی نظروں سے محفوظ رکھنے کی جھونک میں اسے ہر اس شخص کی نگاہوں سے بچائے رکھنا چاہتا ہے، جس میں خود اس سے بڑھ کر کوئی خوبی موجود ہو۔ اگر آپ فرض کیجیے کسی کے محبوب ہوں تو اس کی خواہش کے مطابق بے یار و مددگار رہنے پر مجبور ہوں گے اور اگر اپنے جذبات کو اوّلیت دینے کے سلسلے میں آپ نے اپنے چاہنے والے جذبات کو نظر انداز کیا تو سمجھو آپ میں اور اس میں کھٹ پھٹ ہونا لازمی امر ہوگا۔ مگر اس کے برعکس وہ جن کا شمار محبت کا ڈھنڈورا پیٹنے والوں میں ہوتا ہے ان کے ہاں چاہت کا دارومدار بھی معیار و اہلیت ہی پر ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ لوگ اپنی اہلیت کے اعتماد کی بنیاد پر ہر طرح کے حسد سے محفوظ اور مبرا رہتے ہیں اور اپنے محبوب کے دوستوں کو بھی محبوب رکھتے ہیں بلکہ اپنے محبوب کو نظر انداز کرنے والے لوگوں سے متنفر ہو جاتے ہیں ان کے خیال میں محبوب میں دلچسپی لینے والے لوگ اس کی توقیر میں اضافے، جب کہ اس سے کشیدہ رہنے والے گویا اس کی توہین کا سبب بنتے ہیں اور ان کے نزدیک جتنے زیادہ لوگ محبوب کی قربت کے خواہاں ہوں گے۔ محبوب کے رویے اور شخصیت میں اسی قدر محبت میں اضافہ ہوگا۔ محبت کے حامیوں کی ایک اور خامی یہ ہے کہ جب وہ اپنے جواں سال محبوب سے محبت کا دم بھرتے ہیں تو گویا اس کے ذاتی کردار اور اس کے متعلقین اور متعلقات سے جان بوجھ کر بے بہرہ رہنا پسند کرتے ہیں تا کہ جب ان کا شدید جذبہ (محبت) کمزور پڑنے لگے تو وہ دوسروں کے علم میں آنے سے قبل ہی کنارہ کش بھی ہو سکیں جب کہ محبت کا ڈھنڈورا نہ پیٹنے والوں کی چاہت ایسی کسی کمزوری سے پاک ہونے کی وجہ سے بے باک ہوتی ہے اور ان کی دوستی ہمیشہ پائیدار ہوتی ہے اور دنیاوی معاملات ان کی دوستی میں رخنہ ڈالنے سے قاصر رہتے ہیں۔ علاوہ ازیں ان کی دوستی کی یادیں بھی ہمیشہ خوشگوار رہتی ہیں کیونکہ اس کی راہ میں کسی طرح کی بے وفائی یا سماج کے عناد کی رکاوٹ حائل نہیں ہو سکتی۔

دوسری بات یہ ہے کہ میرے جیسا شخص جو آپ سے صرف دوستی کا خواہاں ہے آپ کی صرف بھلائی چاہے گا اور آپ کی ذات کو زیادہ سے زیادہ تکمیل کے مواقع فراہم کرنے میں کوشاں رہے گا جبکہ محبت کا دعویدار آپ کو بگاڑ دے گا۔ اس لیے کہ وہ آپ کے اعمال و افعال یا اقوال کی

جاو بے جا تعریف میں مصروف رہے گا اور ایسا موقع نہیں آنے دے گا کہ آپ ناراض ہوں۔ دوسرے یہ کہ ان کے شدید جذبات ان کی قوت فیصلہ کو کمزور اور ناقص بنا دیں گے اور یہ وہ چیزیں ہیں جن سے محبت کی نمائش کرنے والا شخص محبت کرتا ہے۔ ایسا شخص مایوس لوگوں کے دکھوں میں اضافے کا سبب بنتا ہے حالانکہ ایسے لوگ خود کسی کو دکھ پہنچانے کا سوچ بھی نہیں سکتے۔ وہ کامیاب محبت کرنے والے کو بھی ایسی اشیا اور کوائف کی تعریف پر مجبور کرتا ہے جس کی تعریف وہ کرنا نہیں چاہتے۔ گویا محبوب کو نگاہ رشک سے دیکھنے کی بجائے اس پر رحم ہی کھایا جاتا ہے اور اگر آپ میری رائے کو قابلِ اعتنا قرار دیں تو اوّل تو میں آپ کے ساتھ التفات کو عارضی طمانیت تک محدود رہنے نہیں دوں گا بلکہ مستقبل کے ممکنہ مفادات کو بھی ملحوظ رکھوں گا اور اس میں بھی محبت کے جذبات کو اپنے اوپر حاوی نہیں ہونے دوں گا بلکہ کوشش کروں گا کہ خود ان پر حاوی رہوں۔ اس ضمن میں، میں چھوٹے موٹے اختلافات کی تو سرے سے پرواہ ہی نہیں کروں گا بلکہ شدید اختلافات کو بھی وجۂ عناد بنانے کی بجائے میں دو نوعیتوں میں تقسیم کر دوں گا۔ اوّل وہ جو نادانستہ طور پر وجود میں آئے ہیں اور دوم وہ جو دانستگی میں روا رکھے گئے ہیں۔ سو اوّل الذکر کو میں معاف کر دوں گا اور دانستہ جارحیت کا البتہ میں دفاع کرنے کی کوشش کروں گا یعنی ان بنیادوں کا علاج کر دوں گا جو ایسے جارحانہ اختلافات کا سبب بنتے ہیں۔ ایسے خصائص کی حامل دوستی ہی درحقیقت پائیدار دوستی ہوتی ہے کہ زمانے کے گرم و سرد جیسے دھندلانے میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔

کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ ایک عاشق ہی قابلِ بھروسا دوست ہو سکتا ہے؟ یاد رکھیے اگر اس میں ذرا بھی حقیقت ہوتی تو اولاد کی والدین سے، اپنے بہن بھائیوں اور دیگر عزیزوں سے محبت کا وجود ہوتا اور نہ ہی دنیا میں وفادار دوست پائے جاتے کیونکہ تعلقات خالص جذبات پر نہیں بلکہ دیگر حقیقت پسندانہ عوامل پر مبنی ہوتے ہیں۔ علاوہ ازیں اگر ہماری منشا اپنی حمایت ان پر نچھاور کرنا ہو جو سب سے زیادہ مناکحت کے طلب گار ہوں تو پھر اس اُصول کے تحت ہماری تمام نیکیوں کا رُخ نیکوکاروں کی طرف نہیں بلکہ ضرورت مندوں کی طرف ہونا چاہیے کیونکہ ایسے لوگوں کی حمایت تکلیفوں سے چھٹکارے کا سبب بن سکتی ہے اور انھیں شکر گزاری کا موقع دے سکتی ہے کیونکہ جب کبھی آپ خیراتی کھانا پکواتے ہیں تو آپ عزیز و اقارب کو نہیں بلکہ غربا و مساکین کو دعوت طعام دیتے ہیں جو بے چارے سدا وسائل سے محروم رہتے ہیں۔ اس لیے کہ ایسے لوگ آپ کے در پر

حاضری بھی دیں گے، آپ کی خدمت میں حاضر رہیں گے ایسا کرنے میں انھیں بے حد خوشی ہوگی اور وہ ہر دم آپ کو دعائیں دیں گے اور اس کے جواب میں آپ پر رحمتیں نازل ہوں گی۔ اس کے برعکس اگر آپ ان کی حمایت نہیں کریں گے جو جواب میں آپ کو فقط دعائیں دے سکتے ہیں بلکہ ان کی حمایت بھی کریں گے جو آپ کو مادی فائدہ پہنچا سکیں۔ آپ نہ صرف محبت کرنے والے کا مفاد دیکھیں گے بلکہ محبوب کی بھلائی بھی آپ کو مطلوب ہوگی۔ آپ کی حمایت نہ صرف ان کو حاصل رہے گی جو فقط آپ کے عہدِ شباب سے مستفید ہونے کے خواستگار ہیں بلکہ انھیں بھی دستیاب ہوگی جو اس تعلق کو زندگی بھر نبھانے کے قائل ہیں۔ اس کا دائرہ نہ صرف ان لوگوں تک وسیع ہوگا جو محبت کے اظہار تک کو مناسب نہیں سمجھتے۔ نہ صرف وہ لوگ اس ذیل میں آئیں گے جو وقتی اور لمحاتی تعلقات کو اوّلیت دیتے ہیں بلکہ وہ بھی جن کے تعلقات کا دائرہ پوری زندگی پر محیط ہوتا ہے۔ آپ انھیں بھی اہمیت دیں گے جو جذباتی صدمہ ہونے کے بعد آپ سے اُلجھنے لگتے ہیں جب ان کے شباب کا جادو کمزور پڑتا ہے تو ان کے حسنِ عمل کا جادو سر چڑھ کر بولتا ہے۔ میں نے جو کچھ عرض کیا ہے۔ اس پر توجہ دیتے ہوئے یہ نکتہ بھی ملحوظ رکھیے کہ دوست محبت کرنے والے فرد کو اس کے کردار کی خامیوں کے حوالے سے پند و نصائح کا نشانہ بناتے ہیں۔ مگر جو محبت نہیں کرتا اس کو اس کے رشتہ دار تک کسی قسم کے محاسبے کا نشانہ نہیں بناتے خواہ اسے ذاتی مفادات کے ضمن میں گمراہ کن مشاورت ہی کیوں نہ میسر رہی ہو۔

آپ شاید یہ سمجھیں کہ میں آپ کو محبت نہ کرنے والے کے ساتھ زندگی بھر منسلک رہنے کی نصیحت کروں گا۔ اس ضمن میں، میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ خود محبت کرنے والے بھی آپ کو محبت کیشوں کے ساتھ اختلاط کا مشورہ نہیں دیں گے کیونکہ مساوی حمایت کو جائز حق دار زیادہ اہمیت نہیں دے گا اور وہ جو حق دار نہیں ہے اور پابندیوں کی نفی کا کوئی جواز نہیں رکھتا، اپنی خوشی چھپا نہ پائے گا۔ حالانکہ محبت کو دونوں گروہوں کے مفاد میں ضرور ہونا چاہیے مگر کسی کے حق میں نقصان دہ ہرگز نہیں ہونا چاہیے۔

میرا خیال ہے میں نے محبت پر ضرورت سے زیادہ اظہار خیال کر دیا ہے تاہم اگر آپ کے خیال میں کسی پہلو کی توضیح نہیں ہوئی ہے تو مجھے بتایئے میں اس کی وضاحت بھی پیش کیے دیتا ہوں۔

فیڈرس: سو جنابِ سقراط، کیا خیال ہے یہ سب تقریر بطور خاص زبان کی ندرت کے حوالے سے شاندار نہیں

ہے؟

سقراط: ہاں! یہ پورا بیان قابلِ ستائش ہے۔ خاص طور پر میں تو اس کے اثر میں جیسے کھو سا گیا اور فیڈرس، سچ تو یہ ہے کہ میں آپ کو بتانے میں خوشی محسوس کر رہا ہوں کہ میں نے تمھارے پڑھنے کے انداز کو بطور خاص نوٹ کیا ہے اور مجھے ایسے لگا ہے جیسے آپ پر ایک خاص جذباتی کیفیت طاری ہے اور یہ خیال کرتے ہوئے کہ آپ اس فن (فنِ خطابت) میں مجھ سے زیادہ تجربہ کار ہیں اور اسی لیے میں نے آپ کے انداز کی پیروی کرنے کی کوشش کی ہے اور مجھ پر، میرے عزیز، آپ ہی کی طرح ایک جوش طاری ہونے لگا ہے۔

فیڈرس: آپ یقیناً خوش ہوئے ہوں گے۔

سقراط: آپ سمجھتے ہیں کہ میں پُرخلوص نہیں ہوں؟

فیڈرس: سقراط محترم! ایسے لہجے میں بات کرنے سے بہتر ہے کہ آپ مجھے اپنی رائے سے آگاہ کریں۔ میں دوستی کے دیوتا زیوس کے نام پر آپ سے استدعا کرتا ہوں کہ آپ خالص تجزیے کے ذریعے بتائیں کہ کیا کوئی یونانی (ہیلینا والا) اس سے بہتر انداز اور مؤثر تر زبان میں اس موضوع پر اس قدر جامعیت سے اظہارِ مدعا کر سکتا ہے؟

سقراط: آپ کیا چاہتے ہیں؟ کیا ہم اس جذبے کو سراہیں جو اس پورے خطاب کے پس منظر میں ہے یا اس کی زبان، جملوں کی بندش اور اندازِ اظہار کی تعریف کریں؟ جہاں تک اوّلین پہلو کا تعلق ہے میں اس کا فیصلہ آپ پر چھوڑنا پسند کروں گا۔ اس لیے کہ ایک تو میں اس صلاحیت سے کماحقہ مزین نہیں ہوں، دوسرے یہ کہ میں آپ کی پوری گفتگو کے دوران مفہوم پر غور کرنے کی بجائے حسنِ زبان میں مستغرق رہا ہوں اور مجھے شک ہے کہ خود لائسیاس بھی اس کا دفاع کر پائے گا کہ نہیں، مجھے محسوس ہوتا ہے (اگرچہ میرے خیال کی تصحیح ممکن ہو) کہ اس نے دو تین دفعہ اپنی بات کو دہرایا ہے۔ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ اس نے ذخیرۂ الفاظ کی کمی کے باعث کیا ہے یا اس نے موضوع پر مناسب تحقیق نہیں کی تھی۔ بلکہ اکثر اس کے انداز سے یہ ٹپکتا تھا کہ وہ بڑی واضح خودنمائی کے انداز میں اس مسرت کا اظہار کرنے میں کوشاں ہے کہ وہ ایک ہی بات کو کئی انداز میں کہنے پر کس قدر قدرت رکھتا ہے!

فیڈرس: یہ تو غیر معقول دلیل ہے جناب سقراط! آپ جسے دہرانا کہتے ہیں وہی تو اس کے کلام کا حسن ہے۔

دراصل وہ اپنی گفتگو کے کسی بھی حصے کو تشنۂ توضیح نہیں رہنے دینا چاہتا تھا اور میں نہیں سمجھتا کہ کوئی ایسے ٹھوس علمی موضوع پر اس سے زیادہ مدلل گفتگو کر سکتا ہے۔

سقراط: میں معذرت خواہ ہوں کہ اس نکتے پر آپ سے متفق نہیں ہو سکتا اور اگر میں محض مروت کے مارے آپ کے نقطۂ نظر سے اتفاق کا اظہار کروں گا تو ماضی قدیم کے ان سمجھ دار خواتین وحضرات کی روحیں اپنی قبروں سے اُٹھ کر آئیں گی جنھوں نے اس موضوع پر اپنی تحریریں یادگار چھوڑی ہیں۔

فیڈرس: وہ کون لوگ ہیں؟ اور آپ نے اس سے بہتر خطاب کہاں سُنا یا مواد کہاں پڑھا ہے؟

سقراط: یہ تو مجھے یقین ہے کہ میں نے سُنا ہے مگر کس سے، یہ مجھے اچھی طرح یاد نہیں۔ شاید خوبصورت سیفو (Sappho) کی زبانی یا عقل مند و سمجھ دار اینا کریون (Anacreon) سے سُنا ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ میں نے یہ سب کسی نثر نگار سے سُنا ہو۔ سنو! ایسا کیوں کہہ رہا ہوں۔ اس لیے کہ میرا سینہ اس موضوع پر مؤثر خیالات سے پر ہے اور میں لائسیاس سے کہیں بہتر الفاظ میں بالکل مختلف نقطۂ نظر پر مبنی اس سے طویل تر تقریر کر سکتا ہوں یا تحریر لکھ کر دے سکتا ہوں اور چونکہ اس ضمن میں مجھے اپنی کم مائیگی کا احساس ہے۔ لہٰذا صاف ظاہر ہے وہ سب کچھ جو میں کہنے کا دعویدار ہوں میری اپنی سوچ نہیں ہے بلکہ یہ سب کچھ میں نے اپنی سماعت ہی کے ذریعے سے یوں حاصل کیا ہے جیسے کسی خالی گھڑے کو دوسرے گھڑے کی مدد سے بھر دیا جائے البتہ اپنی حماقت یا کند ذہنی کے باعث میں اس شخص کا نام بھول گیا ہوں جس سے مجھے یہ تمام معلومات حاصل ہوئیں۔

فیڈرس: بہت خوب! میرا خیال ہے اس میں پریشان ہونے یا اسے اہمیت دینے کی ضرورت نہیں کہ ہم نے کس سے کب سُنا۔ (بلکہ یہ زیادہ اہم ہے کہ ہم نے کیا سُنا ہے!) اور میری خواہش بھی یہی ہے کہ اسے آپ ایک راز ہی رہنے دیں۔ البتہ وعدہ کریں کہ آپ اسی موضوع پر اسی قدر طویل اور مدلل ایک بالکل نئی تقریر کریں گے اور اگر آپ ایسا کر پائے تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ نو آرکونز (Archons) نہ صرف میرا بلکہ آپ کا بھی سنہری مجسمہ بنا کر جو پورے زندہ وجود کے برابر ہوگا، ڈیلفی (Delphi) کے مندر میں نصب کر دیں گے۔

سقراط: اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ میری رائے نے لائسیاس کے موضوع سے انصاف کرنے میں ناکامی کا منھ دیکھا ہے اور یہ کہ اب میں اس خلا کو پُر کر دوں گا تو آپ بھی (سنہرے گدھے) نرے احمق ہیں۔ بُرے سے بُرے مصنف سے بھی کبھی کبھی معقول باتیں ضبطِ تحریر میں آ جاتی ہیں، مثلاً آپ کے اس

موجودہ مقالے پر جو کوئی بھی لکھتا ہے اسے غیر محبت کیش کی انفرادیت کی تعریف اور محبت کیش کی انفرادیت کی مذمت ہی کرنا پڑتی۔ کیونکہ یہ تو موضوع کے وہ عام مقامات ہیں جن کا تذکرہ لازمی تھا (اور عام حالات میں اس کے علاوہ کہا بھی کیا جاسکتا ہے) ظاہر ہے ان مقامات میں سے مقرر یا مصنف کو کچھ چیزیں قبول اور کچھ رد کرنا پڑتی ہیں۔ ہاں البتہ جو ان مقامات کو نظر انداز کر کے کچھ لکھ یا کہہ سکے گا اس کی بات کو حقیقی اور بنیادی سمجھا جاسکتا ہے۔

فیڈرس: آپ کی بات میں وزن ہے، مجھے اس کا اعتراف ہے۔ میں بھی کسی قدر معقولیت کو اپناتا ہوں اور آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ نظر انداز کی گئی باتوں پر روشنی ڈالیں، مثلاً اسی کو بحث کا موضوع بنائیے کہ محبت کیش ذہنی صلاحیتوں اور حاضر جوابی کے اعتبار سے غیر محبت کیشوں کے مقابلے میں اُلجھا اُلجھا سا اور بے ترتیبی کا شکار ہوتا ہے۔ سو اگر باقی ماندہ نکات کو ملحوظ رکھتے ہوئے آپ لائسیاس کی تقریر کے برابر مگر زیادہ مدلل اور بہتر دلائل کے ساتھ تقریر کر سکیں تو میں دوبارہ کہوں گا کہ آپ کا ایک سونے میں ڈھلا مجسمہ اور اولمپیا (Olympia) میں سپسیلڈ (Cypselids) کی تھیٹریکل پیش کشوں کے قریب آپ کی جگہ لے لے گا۔

سقراط: محبت کیش کس قدر مخلص ہے کہ اسے تنگ کرنے کے لیے مجھے اس کی محبت پر انگشت نمائی کی ضرورت پڑتی ہے اور فیڈرس، آپ یہ بھی سمجھتے ہیں کہ میں اس موضوع پر لائسیاس سے بڑھ کر اظہار خیال کر سکتا ہوں؟

فیڈرس: اس ضمن میں، میں آپ کو اسی طرح پکڑتا ہوں جس طرح آپ نے مجھے پوری تقریر دہرانے کے لیے سختی سے پکڑ لیا تھا۔ میری خواہش ہے کہ آپ جو کچھ بھی کہہ سکتے ہیں، بس کہہ ڈالیے! یہ نہ ہو کہ ہم بس "tu quoque" ہی کے الفاظ کا تبادلہ کرتے رہ جائیں۔ مجھے وہ الفاظ کہنے پر مجبور نہ کیجیے جو آپ نے استعمال کیے تھے یعنی، ''سقراط (آپ نے کہا تھا فیڈرس! میں آپ کو اسی قدر جانتا ہوں جتنا میں خود کو جانتا ہوں) میں خود ہی بولنا چاہتا تھا مگر گفتگو کی فرمائش پر بس نخرا کر رہا تھا۔'' میں اس سے مختلف انداز اختیار کروں گا۔ یاد رکھیے! ہم یہاں سے ہلیں گے بھی نہیں جب تک کہ آپ تقریر کے ذریعے اپنے دل کا غبار نکال نہیں لیتے، کیونکہ یہاں ہم اکیلے ہیں اور یہ بھی آپ جانتے ہیں کہ میں آپ کے مقابلے میں جوان بھی ہوں اور طاقتور بھی۔ لہٰذا آپ شروع کیجیے اور مجھے سختی پر مجبور نہ کیجیے!

سقراط: مگر عزیز القدر فیڈرس! میرے لیے اس سے زیادہ نامعقول بات کیا ہوگی کہ میں اپنا تقابل لائسیاس سے کروں، خصوصاً فی البدیہہ تقریر کی صورت میں جبکہ وہ اس کا ماہر ہے اور میں ایک اَن پڑھ آدمی ہوں۔

فیڈرس: آپ کو تو پتا ہی ہے کہ ایسے معاملات میں کیا ہوتا ہے۔ لہٰذا ہنسیے نہیں اور مجھے وہ لفظ کہنے پر مجبور نہ کیجیے کہ جس کے آگے آپ کو ہتھیار ڈالتے ہی بنے گی۔

سقراط: پھر وہ لفظ نہ کہیں تو بہتر ہے۔

فیڈرس: ہاں۔ میں اس لفظ کو ایک قسم کے ساتھ مشروط کرتا ہوں۔ میں کہتا ہوں، بلکہ قسم کھاتا ہوں، (اگر خدا میری قسم کا شاہد ہو) اسی چنار کے درخت کی قسم کہ جب تک آپ اسی درخت کے سائے میں اپنی تقریر کرتے اور اس کے خاص حصوں کو دہراتے رہیں گے میں نہ خود کچھ کہوں گا اور نہ آپ کو اس کے علاوہ کچھ کہنے دوں گا۔

سقراط: او بدمعاش! چلو میں ہارا! ایک بے چارہ خطابت کا پرستار اس کے علاوہ اور کیا کہہ سکتا ہے؟

فیڈرس: تو پھر آپ ابھی تک مجھے کیوں بہلائے جاتے ہیں؟

سقراط: میں آپ کو بہلا ہرگز نہیں رہا۔ بلکہ اب جبکہ آپ نے قسم کھائی ہے تو خود کو اس قسم کا نشانہ بنانا پسند نہیں کروں گا۔

فیڈرس: تو پھر آغاز کیجیے۔

سقراط: آپ کو پتا ہے میں کیا کرنا چاہتا ہوں؟

فیڈرس: فرمائیے۔

سقراط: میں آپ سے اپنا چہرہ چھپا کر (آپ کو دیکھے بغیر) ممکنہ حد تک تیزی سے گفتگو کرتا جاؤں گا تا کہ مجھے (کسی غلطی کی صورت میں) شرمندگی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

فیڈرس: آپ اپنی تقریر شروع کیجیے، انداز خواہ کچھ بھی ہو!

سقراط: آ! اے میوسس (Muses) کہ آپ کا نام خوش گفتاری کے حوالے سے پہچانا جاتا ہے۔ چاہے یہ نام آپ کو آپ کی شبانہ روز ریاضت کی وجہ سے ملا ہے یا اس کے باعث کہ میلی باشندے (Melians) ہوتے ہی موسیقی پسند ہیں! میری مدد کیجیے! اس داستان کی تکمیل جو میرا دوست میری زبان سے سُننا چاہتا ہے۔ محض اس لیے کہ اس کا دوست جسے وہ ہمیشہ عاقل و دانا سمجھتا ہے اس کی

اس شہرت میں اور بھی اضافہ ہو سکے!

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ کہیں ایک خوبصورت لڑکا بلکہ زیادہ مناسب الفاظ میں ایک نوجوان رہا کرتا تھا۔ اس کے حسن کے طفیل اس کے گرد چاہنے والوں کا جمگھٹا لگا رہتا تھا۔ انھی چاہنے والوں میں ایک بہت ہی مکار آدمی بھی تھا جو اگرچہ اس نوجوان پر ظاہر تو یہی کرتا تھا کہ اسے اس سے کوئی خاص لگاؤ نہیں جبکہ فی الحقیقت وہ بھی دوسروں کی طرح اس کی محبت میں گرفتار تھا۔ ایک روز اس حسین نوجوان سے ہمکلامی کے دوران اس نے اسے قائل کرنے کی کوشش کی کہ اسے اس سے محبت کرنے والوں میں نہیں بلکہ محبت نہ کرنے والوں میں شمار کیا جائے۔ اس کے لیے اس نے کچھ اس طرح اظہار خیال کیا:

"تمام اچھے مشیر ایک ہی انداز میں اپنی مشاورت کا آغاز کرتے ہیں۔ مشیر کو کم از کم یہ تو معلوم ہونا ہی چاہیے کہ اس کے کام کی نوعیت کیا ہے؟ ورنہ وہ صفر ہو کر رہ جاتا ہے۔ تاہم عموماً لوگ دعویٰ یہی کرتے ہیں کہ ان کا علم مختلف اشیا کے بارے میں کافی ہے حالانکہ ایسا عموماً ہوتا نہیں ہے اور چونکہ وہ اپنی کم علمی سے بھی کماحقہ آگاہ نہیں ہوتا اس لیے وہ اکثر اپنی ہی بات کی نفی کرتے نظر آتے ہیں۔ چنانچہ لازم ہے کہ جس بنیادی غلطی کو آپ اور میں دوسروں میں بھی دیکھنا پسند نہیں کرتے، اس سے خود کو بھی محفوظ رکھیں لیکن چونکہ ہمارا بنیادی سوال یہ ہے کہ اوّلیت محبت کرنے والے کو حاصل ہونی چاہیے یا نہ کرنے والے کو، لہٰذا ہمیں پہلے قوتِ محبت کی مناسب تعریف پر متفق ہونا ہوگا اور پھر اسی تعریف کی روشنی میں یہ طے کیا جانا چاہیے کہ محبت انسان کے لیے مفید ہے یا مضرت رساں؟"

"ہر شخص جانتا ہے کہ محبت ایک خواہش اور ایک طلب ہے اور یہ بات بھی ہمارے تجربے میں ہے کہ کہ محبت نہ کرنے والے لوگ ہمیشہ خوبصورت اور اچھی اشیا کی طلب کرتے ہیں۔ سو دیکھنا یہ ہے کہ ایسے میں محبت کرنے والے کو نہ کرنے والے پر کس بنا پر اوّلیت حاصل ہو سکتی ہے؟ یہ امر قابل توجہ ہے کہ ہم انسانوں میں دو رہنما عوامل موجود ہوتے ہیں جو اپنی مرضی

سے ہمیں جدھر چاہتے ہیں لیے جاتے ہیں۔ ان میں سے ایک تو راحت اور خوشی کی فطری طلب ہے۔ دوسری وہ اختیاری رائے ہے جو خوب سے خوب تر کی تلاش میں ہمیں سرگرداں رکھتی ہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ یہ دونوں خواہشات کبھی کبھی ایک دوسرے کو تقویت پہنچاتی ہیں اور کبھی کبھار ان کی سمت کار ایک دوسرے کے برعکس بھی ہوتی ہے۔ ایسی صورت میں کبھی ایک خواہش حاوی ہو جاتی ہے تو کبھی دوسری! جب رائے دلیل پر مبنی ہو تو وہ ہمیں بہترین کی جانب رہنمائی کرتی ہے۔ ایسے میں اُصول فتح و کامرانی کو اعتدالِ ذات کہتے ہیں اور جب خواہش دلیل سے منحرف ہو تو ہم پر حاوی ہو کر ہمیں لطف انبساط کی ایسی کیفیت کی جانب لے جاتی ہے جس کی قوت ہمیں گمراہی پر مائل کرتی رہتی ہے۔ ایسی کیفیت کو افراط کہتے ہیں۔ اس افراط کے کئی نام ہیں، اس کے متعدد عوامل ہیں ان گنت اقسام ہیں اور ان میں سے کوئی قسم صاحب صفت کو کوئی نیک نامی نہیں دے سکتی۔ مثلاً کھانے کی طلب کو لیجیے! جب یہ دیگر خواہشات اور معقولیت کی حدود سے آگے نکل جائے تو چٹورا پن یا پیٹو پن کہلاتی ہے اور جو کوئی اس کا حامل ہو وہ چٹورا اور پیٹو کہلائے گا۔ یہی حال پینے پلانے کی عادت کا ہے۔ پینے کا عادی اس عادت کے ہاتھوں میں کھلونا بنا رہتا ہے۔ ایسے شخص کا نام تو اظہر من الشمس ہے اور ایسی ہی خواہشات میں سے کوئی بھی دوسری خواہش جو نام اختیار کرے گی، اس کی وضاحت کی بھی ضرورت نہیں مگر یہ طے ہے کہ یہ ایسی کیفیت کا نام ہوگا جو دیگر تمام کیفیات پر حاوی ہوگی۔ اس لمحے میری گفتگو میں آنے والے موڑ کا آپ کو اندازہ ہو گیا ہوگا مگر چونکہ ہر بولا گیا لفظ ان کہے لفظ کے مقابلے میں زیادہ آسانی سے قابل فہم ہوتا ہے لہٰذا مجھے مزید یہ کہنا چاہیے کہ ہر غیر منطقی طلب بھلائی کی رائے پر حاوی ہونے کی قوت رکھتی ہے اور حسنِ ظاہری سے لطف اندوز ہونے کی طرف راغب کرنے پر قادر ہوتی

ہے اس سے اور بھی کئی خواہشات جنم لیتی ہیں جن کا منبع یہی بنیادی اور
شدید ترین طلب ہوتی ہے جو دیگر قوائے ذہنی و جسمانی کو اپنی گرفت میں
لے لیتی ہے۔ خدمات کی شدت اس طلب کی قوت میں مزید اضافہ کرتی
ہے اور اسی قوتِ نفس امارہ کو جو نام حاصل ہوتا ہے وہ محبت (عشق)
ہے۔"

اور عزیزم فیڈرس اب میں اک ذرا دم لیتا ہوں اور آپ سے پوچھتا ہوں کہ کیا میں نے اس تقریر کے ذریعے کچھ تاثر قائم کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے یا نہیں؟

فیڈرس: جی ہاں، جناب سقراط! اب آپ کے الفاظ میں ایک سلاست اور روانی محسوس ہوتی ہے۔

سقراط: اس کا مطلب ہے کہ آپ کو میری گفتگو پر اپنی توجہ مرکوز رکھنی چاہیے، خصوصاً اس مقدس مقام پر تاکہ جب میں اپنی بات آگے بڑھاؤں تو میرے اندازِ اظہار پر حیرت نہ ہو کیونکہ ممکن ہے میں ایک آفاقی طیش اور جوش و غضب کی سی کیفیت میں نظر آؤں، اس لیے کہ اب میں گفتگو کے جس حصے میں داخل ہونے والا ہوں اس کی کیفیت جوشیلی اور جذباتی مناجات کی سی ہو گی۔

فیڈرس: آپ فکر نہ کریں۔ میں صورت حال کو سمجھتا ہوں۔

سقراط: اب اس کی ذمہ داری آپ پر ہے۔ لہٰذا اگلی بات سنیے! اب شاید آپ محسوس کریں کہ بات کا رخ کسی اور جانب مڑ گیا ہے۔ نتائج تو دیوتاؤں کے ہاتھ میں ہیں تاہم پوری تندہی اور استغراق کے ساتھ بات کو آگے بڑھاتا ہوں۔ آپ توجہ کیجیے۔

سو، میرے دوست، ہم نے موضوع اور مسئلے کی نوعیت تو طے کر لی ہے۔ چنانچہ اس تعریف کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہم نے یہ جائزہ لینا ہے کہ جو لوگ ان کی تحریک کو قبول کریں ان کو محبت کیش اور غیر محبت کیش سے کیا فائدہ یا نقصان پہنچنے کا احتمال ہے؟ جو شخص جذبات کے ہاتھوں میں کھلونا ہے اور مادی لذتوں کے آگے ہتھیار ڈال دیتا ہے وہ اپنے محبوب سے حتی الامکان ہر صورت میں اور ہر نوع کا تعاون چاہے گا۔ اب اگر کوئی شخص بیمار ذہن کا مالک ہے تو وہ تعاون کے دھوکے میں ہر شے کو قبول کر لے گا چاہے وہ اس کی عزتِ نفس کو کتنا ہی نقصان کیوں نہ پہنچائے۔ گویا وہ گھٹیا اور کمتر اشیا کو قبول کر لے گا اور بہتر اور قیمتی عوامل سے متنفر ہو گا یوں وہ خود کو اپنے محبوب کے سامنے آخری سطح تک گرا لے گا۔ یہ تو طے ہی ہے کہ جاہل عالم کے مقابلے میں ہر لحاظ سے کمتر ہوتا ہے۔

اسی طرح بزدل بہادر سے، قوتِ اظہار سے عاری مقرر سے اور کند ذہن، فطین سے کمتر ہوتا ہے۔
یہی اور ایسے بہت سے نقائص محبوب سے منسلک سمجھے جاتے ہیں۔ یہ وہ نقائص ہیں کہ فطرتاً محبوب کی شخصیت میں ہوں تو محبت کیش کے لیے باعثِ طمانیت بنتے ہیں اور فرض کیجیے یہ نقائص محبوب میں نہ ہوں تو محبت کیش کی کوشش رہتی ہے کہ وہ فرضی طور پر ہی سہی انھیں محبوب سے منسوب کر دے تاکہ عارضی طور پر ہی سہی اپنی برتری کے احساس کو قائم رکھ سکے۔ لہٰذا وہ فطری طور پر حاسد طبع ہوتا ہے اور اپنے محبوب کو خاص طور پر سوسائٹی سے الگ رکھنے کی جھونک میں ان مفادات سے محروم رکھنے میں کوشاں رہتا ہے جو اسے لوگوں سے مل جل کر حاصل ہو سکتے ہیں یوں محبوب اس دانش سے محروم ہو جاتا ہے جس کا حصول سوسائٹی ہی کے ذریعے ممکن ہوتا ہے ایسی اور دیگر کئی صورتوں میں وہ دانستہ یا نادانستہ اپنے محبوب کو نقصان ہی پہنچاتا ہے۔ فی الحقیقت محض اتنے سے خوف کے باعث کہ وہ (اپنی فطری خامیوں کے طفیل) محبوب کی نظروں سے نہ گر جائے اسے صاحب نظر ہی نہیں دیکھنا چاہتا بلکہ اسے بصیرت سے محروم رکھنے کی کوشش میں لگا رہتا ہے اور سچ کہیے! وہ اپنے محبوب کو اس سے بڑھ کر کیا نقصان پہنچائے گا؟ گویا اس کی حتی الامکان کوشش ہوگی کہ اس کا محبوب حقائق حیات سے مکمل طور پر بے بہرہ رہے حالانکہ یہ بات اگرچہ عاشق کے لیے باعث طمانیت ہی ہو مگر محبوب کے لیے اس سے بڑھ کر خسارے کا سودا اور کیا ہوگا؟ یاد رکھیے عاشق ایک ایسا نگران ہے جس کی نظر ذاتی فائدے پر ہوتی ہے۔ لہٰذا اپنے محبوب سے ہر اس شے کو منسوب کرنا پسند کرتا ہے جو اس کے اپنے مفاد میں ہو۔
ذرا غور کیجیے! عاشق جس کا قانونِ حیات ہی حقیقی بھلائی کی بجائے مادی اور جسمانی لذت کے گرد گھومتا ہو اپنے محبوب کے جسم کو کیسی تربیت دینا چاہے گا؟ وہ یقیناً مستقل مزاج اور پختہ کردار کے مقابلے میں اپنے محبوب کے طور پر کسی نرم خو، نو آموز اور کمزور کردار کے فرد کا انتخاب کرے گا۔ ایسا فرد جسے مردانہ افعال و مشاغل سے شغف نہ ہو اور جس کی مثال ایسے نرم و نازک پودے کی ہو جسے براہِ راست سورج کی تمازت میں پروان چڑھانے کی بجائے چھتنار درختوں کے نیچے رکھا گیا ہو۔ گویا ایسا شخص اس کی چاہت کے معیار پر پورا اُترے گا جسے کبھی محنت کے پسینے سے شناسائی نہ رہی اور جسے ناز و نعم سے پر تعیش غذاؤں کی مدد سے پالا پوسا گیا ہو اور اس کے مقدر میں ایسی زندگی نہ ہو کہ جس میں سخت کوشی نے صحت کے رنگ بھرے ہوں۔ ایسی صحت مند زندگی جس کا کوئی تصور

کر سکتا ہے، میں اس کی تفصیل کہاں تک بتاؤں! چنانچہ اس ضمن میں، میں اپنے نقطۂ نظر کو ایک جملے میں بیان کر کے آگے بڑھ جاؤں گا اور وہ یہ کہ ایسا شخص کسی جنگ یا بحران کے دوران دشمن کے لیے کوئی رکاوٹ اور چیلنج ثابت ہونے کی بجائے نہ صرف اپنے دوستوں کے لیے بلکہ خود محبوب کے لیے بھی ایک مسئلہ بن جائے گا۔

اب اس امر پر غور کیجیے اور دیکھیے کہ اپنی ملکیتی جائیداد کے سلسلے میں محبوب کو سوسائٹی یا اپنے سرپرستوں کی جانب سے کن مفادات یا نقصانات پہنچنے کا احتمال ہو سکتا ہے۔ یہ ہے اگلا نکتہ جسے ہمیں اپنی بحث کے دوران ملحوظ رکھنا ہوگا۔ عاشق سب سے پہلے تو یہ دیکھے گا، اور اس کی گواہی تمام متعلقہ لوگ دیں گے، کہ وہ اپنے محبوب کو پسندیدہ ترین، سب سے زیادہ مقدس اور بہترین جذبات سے محروم رکھ سکے۔ اس ضمن میں وہ اسے اس کے ماں باپ اور مخلص ترین دوستوں تک سے محروم کر دینا چاہے گا جو کسی بھی طرح اس کی محبت کی راہ میں حائل ہو سکتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ محبوب کے سونے چاندی اور مال و دولت جیسی ذاتی ملکیت سے بھی حسد کرے گا جو اس کے محبوب کو مشکل شکار بنانے میں اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔ چنانچہ جب محبوب ان اشیا سے محروم ہو جائے گا تو اس سے محبوب کو ایک قسم کی طمانیت حاصل ہوگی۔ گویا وہ محبوب کو بیوی، بچوں، گھر بار اور ایسی ''آلائشات'' سے الگ رکھنا چاہے گا یہ بھی چاہے گا کہ اس کی یہ حالت جتنے زیادہ عرصے تک جاری رہے بہتر ہے تاکہ وہ اس کی صحبت سے زیادہ سے زیادہ عرصے تک مستفید ہو سکے۔

بعض ایسے حیوانات ہیں (جیسے ببر شیر) کہ جو اگرچہ فطرتاً خطرناک اور وحشی ہوتے ہیں مگر فطرت نے ان کی ظاہری شکل میں ایک خوبصورت اور خوش کن عنصر شامل کر دیا ہوتا ہے۔ اس کی مثال عاشق ہیں کہ ذاتی کردار کی صورت میں جتنے مکروہ ہوں مگر دیکھنے میں بھلے لگتے ہیں۔ مگر عاشق نہ صرف اپنے محبوب کے لیے تکلیف دہ ہوتا ہے بلکہ دوستوں کے لیے بھی سخت ناقابلِ برداشت ثابت ہوتا ہے۔ مگر وہ جو قدیم کہاوت ہے ''کند ہم جنس با ہم جنس پرواز'' سو میں سمجھتا ہوں کہ ایک عرصہ ساتھ گزارنے کے باعث عاشق اور محبوب کی پسند ناپسند میں یکسانیت آنے لگتی ہے اور یہی یک رنگی بتدریج دوستی میں بدل جاتی ہے تاہم ایسا سب کچھ تمام مثالوں میں برابر رونما نہیں ہوتا بلکہ اس ضمن میں رکاوٹیں امکانات کے مقابلے میں زیادہ شدید ہوتی ہیں۔ عاشق نہ صرف محبوب سے مختلف ہوتا ہے بلکہ اس پر حاوی رہنے کا خواستگار بھی رہتا ہے۔ وہ چونکہ معمر ہوتا ہے اور اس کا

محبوب کم عمر، سو وہ ممکن ہو تو دن رات اس کی صحبت میں گزارتے ہوئے اپنی طلب اور تڑپ کے ہاتھوں مجبور ہو کر اسے دیکھنا، اس کی باتیں سُننا، اسے چھونا اور ہر لحاظ سے اسے محسوس کرنا چاہتا ہے۔ وہ چونکہ معمر ہوتا ہے اور اس کی محبوب پر مکمل گرفت اور تسلط حاصل کرنے سے بڑھ کر اس کے لیے کوئی شے پُر لطف نہیں ہو سکتی مگر سوال یہ ہے کہ اس تمام تر صورت حال میں محبوب کے لیے لطف و انبساط کا کیا پہلو نکلتا ہے؟ کیا اسے حق حاصل نہیں کہ وہ ایک عمر رسیدہ گھاگ اور گرگ باراں دیدہ قسم کے اور ہر قسم کی کشش سے عاری بلکہ قابل تنافر چہرے کو مسلسل دیکھنے کے عذاب کے خلاف اظہار ناپسندیدگی کر سکے؟ اور اس پر مستزاد یہ کہ اس سے خواہش کی جاتی ہے کہ وہ ہر روز بلکہ حتی الامکان ہر وقت عاشق کی نگاہوں کو گرماتا رہے اور حد یہ ہے کہ نہ صرف عاشق ہر لمحے اسے زیر نگرانی رکھ کر آس پاس کی اشیا اور افراد سے کنارہ کش ہونے کی تلقین کرتا ہے بلکہ چاہتا ہے کہ محبوب چاہتے ہوئے یا نہ چاہتے ہوئے ہر وقت عاشق کی تعریف میں رطب اللسان رہے۔ ظاہر ہے کسی بھی عام شخص کے لیے اس معیار پر پورا اُترنا ممکن نہیں۔ ایسے میں عاشق خصوصاً جب وہ شراب کے نشے میں ہو تو محبوب کی ''خامیوں اور کوتاہیوں'' کے اشتہار لگا کر رکھ دیتا اور اسے دنیا بھر میں بدنام کرنے سے بھی گریز نہیں کرتا۔

اس کی ضرر رسانی اور ناخوشگوار عوامل کے اثرات اگرچہ عرصہ محبت کے دوران بھی سرگرم عمل رہتے ہیں مگر کسی وجہ سے جب محبت میں کمی آنے لگے تو ایسے میں تو وہ جھوٹ، فریب اور بے ایمانی کے ہتھیاروں سے لیس کمینہ دشمن ثابت ہوتا ہے۔ اسی کا دشمن جس پر وہ کبھی اپنی دعائیں اور قسمیں اور وعدے نثار کرتا تھا۔ اور اب بھی اسے فائدے کی توقع ہو تو اس کی محبت کا محور کوئی اور بن چکا ہوتا ہے۔ یعنی وہ محبت سے سبق حاصل کر چکا ہوتا ہے اس لمحے محبت اور فریفتگی کی بجائے عقل اور اعتدال ذات پر اس کا انحصار بڑھ جاتا ہے مگر اس تبدیلی کی محبوب کو ہوا تک نہیں لگتی۔ اسی لیے جب محبوب اسے اس کے وعدے اور قسمیں یاد دلا کر اسے محبت کی لاج رکھنے کو کہتا ہے اور عاشق کے ردعمل کو دیکھ کر اسے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے وہ تو کوئی اور شخص ہو اور کبھی اس کے اور محبوب کے درمیان کوئی قول و قرار ہوئے ہی نہ ہوں۔ دراصل عاشق اس وقت خود کو بند گلی میں پاتا ہے اور نہیں سمجھ سکتا کہ اس صورتِ حال سے کیسے نکل سکے گا اور ان وعدوں کو کیسے بھا پائے گا جو اس نے اپنی نام نہاد محبت کے جادو کے زیر اثر کیے تھے۔ دراصل وہ اپنے گزشتہ وعدوں اور اعمال و افعال کو

حماقت قرار دینے لگتا ہے اور جو ضبطِ نفس اسے تازہ تازہ حاصل ہوا ہوتا ہے وہ اسے گزشتہ احمقانہ باتوں کو دہرانے اور انھی اعمال وافعال کو سرانجام دینے سے روک دیتا ہے جو بعید از معقولیت تھے۔ چنانچہ اس کے پاس سوائے پشت دکھانے کے اور کوئی چارہ کار نہیں رہتا۔ گویا قرعہ فال اس کے حق میں نہیں پڑتا۔ سو وہ صورتِ حال کا مقابلہ کرنے کی بجائے بھاگ نکلنے میں آسانی محسوس کرتا ہے۔ ایسے میں محبوب لاکھ اس کے پیچھے بھاگے وہ ہاتھ نہیں آتا۔ اس وقت کاش محبوب سمجھ پائے کہ اس جذباتی بھگوڑے عاشق کے مقابلے میں سنجیدہ اور مستقل مزاج غیر عاشق کہیں بہتر تھا۔ لہٰذا بدقسمتی سے اس نے ایسا راستہ اختیار کیا جو اس کی شخصیت کے لیے، اس کی روح اور ذہن کے لیے بلکہ اس کی جسمانی صحت اور توانائی کے لیے بھی نقصان دہ، زود رنجی کا باعث، غم وغصہ کا سبب بن گیا اور ایسی کیفیت اختیار کر لی جو نہ انسانوں کے لیے پسندیدہ ہے نہ دیوتاؤں کے لیے۔ لہٰذا نوجوان محبوب کو یہ نکتہ ذہن میں رکھنا چاہیے کہ اس عاشق کی ''چاہت'' میں ہمدردی اور بالخصوص محبوب سے ہمدردی کا کوئی شائبہ تک نہ تھا بلکہ وہ تو فقط جذباتی بھوک کا اسیر تھا اور نوجوان محبوب کے خوبصورت جسم سے اس کی تسکین کرنا چاہتا ہے گویا اس کی محبوب سے محبت ایسی ہی تھی جیسی بھیڑیے کو میمنے سے ہوتی ہے۔

دیکھیے اس خوبصورت قول کا استعمال میں نے اپنی معمولی تقریر کو خوبصورت اختتام دینے کے لیے کیا ہے۔

فیڈرس: ارے میں تو سمجھا تھا کہ اس نکتے پر آپ کی آدھی تقریر مکمل ہوئی ہے اور اب آپ اتنا ہی وقت غیر عاشق کی حیثیت سے منسلک فوائد پر روشنی ڈالنے میں صرف کریں گے۔ سو بات کو آگے کیوں نہیں بڑھاتے؟

سقراط: اس سادگی پر کون نہ مر جائے اے خدا۔ ارے صاحب میں تو سمجھ رہا تھا کہ عاشق کی خرابیاں بیان کرنے سے غیر عاشق کی خوبیوں پر خود بخود روشنی پڑے گی۔ اب آپ شاید لفاظی سے زیادہ سیدھے سادے لفظوں میں کچھ سُننے کے متمنی ہیں اور اگر میں غیر عاشق کی تعریفوں کے پل باندھنے پر اُتر آؤں تو ذرا سوچو خود میرا کیا بنے گا کیونکہ میں تو خود نہ جانے کتنے پری وشوں کی زلفِ گرہ گیر کا اسیر ہو چکا ہوں اور خود آپ ہی نے اپنی چالاکی سے میرا راز فاش کیا ہے۔ لہٰذا اس موضوع پر میں فقط ان الفاظ پر اکتفا کروں گا کہ غیر عاشق کو وہ تمام فوائد حاصل ہوتے ہیں جن سے

عاشق محروم ہوتے ہیں یا اپنی ناقص شخصیت کے باعث ان سے مستفید ہونے کی صلاحیت کھو چکے ہوتے ہیں۔ بس اس سے زیادہ مجھے (اس بارے میں) کچھ نہیں کہنا۔ میرا خیال ہے کہ دونوں قسموں کے افراد کے بارے میں کافی کچھ کہہ دیا گیا ہے۔ اب کہانی کے انجام کو وقت کے ہاتھوں میں سونپتے ہوئے میں تو، اس سے پہلے کہ تمھاری طرف سے کوئی اور مصیبت میرے لیے ظاہر ہو جائے دریا پار کر کے گھر پہنچنے کی کرتا ہوں۔

فیڈرس: ابھی نہیں سقراط! ابھی تو سورج نصف النہار پر ہے کیا ضروری ہے کہ آپ اس قدر شدید گرمی میں جائیں۔ آیئے کچھ دیر اپنے مابین ہونے والی گفتگو پر تبصرہ کرتے ہیں اور جب دھوپ ذرا ماند پڑے گی تو آرام سے گھر چلے جائیں گے۔

سقراط: خطابت سے تمھاری محبت، عزیزم فیڈرس، لاجواب ہے۔ میرا خیال ہے اس معاملے میں اس دور میں کوئی تمھارا ہمسر نہیں۔ کوئی نہ تقریر کرنے میں اور نہ دوسروں کو تقاریر پر اُکسانے میں، آپ کا ہم پلہ ہو سکتا ہے۔ ہاں البتہ ایک فرد تھیبان (Theban) کا سمیاس (Simmias) اس زمرے میں آتا ہے اس کے علاوہ سب آپ سے کہیں پیچھے ہیں اور اب مجھے یقین ہے کہ آپ ایسے ایک اور شخص کا اضافہ کرنے جا رہے ہیں۔

فیڈرس: خبر تو اچھی ہے مگر آپ کا اس سے مطلب کیا ہے؟

سقراط: مطلب یہ ہے کہ جب میں نے ندی پار کر کے لوٹ جانے کا ارادہ کیا تھا (اور اس کا اظہار بھی کر دیا) مجھے ایک اشارہ ملا جو عموماً مجھے نقصان دہ باتوں سے روکنے اور اچھی باتوں کے مکمل کرنے پر اُکساتا ہے اور مجھے محسوس ہوا جیسے کوئی میرے کان میں کہہ رہا ہو کہ مجھ سے کچھ غیر مستحق بات ہو گئی ہے اور جب تک میں اس کا کفارہ ادا نہ کروں۔ مجھے یہاں سے جانا نہ چاہیے۔ اب میری حیثیت ایک روحانی بزرگ کی سی ہے اگرچہ کوئی جامع الکمال مرتبہ رکھنے کا دعویٰ میں نہیں کر سکتا۔ تاہم میں اپنی روحانی ضرورت پوری کرنے کی حد تک مذہب کا پیرو بھی ہوں بالکل ایسے ہی جیسے کہ بدخط شخص کی تحریر دوسروں کے لیے دقت کا باعث ہو تو خود اس کے لیے نہیں ہوتی۔ ویسے مجھے کچھ کچھ اپنی غلطی کا احساس ہو چلا ہے۔ میرے دوست، انسانی روح واقعی بڑی پیغمبرانہ شان کی حامل ہوتی ہے۔ ایک وقت تھا کہ مجھے بھی ابیکس (Ibycus) کی طرح یہ دھوکا ہوا تھا کہ میں مصیبت میں گرفتار ہونے والا تھا مجھے ایسے لگتا تھا جیسا میں دیوتاؤں کے ضمن میں گناہگار ہونے کی قیمت پر

انسانوں کی نظر میں عزت واحترام خرید رہا تھا۔ مگر اب میری غلط فہمی رفع ہو چکی ہے اور مجھے اپنی غلطی کا ادراک ہو چکا ہے۔

فیڈرس: مثلاً کس غلطی کا احساس ہوا ہے؟

سقراط: دراصل آپ جو تقریر ساتھ لائے تھے وہ بڑی خوفناک تھی اور ویسی ہی بُری تقریر مجھے بھی کرنا پڑی۔

فیڈرس: وہ کس طرح؟

سقراط: میں بھی کسی حد تک احمق تھا۔ ایک بے دین اور بدعقیدہ شخص۔ کیا اس سے زیادہ دہشت ناک شے کوئی اور بھی ہو سکتی ہے۔

فیڈرس: بالکل نہیں ہو سکتی، بشرطیکہ وہ تقریر ایسی ہی ہو جیسی آپ بتاتے ہیں!

سقراط: اور کیا ایروس (Eros) فی الحقیقت ایفروڈائیٹ (Aphrodite) کا بیٹا، اور خود بھی ایک دیوتا نہیں ہے۔

فیڈرس: لوگ کہتے تو یہی ہیں۔

سقراط: مگر لائسیاس نے اپنی تقریر میں اس کا اقرار نہیں کیا۔ نہ اس دوسری تقریر میں اس کا ذکر آیا ہے جو میرے لبوں سے محض آپ کی شخصیت کے سحر کے باعث جاری ہوئی ہے کیونکہ محبت اگر فی الحقیقت (جیسا کہ حقائق سے محسوس ہوتا ہے) کوئی آفاقی شے ہے تو پھر یہ گناہ نہیں ہو سکتی۔ دونوں تقریروں میں یہی مشترکہ غلطی تھی۔ ان (تقریروں) کے بارے میں ایک اور نکتہ بھی قابلِ غور ہے اور وہ یہ کہ اگرچہ دونوں میں حقیقت کی سطح بہت ہی کم تھی مگر پھر بھی دونوں کے ذریعے نہ صرف عوام کو بلکہ خاص خاص عاقل ودانا اور اہم لوگوں کو بھی دھوکا دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ البتہ میں اب اپنا تزکیۂ نفس چاہتا ہوں اور اس تزکیۂ نفس سے میری مراد وہ روایتی تزکیہ نفس ہے جو دیومالائی غلطیوں کی بنا پر مشاہیر نے کیا۔ ہومر اس لیے اسے نہیں سمجھ پایا کہ وہ اندھا ہونے کے باعث یہ نہ جان پایا کہ اس کے نابینا پن کے پسِ منظر میں کیا تھا مگر سٹیسی کورس جو ایک فلسفی تھا اور وہ ہر شے کی وجہ جاننے کا ماہر تھا لہٰذا جب اس کی بینائی جاتی رہی تو اسے خوب معلوم تھا کہ یہ اس کی اس غلطی کی پاداش میں تھا جو حسینۂ عالم ہیلن (Helen) سے زبان درازی کی صورت میں سرزد ہوئی تھی۔ سو اس نے فوراً ہی اپنا تزکیہ کیا اور یہ تزکیہ ایک مراجعتی اقدام کی صورت میں تھا جس کے اظہار کا آغاز کچھ یوں ہوا:

''میرا وہ لفظ غلطی پر مبنی ہے، سچ تو یہ ہے کہ تم کبھی جہاز میں سوار ہوئے نہ تم

نے ٹرائے کی دیواروں تک پیش قدمی کی۔"

اور جیسے ہی اس نے "مراجعت" (The Recantation) کے عنوان سے اپنی نظم مکمل کی اسی لمحے اس کی بینائی لوٹ آئی۔ میں اس موقع پر سٹیسی غورث (Stesichorus) یا ہومر دونوں سے زیادہ عقل مندی کا ثبوت دیتے ہوئے محبت کی شان میں گستاخی کی سزا کا مستحق ہونے سے قبل مراجعت اختیار کرتا ہوں، اس سے قبل کہ میں کسی عذاب میں مبتلا ہو جاؤں اور ایسا میں پہلی تقریر کی طرح نہیں کروں گا جس میں میں پشیمان اور شرمندہ شرمندہ سا محسوس کر رہا تھا بلکہ یہ سب کچھ میں بڑی خندہ پیشانی اور جرأت مندی سے کروں گا۔

فیڈرس: آپ اس ضمن میں جو کچھ بھی فرمائیں گے اسے میں پوری توجہ اور دلجمعی سے سنوں گا۔

سقراط: صرف یہی سوچیے میرے دوست فیڈرس! کہ ان دونوں کی طویل تقاریر میں نفاست کا کون سا پہلو غائب رہا ہے یعنی خود میری تقریر میں اور اس میں جو آپ نے کتاب سے پڑھ کر کی۔ کیا حقیقت یہ نہیں ہے کہ ہم نے اپنی اپنی تقاریر میں عاشقوں کے تکلیف دہ طرز عمل، ان سے محبوب کو پہنچنے والے نقصانات، ان کی باہمی رقابتیں اور دشمنیاں اور ایسے تمام منفی عوامل کا ذکر نہیں کیا۔ ہم نے ایک مخصوص (ملاحوں کے) طبقے سے اخذ نہیں کیے کہ جن کے ہاں محبت کا تصور سرے سے واضح ہی نہیں۔ لہٰذا ان کے باہمی حسد کے معاملات کا اطلاق ان معقول اور مہذب لوگوں پر نہیں کیا جا سکتا جو نہ صرف معقول انداز میں محبت کرتے ہیں بلکہ خود انھیں بھی اپنے جیسے معقول افراد کی محبت حاصل رہی ہے۔

فیڈرس: میں یہی کہوں گا کہ ایک طرح کے لوگوں کے طرزِ عمل کا اطلاق دوسری طرح کے لوگوں کے معاملات پر نہیں ہونا چاہیے۔

سقراط: لہٰذا اب جب کہ اس معاملہ میں نامعقول تصور کی حمایت کرنے پر شرمندگی محسوس کرتے ہوئے اور کچھ اس لیے بھی کہ اب مجھے خود اس ہستی سے خوف آنے لگا ہے جس سے میں محبت کرتا ہوں، مجھ پر لازم ہے کہ میں سُنی سنائی باتوں کی جگہ شفاف حقائق کو دوں۔ لہٰذا میں عاشقوں کو بھی یہی مشورہ دوں گا کہ وہ ایک اور تقریر یا مضمون تحریر کریں جس سے "Ceteris paribus" یعنی عاشق، کو غیر عاشق کے مقابلے میں پسندیدگی کی نظر سے دیکھا گیا ہو۔

فیڈرس: آپ یقین کیجیے وہ ایسا کر گزریں گے۔ ظاہر ہے آپ جب عاشقوں کے حق میں بولیں گے تو

لائسیاس یقیناً مجبور ہوگا کہ وہ بھی اس موضوع پر ایک نئی تقریر قلمبند کرے۔

سقراط: آپ اس نقطۂ نظر کی حمایت کر کے گویا اپنے خوش عقیدہ اور معقول فطرت ہونے کا ثبوت دیں گے اور اس لیے میں بھی آپ پر بھروسا کرتا ہوں۔

فیڈرس: آپ بلا جھجک کہہ ڈالیے۔

سقراط: ارے وہ دلکش نوجوان کہاں چلا گیا جس سے تھوڑی دیر ہم نے گفتگو کی تھی۔ اسے تو دراصل اب میری باتیں سُننی چاہئیں ورنہ ایسا نہ ہو کہ وہ بھی (میری گزشتہ گفتگو کے باعث) کسی غیر عاشق ہی کے ہتھے نہ چڑھ جائے اور اسے معلوم ہی نہ ہو سکے کہ وہ کیا کر بیٹھا ہے۔

فیڈرس: وہ یہیں ہے جناب اور ہمیشہ آپ کے حکم کے تابع رہے گا۔

سقراط: تو سُنو اے نوجوان! اس سے پہلے جو کچھ ہم نے کہا وہ دراصل فیڈرس کا نقطۂ نظر تھا جو دین مین (Vain Man) کا بیٹا ہے جو مرحینا (Myrrhina) (یا مائیری نیوسیئس :Myrrhinusius) کے شہر کا باسی ہے اور جو کچھ اب میں کہنے جا رہا ہوں وہ گویا سٹیسی غورث جو کہ انسان نما دیوتا ہے یوفیمس (Euphemus) کا بیٹا ہے کے انداز میں مراجعت ہے۔ سٹیسی غورث کا تعلق شہر طلب (Town of Desire) سے ہے جسے حمیرا (Himera) بھی کہتے ہیں۔ اس نے بھی "مراجعت" کے زیرِ عنوان اپنی نظم میں کہا تھا کہ "میں نے جب یہ سب کچھ کہا تھا تو بلاشک جھوٹ بولا تھا۔" میں بھی یہی کہتا ہوں کہ جب میں نے یہ کہا تھا کہ محبوب کو چاہیے کہ غیر عاشق کو عاشق کی موجودگی میں اہمیت دیں تو گویا میں نے غلط بیانی سے کام لیا تھا۔ یہ تو طے ہے کہ ان دونوں میں سے ایک معقول فرد قرار دیا جا سکتا ہے تو دوسرا دیوانہ۔ مگر قابلِ توجہ امر یہ ہے کہ دیوانگی لازمی طور پر منفی کیفیت ہی نہیں ہے بلکہ یہ ایک عظیم آفاقی صلاحیت بھی ہے (جو عشقِ حقیقی کی طرف پہلا قدم ہے) بلکہ قدرت نے انسان کو جن نعمتوں سے نوازا ہے دیوانگی یا جنون ان میں سے ایک اہم اور جامع الکمالات نعمت ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ پیغمبری میں بھی مثبت جنون کی کئی مثالیں دستیاب ہیں۔ آپ یاد کیجیے کہ ڈیلفی کے مقام پر ایک نبیہ نے اور ڈوڈونا (Dodona) کے مقام پر کاہنہ نے عالم جنون میں ہیلاز (یونان کے رہنے والوں) (Hellas) کے لیے جو کارنامے سرانجام دیے، عالمِ ہوش و خرد میں وہ اس کا خواب بھی نہ دیکھ سکتی تھیں۔ ان کے کارناموں کی مثالیں نجی اور عوامی دونوں طرح کی زندگی میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ میں آپ کو بتا سکتا ہوں کہ سیبائل (Sibyl) اور بہت سے دوسرے متاثرہ افراد

نے اپنے عالم جنون ہی میں مستقبل سے متعلق ایسے ایسے انکشافات کیے کہ پورا خطہ مستقبل کے کئی خطرناک مرحلوں پر (پہلے سے تیاری کے باعث) تباہی سے محفوظ رہا۔ البتہ ایسے تمام لوگوں کا (جنونی) علم کن کن معاملات کو اپنے دائرہ اثر میں محیط کرتا ہے، اس کے بارے میں کچھ بتانا آسان نہیں۔

البتہ قدیم قانون سازوں کے کام کا حوالہ دیا جاسکتا ہے، جنھوں نے ابتدائے تاریخ میں اشیا کے لیے نام تجویز کیے۔ بظاہر انھوں نے الہام جو کہ مستقبل میں جھانکنے کی صلاحیت کا نام ہے اور سب سے زیادہ محترم صلاحیت سمجھی جاتی ہے اور دیوانگی سے منسلک قرار نہ دیا ہوتا اگر انھیں دیوانگی میں توہین کا ذرا بھی پہلو نظر آیا ہوتا۔ ویسے بھی یہ دونوں دراصل ایک ہی لفظ ہیں اور آ کا اضافہ محض زائد ہے اور حال ہی میں شامل ہوا ہے یہی اس نام سے بھی ثابت ہے جو مستقبل شناسی کے شعبے میں تحقیق و جستجو کو دیا گیا ہے۔ مستقبل سے متعلق جاننے کا سلسلہ چاہے پرندوں کے مختلف انداز ہائے چہکار سے ہو یا مختلف جانوروں کی عادات میں عارضی تبدیلی سے، دونوں صورتوں میں اس کے لیے ایک ہی خانہ ذہن کی کارگزاری مطلوب ہوتی ہے جس کا تعلق منطق (Logic) سے ہو یا معلومات سے جو بالآخر انسانی سوچ (Thinking) کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ ابتدا میں اس کیفیت کو حالت کہا گیا مگر گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ اس میں اومیگا (Omega) کے ذریعے بلند آہنگی کا اضافہ ہو گیا ہے اس لحاظ سے نام اور کیفیت دونوں صورتوں میں قدیم ماہرین کی نظر میں اسی تناسب سے جنون معقولیت (دانش) کے مقابلے میں کہیں زیادہ پُروقار سمجھا جاتا کیونکہ ذہانت اور معقولیت انسانی صفات ہیں جبکہ دیوانگی اور جنون آفاقی ہے۔ اس کے علاوہ جب کبھی انسانوں پر ان کی گزشتہ نسلوں میں خون کی بذریعہ بیوفائی ملاوٹ کے نتیجے میں کوئی بڑی مصیبت نازل ہوئی ہے تو دیوانگی اور جنون وہاں دعاؤں اور مذہبی اعمال کے ذریعے ان کنبوں میں ضرورت مندوں کے لیے نجات کی راہیں نکالتی رہی ہیں۔ یعنی ان کنبوں میں جو شخص مائل بہ دیوانگی ہوتا ہو اور اس وجہ سے اس خانوادے پر حرمت اور سلامتی کے نزول کا ذریعہ بنا ہو۔ دراصل وہ پہلے خالی الذہنی کی کیفیت میں آتا ہے یعنی عقل و خرد کے ساتھ اس کے وجود میں سے ہر طرح کی بُرائی بھی ڈھل جاتی ہے اور تب اس کا رفتہ رفتہ یوں تزکیۂ نفس ہونے لگتا ہے کہ آخرکار اسے مستقبل بینی کی صلاحیت کے ساتھ کچھ ایسی روحانی توانائیاں بھی حاصل ہو جاتی ہیں جن کی مدد سے اس کے اور اس کے کنبے

کے سارے دکھ درد زائل ہو کر رہ جاتے ہیں۔

اہلِ جنوں کی تیسری قسم وہ ہے جن پر شاعری کی دیوی کا سایہ ہوتا ہے جو صرف معصوم اور شفاف روحوں پر ہی اپنی گرفت مضبوط کرتی ہے اور اس کی متاثر کن شوریدہ سری ان کے وجود میں موسیقیت اور اعداد کے احساس کی صلاحیت بیدار کرتی ہے۔ یہی وہ صلاحیت ہے، جس کے باعث قدیم نسلوں کی ان گنت خوبصورت خاصیتیں ان کی آئندہ نسلوں میں منتقل ہوئی ہیں۔ مگر وہ لوگ جن کو شاعرانہ ذوق سے کوئی لگاؤ نہیں ہوتا ان کی دیوانگی مختلف قسم کی ہوتی ہے، جس میں ماریت کا عنصر زیادہ ہوتا ہے۔ وہ گویا عبادت گاہ کے دروازے پر پہنچ کر سمجھتے ہیں کہ ان کی مہارت انھیں خدا کے گھر میں داخل کر سکتی ہے۔ مگر میں آپ کو بتا دوں کہ ان کی شاعری اور وہ خود شرفِ قبولیت حاصل نہیں کر سکتے۔ سچ تو یہ ہے کہ پاکباز انسان خصوصاً جب کسی مجنون کے مقابلے میں آتا ہے تو کہیں کا نہیں رہتا۔

میں کچھ اور نیک کاموں کی نشاندہی بھی کر سکتا ہوں جو صرف اہلِ جنون ہی سے سرزد ہو سکتے ہیں۔ سو ہم لوگ اس بات سے متزلزل نہیں ہو سکتے کہ متاثر فرد کی بجائے معتدل ذات دوست کا انتخاب کیا جائے، بلکہ ان کو جان لینا چاہیے کہ دیوتا جب کسی پر (عاشق اور محبوب دونوں کی صورت میں) محبت نازل کرتے ہیں تو اسے ان لوگوں سے سرزد ہونے والی نیکیوں سے مشروط نہیں کرتے۔ بلکہ وہ (عاشق یا محبوب) کوئی نیکی کرنے ہی والا ہے تو بے شک اس سے ہاتھ اُٹھا لے۔ ہم تو اپنی جانب سے یہ ثابت کر سکتے ہیں کہ محبت کا جنون تو خدا کی نعمتوں میں سے ایک عظیم نعمت ہے۔ اس امر کا ثبوت صرف صاحب عقل و خرد کو ہی دستیاب ہو سکتا ہے جو عاقل و دانا ہونے کا ڈھونگ رچاتے ہیں، ان پر کچھ ظاہر نہیں ہو پاتا۔ مگر ایسے کسی نتیجے پر پہنچنے کے لیے آفاقی (دیوتاؤں سے متعلق) اور انسانی روحوں میں فرق معلوم کرنے اور ان سے متعلق حقائق کو جاننے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ ہم اپنی بات کا ثبوت درج ذیل بیان کی صورت میں پیش کر سکتے ہیں:

روح اپنے مکمل وجود کے ساتھ غیر فانی ہے کیونکہ ہر وہ شے جو ہمیشہ سے متحرک ہو لافانی ہے۔ مگر ایسی اشیا جن کا تحرک کسی دوسرے عنصر کی بدولت ہو یا جو دوسری اشیا کو متحرک تو کر سکے مگر وہ تحرک عارضی ثابت ہو تو سمجھ لیجیے کہ وہ شے فانی ہے۔ صرف وہ اشیا جو خود متحرک ہو سکتی ہیں، کبھی اپنے وجود سے الگ نہیں ہوتیں، اور جس کی حرکت کبھی موقوف نہیں ہوتی وہی دراصل ماحول کی دیگر اشیا

کی حرکت کا منبع ثابت ہوتی ہیں۔ علاوہ ازیں ابتدا ہمیشہ غیر انجام پذیر ہی رہتی ہے کیونکہ جو کچھ بھی انجام پذیر ہے تو لازماً اس کا کہیں نہ کہیں کوئی نقطۂ آغاز ہوتا ہے۔ مگر آغاز کا اپنا کوئی انجام نہیں ہوتا البتہ ہر آغاز کی بنیاد کسی دوسرے انجام پر رکھی جاتی ہے۔ گویا ہر وہ شے جس کا انجام ممکن ہو اسے ختم یا تباہ کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ اگر آغاز کی تباہی ممکن ہوتی تو کسی شے کا کبھی آغاز ہی نہ ہو پاتا۔ لہٰذا یہ تو طے ہے کہ ہر شے کا کوئی نہ کوئی نقطۂ آغاز ضرور ہونا چاہیے۔ سو اگر خود حرکتی کی صلاحیت کی حامل شے غیر فانی قرار پاتی ہے تو اس شخص کو پریشان ہونے اور الجھنے کی ضرورت نہیں کیونکہ وہ جسم جسے حرکت کے لیے بیرونی عوامل توانائی کی ضرورت پڑے، روح سے عاری ہوتا ہے اور جس کی حرکت اس کے اندرونی عوامل پر مبنی ہو، ذی روح کہلائے گا کیونکہ حقیقتِ روح اس کے سوا کچھ نہیں اور اگر اسے درست تسلیم کر لیا جائے تو پھر یہ بھی ماننا پڑے گا کہ روح خود حرکتی کی صلاحیت رکھتی ہے اسی لیے غیر فانی ہے اور اسے کبھی فنا نہیں۔ میرا خیال ہے روح کے غیر فانی ہونے سے متعلق بس اتنا ہی کافی ہے۔

جہاں تک روح کی ساخت کا تعلق ہے اگرچہ اس کی مکمل حقیقت تو اس قدر عظیم ہے کہ یہ فانی الفاظ کی گرفت میں نہیں آ سکتی۔ مگر میں مختصراً وہ بھی اس کی شکل کی صورت میں بیان کروں گا۔ آپ غور کریں تو اس تصویر کو احاطۂ تصور میں لا سکتے ہیں۔ میرے تصور میں اس کی تصویر ایک دو گھوڑوں والی بگھی اور اس میں جتے دو پردار گھوڑوں پر مشتمل ہے۔ اب اگر آپ دیوتاؤں کی روحوں کی باتیں کریں تو یوں سمجھ لیجیے کہ ان کی بگھی کے گھوڑے اعلیٰ نسل کے ہیں جبکہ انسانی روحوں کی بگھی کو دوغلے گھوڑے کھینچتے ہیں یا پھر انسانی روح کی صورت میں بگھی کو چلانے والا (رتھ بان) دو قسم کے گھوڑوں کی مدد سے چلاتا ہے جن میں سے ایک اعلیٰ اور خالص نسل کا ہوتا ہے تو دوسرا ادنیٰ اور دوغلی نسل کا۔ دونوں کو وہ طلب کے تازیانے سے ہانکتا ہے اور اسی لیے انسان کو زندگی میں مشکلات کا سامنا رہتا ہے۔ اب میں آپ کو یہ سمجھانے کی کوشش کروں گا کہ فانی مخلوقات بالآخر غیر فانی مخلوقات سے کیونکر مختلف ہوتی ہیں؟

روح دراصل اپنی مکمل صورت میں مادی جسم کو منضبط کرتی ہے اور تمام روحیں غوطہ خوروں کی طرح آفاق میں ادھر اُدھر اور دائیں بائیں غوطے لگاتی پھرتی ہیں۔ اب ایسی صورت میں وہ روحیں جن کے پر مضبوط اور مکمل ہوتے ہیں بلندی کی طرف مائل بہ پرواز رہتی ہیں اور پوری کائنات ان کے

دائرہ تصرف میں ہوتی ہے جبکہ وہ روحیں جن کے پر ناقص ہونے کے باعث جھڑ جاتے ہیں اور یہ گرتی ہوئی آخر زمین پر آن ٹکتی ہیں اور یہاں کے ماحول میں رچنے بسنے کے لیے اسے جسمانی وجود کی ضرورت پڑتی ہے اور یہ وجود اگرچہ خود حرکتی کی صلاحیت کا حامل نظر آتا ہے مگر فی الحقیقت اس کی حرکت روح ہی کی مرہون منت ہے۔ اسی اتصال سے حاصل ہونے والی مخلوقات ہی ذی روح مگر فانی کہلاتی ہیں۔ جہاں تک غیر فانی روحوں کا تعلق ہے۔ میرے خیال میں ان کے لیے جسم و روح کے ایسے اتصال کی ضرورت نہیں ہوتی۔ مگر چونکہ غیر فانی افراد یعنی دیوتاؤں کو چونکہ نہ مادی آنکھ سے دیکھا جا سکتا ہے اور نہ ہی ان کے بارے میں چشم تصور ہی کوئی تصویر دکھا پاتی ہے تاہم یہ بھی سمجھا جاتا ہے کہ لافانی! غیر فانی وجود (یعنی دیوتا) بھی روح اور جسم دونوں کے حامل ہوتے ہیں اور یہ دونوں ہمیشہ متصل رہتے ہیں۔ البتہ یہ دونوں دیوتاؤں کی مرضی پر منحصر ہے اور ہمیں بھی دیوتاؤں کی مرضی کی حد تک ہی گفتگو کو محدود رکھنا چاہیے۔ اب آیئے ذرا اس امر کا جائزہ لیں کہ آخر بعض روحوں کے پر کیوں اور کیسے جھڑ جاتے ہیں؟

پر فی الحقیقت مادی جسم کا حصہ ہوتے ہیں مگر ان کی ایک آفاقی صفت یہ ہے کہ یہ جسم خاکی کو بلند پروازی کی طرف مائل کر کے زمین کی کشش کے برخلاف ان خلاؤں اور بلندیوں کی جانب راغب کرتا ہے جہاں دیوتاؤں کا مسکن ہے۔ آفاقی خصائص میں حسن، دانائی، نیکی اور اسی قبیل کے دیگر خصائص بھی شامل ہیں۔ انھی سے دراصل روح کے پروں کی پرورش ہوتی ہے۔ یہ خصائص جس قدر قوی ہوں، روح کے پروں کی بالیدگی پر اتنا ہی خوشگوار اثر پڑتا ہے مگر جب اس پرورش میں مذکورہ بالا خوبیوں کی بجائے ان کے برعکس بدی اور بدنہادی شامل ہو جائیں تو یہی پر کمزور ہو کر گر جاتے ہیں (اور روح کی بلندیوں کی سمت پرواز رک جاتی ہے بلکہ وہ پستیوں کی طرف راغب ہو جاتی ہے) زیوس جو عظیم دیوتاؤں کا دیوتا ہے اپنی پرواز کی باگیں تھامے گویا تمام روحوں کی پرواز کی سمت متعین کرتا اور انھیں بلند منزلوں کی جانب رہنمائی فراہم کرتا ہے اور ساتھ ساتھ ان کی نگرانی اور دیکھ بھال بھی اسی کی ذمہ داری ہے اور اس کے پیچھے دیگر دیوتاؤں اور اوتاروں کے پرے گیارہ ٹکڑیوں میں فردوس کی جانب مائل بہ پرواز ہوتے ہیں۔ صرف ہسٹیا (Hestia) دیوی اپنے آسمانی گھر میں رہتی ہے اور اس کے علاوہ تمام کے تمام دیوتا جن کا شمار بارہ حکمرانوں میں ہوتا ہے، حسب مراتب ترتیب وار مارچ کرتے ہوئے جاتے ہیں۔ انھیں بہشت

برین کے اندرونی خطوں میں بڑے دل خوش کن مناظر دکھائی دیتے ہیں۔ یہاں کئی روشیں ادھر اُدھر گزرتی ہیں جن پر ان گنت دیوتا اپنی مخصوص ذمہ داری سرانجام دیتے ہوئے گزرتے نظر آتے ہیں۔ یہاں ہر ایک کو اپنے کام سے کام ہوتا ہے کیونکہ جسم کا یہاں گزر نہیں۔ البتہ جب وہ بگھی یا تہوار وغیرہ پر اکٹھے ہوتے ہیں تو انھیں بہشتِ بریں کے بالائی طبقوں کی جانب ڈھلوانی راستوں سے چڑھائی چڑھنا ہوتی ہے تو اس وقت ان کی بگھی کی رفتار میں دلجمعی کا عنصر مختلف سطح پر ہوتا ہے۔ ایسے میں چونکہ ڈھلوانی سطح کے باعث بگھی کا بوجھ بوجہ کشش ثقل زمین کی جانب کھنچتا ہے لہٰذا بعض گھوڑے تو دلجمعی سے مائل بہ مشقت رہتے ہیں مگر بعض بدباطن گھوڑوں کی رفتار میں فرق آجاتا ہے۔ شاید اس لیے بھی کہ ان گھوڑوں کی ترتیب معقول سطح پر نہیں ہوتی۔ یہ مرحلہ دراصل ان دیوتائی ارواح کے لیے سب سے زیادہ تکلیف دہ اور باعثِ رشک و رقابت ٹھہرتا ہے۔ یہ غیر فانی ارواح دراصل بلندی پر بہشت کے بالائی خطے کے کنارے پر پہلے پہنچنے کی جھونک میں ہوتی ہیں۔ اس وقت جب گردشِ آفاق انھیں چکر دیتی ہے تو وہ اپنے سامنے کی اشیا کو مضبوطی سے تھام لیتی ہیں۔ وہ بہشت بریں جو فردوسوں کا فردوس ہے اس کی توضیح بے چارہ خاکی شاعر کیوں کر سکتا ہے۔ آئیے میں آپ کو بتاؤں کہ یہ بہشتِ بریں ہے اور یہاں وہی سکونت پذیر ہو سکتا ہے جو علمِ حقیقی کا حامل ہو۔ رنگ جس کی شناخت نہ ہو، نہ اس کی کوئی واضح شکل بنائی جا سکے وہ فقط ایک ناقابلِ احساس جوہر ہو اور یہی وہ جوہر ہے کہ صرف ذہن ہی اس کی فہم پر قادر ہے ظاہری حسیات اسے دائرۂ ادراک میں نہیں لا سکتیں اور یہی فی الحقیقت وہ قوت ہے جو روح کو قوتِ پرواز عطا کرتی ہے۔

آفاقی دانائی جو خالص علم و عرفان اور ذہنِ رسا سے پروان چڑھتی ہے اور ہر روح کی ذہانت جو اس کے لیے کام و ذہن کی تسکین کے علاوہ اس کے لیے مادی توانائی کی بہم رسانی کا ذریعہ بھی ہے۔ جب حقیقت مطلقہ کا ادراک کر پاتی ہے تو خوشی اور طمانیت کے حصول کا سب سے بڑا ذریعہ بھی بن جاتی ہے اور یہ خوشی و انبساط کا تاثر بدستور قائم رہتا ہے تاوقتیکہ گردشِ لیل و نہار اسے پھر اسی پہلے مقام پر لا کھڑا کرتی ہے۔ اس گردش کے دوران اسے عدل و انصاف، اعتدالِ ذات اور علمِ حقیقی کے عظیم تجربات سے گزرنا پڑتا ہے۔ یہ تجربات نسل در نسل حاصل ہونے والے اور انسانی تعلقات کے حوالے سے حاصل شدہ تجربات جیسے نہیں ہوتے بلکہ ان کی حیثیت وجودِ مطلق

کے علم مطلق کی صورت میں ہوتی ہے۔ ایسے علم اور تجربے کے ذریعے وہ روح دیگر ہم جنس ارواح سے متعلق علم حاصل کرتے ہوئے بہشت کے اسی درمیانے خطے میں لوٹ آتی ہے جہاں اس کا رتھ بان اپنے گھوڑوں کو اصطبل میں باندھ چکنے کے بعد اس کی آبِ حیات اور شہد سے تواضع کرتا ہے۔

یہ دیوتاؤں کی زندگی کے نقشے کا فقط ایک رُخ ہے۔ مگر جہاں تک غیر دیوتائی اور عمومی روحوں کا تعلق ہے یہ بھی دیوتاؤں کی حتی الامکان پیروی کرتے ہوئے ان کے تعاقب میں رہتی ہیں اور اسی کی دیکھا دیکھی اپنی رتھ کو بلندی کے رُخ پر رکھتی ہیں اور گردشِ ماہ و انجم کے ساتھ رہنے کے بعد اپنے گھوڑوں کی بدنہادی کا شکار ہو کر، حقائق مطلقہ کا محض ایک طائرانہ جائزہ لینے کے بعد زمین کی جانب لوٹ آتی ہیں۔ اس دوران ان کا مشاہدہ بھی غیر مسلسل اور ناقص رہتا ہے جس کا باعث اس کے گھوڑوں کی کم نسلی ہے۔ ان کے علاوہ کم درجہ روحیں ان دوسرے درجے کی روحوں کے پیچھے پیچھے رہتی ہیں اور کسی حد تک بالائی دنیا تک پہنچنے میں کامیاب ہو پاتی ہیں۔ مگر چونکہ ان کی توانائی دیوتاؤں یا اوتاروں اور بلند مرتبہ روحوں کے مرتبے پر نہیں ہوتیں لہٰذا ان کی پرواز بھی اسی مناسبت سے زیادہ بلند نہیں ہوتی اور ان کی گردش کا مدار کم تر فاصلے پر رہتا ہے۔ اس عالم میں ان کی پرواز، باقاعدہ نہیں ہوتی بلکہ ان روحوں کے رتھ لنگڑاتے، باہم ٹکراتے، ہچکولے کھاتے ایک دوسرے پر گرتے اور یوں منزل پر پہنچنے والی پہلی روح کے اعزاز کے حصول کے لیے مسلسل سرگرم پرواز رہتے ہیں مگر پھر بھی وہ بلند مرتبہ، جہاں انھیں حقائق مطلقہ کا نظارہ میسر آئے، نصیب نہیں ہوتا کیونکہ اس دوران ان کے تمام تر حواس، سخت جدوجہد اور کوشش پیہم میں مصروف رہتے ہیں اور اسی تگ و دو میں ان کے گھوڑوں کے خام اور ناقص پر ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جاتے ہیں اور اسی لیے حقائق مطلقہ کے تحیرات تک ان کی رسائی نہیں ہو پاتی اور ان کی خوراک محض افواہیں یا آرا ہوتی ہیں۔ یہ روحیں حقیقتِ مطلقہ کی تگ و دو میں مسلسل سرگرداں اس لیے رہتی ہیں کہ یہ وہ مقام ہے جہاں وہ آفاقی مرغزار پائے جاتے ہیں جو روحوں کو بہت مرغوب ہوتے ہیں اور روح کے پروں کو، جن کے ذریعے اسے مصروفِ پرواز رہنا ہوتا ہے انھی سے توانائی حاصل کرتے ہیں اور اس ماورائے کائنات دنیا کا یہ دستور ہے کہ جو روح دیوتاؤں کی معیت میں کسی بھی حقیقت کا نظارہ کرنے میں کامیاب ہو جائے گی اسے پرواز کے دوسرے دور تک تمام مصائب سے تحفظ میسر

رہے گا اور اگر وہ ہر دفعہ اس نظارے سے مستفیض ہو پائے تو ہمیشہ کے لیے دکھوں سے محفوظ رہے گی۔ تاہم اگر وہ دیوتاؤں کی معیت میں کسی بھی حقیقت کا نظارہ کرنے میں کامیاب ہو جائے گی اسے پرواز کے دوسرے دور تک تمام مصائب سے تحفظ میسر رہے گا اور اگر وہ ہر دفعہ اس نظارے سے مستفیض ہو پائے تو ہمیشہ کے لیے دکھوں سے محفوظ رہے گی۔ تاہم اگر وہ دیوتاؤں کے اس تعاقب اور پیروی میں ناکام رہے اور مطلق سچائی کا نظارہ بھی نہ کر پائے یا کسی حادثے اور اپنی کم اصلیت اور بدی کے دوہرے بوجھ کے باعث نیچے لڑھک آئے اور اسی دوران اس کے پر بھی ٹوٹ کر گر جائیں تو پھر زمین کی طرف مراجعت ہی اس کا مقدر ٹھہرتی ہے۔ اس وقت اس پر آفاقی ضابطے کا اطلاق ہوتا ہے کہ وہ اب کسی دوسری مخلوق (مثلاً اوتار وغیرہ) کی حیثیت اختیار کرنے کی بجائے حالتِ انسانی تک محدود رہے گی۔ البتہ یہ ضابطہ اس کی اوّلین پیدائش ہی پر لاگو ہوتا ہے۔ اس مرحلے پر پھر ان روحوں کی درجہ بندی حقیقت مطلقہ سے قربت کے تناسب سے یوں ہوتی ہے کہ قریب ترین روح فلسفی کی حیثیت سے جنم لیتی ہے یا فنکار، موسیقار یا محبت کرنے والے (عاشق) کی صورت میں وجودِ انسانی میں ڈھلتی ہے۔ جس نے حقیقتِ مطلقہ کی زیارت سے دوسرے درجے تک مستفیض ہونے کا شرف حاصل کیا ہوتا ہے۔ اس کا انسانی جنم بادشاہ یا سالارِ اعظم کی حیثیت سے ہوتا ہے۔ اسی طرح تیسرے درجے کی روح ایک سیاستدان، ماہر معاشیات یا تاجر کے قالب میں ڈھلتی ہے۔ چوتھے درجے کی روح کے مقدر میں اتھلیٹ یا فزیشن بننا ہوتا ہے۔ پانچویں درجے کی روح کو کسی غیب گو یا دینی پیشوا یا پادری کا جسم میسر آتا ہے۔ چھٹے درجے کی روحیں شعرا یا ایسے دوسرے تخلیقی فنون کے ماہرین کے وجود میں جنم لیتی ہیں۔ ساتویں درجے کی روحوں کو دستکار یا محض اولاد پیدا کرنے والا فرد بننا پڑتا ہے۔ آٹھویں درجے کی روحیں استدلالی علما یا معلمین کی صورت میں عالم وجودِ انسانی میں آتی ہیں جبکہ نویں اور کمترین درجے کی روحوں کو ظالم حکمران کی شکل میں جنم لینا پڑتا ہے۔ مگر لطف کی بات یہ ہے کہ یہ نو کے نو درجے ناقابلِ تبدیل نہیں بلکہ کسی بھی روح کو نیکیوں کی طرف رجوع کر کے بلند درجوں کی طرف جبکہ بُرائی کی طرف راغب ہونے کے باعث نچلے درجوں کی طرف منتقل ہونا ہوتا ہے۔

کسی روح کو اپنے اصل مقام کی طرف لوٹ آنے میں دس ہزار سال کا عرصہ درکار ہوتا ہے کیونکہ اس سے قبل اس کے ٹوٹ کر گرنے والے پر دوبارہ میسر نہیں آپاتے۔ البتہ فلسفی کی روح جو مکاری اور

حیلہ سازی سے مبرا اور پاکیزگی کی حامل ہوتی ہے یا ایک عاشق کی روح جو خصائص میں فلسفی کی روح کے قریب تر ہوتی ہے اس مرحلے سے گزرنے میں بہت کم وقت لیتی ہے جو ایک ہزار سال کے ایک تہائی کے برابر ہوتا ہے۔

یہ عام اچھے اور نیک انسانوں سے بھی منفرد ہوتے ہیں جن کے لیے قلب ماہیت کا یہ عرصہ تین ہزار سال مقرر ہے اور جو روحیں ایسی زندگی تین ہزار سال تک تواتر بحال رکھنے میں کامیاب رہتی ہیں انھیں دوبارہ پر عطا ہو جاتے ہیں اور یوں تین ہزار سال کے اختتام پر (پر عطا ہونے کے باعث) یہ روحیں پھر سے اپنی نئی منزل (حصول درکِ حقیقتِ مطلقہ) پر روانہ ہو جاتی ہیں۔ دیگر کم مرتبہ روحوں کو ہر دورِ حیات کے اختتام پر امتحان اور حساب کتاب کے مرحلے سے گزرنا پڑتا ہے اور جو روحیں، جب بھی اس آزمایش اور حساب میں پوری اُترتی ہیں انھیں بھی پھر سے تلاشِ منزل کے سفر پر روانگی کی اجازت مل جاتی ہے۔ البتہ ان میں سے کچھ روحیں ایسی بھی ہوتی ہیں جنھیں کچھ عرصہ عالم برزخ میں گزارنا ہوتا ہے جہاں ان کا تجزیہ ہوتا ہے اور وہ تہذیب و تنقیح کے مراحل سے گزرتی ہیں۔ یہ اصلاح خانہ زیرِ زمین ہوتا ہے جہاں تدفین کی صورت میں ارواح پہنچائی جاتی ہیں۔ اس عالم تزکیہ سے بآسانی گزرنے والوں کو ایک طرح کے بہشت ہی کا ماحول میسر آتا ہے البتہ اس ماحول کی آسایشات ان اعمال سے متناسب ہوتی ہیں جو ان سے بطور انسان کے سرزد ہوئے ہوتے ہیں۔ اس تمام تفصیل کی توضیح و توجیہ یہ ہے کہ ایک دانا انسان کے دائرۂ فہم میں کائنات کے کتنے ہی تصورات صحیح صحیح آ جاتے ہیں اور انسانی فہم و ادراک میں معقولیت، منطق اور دلائل کی صورت میں محفوظ ہوتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ تمام تفاصیل اور مناظر انسان کی نظروں سے اس وقت گزر چکے ہوتے ہیں جب اس کی روح دیوتاؤں کی روح کے تعاقب میں بھٹکتی پھرا کرتی تھیں۔ ہم نے جو روحانی سفر کے حوالے سے روحوں کی بابت کہا تھا کہ ایک مرحلے پر یہ اوپر نگاہ ڈالتی ہیں کہ حقیقت مطلقہ کو نظر بھر کر دیکھ سکیں۔ سو ایسے مناظر بھی دنیاوی زندگی میں خفیہ یادداشتوں کے ذخیرے کی صورت میں موجود رہتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ فلسفی ہی کی روح کے پر بحال رہتے ہیں اور یہی انصاف بھی ہے کیونکہ فلسفی ہمیشہ اپنی سوچ اور فکر کو اپنی صلاحیتوں کے تناسب سے زحمت پرواز دیتا ہے اور اسی تخیل کی پرواز میں دراصل وہ دیوتاؤں کو اپنے آفاقی مسکن میں سکونت پذیر دیکھتا ہے اور اسی یادداشت میں دیوتاؤں کے حقیقی مدارج کا

ادراک بھی محفوظ ہوتا ہے لہٰذا وہی فرد (فلسفی) تحیرات کائنات میں کما حقہ، تصرف قائم کرنے اور تکمیل ذات پر قادر آ سکتا ہے جس نے اس عہدِ روحانی کی زیادہ سے زیادہ تفصیلات اپنی یادداشت میں محفوظ کی ہوتی ہیں مگر اس دانا شخص نے چونکہ دنیاوی معاملات کو پس پشت ڈال دیا ہوتا ہے اور محض آفاقی معاملات کو درخور اعتنا سمجھتا ہے لہٰذا کم ظرف دنیادار اسے مجنون قرار دیتے ہیں۔ وہ اسے تضحیک کا نشانہ بناتے ہیں اور نہیں جانتے کہ وہ شخص تو القا والہام کی کئی منزلیں طے کر چکا ہے۔

گفتگو کے اس مرحلے پر میں جنون کی چوتھی قسم کی تفصیلات بیان کر رہا تھا۔ یہ جنون اس فرد کو نصیب ہوتا ہے جو اس مادی دنیا کے حُسن کو دیکھ کر کائنات کے حسنِ ازلی کے مناظر یاد کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو جو اس ازلی وابدی حسن کی تلاش وجستجو میں مائل بہ پرواز ہونا چاہتا ہے مگر ایسا کر نہیں سکتا۔ اس کی مثال اس پرندے کی سی ہوتی ہے جو شوقِ پرواز میں اوپر ہی اوپر دیکھتا چلا جاتا ہے اور یوں اپنے سے نیچے کی دنیا کو نظر انداز کر بیٹھتا ہے اور لوگ اسے دیوانہ اور مجنون پکار اُٹھتے ہیں (شاید چکور کا شمار اسی لیے دیوانگی کے شکار پرندوں میں ہوتا ہے)۔ یوں میں نے اس گفتگو کے ذریعے القا والہام کی صلاحیت کو دیگر تمام انسانی صلاحیتوں کے مقابلے میں سب سے زیادہ مقدس اور قابلِ اعتنا ثابت کیا ہے اور یہ نتیجہ ہے انسانی شخصیت کی بلند ترین صلاحیتوں کا اور جو شخص اس خاصیت کے طفیل حسن سے محبت کرے اسی کو عاشق کہیں گے۔ یہ میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ انسانی روح اپنے روحانی سفر میں اور تکمیلِ فطرت کے مرحلے میں حقیقتِ مطلقہ کو نظر بھر کے دیکھ چکی ہوتی ہے کیونکہ یہ روح کے انسانی پیکر میں ڈھلنے کے عمل کا ایک طے شدہ مرحلہ ہے۔ البتہ یہ سچ ہے کہ تمام روحیں آسانی کے ساتھ اس ماورائی دنیا کے مناظر کو برابر سہولت اور آسانی سے یادداشت کی سطح پر نہیں لا سکتیں۔ اس کی کئی وجوہات ہو سکتی ہیں مگر آسانی سے قابلِ بیان وجوہات میں سے ایک تو یہ ہے کہ بعض روحوں کو وہ مناظر دیکھنے کا موقع مختصر ترین وقفے کے لیے میسر آتا ہے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ بعض روحیں دنیاوی زندگی کے بُرائی کے عوامل کے ہاتھوں میں کھلونا بن کر نیکی کے عوامل سے اتنی دور نکل جاتی ہیں کہ ان کی یادداشت ان پاکیزہ روحانی مناظر کے لیے بہت کمزور ثابت ہوتی ہے۔ بہت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کی یادداشت میں اس روحانی منظر کی بڑی واضح تفصیلات باقی رہ جاتی ہیں۔ چنانچہ جب وہ اس آفاقی حسن کا کوئی شائبہ اس دنیا میں

دیکھتے ہیں تو بحرِ تحیر میں غوطہ کھانے لگتے ہیں۔ تاہم وہ اپنے اس تحیر کو کوئی واضح مفہوم عطا نہیں کر سکتے کیونکہ ان کی یادداشت واضح ہونے کے باوجود ادھوری ہوتی ہے اور اس ادھورے پن کی وجہ ان کے ذہن میں عدل، اعتدالِ ذات اور ایسے بلند خیالات کی واضح تصویر دنیاوی معاملات کے حوالے سے موجود نہیں ہوتی۔ اس صورتِ حال کی مثال ایسے ہے جیسے ہم کسی کھڑکی کے دھندلے شیشوں میں سے باہر کا منظر دیکھیں (کہ منظر کی تفصیلات تو نظر آئیں گی مگر واضح نہ ہوں گی)۔ بہت ہی کم لوگ ان دھندلے مناظر میں سے حقیقت کو پہچان پاتے ہیں اور وہ بھی بڑی دقت سے۔ ایک وقت وہ تھا جب انھوں نے (روحوں کے جمگھٹے میں اور خود بھی ایک روح کی حالت میں) اس منظر کو اظہر من الشمس دیکھا تھا۔ ہم فلسفیوں نے زیوس کی پیروی میں اور دوسری روحوں نے دوسرے دیوتاؤں کی تقلید میں جب اس پُرمسرت منظر پر نظر ڈالی تھی تو ایک ایسے عالم حیرت میں جا پہنچے تھے جسے بلاشبہ خدا کی مہربانی کا ایک کرشمہ کہا جا سکتا ہے۔ ہم نے اس منظر اور اس کے حسن کو پوری معصومیت کے ساتھ اپنے اوپر طاری کر لیا کیونکہ ہمیں کوئی بدی ورغلانے میں کامیاب نہیں ہو سکی تھی۔ ہم نے جو نظارہ دیکھا اس میں معصومیت، پاکیزگی، سادگی، سکون اور طمانیت کا ایک خوبصورت امتزاج تھا اسے ہم نے شفاف نور سے منور دیکھا۔ وہ منظر بھی پاکیزہ تھا اور ہم بھی پاک صاف تھے اور ابھی ہم سیپ میں بند موتی کی مانند جسم کی قید میں نہیں آئے تھے۔ ذرا ایک لمحے رُک کر مجھے ان گزرے مناظر کی یادوں سے لطف اندوز ہونے دیجیے۔

مگر وہ حسن میں پھر دہراتا ہوں کہ وہ حسن دیگر اصنافِ حسن کی معیت میں منور تھا اور زمین پر آ کر ہم نے یہاں بھی اسی حُسن کی جھلکیاں دیکھی ہیں۔ اگرچہ یہ نظارہ ہم نے حسیات کے شفاف ترین ذریعے سے شفاف اور منور صورت میں کیا ہے کیونکہ نظر ہی دراصل ہماری حسیات میں سے سب سے زیادہ آر پار گزر جانے والی حس ہے۔ البتہ اس ظاہری نگاہ سے ذہانت اور دانائی کو دیکھنا ممکن نہیں۔ اس کا بھی اگر کوئی دائرہ نظر میں آنے والا عکس موجود ہوتا تو شاید نگاہ کے دائرہ اثر میں آ جاتا۔ اسی طرح خیالات بھی دیکھے جا سکتے ہیں اور اس صورت میں ہم خیالات اور ذہانت وفطانت کے حُسن کو بھی شاید دیکھ پاتے۔ مگر یہ صرف حُسن کا اعزاز ہے کہ اسے ہم دلکش ترین ہونے کے باوجود ظاہری آنکھ سے بھی دیکھ سکتے ہیں جو لوگ معصوم نہیں ہوتے اور مادی آلائشوں میں گھرے رہنے والے ہوتے ہیں وہ حُسن کے احساس کے لیے اپنے دائرے سے باہر نہیں نکل پاتے۔ وہ

اگر حُسن کو دیکھ بھی لیتے ہیں تو فقط اس کا ظاہری پہلو دیکھ سکتے ہیں۔ حقیقتِ حُسن سے آگاہی ان کا مقدر نہیں ہوتی۔ ان کی دسترس میں اگر حُسن کا کوئی پہلو آ بھی جائے تو وہ اس کے نظارے سے دل کو منور کرنے کی بجائے بھوکے درندے کی طرح اس پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ ایسے میں وہ اپنے سفلی جذبات کی رو میں یوں بہ جاتے ہیں کہ قانونِ فطرت کو توڑنے کے مکروہ فعل کے باوجود شرمندگی محسوس نہیں کرتے۔ مگر ایسا فرد جو اس پُر فریب دنیا میں نو آموز ہے (اور گناہ کے عوامل نے ابھی اس کی معصومیت کو آلودہ نہیں کیا) وہ جب کسی حسین چہرے اور جسم کو دیکھتا ہے تو اس میں اسے دیوتاؤں کا حُسن نظر آتا ہے۔ اسی لیے پہلی نظر میں ہی اس کے رگ و پے میں بجلی سی دوڑ جاتی ہے اور اس پر وہی (روحانی حالات والی) کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ یوں وہ اپنے محبوب کے چہرے کو یوں دیکھ کر اس کی پرستش کرتا ہے جیسے اس نے کسی دیوتا کی زیارت کی ہو اور اس وقت اگر اسے دنیا کی نظروں میں دیوانہ اور مجنون قرار دیے جانے کا ڈر نہ ہو تو وہ اپنے محبوب کے سامنے بھی یوں قربانی پیش کرنے لگے جیسے وہ سچ مچ دیوتا کے چرنوں میں کوئی بھینٹ پیش کر رہا ہو۔ ایسے عالم میں جب وہ اپنے محبوب کے چہرے پر نظر ڈالتا ہے تو وہاں اسے ایک قسم کا ردِعمل نظر آتا ہے تو اس کی کپکپاہٹ ایک انوکھی گرمجوشی اور پسینے میں بدل جاتی ہے۔ چونکہ حُسن کا یہ منظر اس کے دل میں آنکھوں کے ذریعے اُترتا ہے لہٰذا آنکھوں کی نمی کے باعث اس کی روح کے پروں والی جگہ گیلی ہو جاتی ہے اور اس میں ایک گرمجوشی پیدا ہو جاتی ہے اس کیفیت کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ سوراخ جو پر جھڑ جانے سے سخت ہو کر بند ہو چکے تھے پگھلنے لگتے ہیں اور یوں وہ سوراخ کھل جاتے ہیں اور پروں کے اُگنے کے لیے صورت حال سازگار ہو جاتی ہے۔ ان کی جڑیں پھول کر اُگنے کی کیفیت کا اظہار کرنے لگتی ہیں اور اس روئیدگی کا اثر پوری روح پر طاری ہو جاتا ہے جیسے آن کی آن میں اسے پر عطا ہو گئے ہوں۔ اس عمل کے دوران پوری روح پر کھولتے جذبات کی کیفیت طاری ہو جاتا ہے اور وہ ایک عجیب قسم کی مہک میں بھیگنے لگتی ہے۔ اس حالت کو اس کیفیت سے مشابہ قرار دیا جا سکتا ہے جب دانت نکلتے وقت مسوڑھوں میں عجیب گدگدی سی ہونے لگتی ہے (اور اسی وجہ سے بچے دانت نکلنے کی عمر میں کوئی نہ کوئی شے اپنے مسوڑھوں پر رگڑتے دکھائی دینے لگتے ہیں۔ اس کے دماغ میں کھد بد ہونے لگتی ہے اور وہ عجیب سی بے چینی اور اضطراب محسوس کرنے لگتا ہے)۔ اس انداز میں جب روح کو دوبارہ نئے سرے سے پر نصیب ہونے لگتے ہیں تو محبوب کے حُسن سے

اس کی آنکھوں میں کچھ اور ہی تاثر قائم ہو جاتا ہے۔ ایسے عالم میں محبوب کے وجود سے عجیب سی مقناطیسی توانائی کے ذرات نکل کر روح تک پہنچتے ہیں اور توانائی کے اسی بہاؤ کو جذبات کا نام دیا گیا ہے۔ روح ان جذبات سے تازہ دم اور گرمجوش ہو جاتی ہے اور اسی لیے اس کا دھیما دھیما درد (جو پروں کے اُگنے کے باعث اس کے وجود میں سرایت کر گیا تھا) مسرت وانبساط میں بدل جاتا ہے۔ اگر اسی دوران روح سے اس کا محبوب بچھڑ جائے تو وہ نمی جس نے اس کے وجود کو گدازی عطا کی تھی مفقود ہو جاتی ہے اور اس طرح وہ مسام جن سے پروں کی روئیدگی کا عمل شروع ہوتا تھا خشک ہو کر بند ہو جاتے ہیں اور یوں پروں کی روئیدگی کا عمل رُک جاتا ہے۔ اس سے جذبات کے بہاؤ میں بھی رُکاوٹ آ جاتی ہے اور روح پسینے پسینے ہو جاتی ہے، اس میں دھڑکن کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ جب یہ دھڑکن قابو سے باہر ہونے لگتی ہے تو کوئی قریبی نس پھٹ جاتی ہے جس سے روح کو درد، تکلیف اور بے چینی کی سی کیفیت میں مبتلا ہونا پڑتا ہے۔ ایسے میں اگر کوئی شے راحت پہنچا سکتی ہے تو وہی زیارتِ حسنِ ازلی ہے۔ یہ دونوں کیفیتیں روح کو ایک عجیب اور بہت انوکھے احساس میں مبتلا کر دیتی ہیں۔ جس سے اس پر ایک عجیب سا جوش وخروش، طاری ہو جاتا ہے چنانچہ اس روح.........کو نہ رات کی نیند نصیب ہوتی ہے نہ دن کا چین۔ گویا اس پر ایک طرح کی دیوانگی طاری ہو جاتی ہے اور وہ حُسن کے نظارے کی طلب میں سرگرداں ہو جاتی ہے۔ اس کی سرگردانی میں افاقہ اسی صورت میں ممکن ہے جب اُسے کوئی حسین چہرہ نظر آ جائے اور وہ اس کے حسن کے تصور میں غوطے لگا سکے۔ اس کے بعد ہی اسے چین آتا ہے اور اس کی بے قراری اور درد راحت میں بدل جاتا ہے۔ یہ وہ انوکھا ترین لطف ہے جو روح کو حاصل ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سچا عاشق اپنے محبوب سے جدائی کا تصور تک نہیں کر سکتا۔ کیونکہ وہ اسے کائنات کی ہر شے سے زیادہ چاہتا ہے اور محبوب اس کے لیے سامانِ راحتِ جاں ہے۔ یہ تو ممکن ہے کہ وہ اپنے ماں باپ اور بہن بھائیوں کو بھول جائے، یہ بھی ممکن ہے کہ وہ دوست احباب کے علاوہ اپنی جان ومال تک سے بے نیاز ہو جائے اور اسے اپنی عزت ووقار کا بھی احساس نہ رہے مگر یہ ممکن نہیں کہ وہ ایک لمحے کے لیے بھی اپنے محبوب کو بھول سکے بلکہ وہ تو اپنے تمام سابقہ فخر ومباہات معاملات کو بھلا کر اپنے آپ کو محبوب کی یاد اور طلب میں گم ہو جاتا ہے۔ وہ گھر کے آرام وراحت کو ترک کر کے محبوب کی گلی کی ریت پر سونے میں فخر محسوس کرتا ہے کیونکہ وہی اس کی چاہت اور عبادت وریاضت اور پرستش کا

مرکز ہوتا ہے۔ یہ محبوب ہی ہے جو اس کے زخم دل پر مرہم رکھ سکتا ہے اور اس کے دردِ دل کا علاج کر سکتا ہے اور اے میرے فرضی نوجوان جس سے میں مخاطب ہوں، یہی وہ کیفیت ہے جسے محبت کہتے ہیں اور دیوتاؤں کے ہاں بھی ایک لفظ ہے کہ جسے تم اپنی سادگی کی بدولت نقل کرنا چاہو گے۔ اپوکرائفل (Apocryphal) کی تحریر میں دو مصرعے ہیں جنھیں ہومر سے منسوب کیا جاتا ہے۔ ان میں یہ نام موجود ہے۔ ان میں سے ایک دائرۂ پیمائش میں ہونے کی بجائے غیر معمولی ہے۔ وہ مصرعے یہ ہیں:

"فانی لوگوں کے نزدیک یہ مجازی اور عارضی محبت ہے
مگر غیر فانی مخلوق میں یہ جذبہ قوتِ پرواز رکھتا ہے۔
کیونکہ پروں کا اُگنا اس کی زندگی کی ضرورت ہے۔"

آپ کو اس پر پسند کیے بغیر یقین نہیں آ سکے گا۔ بہر صورت محبوب عاشق اور ان کے عشق کی یہی توجیہہ و توضیح درست ہے جو میں پیش کر چکا ہوں۔

اب اگر کوئی فرد عظیم دیوتا زیوس کی خدمت پر مامور ہو تو اس میں یقیناً یہ حوصلہ اور صلاحیت موجود ہوگی کہ وہ اصل محبت کا بوجھ اُٹھا سکے۔ مگر ایریس (Ares) کے خدام اور ساتھیوں پر جب محبت اثر انداز ہوتی ہے تو اگر ان کو ذرا بھی احساس ہو جائے کہ ان سے کچھ خطا سرزد ہوئی ہے تو وہ خود کو بھی مار ڈالیں گے اور اپنی محبت اور محبوب کا بھی گلا گھونٹ دیں گے اور وہ جنھوں نے دوسرے دیوتاؤں کے قافلے کا ساتھ دیا ہوگا، بشرطیکہ وہ بدی کی قوتوں کا اسیر نہ ہوا ہو اور اس کا ازلی زیارتِ حقیقت مطلقہ کا تاثر بھی ابھی تک قائم ہو تو ایسے افراد اپنے پیشرو دیوتا کی تقلید کرتے اور اس ضمن میں اس کے نقشِ قدم پر چلتے ہیں اور جہاں تک ممکن ہو اس میں کوتاہی نہیں کرتے۔ ایسے افراد یا روحیں اپنی اس ارضی زندگی کے اوّلین دور میں اپنے محبوب سے اختلاط کے ضمن میں یا دیگر بنی نوع انسان سے سلوک کی صورت میں اپنے پیشرو دیوتا ہی کا سا رویہ اختیار کرتے ہیں۔ حسن کی صفوں اور مدارج میں سے ہر کوئی اپنے ذوقِ سلیم کے مطابق محبوب منتخب کرتا ہے اور اسی کو اپنا معبود قرار دے لیتا ہے اور اس کے ساتھ اس کا سلوک بالکل ایسے ہی ہوتا ہے جیسے وہ دل و جان سے اس کی پرستش کرتا ہے۔ زیوس دیوتا کے پیروکاروں کی خواہش ہوتی ہے کہ ان کے محبوب میں عظیم دیوتا زیوس کی زیادہ سے زیادہ خوبیاں پائی جائیں۔ سو وہ ایسے فرد کا انتخاب کرتے ہیں جو فطرتاً فلسفیانہ مزاج اور

عقلیت پسند ہو۔ اور جب وہ ایسے کسی فرد کو پالیتے ہیں اور اس سے باقاعدہ محبت کرنے لگتے ہیں تو اس میں مذکورہ خصائص کے مضبوط قیام کے لیے ہر مناسب ذریعہ اختیار کرتے ہیں اور اگر انھیں اس فرض سے سبکدوش ہونے کا قبل ازیں کوئی تجربہ نہ ہو تو وہ کسی بھی شخص سے جو ان کی رہنمائی کی صلاحیت رکھتا ہو اس کا طریقہ سیکھتے اور اس پر عمل کرتے ہیں۔ ایسے لوگ اپنے دیوتا کے خصائص اپنی ذات میں پیدا کرنے میں کم ہی دقت محسوس کرتے ہیں کیونکہ اپنی چاہت کے باعث انھو ں نے اس کی ذات کا مشاہدہ دقت نظر اور دلجمعی سے کیا ہوتا ہے۔ لہٰذا ان کی یادداشت واضح ہوتی ہے اور اس سے وہ منسلک رہتے ہیں اور یوں اپنے محبوب اور معبود کے خصائص میں جاری وساری ہو جاتے ہیں۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہی ہے جیسے بندے میں خدائی صفات منتقل ہو جاتی ہیں۔ وہ اپنے محبوب میں معبود کا عکس دیکھتے ہیں۔ یوں ان کی محبت ہر لمحے شدید سے شدید تر ہوتی چلی جاتی ہے اور اگر اپالو (عاشق) کی طرح وہ اپنے خدا سے ادراک حاصل کرتے ہوں تو اپنے محبوب کو اپنے جذبات اور چاہت کے چشمے سے سیراب کرتے ہیں تاکہ وہ ان کے معبود کے زیادہ سے زیادہ مشابہ ہو جائے مگر جو ہرا (Hera) کے پیرو ہوتے ہیں انھیں کسی شاہی محبوب کی تلاش ہوتی ہے اور جب وہ اسے پا جاتے ہیں تو اس کے ساتھ مرشد کے پیروکاروں کی طرح سلوک کرتے ہیں۔ اسی طرح اپنے دیوتا اور دیگر دیوتاؤں کے پرستار اور پیروکار بھی ایسے ہی محبوب تلاش کرتے ہیں جس میں ان کے معبود کے خصائص اپنانے کی صلاحیت موجود ہو اور جب کسی ایسے فرد کو پا جائیں تو خود اپنے معبود کی نقل کرتے اور چاہتے ہیں کہ محبوب بھی ایسا ہی کرے اور جہاں تک ان سے ممکن ہو اپنے محبوب کو ایسی ہی تعلیم وتربیت سے گزارتے ہیں کہ وہ ان کے مقصد کے حصول کے عمل میں ان سے پورا پورا تعاون کرتے ہیں۔ دراصل ان میں حسد اور دشمنی کے جذبات پروان نہیں چڑھ سکتے۔ لہٰذا ایسی قباحتوں سے ان کے محبوب محفوظ رہتے ہیں۔ تاہم ان کی پوری کوشش ہوتی ہے کہ وہ اپنے محبوب میں خود اپنے اور اپنے معبود کے جس قدر خصائص ممکن ہو منتقل کرسکیں۔ لہٰذا محب عاشق کی خواہش اس کے محبوب کے لیے انتہائی معقول اور لازم ہوتی ہے۔ اس کی بنیاد ان کے ابتدائی عشق کے مرحلے میں، جیسا کہ میں نے پہلے بھی کہا، موجود ہوتی ہے۔ بشرطیکہ عاشق اور معشوق متصل ہو پائیں اور اس سے ان کے مقصدِ حیات کو تقویت ملے۔ اب آیئے میں آپ کو بتاؤں کہ محبوب کو متاثر کرنا کیسے ممکن ہے؟

اس گفتگو کے آغاز ہی میں، میں کہہ چکا ہوں کہ میں روح کو تین حصوں میں تقسیم کرتا ہوں، یعنی دو گھوڑے اور ایک رتھ بان اور (عام انسانوں کی صورت میں) ایک گھوڑا خوش نہاد جبکہ دوسرا بدنہاد ہوتا ہے۔ یہ تقسیم اپنی جگہ پر ہے مگر ابھی میں نے یہ وضاحت نہیں کی کہ خوش نہاد گھوڑے میں نیکی کے کون کون سے پہلو پوشیدہ ہوتے ہیں اور بدنہاد میں بُرائی کے کون کون سے؟ اب میں اسی وضاحت کے ساتھ آگے بڑھوں گا۔ دائیں جانب والا گھوڑا بلند قامت، شفاف جلد، سفید رنگ اور گہری سیاہ آنکھوں والا ہوتا ہے۔ اس کی گردن لمبی اور ناک ستوان ہوتی ہے۔ یہ معززین اور اصحاب مؤدت کو پسند کرنے والا ہوتا ہے۔ چنانچہ یہ سچی اور حقیقی کامیابی و کامرانی پر یقین رکھتا ہے۔ اسے کوڑے یا ایڑ کی ضرورت نہیں پڑتی بلکہ وہ زبانی حکم اور اشارے پر چلتا ہے۔ بائیں طرف والا گھوڑا بڑا مکار اور بے ڈھنگا جانور ہوتا ہے۔ وہ کوتاہ مگر موٹی گردن کا مالک ہوتا ہے۔ اس کا رنگ شربتی، آنکھیں بھوری اور چہرہ سپاٹ ہوتا ہے۔ اس پر تعظیم اور بے عزتی دونوں بے اثر ہوتے ہیں۔ وہ بہرا اور بالوں سے بھرے کانوں والا ہوتا ہے اور اس پر کوڑا یا ایڑی بھی مشکل سے اثر کرتے ہیں۔ چنانچہ جب رتھ بان کی نگاہ محبوب پر پڑتی ہے تو اس کے حسن کی چکاچوند سے اس کی پوری روح پسیج جاتی ہے اور خواہش وصال کی شدت سے اس کی رگوں میں خون کی گردش تیز ہو جاتی ہے اور وہ عجیب سی بے چینی کا شکار ہو جاتا ہے۔ ایسی حالت میں خوش نہاد گھوڑا فطری شرم اور معقولیت کے باعث محبوب پر جھپٹ پڑنے سے کتراتا ہے مگر دوسرا جو ایسی کیفیتوں کے احساس سے عاری ہوتا ہے، کچھ اپنی بدفطرتی کے باعث اور کچھ کوڑے اور ایڑ کے ردعمل کے طور پر بھاگ اُٹھتا ہے اور اپنے ساتھی گھوڑے اور رتھ بان دونوں کو عذاب میں ڈالتا ہے، کیونکہ اس وقت رتھ بان پوری کشش سے حسنِ محبوب کی طرف مائل ہوتا ہے اور فوراً اس سے مل کر وصال کے لمحوں کے احساس کو اپنی یادداشت میں سمیٹنا چاہتا ہے۔ پہلے پہل تو دونوں گھوڑے اسے خفگی کے ساتھ محبوب کے اختلاط سے باز رکھنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن جب اسے بضد پاتے ہیں تو بالآخر رام ہو جاتے ہیں اور اس کے حکم کی تعمیل پر مائل ہو جاتے ہیں۔

گویا دونوں گھوڑے حکم کی تعمیل میں وہیں پہنچتے ہیں جہاں محبوب اپنے حسن کی کرنیں بکھیر رہا ہوتا ہے۔ رتھ بان جونہی اسے دیکھتا ہے اسے محبوب کی معیت میں حسن ازلی کا نظارہ یاد آ جاتا ہے وہ بھی ایسے جیسے کوئی تصویر یا بت تقدس کے باعث کسی اونچے سنگھاسن پر رکھا ہو۔

رتھ بان حسنِ ازلی کو دیکھتا ہے تو اس پر ایک عجیب خوف طاری ہو جاتا ہے اور وہ اچانک (احترام کے باعث) پیچھے ہٹتا ہے تو ریس میں حصہ لینے والے رتھ بان کی طرح گر جاتا ہے اور بے ساختہ دونوں گھوڑوں کی باگیں کھنچ جاتی ہیں اور دونوں پچھلی ٹانگوں پر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ البتہ ایک گھوڑے کا رویہ (دائیں جانب والے کا) اس مرحلے پر بھی مثبت ہوتا ہے اور وہ رتھ بان کے خلاف جدوجہد نہیں کرتا البتہ دوسرا جو مقابلتاً اکھڑ ہوتا ہے وہ مشکل سے قابو آتا ہے۔ تاہم جب دونوں ذرا سا پیچھے ہٹتے ہیں تو ان میں سے ایک (غالباً دائیں جانب والا) کو شرمندگی اور تحیر گھیر لیتا ہے اور اس کا پورا وجود (روح) پسینے پسینے ہو جاتا ہے۔ البتہ دوسرا، جب اس کی لگام ذرا ڈھیلی ہوتی ہے اور گرنے کے دھچکے سے سنبھل جاتا ہے اور اس حادثے کی تکلیف ذرا کم ہوتی ہے تو اس پر غصے کا غلبہ ہو جاتا ہے۔ اس وقت اس شدید غصے پر قابو پانے کے لیے اسے دوسرے گھوڑے اور رتھ بان کی ہمدردی کی ضرورت پڑتی ہے۔ نتیجتاً انھیں اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ ان کا رویہ غیر معقول تھا اور ان سے سخت حماقت کا ارتکاب ہوا ہے وہ حسن کی توہین کے مجرم ٹھہرتے ہیں۔ ایسا بار بار ہوتا ہے یعنی رتھ بان، بار بار حسن کی قربت پر قید لگاتا ہے اور گھوڑے بار بار عدم تعاون کا اظہار کرتے ہیں۔ آخر وہ اسے قائل کر لیتے ہیں کہ وہ آئندہ موقع تک صبر و سکون سے انتظار کرے۔

جب دوسرے موقع کا مقررہ وقت آن پہنچتا ہے تو گھوڑے یوں ظاہر کرتے ہیں جیسے وہ گزشتہ حادثے کو قطعی بھول چکے ہیں اور آئندہ کوشش کا کوئی پروگرام انھیں یاد نہیں مگر رتھ بان انھیں یاد دلا دیتا ہے اور یوں وہ پھر سے اُڑی کرتے، اُچھلتے کودتے، ہنہناتے ہوئے آخر رتھ بان کے مجبور کرنے پر پھر اسی حسن کی قربت میں جانے کی سعی کرتے ہیں اور جونہی ذرا قریب جاتے ہیں تو بدنہاد گھوڑا پھر بپھر جاتا ہے۔ وہ سر خمیدہ کر کے دم اُٹھا لیتا ہے اور کڑیالے کو دانتوں میں دبا کر بے شرمی سے کھینچتا ہے۔ رتھ بان اس مرتبہ زیادہ بُری طرح گرتا ہے بالکل ایسے ہی جیسے دوڑ میں کسی رتھ کے پہیوں کے راستے میں کوئی اچانک رکاوٹ آنے سے رتھ بان اُچھل کر دور جا گرتا ہے۔ مگر وہ لگام تھامے رکھتا ہے اس کی خوب ٹھکائی کرتا ہے۔ ایسا جب کئی بار ہو چکتا ہے تو بدطینت گھوڑے کی شیطنت بھی کافی دھیمی پڑنے لگتی ہے اور آہستہ آہستہ وہ رام ہو جاتا ہے اور پھر رتھ بان کے اشارے پہ چلنے لگتا ہے۔ یہاں تک کہ اب حسین محبوب پر نظر پڑتے ہی اس پر خوف طاری ہونے لگتا ہے۔

اس دوران محبوب جسے ہر طرح کی پرستش اور مدارات میسر ہوتی ہیں اور وہ بھی دکھاوے کی نہیں بلکہ دل کی گہرائیوں سے تو قدرتی طور پر اس کی شرم وحیا میں بھی کمی آنے لگتی ہے اور عاشق کو اب التفات میسر آنے لگتا ہے۔ اب گزشتہ شرم وحیا در خور اعتنا نہیں رہتی اور وہ تھی بھی تو محبوب کے بے تکلف دوستوں کے باعث کہ جو اسے ہر وقت طعن وتشنیع کے ذریعے باور کراتے رہتے تھے کہ جو کچھ اس کے ساتھ ہو رہا ہے باعثِ توقیر نہیں ہے۔ اب وقت گزرنے کے ساتھ گویا وہ مخصوص لمحہ آن پہنچتا ہے جب محبوب کے اپنے اندر تعاون اور باہمی التفات کا جذبہ اس کی بالغ نظری کے باعث مضبوط سے مضبوط تر ہونے لگتا ہے۔ ابھی تک گویا تقدیر نے اچھے اور بُرے دونوں کے مابین دوستی اور اپنائیت کو ممنوع قرار دے رکھا تھا مگر جب محبوب کا التفات عاشق سے بڑھتا ہے تو محبوب پر یہ اسرار کھلتے چلے جاتے ہیں کہ یہ عشق ومحبت تو دنیا کے تمام تعلقات اور رشتوں سے کہیں زیادہ قابلِ فخر تعلق ہے۔ بلکہ باقی رشتوں کا تو اس تعلق سے کوئی مقابلہ ہی نہیں۔ جب اس کا یہ رویہ کچھ عرصہ جاری رہتا ہے اور وہ وقتاً فوقتاً جمناسٹک کی مشقوں یا ایسے دوسرے مواقع پر اپنے عاشق سے ذرا زیادہ ہی قریب ہوتا ہے تو اس کے اندر لطیف جذبات کا ایک فوارہ سا پھوٹنے لگتا ہے بالکل ایسا ہی جیسا عظیم دیوتا (زیوس) کے من میں اس وقت پھوٹا تھا جب اسے جینیمیڈ (Ganymede) نامی ''خواہش'' (Desire) سے عشق ہو گیا تھا۔ یہ چشمہ عاشق کو مکمل طور پر بھگو ڈالتا ہے۔ بلکہ اس چشمے کا کچھ پانی اس کی روح میں بھی داخل ہو جاتا ہے اور اسے پُر کر کے باہر گرنے لگتا ہے اور جیسے ہوا کے نرم ولطیف جھونکے یا بلند آہنگ صدائیں سخت چٹانوں سے ٹکرا کر بازگشت کی صورت میں لوٹ آتی ہیں یہی حشر حسن کی شعاعوں کا ہوتا ہے، جب وہ روح کی کھڑکیوں یعنی آنکھوں کے راستے سے گزر کر دوبارہ حسین محبوب تک لوٹتی ہیں یعنی وہ عاشق کی آنکھوں میں اپنے حسن کا عکس دیکھتا ہے تو گویا روح کے پروں کے اُگنے کی جگہ بھی بھیگ کر نرم ہو جاتی ہے اور پر پھر سے اُگنے لگتے ہیں۔ اسی لمحے محبوب کا دل بھی محبت سے معمور ہو جاتا ہے۔ چنانچہ وہ محبت تو شروع کر دیتا ہے اگرچہ سمجھ نہیں پاتا کہ کیا کر رہا ہے۔ اسے خود اپنی کیفیت کی سمجھ نہیں آتی۔ ایسے لگتا ہے جیسے اسے اندھے پن کی بیماری کسی دوسرے سے لگ گئی ہے۔ اس لمحے اس کا عاشق ایک ایسا آئینہ ہوتا ہے جس میں اسے اپنے ہی حسن کی جھلک نظر آتی ہے اگرچہ وہ خود اس کیفیت کی اصلیت سے آگاہ نہیں ہوتا۔

اس وقت صورت حال کچھ ایسی ہوتی ہے کہ جب تک عاشق اور محبوب ایک دوسرے کے سامنے رہتے ہیں۔ ان کے دل کے درد میں افاقہ رہتا ہے جونہی بچھڑتے ہیں خود محبوب بھی دوبارہ وصال کی طلب میں تڑپنے لگتا ہے۔ اس وقت عاشق ہی کی تصویر اس کی نگاہوں میں پھرتی رہتی ہے اور عاشق کے دل میں محبوب کی محبت کا طوفان موجزن رہتا ہے۔ محبوب اگرچہ اسے محبت قرار نہیں دیتا بلکہ اسے فقط دوستی سمجھتا ہے۔ اس وقت محبوب کے دل میں عاشق سے وصال کی طلب موجود ہوتی ہے جو اگرچہ خود عاشق کی تڑپ سے قدرے کم ہوتی ہے۔ وہ اپنے عاشق کو دیکھنا، اسے چھونا، اس کے بوسے لینا، گلے لگانا چاہتا ہے مگر لطف کی بات یہ ہے کہ ایسا کر گزرنے کے بعد وہ طلب اور خواہش مٹ سی جاتی ہے۔ جب عاشق اور محبوب کی ملاقات ہوتی ہے تو عاشق کی روح کا بدنہاد گھوڑا رتھ بان سے التجا کرتا ہے کہ اس کی بے شمار تکلیف کے بدلے میں اسے راحت کے کچھ لمحات بھی میسر آنے چاہئیں۔ تاہم محبوب کی روح کے ایسے گھوڑے کی جانب سے کچھ بھی نہیں کہا جاتا کیونکہ اس وقت وہ ناقابلِ فہم جذبات کے نرغے میں ہوتا ہے۔ اس وقت عاشق کے گلے میں یوں بانہیں ڈالتا ہے جیسے کائنات میں اس سے بڑھ کر اس کی اور کوئی طلب نہ ہو اور جب عاشق اور محبوب ایسے عالم میں پہلو بہ پہلو ہوتے ہیں تو محبوب اسی مخصوص جذباتی کیفیت کے باعث عاشق کی کسی بھی خواہش کو رد کرنے کی جسارت نہیں کر سکتا۔ خواہ وہ کچھ بھی طلب کرے حالانکہ محبوب کی روح کی رتھ کا خوش نہاد گھوڑا اور رتھ بان دونوں مارے شرمندگی کے اسے اس سے لاکھ منع کریں مگر ان کی کوئی دلیل کارگر نہیں ہوتی۔

اس مخصوص لمحے کے بعد دونوں یعنی عاشق اور محبوب کی طمانیت کا دار و مدار اس پر ہے کہ وہ اپنے جذبات کو کس قدر کامیابی سے اپنی گرفت میں رکھ سکتے ہیں۔ اگر اس موقع پر ان کا شعور اور عقل و خرد ان کا ساتھ دے اور ان کی مثبت رہنمائی کرے تو وہ فلسفہ (فکر و نظر) اور معقولیت کے زیر اثر پوری زندگی اطمینان، طمانیت اور امن و سکون سے گزارنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔ اس وقت انھیں ایسی توانائی میسر آ جاتی ہے جس کی مدد سے وہ بدی کی قوت کو دبا دیتے ہیں اور کردار کے نیک پہلوؤں کو تقویت ملتی ہے اور جب یہ مرحلہ اسی اعتدالِ ذات کے باعث کامیابی سے پایۂ تکمیل کو پہنچ جاتی ہے تو ان کی روح بھی ذوق پرواز کے علاوہ صلاحیتِ پرواز (یعنی پر) بھی حاصل کر چکی ہوتی ہے اور اب وہ عالم بالا میں اپنے نئے سفر پر روانہ ہونے کے لیے تیار

ہوتی ہے۔ گویا اس نے تین آفاقی اولمپین مقابلوں میں سے پہلا پورے اعزاز کے ساتھ جیت لیا ہوتا ہے۔ یہ وہ کامیابی و کامرانی ہے کہ کوئی انسان علم یا آفاقی القا اس سے زیادہ باعث شرف و کرامت نہیں ہوسکتا اور اگر کہیں وہ فلسفہ (فکر و نظر) سے منھ موڑ لیں اور کسی کم درجہ زندگی کا انتخاب کر لیں تو نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کسی کمزور لمحے میں جب وہ شراب وغیرہ کے زیر اثر ہوں، دونوں ایسے وحشی جانوروں کی حیثیت اختیار کر جاتے ہیں جن کی روحوں کو ہر طرح کی نگرانی اور ہدایت سے چھٹکارا مل گیا ہو۔ اس لیے وہ اپنے دلوں کی اس خواہش کے آگے گھٹنے ٹیک دیتے ہیں جو کچھ لوگوں کو محسوس ہوتی ہے (مگر حقیقت اس کے برعکس ہے) اس کی خاصیت یہ ہے کہ جب ظالم ایک بار منھ سے لگ جائے تو زندگی بھر نہیں چھٹتی اور لوگ اس سے بظاہر لطف اندوز بھی ہوتے ہیں مگر یہ لطف جھوٹا ہوتا ہے کیونکہ اسے مکمل روح کی تائید حاصل نہیں ہوتی۔ وہ محبت کے لمحوں کے دوران بھی اور ان کے بعد بھی اگر چہ ایک دوسرے کو چاہتے رہتے ہیں مگر ان کی چاہت اوّل الذکر جوڑے جیسی سچی اور حقیقی نہیں ہوتی، کیونکہ اس جوڑے کے افراد تو ایک دوسرے کو اپنی زندگی اور ہستی کی مقدس ترین امانت سونپ چکے ہوتے ہیں اور انھیں یقین کامل ہوتا ہے کہ ان کا یہ تعلق عمر بھر دشمنی میں بدل نہیں سکتا۔ بالآخر ان کی روحیں اسی طرح پروں یعنی صلاحیت پرواز سے عاری جسم کی قید سے آزاد ہو جاتی ہیں اور انھیں محبت اور دیوانگی جیسا صلہ بھی میسر نہیں آتا۔ جبکہ وہ روحیں جو عالم افلاک کی جانب ایک بار اپنے ارتقا (معراج) کے لیے سفر کا آغاز کر لیں تو پھر پستی کی طرف رجعت نہ انھیں پسند ہوتی ہے نہ ان کے لیے ممکن ہی رہتی ہے۔ اس میں وہ زیر زمین (قبر) تاریکی سے بھی بے نیاز ہو جاتے ہیں اور وہ مسلسل اچھے شرکائے حیات کی طرح روشن زندگی گزارتے ہیں اور جب ان کے (روحوں کے) پر دوبارہ حاصل کرنے کا وقت آتا ہے تو ان کی یہی محبت ان کے پروں کی احسن تکمیل میں ممد اور معاون ثابت ہوتی ہے۔

سو میرے دوست! میرے نوجوان دوست! وہ آفاقی نعمتیں جو آپ کو آپ کے عاشق کی محبت کے ذریعے حاصل ہوں گی جواب نہیں رکھتیں۔ جبکہ ایک غیر عاشق کے ساتھ تعلق دنیاوی قوانین اور مادی قواعد و ضوابط سے ملوث رہتا ہے اور تمھارا باہمی تعلق دنیاوی لالچ اور حرص و طمع کے زیر اثر رہتا ہے اور تمھاری روح ایسی بیہودہ خواہشات کی آماجگاہ بن جاتی ہے جسے صرف معمولی عوام ہی پسند کر سکتے ہیں اور نتیجہ یہی ہوتا ہے کہ پھر آپ کی روح پورے نو ہزار سال تک اسی کرۂ ارض پر

بھٹکتی پھرے گی اور آپ اس کم مرتبہ دنیا میں ایک احمق کی طرح وقت گزارنے پر مجبور رہیں گے۔ سو عزیزم ایروس (Eros)، میں نے ہومر کے لفظوں میں اپنی بازآفرینی (رجعت) پیش کر دی ہے اور اس کے لیے جس قدر شاعرانہ انداز میں اختیار کر سکتا تھا وہ میں نے کیا ہے اور یہ میرے لیے یوں بھی ضروری تھا کہ میرے دوست فیڈرس کی یہی خواہش تھی اور اب میری استدعا ہے کہ میرے ماضی کو (گزشتہ گزارشات کو) نظرانداز کیجیے اور میرے حال (حالیہ گزارشات) کو قبول کیجیے اور مجھ پر اتنا احسان اور کرم فرمائی اور کیجیے کہ اپنے غضب کے باعث مجھے اپنے دیدار کے شرف سے محروم نہ کیجیے اور نہ مجھ سے محبت کرنے کا وہ فن ہی چھینیے جو فی الحقیقت آپ ہی کی عطا ہے بلکہ مجھے وہ صلاحیتیں اور ظرف عطا کیجیے جو مجھے اہلِ حسن کی نظروں میں اور معتبر کر دے اور اگر فیڈرس نے یا خود میں نے اپنی گزشتہ تقریر میں کوئی ناپسندیدہ بات کہہ دی ہے تو اس کے لیے لائسیاس ہی کو موردِ الزام ٹھہرایئے جو اس فن کا باپ ہے۔ ہمیں اس کے مزید اثر سے محفوظ رکھ اور اسے بھی توفیق دے کہ وہ اپنے بھائی پولیمارکس (Polemarchus) کی طرح فلسفے کا ریاض کرنے اور غور و فکر سے کام لینے کی راہ اپنائے۔ مجھے اُمید ہے کہ اس کا عاشق فیڈرس دو آرا کے درمیان لٹکا نہیں رہے گا۔ بلکہ اپنے آپ کو مکمل طور پر اور بہ دل و جان، محبت اور فلسفیانہ انداز اظہار کے لیے وقف کر دے گا۔

فیڈرس: سقراط! میں بھی آپ کی اس دعا میں شریک ہوتا ہوں اور یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اگر یہ میری بھلائی میں ہو تو آپ کا کہا درست ثابت ہو مگر مجھے حیرت ہے کہ آپ نے یہ دوسری تقریر پہلی کے مقابلے میں اس قدر نفاست اور عمدگی کے ساتھ کیسے کر لی؟ واقعی! یہ کیسے ممکن ہوا؟ اب تو مجھے شک ہو رہا ہے کہ شاید میں لائسیاس کے خیالات سے منحرف ہی نہ ہو جاؤں کیونکہ میرا نہیں خیال کہ وہ آپ کے مقابلے میں کامیاب ہو گا۔ چاہے وہ اتنی ہی طویل اور خوبصورت تقریر کر ہی کیوں نہ گزرے جو کہ بظاہر ممکن نہیں۔ کیونکہ کچھ روز قبل ہمارے سیاست دانوں میں سے ایک اسے بار بار تقریر نویسی کا طعنہ دے کر بُرا بھلا کہہ رہا تھا لہٰذا ممکن ہے کہ فخر و مباہات کے کسی احساس کے تحت وہ تقریر نویسی ترک ہی کر دے۔

سقراط: آپ نے کس قدر مضحکہ خیز بات کہہ دی ہے۔ میں سمجھتا ہوں، میرے نوجوان دوست، کہ اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ آپ کا وہ دوست معمولی شور شرابے سے خوفزدہ ہو جائے گا تو آپ غلطی پر ہیں۔ شاید

آپ یہ بھی سوچیں کہ آپ کا تقریر نویس ضرورت سے زیادہ مستعد تھا۔

فیڈرس: میں نے بھی یہی خیال کیا تھا، جناب سقراط، کہ وہ ایسا ہی ہے اور آپ کو تو معلوم ہی ہے کہ عظیم تر اور زیادہ تر حکمران طبقہ کے افراد تقاریر کو لکھنا اور ان کو تحریری صورت میں باقی رکھنا پسند نہیں کرتے محض اس لیے کہ کہیں انھیں آئندہ نسلیں سوفسطائی (Sophists) نہ قرار دے دیں۔

سقراط: عزیزم فیڈرس! آپ کو شاید معلوم نہیں کہ وہ جو ایک کہاوت "Sweet Elbow" موجود ہے وہ فی الحقیقت عظیم نی (NILE) کی ایک طویل شاخ ہے اور آپ اس سے بھی بے خبر لگتے ہیں کہ یہاں بیان کرنے والے کے نزدیک بھی "Sweet Elbow" کی صورت میں حیثیت رکھتی ہے کیونکہ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے سیاست دانوں کے لیے اس سے بڑھ کر پسندیدہ شے اور کچھ ہے ہی نہیں کہ وہ تقاریر تحریر کریں اور انھیں آئندہ نسلوں کے لیے باقی رکھیں اور وہ اپنے مداحوں کے نام اظہار تشکر کے لیے تقریر کے اوپر تحریر کرتے ہیں۔ واقعی ایک لمبے بازی کی

فیڈرس: آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟ میں کچھ سمجھ نہیں سکا ہوں۔

سقراط: آپ کا کیا خیال ہے؟ جب کوئی سیاستدان کوئی تقریر لکھتا ہے تو اس کے سرنامے پر اپنے تائید کنندگان کے نام کیوں لکھتا ہے؟

فیڈرس: کیوں لکھتا ہے؟ مجھے کیا معلوم؟

سقراط: آپ نے دیکھا نہیں وہ یوں آغاز کرتے ہیں:

"اسے سینٹ کے ذریعے ایک قانون کی حیثیت دلانا مقصود ہے یہ عوام کی خواہش...... فلاں فلاں شخص کے ذریعے سے ہے۔"

اور فلاں فلاں شخص یہی ہمارے سیاستدان ہی ہوتے ہیں اور پھر بڑی سنجیدگی سے وہ اپنی ذہانت و فطانت کے 'شاہکار' کو اپنے مداحوں کے نام سے پیش کرنا شروع کرتا ہے اور یہ سب بعض اوقات بہت طویل اور پیچیدہ انشائیہ ثابت ہوتا ہے۔ اب یہ سب کچھ ایک باقاعدہ تصنیف کے علاوہ اور کیا کہلائے گا؟

فیڈرس: آپ درست فرما رہے ہیں۔

سقراط: اور اگر کہیں مجوزہ قانون باقاعدہ طور پر قبولیت کی سند حاصل کر ہی لے تو اس تقریر کے مصنف کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں ہوتا اور فخر سے سربلند تھیٹر سے (اسمبلی ہال سے) باہر نکلتا ہے اور اگر بدقسمتی

[illegible] پارٹی کی حالت دیکھی نہیں جاتی۔

فیڈرس: یہ بھی درست ہے۔

سقراط: اس [illegible] فرسلامیت قرار دیتے ہیں۔

فیڈرس: یہ حقیقت ہے۔

سقراط: اس پر مستزاد بعض حکمرانوں یا مقررین کی مثالیں ہیں جن میں [illegible] (Darius) کو شامل کیا جا سکتا ہے کہ جب ان کی تصانیف یا افکار [illegible] میں بھی زندہ رہیں تو لوگ ان سے کس قدر متاثر ہوتے اور ان کی کتنی قدر [illegible] بلکہ اگر ان مقررین یا مصنفین میں سے کوئی اتفاق سے زندہ ہو تو وہ خود بھی اپنے آپ [illegible] سمجھنے پر تیار ہی نہیں ہوتا۔

فیڈرس: اس میں بھی کوئی شک نہیں۔

سقراط: ایسی صورت میں آپ یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ اس طبقے کا کوئی فرد، خواہ وہ عداوت میں [illegible] معیار کیوں نہ ہو، محض تقریر نویسی پر کسی کو مورد الزام قرار دے سکتا ہے۔

فیڈرس: آپ کے نقطۂ نظر سے تو ظاہر ہے ایسا ہونا ممکن نہیں کیونکہ آپ کے اس مدلل بیان کے بعد تو ایسا لگتا ہے کہ کوئی سیاستدان کسی کی محض تقریر نویسی پر مذمت کر کے خود اپنی مذمت کرے گا۔

سقراط: اور یہ نکتہ بھی قابلِ غور ہے کہ کوئی محض کچھ لکھنے سے قابلِ نفرت کیسے ٹھہرایا جا سکتا ہے۔

فیڈرس: یقیناً نہیں ٹھہرایا جانا چاہیے۔

سقراط: البتہ اس صورت میں لکھنے والے کے لیے توہین کا پہلو نکلتا ہے جب وہ بہت بُری تحریر کا مرتکب ٹھہرے۔

فیڈرس: واضح ہے!

سقراط: اور یہ جاننے کے لیے کہ تحریر اچھی کب ہوتی ہے اور بُری کیسے، ہمیں لائسیاس یا اس قبیل کے کسی دوسرے سے جو شاعر یا خطیب ہو اور اس نے نظم یا نثر کی صورت میں کوئی سیاسی یا غیر سیاسی تحریر یا کلام چھوڑا ہو، پوچھنا پڑے گا اور اس سے ہمیں خود بھی استفادہ کرنا چاہیے۔

فیڈرس: کیا واقعی ہمیں اس کی ضرورت ہے؟ گویا آپ سمجھتے ہیں کہ اگر انسان کو تقریر کے ذریعے اظہار خیال کے مواقع میسر نہ آسکیں تو اس کی زندگی کس کام کی؟ یہ درست تو ہوگا اگرچہ عام مادی تصور کے مطابق اس کی اہمیت نہیں ہوگی کیونکہ مادی لحاظ سے انصاف سے لطف اندوز ہونے کا کوئی امکان نہیں کیونکہ مادی ذہن کے عام لوگوں کے نزدیک الفاظ بھی درد اور دکھ کی طرح ہوتے ہیں جن کا احساس ہر دفعہ ایک ہی جیسا ہوتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ایسا سوچنے والے لوگ غلامانہ ذہنیت کے مالک ہوتے ہیں۔

سقراط: وقت ابھی کافی باقی ہے اور مجھے لگتا ہے کہ یہ جھینگر جو اس تپتی دوپہر میں عین ہمارے سروں پر جھائیں جھائیں کر رہے ہیں۔ ایک دوسرے سے گفتگو کے دوران ہمیں حقارت سے دیکھ رہے ہوں گے۔ وہ اس وقت کیا سوچتے ہوں گے جب ہمیں اس حال میں دیکھتے ہوں گے کہ ہم بحث و تمحیص میں مصروف ہونے کی بجائے اس دوپہر میں محض کاہلی سے لیٹے ہیں اور ان کی موسیقی سے لوری کا سا اثر لے رہے ہیں۔ ان کی نظروں میں تو ہماری حیثیت محض ان بھیڑوں کی سی ہوگی جو دھوپ اور تکان سے چھٹکارے کے لیے کسی کنوئیں کی منڈیر کے اردگرد لیٹی ہوتی ہیں۔ البتہ اگر وہ ہمیں باہم محو مباحثہ پائیں تو ہم ان کی نظروں میں اوڈیسس (Odysseus) کی طرح ہوں گے جو اپنے بجرے پر تیرتا ہوا ان کی موسیقی پر کان دھرے بغیر گزر جاتا تھا (کیوں کہ وہ اپنے منصوبے کی سوچ میں مگن ہوتا تھا) ایسے میں شاید وہ ہمارے احترام میں ہمیں وہ تحائف پیش کریں جو انھیں دیوتاؤں نے انسانوں تک پہنچانے کے لیے عطا کیے ہیں۔

فیڈرس: آپ کن تحائف کی بات کرتے ہیں؟ میں نے تو ان کے بارے میں کچھ نہیں سُنا۔

سقراط: آپ جیسے موسیقی کے پرستار سے وہ کہانی پوشیدہ نہیں ہونی چاہیے جس کے مطابق میوسس (Muses) (موسیقی کی دیوی) کے زمانے سے پہلے انسانی وجود رکھتے تھے سو جب موسیقی کی دیوی یورانیہ (Urania) کا ظہور ہوا اور وہ گانے لگی تو ان لوگوں نے اس کے گیت سُنے اور اس کی پیروی میں گانے میں یوں مگن ہوئے کہ انھیں کھانے پینے کا بھی کچھ ہوش نہ رہا اور وہ اسی عالم میں بغیر کچھ کھائے پیئے (کمزوری کے باعث) موت کے منہ میں چلے گئے۔ انھیں دوبارہ زندگی گویوں کی شکل میں ملی اور وہ بھی موسیقی کی دیوی یورانیہ ہی کی کوششوں سے اور اب عالم یہ ہے کہ وہ چوبیس گھنٹے موسیقی میں مگن رہتے ہیں کیونکہ انھیں نہ کھانے کی ضرورت پڑتی ہے نہ پینے کی اور اگر ان میں

سے کوئی مرجاتا ہے تو وہ سیدھا بہشت میں میوسس کے پاس پہنچتا ہے جو اسے پھر زمین پر بھجوا دیتا ہے۔ انہی کی رپورٹ پر ٹرپسیچور (Terpsichore) کو رقاص پسند ہیں۔ انھوں نے ارائو (Erato) کے بارے میں رپورٹ کی تو انھیں میوسس نے پسند کیا۔ اسی طرح دیگر لوگوں نے بھی ان کو اعزاز دے رکھا ہے۔ ان میں سے قدیم ترین میوسس یعنی کلیوپ (Calliope) کے اور اس کے بعد دوسرے نمبر پر آنے والی دیوی یورانیہ کو فلسفیوں سے لگاؤ ہے۔ اسی کی وجہ بھی گویوں کی رپورٹ ہی ہے کیونکہ یہ وہ ہیں جن کے دائرہ کار میں دیوتا اور انسان آتے ہیں۔ یہ خالص دیوتاؤں کی طرح آفاقی بھی ہیں اور ان میں انسانی خصائص بھی پائے جاتے ہیں۔ ان کی آواز دلکش ترین ہوتی ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ ہم اس تپتی ہوئی دوپہر میں سونے کی بجائے غور و فکر اور بحث و تمحیص میں وقت گزاریں۔

فیڈرس: یقیناً ہمیں گفتگو جاری رکھنی چاہیے۔

سقراط: تو کیا جیسے ہماری تجویز تھی، ہم تحریر و تقریر کے اُصولوں پر گفتگو شروع کر دیں۔

فیڈرس: یہ تو بہت ہی عمدہ خیال ہے۔

سقراط: کیا عمدہ تقریر کے خصائص میں یہ بات بھی شامل نہیں ہونی چاہیے کہ اس میں پیش کردہ مواد حقیقت پر مبنی ہو؟

فیڈرس: مگر سقراط محترم، میں نے تو یہ سُنا ہے کہ ایک اچھے خطیب کے لیے حقائق کی پاسداری ضروری نہیں بلکہ اسے چاہیے کہ وہ جو کچھ بھی کہے اس کا انداز اس قدر مؤثر ہو کہ سامعین اس کی بات کو حقیقت سمجھنے پر مجبور ہو جائیں کیونکہ اس کا کام حق گوئی نہیں بلکہ رائے عامہ کو اپنے حق میں کرنا ہوتا ہے اور رائے عامہ حقائق سے نہیں بلکہ اظہار کے انداز سے متاثر ہوتی ہے۔

سقراط: مگر آپ عاقل و دانا لوگوں کے الفاظ کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ آخر ان میں کوئی ایسی قوت تو ہوتی ہے جو انھیں مؤثر بناتی ہے۔ سو جو کچھ میں نے عرض کیا ہے اس کے مفہوم کو اس قدر جلدی رد مت کیجیے۔

فیڈرس: چلیے مان لیتے ہیں کہ آپ درست فرما رہے ہیں؟

سقراط: آیئے اب اصل معاملے کی طرف رجوع کریں۔ فرض کیجیے میں آپ کو قائل کرنا چاہوں کہ آپ فوراً ایک گھوڑا خریدیں اور جنگ میں شامل ہو جائیں۔ اس حالت میں کہ ہم میں سے کسی کو معلوم

نہ ہو کہ گھوڑا حقیقتاً کیسا ہوتا ہے، البتہ آپ فقط اتنا جانتے ہوں کہ گھوڑا لمبے لمبے کانوں والا ایک
پالتو جانور ہے۔

فیڈرس: بڑی مضحکہ خیز بات کہی ہے آپ نے!

سقراط: صبر کیجیے! اگلی بات آپ کو اس سے بھی زیادہ مضحکہ خیز لگے گی۔ فرض کیجیے آپ کے ساتھ اس گفتگو کے بعد میں جاؤں اور ''گدھے'' کی تعریف میں ایک خوبصورت تقریر ترتیب دے ڈالوں، جس کا آغاز کچھ اس طرح ہو ''ایک قابل احترام جانور، اور انسان کی ایک مفید ملکیت۔ خاص طور پر جنگ کے عالم میں کہ اس پر سوار ہو کر نہ صرف آپ جنگ کر سکتے ہیں بلکہ اس سے بار برداری کا کام بھی لے سکتے ہیں۔''

فیڈرس: واقعی! مضحکہ خیز!

سقراط: مضحکہ خیز تو ہے مگر کیا خیال ہے، ایک مضحکہ خیز دوست اور ایک مکار اور چالاک دشمن سے کہیں بہتر نہیں ہے۔

فیڈرس: یقیناً ہے۔

سقراط: اب ایک خطیب کی بات کرتے ہیں۔ فرض کیجیے وہ گھوڑے کی بجائے غلطی سے گدھے کو پیش کرے اور بجائے نیکی کے دھوکے میں بدی کو پیش کر رہا ہو اور اس کی وجہ سے بے شک اس کی بدنیتی نہیں بلکہ کم علمی ہو اور اتفاق سے جن لوگوں کے سامنے وہ اپنے خیالات کا اظہار کر رہا ہو وہ اس سے بھی کہیں زیادہ کم علم اور جاہل ہوں اور خطیب اپنے خیالات ہاتھ سے تحریر کر کے اور پڑھ کر مگر اس کا معقول تجزیہ کیے اور اسے سمجھے بغیر پیش کر رہا ہو، جیسے کوئی گدھے کے عکس کو گھوڑا تصور کر لے، اسی طرح وہ نیکی اور بدی کے مفہوم کو آپس میں گڈمڈ کر رہا ہو تو آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ایسا بیج بول کر وہ کیسا پھل کاٹے گا (اور اس کی بُرائی اکہری نہیں رہے گی بلکہ اتنے گنا ہو جائے گی جتنے لوگ اس سے متاثر ہو کر بدی کو نیکی سمجھ کر اختیار کر رہے ہوں گے)۔

فیڈرس: بالکل اس کا نتیجہ تو نیکی کی بجائے بدی ہی نکلے گا۔

سقراط: ایسے میں فن خطابت سے گویا ہم مذاق کر رہے ہوں گے بلکہ اس کی توہین کے مرتکب ہو رہے ہوں گے۔ بلکہ ہو سکتا ہے فن خطابت پکار اُٹھے ''یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ یہ کیسی بیہودہ بکواس کی جا رہی ہے۔ کہیں یہ میرا قصور تو نہیں کہ میں نے انسان کو جہالت کے عالم میں نیکی پر گفتگو کرنے کے لیے

اُکسایا (اور اس کا ایسا خوفناک نتیجہ برآمد ہوا)۔ میری ہدایت کا خواہ کچھ بھی نتیجہ ہوتا مگر مجھے اس پر زور دینا چاہیے تھا کہ گفتگو کرنے اور قوتِ بیان کو آزمانے سے پہلے صداقت کی پہچان لازم تھی۔ بلکہ میں تو یہ بھی کہنا چاہتا ہوں کہ محض حق شناسی ہی سے لوگوں کو قائل کرنے کی صلاحیت حاصل نہیں ہو جاتی۔"

فیڈرس: ان الفاظ میں فنِ خطابت نے خوب اپنا دفاع کیا ہے۔

سقراط: بالکل درست۔ بلکہ ابھی جو مزید دلائل سامنے آنے والے ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ فنِ خطابت کو بہت سے فنون کی بنیاد ہونے کا شرف حاصل ہے حالانکہ عام لوگوں کی رائے اس سے قطعی مختلف ہیں کیونکہ ان کے نزدیک فنِ خطابت تو کوئی فن سرے سے ہے ہی نہیں بلکہ یہ تو جھوٹ کو سچ ثابت کرنے کا محض ایک ذریعہ ہے اور لیجیے ایک سپارٹا کا باسی (Spartan) اس موضوع پر یوں گویا ہوتا ہے۔ ہم ایسے فن کو کیسے صائب قرار دے سکتے ہیں جو الفاظ میں سے حقیقت کو منفی کر دینے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

فیڈرس: اور محترم سقراط! وہ دلائل جن کا آپ خطابت کے حق میں ذکر کر رہے تھے کون سے ہیں؟ انھیں بیان تو کیجیے تا کہ ان کی اہمیت اور افادیت کا صحیح جائزہ لیا جا سکے۔

سقراط: اے خوبصورت لڑکو، باہر آ جاؤ اور محترم فیڈرس کو قائل کرو، فیڈرس جو خود بھی ایسی ہی حسین اولاد کا باپ ہے (یا حسین تحریروں کا خالق ہے) مگر وہ بھی ان کے بارے میں مدلل گفتگو پر اس وقت تک قادر نہیں ہو سکے گا جب تک اسے فلسفے کا معقول علم میسر نہ ہو۔ دیکھتے ہیں فیڈرس تمھیں کیسا جواب فراہم کرتا ہے۔

فیڈرس: آپ سوال تو پوچھیے!

سقراط: کیا خطابت کو پوری دنیا میں دلائل کی مدد سے لوگوں کے ذہنوں کو مبہوت کرنے کے فن کی حیثیت حاصل نہیں ہے؟ یہ فن نہ صرف عدالتوں اور عوامی اسمبلیوں میں بلکہ عام گھریلو مباحث میں اور ہر قسم کے معاملات کے ضمن میں چاہے وہ معمولی ہوں یا اہم، اچھے ہوں یا بُرے برابر استعمال ہوتا ہے۔ کیا اس ضمن میں آپ نے اب تک کی معلومات یہی نہیں بتائیں؟

فیڈرس: نہیں۔ بالکل ایسا نہیں۔ بلکہ میری معلومات کے مطابق فنِ خطابت کا استعمال عدالتی معاملات اور عوامی اجتماع کے علاوہ کہیں اور استعمال میں نہیں آتا۔

سقراط: اس پر تو میں یہ کہوں گا کہ آپ نے صرف نیسٹر (Nestor) اور اوڈیسس (Odysseus) کی وہ منظومات نہیں پڑھیں یا سُنی جو انھوں نے ٹرائے میں قیام کے دوران فارغ اوقات میں مرتب کی ہیں اور یہ کہ آپ نے پالامیڈس (Palamedes) کی خطابت سے متعلق تحریریں نہیں دیکھیں یا سُنیں یا آپ اس کی خطابت سے لطف اندوز نہیں ہوئے۔

فیڈرس: اگر آپ نیسٹر کو اوڈیسس اور جورجیاز یا تھریسی میکس (Thrasymachus) کو اچھا سمجھتے ہیں تو واقعی میں نے نیسٹر اور تھریسی میکس کے علاوہ کسی کو نہیں سُنا۔

سقراط: شاید میرا مطلب بھی یہی تھا مگر ان کو چھوڑیے اور اس کے بجائے آپ مجھے یہ بتائیے کہ مدعی اور مدعاعلیہ عدالت میں کیا کر رہے ہوتے ہیں؟ کیا وہ ایک دوسرے کے دلائل کا جواب نہیں دے رہے ہوتے؟

فیڈرس: بالکل دے رہے ہوتے ہیں!

سقراط: اور ان کی بحث کا ماحصل انصاف اور عدم انصاف ہوتا ہے۔ یہی ہوتی ہے ناں ان کی اصل بحث؟

فیڈرس: جی ہاں:

سقراط: اور اسمبلیوں میں بھی تو یہی ہوتا ہے۔ وہاں بھی مقررین کی گفتگو، آرا اور دلائل کو شہر (ریاست) کے لیے مفید اور غیر مفید یا اچھی اور بُری قسموں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

فیڈرس: یہ بھی درست ہے۔

سقراط: ہم نے ایلی ائیک پالامیڈس (زینو: Zeno) کے بارے میں سُن نہیں رکھا کہ جو اپنے سامعین کو یوں انگلیوں پر نچاتا ہے کہ وہ ایک ہی شے کو بیک وقت اچھی اور بُری، مفید اور مضر، مشابہ اور غیر مشابہ، ایک اور متعدد اور ساکن اور متحرک مان لینے پر تیار ہو جاتے ہیں۔

فیڈرس: سُنا تو ہے اور یہ سچ بھی ہے۔

سقراط: اسی سے ثابت ہو جاتا ہے کہ ایسی مباحث اور مناقشات (Disputations) عدالتوں اور سیاسی اسمبلیوں تک محدود نہیں ہیں بلکہ زبان کے ہر استعمال میں (یعنی جہاں جہاں زبان کے استعمال کی ضرورت پڑتی ہے) صحیح اور غلط کی بحث موجود ہوتی ہے۔ یہ ایک ایسا فن ہے، (اگر آپ اسے فن تسلیم کر سکیں) جو ہر اس جگہ یگانگت اور مشابہت مہیا کر دیتا ہے جہاں اس کا ذرا بھی امکان موجود ہو۔ بلکہ دیگر نقطہ ہائے نظر کے ذریعے ثابت کی گئی مشابہت یا اس کے بھیس کو روز روشن کی طرح

واضح کرنے میں بھی اسی فن پر سب سے زیادہ بھروسا کیا جا سکتا ہے۔

فیڈرس: یہ مفہوم آپ نے کیسے نکالا؟

سقراط: میں اپنی بات کی وضاحت اس طرح کر سکتا ہوں: ذرا بتایئے! دھوکے کا امکان کہاں زیادہ ہوگا، جب فرق بہت زیادہ ہو یا جب یہ بہت کم ہو؟

فیڈرس: ظاہر ہے جب فرق بہت معمولی ہوگا۔

سقراط: اور اگر آپ ایک کنارے سے دوسرے کنارے درجہ بدرجہ جائیں تو کم واقف ہوں گے۔ بمقابلہ اس کہ آپ فوراً جگہ بدل لیں؟

فیڈرس: میں آپ سے متفق ہوں۔

سقراط: گویا وہ شخص جو دوسروں کو تو دھوکا دینے میں کامیاب ہو جائے مگر خود دھوکا نہ کھائے وہ مختلف اشیا کے مابین مابہ الامتیاز یا مشابہت سے کماحقہ واقف ہوگا۔ کیا خیال ہے؟

فیڈرس: یقیناً ہوگا!

سقراط: اور اگر کوئی شخص کسی شے کی حقیقت سے قطعی بے خبر ہو تو وہ زیرِ نظر شے میں اور دیگر اشیا میں مشابہت کے درجے کا ادراک کیسے کر سکے گا جس کے بارے میں، ہمارے مفروضے کے مطابق وہ قطعی بے خبر ہے۔

فیڈرس: قطعی ادراک نہیں کر سکے گا۔

سقراط: اور جب لوگ دھوکا کھا جاتے ہیں اور ان کا نقطۂ نظر حقیقت کے قریب نہیں ہوتا تو یہ طے شدہ بات ہے کہ ان کی غلطی کی بنیاد بھی یہی قریبی مشابہت ہے جو غلط کو صحیح سے ممتاز کرنے میں رکاوٹ ڈال دیتی ہے۔

فیڈرس: ہاں! یہی غلط فہمی کا سب سے بڑا ذریعہ ہو سکتی ہے۔

سقراط: گویا جو شخص ماسٹر آف دی آرٹ (ماہرِ فنون) ہوگا وہ ہر شے کی حقیقت سے کماحقہ آگاہ ہو سکتا ہے۔ کیونکہ دوسری صورت میں وہ حقیقت سے جھوٹ تک بتدریج منتقلی، بوجہ مشابہت ارتکاب کرنے یا اس سے اجتناب کرنے پر کیونکر قادر آ سکتا ہے۔

فیڈرس: بالکل نہیں قادر آ سکتا۔

سقراط: سو جو حقیقت سے بے خبر ہوگا وہ فقط ظاہر کو دیکھے گا یعنی وہ محض خطابت کے جال میں پھنس جائے

گا۔ وہ کافی مضحکہ خیز شے ہے اور کم از کم فن تو ہرگز نہیں۔

فیڈرس: اسی کی توقع کی جاسکتی ہے۔

سقراط: میں یہ تجویز پیش کروں گا کہ ہم لائسیاس کی تقریر میں، جو اس وقت بھی آپ کے ہاتھ میں ہے، اور خود میری تقریر میں فن کی موجودگی اور عدم موجودگی کی مثالیں الگ الگ کر لیں اور اس سے اپنے اپنے نقطۂ نظر کی صداقت کو پرکھیں۔

فیڈرس: اس سے بہتر تو کوئی تجویز ہو ہی نہیں سکتی اور میں تو یہ بھی کہوں گا کہ ہمارے گزشتہ دلائل محض تجریدی (فرضی) تھے اور وہ کافی حد تک تشنہ تشریح رہے ہیں۔

سقراط: بالکل درست! اور دونوں تقریروں میں ایسا مواد وافر مقدار میں موجود ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ ایک کامیاب خطیب بڑی کامیابی سے سامعین سے علم میں آنے کا موقع دیے بغیر حقیقت کو ان کی آنکھوں سے بڑی کامیابی سے چھپا سکتا ہے۔ تاہم اس خوش قسمتی کی حامل صلاحیت کو میں مقامی دیوتاؤں کی عطا سمجھتا ہوں یا زیادہ سے زیادہ موسیقاروں کے ان پیغام رسانوں (جھینگروں) کی جو اس وقت ہمارے سروں پر اپنی موسیقی کے سُر بکھیر رہے ہیں، کہ ان ہی کی برکت سے اس وقت یہ تصورات میرے ذہن میں آتے چلے جا رہے ہیں۔ کیونکہ میری اپنی ذات میں فنِ خطابت کی کوئی قابلِ ذکر صلاحیت موجود نہیں ہے۔

فیڈرس: تسلیم! کیا آپ مہربانی فرما کر بات جاری رکھیں گے؟

سقراط: فرض کر لیتے ہیں کہ آپ لائسیاس کی تقریر کے ابتدائی الفاظ مجھے پڑھ کر سُناتے ہیں۔

فیڈرس: ''آپ جانتے ہیں میرے ساتھ معاملات کیسے منسلک رہتے ہیں؟ اور جیسے میں تصور کرتا ہوں ان معاملات کو ہم اپنی مشترک دلچسپی اور مفاد کے لیے کس طرح ترتیب دے سکتے ہیں اور میں اس بات پر قائم ہوں کہ میں اپنی بات منوانے میں ناکام نہیں رہوں گا کیونکہ میں آپ کا عاشق تو ہوں نہیں کیونکہ یہ عاشق ہی ہوتے ہیں جنھیں بالآخر شرمندگی اُٹھانا پڑتی ہے اور وہ پچھتاوے میں پڑتے ہیں.................''

سقراط: بس کافی ہے۔ کیا میں ان مختصر الفاظ میں سے خطابت کی غلطیوں کی نشاندہی کروں؟

فیڈرس: ضرور کیجیے!

سقراط: ہر کوئی جانتا ہے کہ بعض اشیا کے بارے میں ہم باہم متفق ہوتے ہیں تو بعض کے بارے میں

اختلاف بھی رکھتے ہیں۔

فیڈرس: میں شاید آپ کی بات سمجھ رہا ہوں۔ مگر کچھ مزید وضاحت کی ضرورت ہے۔

سقراط: جب کوئی شخص لوہے اور چاندی کے متعلق (ان کے فرق کو ملحوظ رکھتے ہوئے) گفتگو کر رہا ہو تو کیا ایسی ہی کیفیت اس کے ذہن میں نہیں ہوگی۔ (یعنی اتفاق اور اختلاف سے متعلقہ خصائص)

فیڈرس: یقیناً ہوگی۔

سقراط: مگر جب گفتگو عدل وانصاف اور نیکی سے متعلق ہو تو ہم بعض اوقات اوروں سے تو کیا خود سے بھی متفق ہونے میں دقت محسوس کرتے ہیں (یعنی ہمارا دل کچھ کہتا ہے تو دماغ کا مطالبہ کچھ اور ہوتا ہے)

فیڈرس: بالکل ایسی ہی بات ہے۔

سقراط: گویا ہمارا اتفاق جزوی ہوتا ہے یعنی بعض معاملات میں ہوتا ہے بعض میں نہیں ہوتا۔

فیڈرس: یہ بھی سچ ہے۔

سقراط: ہم ان صورتوں میں سے کس میں دھوکا کھانے کے زیادہ امکانات کا سامنا کرتے ہیں اور کس میدان میں صاحب خطابت کو اپنی قوت آزمانے کا زیادہ موقع ملتا ہے؟

فیڈرس: یقیناً وہاں دھوکا کھانا اور دھوکا دینا زیادہ ممکن ہوتا ہے جہاں غیر یقینی صورت حال کا سامنا ہو۔

سقراط: ایسی صورت میں ایک مقرر کے لیے ضروری ہے کہ وہ غلط اور صحیح کے درمیان واضح خطِ امتیاز کھینچنے کی صلاحیت رکھتا ہو اور اس کے سامنے دونوں اقسام کے حوالے سے بھی بڑا واضح تصور موجود ہو کہ فلاں میں زیادہ سے زیادہ غلطی کا امکان ہے اور فلاں میں غلطی کا امکان نہ ہونے کے برابر ہے۔

فیڈرس: آپ درست کہتے ہیں۔ اگر کسی فرد کو یہ صلاحیت حاصل ہو تو اسے کامیاب ترین اور صاحب اُصول فرد قرار دیا جاسکتا ہے۔

سقراط: یہ تو ہے، مگر اسے گفتگو کے دوران بھی سخت محتاط ہونے کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ وہ دونوں اقسام کے عوامل کو خلطِ مبحث کرنے کی غلطی کے ارتکاب سے بچا رہ سکے۔

فیڈرس: یقیناً یہ تو لازمی ہے۔

سقراط: یہ بتائیے کہ محبت کو آپ کس زمرے میں شمار کرتے ہیں؟ اس میں جس پر بحث ممکن ہے یا اس میں جہاں صرف طے شدہ امور ہو سکتے ہیں۔

فیڈرس: صاف ظاہر ہے کہ یہ اس زمرے میں آئے گی جس میں قابل بحث امور آتے ہیں کیونکہ اگر ایسا نہ ہوتا تو آپ کے لیے کیسے ممکن تھا کہ آپ ایک بھرپور لیکچر جھاڑتے جس میں محبت، عاشق اور محبوب تینوں کو ہدف تنقید بنایا گیا اور فوراً ہی بعد میں آپ نے ایک بلیغ تقریر محبت کی خوبیاں اور ثمرات بیان کرتے ہوئے فرمادی۔

سقراط: خوب! مگر ذرا سوچ کر بتایئے کہ کیا گفتگو کے آغاز میں، میں نے باقاعدہ محبت کی کوئی تعریف بیان کی ہے کہ نہیں کیونکہ اندرونی جوش وخروش کے باعث، مجھے ایسے لگتا ہے جیسے، میں اسے نظرانداز کر گیا ہوں۔ مجھے البتہ اچھی طرح یاد نہیں ہے۔

فیڈرس: بالکل آپ نے محبت کی تعریف بیان کی ہے اور وہ کوئی غلط بھی نہ تھی۔

سقراط: بہر طور میں سمجھتا ہوں کہ سی فیلس سے لائسیاس کے مقابلے میں ہرمیس کا بیٹا پین اور اکیلا ؤس کا نمفس (Nymphs) کہیں زیادہ بلند پائے کے ماہرین خطابت تھے۔ سی فیلس کا بیٹا بے چارہ لائسیاس تو ان سے کہیں زیادہ کمتر ہے یا ہوسکتا ہے۔ میں بھی غلطی پر رہا ہوں اور شاید لائسیاس کی تقریر کا یہ انداز بھی ہماری وجہ سے تھا۔ کیونکہ میں نے عشاق سے متعلق اپنی تقریر کے آغاز کے وقت اپنے نقطۂ نظر کو ملحوظ رکھا ہوگا اور اس نے اپنے چشم تصور سے وہی منظر دیکھا اور پھر اس پر عمل درآمد شروع کر دیا۔ ذرا اس کی تقریر کا ابتدائی حصہ پھر سے پڑھیے!

فیڈرس: آپ چاہیں تو پڑھ لیں مگر مجھے یقین ہے کہ آپ اپنی مطلوبہ بات اس میں نہیں پاسکیں گے۔

سقراط: آپ پڑھیے تا کہ میں اس کے اصل الفاظ پر توجہ مرکوز کرسکوں۔

فیڈرس: ''آپ کو معلوم ہی ہے کہ میرے ساتھ کیسے کیسے معاملات ہیں! اور جیسے میں تصور کرتا ہوں کہ وہ ہمارے مشترکہ خیال کی روشنی میں کیسے ترتیب پائیں گے اور میں پھر یہ کہتا ہوں کہ میں اپنے نقطۂ نظر میں ناکام ہرگز نہیں ہوں گا۔ کیونکہ میں آپ کا چاہنے والا نہیں ہوں کیونکہ چاہنے والوں کو اکثر اپنے نرم رویے پر، محبت کا جوش وخروش ختم ہونے پر پچھتانا پڑتا ہے۔''

سقراط: یہیں پر فی الحقیقت اس نے اصل موضوع کے برعکس بات کی ہے کیونکہ اس نے آغاز گفتگو ہی انجام کار سے متعلق اپنے خیالات سے کیا ہے اور اس کے گنجلک خیالات الجھائے الجھائے نقطۂ نظر میں فقط ان کے ہی کے اردگرد گھومتے رہتے ہیں۔ کسی حسین فرد سے اس کا تخاطب اس مرحلے سے شروع ہوتا ہے جہاں درحقیقت کسی عاشق کو بات کا اختتام کرنا چاہیے تھا۔ کیوں عزیزم

فیڈرس، میں نے درست کہا؟

بے شک سقراط، وہ فی الحقیقت انجام ہی سے آغاز کرتا ہے۔

فیڈرس: اب دوسرے موضوعات کو لیں۔ کیا انھیں بالکل ہی نظر انداز نہیں کر دیا گیا؟ کیا یہ بھی کسی اصول

سقراط: کے تحت ہوا ہے؟ آخر اگلے موضوع کو منطقی ترتیب کے مطابق دوسرے نمبر پر پیش کیوں نہیں کیا گیا؟ میں اپنی تمام تر کم علمی کو ملحوظ رکھنے کے باوجود یہی کہوں گا کہ اس نے اپنے خیالات کو منطقی ترتیب دیے بغیر بس جو سامنے آیا بیان کر دیا، کے اُصول پر عمل کیا ہے اور مجھے بہر طور یہ کہنا پڑے گا کہ پوری تقریر میں متعدد مواقع پر آپ کو خطابانہ جھول نظر آئیں گے۔

فیڈرس: اگر آپ سمجھتے ہیں کہ میں نے اس کی تقریر کا بھرپور تجزیہ خالصتاً خطابت کے اصولوں کی روشنی میں کیا ہو گا تو مجھے اپنے بارے میں خوش فہمی کا اعتراف کرنا پڑے گا۔

سقراط: بہر طور یہ تو آپ تسلیم کریں گے ہی کہ ایک کامیاب تقریر بھی کسی ذی روح وجود کی طرح ہوتی ہے۔ جیسے باقاعدہ جسم اور سر ہوتے ہیں اور پوری تقریر سُن کر محسوس ہونا چاہیے کہ فلاں حصہ آغاز، فلاں انجام اور فلاں درمیان سے تعلق رکھتا ہے۔

فیڈرس: یقیناً!

سقراط: کیا تم لائیاس کی تقریر کے بارے میں یہ کہہ سکتے ہیں؟ کیا تم اس کے الفاظ میں فریجی (Phrygian) کے میڈاس (Midas) کی قبر پر کندہ کتبے میں درج الفاظ سے زیادہ منطقی ربط موجود نہیں ہے۔

فیڈرس: اس لوحِ مزار کی تحریر میں کون سی شے قابلِ ذکر ہے؟

سقراط: اس کے مندرجات کچھ اس طرح ہیں:

> ''میں پیتل کی بنی کنیز ہوں اور میڈاس کے مقبرے پر پڑی ہوں۔ جب تک دریاؤں میں روانی اور بلند قامت درختوں کے اُگنے کا سلسلہ جاری رہے گا، اور جب تک میں یہاں اس پُر حسرت مقبرے پر (اس کے پہلو میں) موجود ہوں، ہر گزرنے والے سے کہتی رہوں گی کہ ''میڈاس یہاں محوِ خواب ہے۔''

اب اس مثال میں دیکھیے کہ آپ چاہے اپنی چشمِ تصور سے اس نظم کی کوئی سطر (کوئی مصرع) پہلے

پڑھیں یا بعد میں، مفہوم میں کوئی فرق نہیں آتا۔

فیڈرس: ارے، آپ نے تو ہماری تقریر کا کچومر ہی نکال کر رکھ دیا ہے۔

سقراط: چلیے! اب میں آپ کے دوست کی تقریر پر کوئی حرف گیری نہیں کروں گا، مبادا آپ ناراض ہی ہو جائیں۔ اگرچہ میں اس کے بعض دیگر حصوں کے نقائص کی نشاندہی بھی کرنا چاہتا تھا جنھیں عموماً لوگ نظرانداز کرنا پسند کرتے ہیں۔ مگر میں دوسری تقریر کی جانب توجہ مبذول کرتا ہوں جس میں فنِ خطابت کے طلبہ کے استفادے کے لیے کافی مواد موجود ہے۔

فیڈرس: وہ کیسے؟

سقراط: دو تقاریر، جیسا کہ آپ کو یاد ہوگا، ایک جیسی نہ تھیں کیونکہ ایک میں عاشق کو جب کہ دوسری میں محبت نا آشنا کو اوّلیت دینے پر زور دیا گیا تھا۔

فیڈرس: اور خوب دیا گیا تھا!

سقراط: آپ نے مردانہ انداز میں کہا حالانکہ آپ کو دیوانہ کہنا چاہیے تھا اور ان میں پیش کردہ دلائل کے بنیاد میں دیوانگی ہی تھی جیسا کہ میں نے ابھی کہا ہے کہ محبت دراصل ہے ہی دیوانگی کا دوسرا نام!

فیڈرس: آپ نے درست کہا۔

سقراط: اور دیوانگی یا جنون کی دو ہی قسمیں ہیں۔ پہلی قسم تو انسان پر خود اس کی کمزوری اور ضعف کی بدولت طاری ہوتی ہے جب کہ دوسری قسم کا تعلق اس آفاقی طوق کی بدولت ہے جو دیوتاؤں نے مخصوص رواج اور روایات کی صورت میں انسان کے گلے میں ڈال دیا ہے۔

فیڈرس: یہ بات کوئی ڈھکی چھپی نہیں۔

سقراط: اور جو آفاقی جنون ہے اس کی مزید چار اقسام ہیں۔ یعنی ۱۔ پیغمبرانہ یا غیب گویانہ، ۲۔ تخلیقانہ، ۳۔ شاعرانہ اور ۴۔ شہوانی، اور ان میں سے ہر ایک کی نگرانی ایک الگ دیوتا کے ذمے ہے۔ یعنی ان میں اوّل الذکر کا فیضان اپالو کا ہے۔ دوسری ڈائیونائیسس (Dionysus) کا، تیسرا میوسس کا جبکہ چوتھا ایفروڈائٹ اور ایروس کا فیضان ہے۔ آخری قسم کی دیوانگی، جو بہترین سمجھی جاتی ہے، جسمانی حسن سے محبت کے لیے مخصوص ہے جس میں ہم نے ایک حقیقی اور قابلِ عمل دیومالا استعمال کی ہے اگرچہ اس میں غلطی کا بس ایک خفیف سا احتمال بھی موجود ہوتا ہے بلکہ یہ احتمال بھی محبت کے اعزاز میں ایک خوبصورت اضافے ہی کا سبب بنتا ہے (جیسے نمک سے کھانے کی لذت دوبالا

ہو جاتی ہے) مناجات محبت جس کا آپ بھی احترام کرتے ہیں اور میں بھی کرتا ہوں۔ یہ ہمارا ہی
خوبصورت کم عمر لوگوں کا تحفظ کرتی ہے جن کے لیے اپنے گیتوں میں ہمیں ایک طرح کے توازن کا
اہتمام کرنا پڑتا ہے۔

فیڈرس: میں جانتا ہوں اور آپ کی ایسی باتیں ہمیشہ میرے لیے پُر لطف ہی ثابت ہوتی ہیں۔

سقراط: آیئے زیرِ نظر مثال پر اپنی توجہ مرکوز کرتے ہوئے دیکھیں کہ اس میں تنقیص و تعریف کے پہلوؤں کو
کیونکر ملحوظ رکھا گیا ہے؟

فیڈرس: میں سمجھا نہیں کہ آپ کی اس سے کیا مراد ہے؟

سقراط: میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اس میں جو انشا پردازی استعمال ہوئی ہے وہ کافی حیات بخش رہی ہے۔
تاہم اس وقتی اور اتفاقیہ خیال آفرینی سے ہمیں دو اُصولوں سے آگاہی ہوئی ہے اگر آرٹ اجازت
دے تو ان اُصولوں کی مدد سے ہم اس کی کافی وضاحت پیش کر سکتے ہیں۔

فیڈرس: وہ اُصول کیا ہیں؟

سقراط: پہلے اُصول میں مختلف النوع خصائص کو ایک خیال میں سمونا شامل ہے جیسے کہ محبت کی تعریف کے
ضمن میں ہم نے یہی اُصول پیش کیا ہے۔ یہ اُصول حقیقی معنوں میں ہو یا مجازی میں، خطاب کو
ایک تسلسل، توازن اور مفہوم کی خالص کیفیت کو بحال رکھنے میں ممد و معاون ثابت ہوتا ہے اس
کے ذریعے مقرر اپنے موضوع کے متعدد اور متنوع پہلوؤں کے باوجود مفہوم کے شفاف پن کو قائم
رکھ سکتا ہے۔

فیڈرس: محترم سقراط! دوسرا اُصول بھی تو بیان فرمایئے۔

سقراط: دوسرا اُصول یہ ہے کہ اگرچہ موضوع کے پہلوؤں میں تنوع جس قدر وسیع ہو مگر ان تمام پہلوؤں
کے بیان کے دوران ان کے باہمی ربط کو ٹوٹنے نہ دیا جائے جیسے کسی ماہر فن، کندہ گر کا کمال یہ
ہے کہ اس کی بیلوں یا نقوش کے درمیان کہیں جوڑ نظر نہیں آنا چاہیے جیسا کہ ہمارے
زیرِ مطالعہ و تجزیہ دونوں تقریروں میں ہم نے دیکھا ہے کہ ایک جیسے مفروضے میں اوّلین عنصر کے
طور پر جو شے نظر آتی ہے وہ تسلسل اور ہم آہنگی ہے۔ اس کی مثال ایسے ہے جیسے انسانی جسم کے
بعض اعضا (جو جوڑوں کی صورت میں مثلاً ہاتھ، پاؤں، آنکھیں، ناک وغیرہ) دائیں اور بائیں
ہونے کے باوجود شکل و صورت اور نوعیت میں بالکل ایک جیسے ہوتے ہیں۔ اس نکتے کے بعد مقرر

نے آگے بڑھتے ہوئے بائیں جانب کے حصوں کو پھر اچھی اور بُری کی قسموں میں تقسیم کر ڈالا ہے اور اسی مرحلے پر اس نے محبت کو بُرا اور غلط انداز (خلافِ معمول) پایا اور اس کی مخالفت کی جبکہ دوسری تقریر میں محبت کو ہم نے ایک مخصوص جنون یا دیوانگی کا شاخسانہ پایا۔ یہ جسم کا دایاں پہلو تھا اور یہاں بھی ہمیں محبت ہی نظر آتی ہے جو بائیں پہلو سے منسوب محبت ہی کی ہم نام ہے مگر یہ محبت انسانی نہیں بلکہ آفاقی ہے۔ اس محبت کو (دوسری تقریر کے) مصنف نے ہمارے سامنے ایک انتہائی قابلِ قدر اور مفید جذبہ قرار دیا ہے۔

فیڈرس: مجھے آپ کے الفاظ سے پورا پورا اتفاق ہے۔

سقراط: میں خود اس تقسیم اور عمومیت کے طریقے کا پرستار ہوں۔ اس طریقے کو استعمال کرنے سے میں گفتگو اور غور و فکر دونوں کو ساتھ ساتھ چلا سکتا ہوں اور اگر میری نظروں سے کوئی ایسا شخص گزرے جو فطری انداز میں کسی شے کو بیک وقت ''وحدت و کثرت'' کے عالم میں دیکھ اور پہچان سکے تو میں اس کا پیروکار بن جاتا ہوں اور اس کے نقشِ قدم پر یوں چلتا ہوں گویا وہ کوئی دیوتا ہو اور وہ لوگ جو اس فن کے ماہر ہیں میں انھیں لجھوں کے ماہرین کہا کرتا ہوں۔ البتہ یہ نام کہاں تک درست ہے یہ خدا جانتا ہے۔ مجھے بتائیے کہ آپ اپنے اور لائسیاس کے پیروکاروں اور شاگردوں کو کیا نام دینا پسند کریں گے اور یہ بھی کہ کیا یہ وہی فن خطابت نہیں ہے جس کی تھریسی میکس اور دیگر ماہرین پیروی کرتے اور آگے تعلیم دیتے رہے ہیں۔ یہ سب بہت قادر الکلام مقررین ہیں اور اپنی تقاریر اور خطابوں کے ذریعے لوگوں کو حکومت کرنے اور اس فن سے فائدہ اُٹھانے کی تربیت دینے میں بہت کامیاب رہے ہیں۔

فیڈرس: بہتر حال فن خطابت سے متعلق کتب میں بہت کچھ مل جاتا ہے۔

سقراط: جی بالکل! بلکہ یاددہانی کا بہت بہت شکریہ! اگر مجھے درست یاد ہے تو ایک موضوع دستیاب ہے جس میں تقریر کے آغاز پر سیر حاصل روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہی آپ کا مطلب تھا ناں۔ ان میں فن کی نفاستوں سے متعلق قیمتی معلومات لکھی ہوتی ہیں۔

فیڈرس: جی ہاں! میرا یہی مطلب ہے۔

سقراط: میری مراد اسی سے ہے اور اس نے تائید و مزید تائید کی طرح تردید اور مزید تردید پر بھی زور دیا ہے اور اس کا طریقہ بھی بتایا ہے۔ چاہے یہ تردید الزامات کی صورت میں ہو یا الزامات کے خلاف

دفاع کی شکل میں۔ میں یہاں مشہور ماہر پیریان (Parian) یا ایوینوس (Evenus) کی بات بھی کروں گا جس نے سب سے پہلے کنائے اور بالواسطہ تعریف وتوصیف کا طریقہ ایجاد کیا بلکہ وہی بالواسطہ تنقید کی ایجاد کا ذمہ دار بھی ہے جسے اس نے نظم کی صورت میں پیش کرنا پسند کیا تا کہ بات کسی قدر سہولت سے سامع کی یادداشت میں شامل ہو سکے۔ اسی کے ساتھ ہی میں (بھولنے کی صلاحیت کو مزید کمزور کرنے کے لیے) ٹسیاس (Tisias) اور جارجیاز کا حوالہ بھی دینا چاہتا ہوں جنھیں یہ اچھی طرح معلوم ہے کہ امکانات حقائق سے بھی زیادہ قوی تر ہوتے ہیں (اور ان کا دائرہ بھی حقائق کی نسبت کہیں وسیع تر ہوتا ہے) لہٰذا وہ دلائل کی اپنی قوت سے معمولی کو عظیم، عظیم کو معمولی ثابت کرنے اور قدیم کو جدید کا بھیس دینے اور جدید کو قدیم کی صورت میں پیش کرنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتیں اور انھوں نے اس کے لیے باقاعدہ طریقہ ہائے کار وضع کر رکھے ہیں، ان میں مختصر بھی ہیں اور لامتناہی بھی۔ مجھے یاد ہے جب میں نے پروڈیکس کو یہ بات بتائی تو وہ خوب ہنسا اور مجھے بتانے لگا کہ اس نے خود بھی ایک ایسا طریقہ ایجاد کر رکھا ہے اور اس کی خوبی یہ ہے کہ نہ وہ بہت زیادہ طویل ہے اور نہ غیر ضروری طور پر مختصر بلکہ معقول طوالت کا حامل ہے۔

فیڈرس: پروڈیکس نے تو کمال کر دیا۔

سقراط: اور پھر ایسی مثالوں میں ہپیاس جسے اجنبی مغائر بھی کہا جاتا ہے، بھی شامل ہے جو پروڈیکس کی تائید کرتا ہے۔

فیڈرس: ہاں ہے!

سقراط: انھی میں پولُس (Polus) کا ذکر بھی آنا چاہیے جس کے پاس ڈپلوشیالوجی (Diplasiology)، کہاوتوں کے علم اور ایکونالوجی (Eikonology) کا بے پناہ ذخیرہ موجود ہے اور ان ہی کی مدد سے وہ اسے لائسیاس کی طرف سے دیے گئے ناموں کو درست کر کے ان کی تعلیم دیتا ہے۔

فیڈرس: پروتاغورس کے پاس ایسی کوئی شے نہیں؟

سقراط: کیوں نہیں! اسے درست ذخیرہ الفاظ (ڈکشن) کے استعمال پر دسترس حاصل ہے، علاوہ ازیں اس کے پاس وعظوں پر مشتمل ایسے خطبات کا ذخیرہ موجود ہے، جن میں ایک غریب بوڑھے کے دکھوں کے اظہار سے لے کر بہت سے دیگر موضوعات پر ایسے جذباتی پیرائے میں گفتگو پر مشتمل تقریریں ہیں (ان میں سب سے بہتر وہ ہے جس کا عنوان ''چیلسی ڈون کا (Chalcedonian) دیو''

ہے) جن کے ذریعے وہ پورے مجمع کے جذبات سے کھیل سکتا ہے اور وہ لوگوں کے جذبات کو مشتعل کرنے کے فن کے باعث اپنی مرضی کی کوئی بھی صورت حال تخلیق کرسکتا ہے چاہے اس کے پاس اس کے لیے کوئی ٹھوس بنیاد موجود ہو یا نہیں۔ اس کے کامیابی کی دلیل یہ ہے کہ اس کی طویل ترین تقریر کے بعد بھی لوگوں کی دلچسپی بحال رہتی ہے اور وہ آخر میں بعض نکات کا اعادہ چاہتے ہیں۔ بے شک لفظ نہ دہرائے جائیں اور اس کے لیے نیا پیرایہ اختیار کیا جائے۔

فیڈرس: گویا آپ کا اشارہ اس حقیقت کی طرف ہے کہ تقریر کے اختتام پر موضوع کا ایک مؤثر خلاصہ بیان کر دیا جائے تاکہ اصل مقصد سامعین کے ذہنوں میں آسانی سے باقی رہ سکے اور ان کی یادداشت کا براہِ راست حصہ بن جائے۔

سقراط: یہاں تک پہنچ کر گویا سب کچھ کہہ چکا جو میں فن خطابت کے بارے میں کہنا چاہتا تھا یا کہہ سکتا تھا۔ اب اگر اس میں کچھ اضافہ کرنا چاہیں تو ارشاد فرمائیں۔

فیڈرس: کچھ خاص نہیں۔ میرے ذہن میں اس موضوع پر کوئی بات نہیں جس کا آپ نے ذکر نہ کر دیا ہو۔

سقراط: غیر اہم باتوں کو چھوڑیے اور آیئے اپنی توجہ ایک بہت ہی اہم سوال پر مرکوز کریں اور سوال یہ ہے کہ اس فن خطابت میں کون سی خاص طاقت پوشیدہ ہے اور یہ کہ اس کا استعمال کن مواقع پر ممکن ہے؟

فیڈرس: بہت زبردست قوت ہے اور یہ عوامی جلسوں یا اجتماعات میں ظاہر ہوتی ہے۔

سقراط: وہ تو ہے مگر میں فی الوقت یہ چاہتا ہوں کہ ماہرین فن خطابت کے بارے میں، کیا آپ کا بھی وہی نقطہ نظر ہے جو میرا ہے؟ مجھے تو ان کے اس فن میں بے پناہ خامیاں اور نقصان دہ عوامل نظر آتے ہیں۔

فیڈرس: مثلاً کیسے نقائص۔ کوئی ایک مثال تو دیجیے!

سقراط: ہاں ہاں! مثال بھی دیتا ہوں۔ فرض کیجیے کوئی شخص آپ کے دوست اریکسی میکس (Eryximachus) یا اس کے باپ اکیومینس کے پاس آئے اور یوں گویا ہوا، مجھے ایسی ادویہ کا استعمال معلوم ہے جن کی تاثیر گرم یا سرد ہوتی ہے اور میں قے آور اور دست آور ادویہ بھی دے سکتا ہوں، اور ایسی ہی دیگر صلاحیتیں بھی مجھے حاصل ہیں۔ سو میں نہ صرف یہ کہ خود ایک مستند طبیب ہونے کا دعویٰ کرتا ہوں بلکہ اسی علم کے زور پر دوسروں کو طبابت کی تعلیم بھی دے سکتا ہوں۔ تو آپ کے خیال میں وہ اسے کیا جواب دیں گے؟

فیڈرس: وہ یقیناً اس سے یہ دریافت کریں گے کہ آیا وہ یہ بھی جانتا ہے کہ کس مریض کو کون سی دوا کس وقت اور کتنی مقدار میں دی جانی چاہیے؟

سقراط: اور فرض کیجیے کہ اس کا جواب یہ ہے کہ وہ ایسی تفصیلات سے نابلد ہے اور فرض کر لیتا ہے کہ اس کے مریض جو اس سے طبی مشورے لینے آئیں گے، خود جانتے ہوں گے کہ انھیں کتنی دوا کس وقت لینا ہے۔

فیڈرس: ایسی صورت میں وہ اس سے یہی کہہ سکتے ہیں کہ وہ پاگل یا کوئی مدعی فضیلت ہے جو سمجھتا ہے کہ کسی کتاب میں بعض نامکمل باتیں پڑھ کر وہ اس فن میں ماہر ہو گیا ہے یا دو چار نسخوں کی مدد سے ٹامک ٹوئیاں مارنے کے بعد وہ طبیب بن چکا ہے حالانکہ فی الحقیقت اسے فن طبابت کی کچھ سمجھ بوجھ نہیں۔

سقراط: اور فرض کیجیے کہ کوئی فرد اسی طرح سوفوکلس (sophocles) یا یوریپیڈس (Euripedus) کے پاس آئے اور کہے کہ: وہ ایک معمولی سے نکتے پر ایک طویل خطاب پیش کر سکتا ہے اور ایک طویل بحث والے موضوع کو چند جملوں میں سمیٹنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ علاوہ ازیں وہ تقریر کے ذریعے دکھ، رنج والم اور حیات انسانی سے متعلق تکالیف اور پریشانیوں کا نقشہ کھینچ کر رکھ سکتا ہے اور یہ سب کچھ جب دوسروں کو سکھاتا ہے تو سمجھتا ہے کہ وہ انھیں المیے کی تعلیم دے رہا ہے۔ تو وہ کیا کہیں گے؟

فیڈرس: وہ لوگ یقیناً اُس شخص کا مضحکہ اُڑائیں گے جو سمجھتا ہے کہ مختلف عناصر کو ترتیب وار بیان کر دینے کا نام المیہ (ٹریجڈی) ہے۔

سقراط: بلکہ میں تو یہ بھی خیال کرتا ہوں کہ وہ اس سے برہم ہوں گے اور اسے بُرا بھلا کہیں گے اور اسی طرح سے وہ ایسے شخص کو موسیقار قرار نہیں دیں گے جو ہارمونیم پر دھیمے اور شوخ دھنیں بجا لیتا ہو۔ وہ تو اسے احمق اور بے وقوف ہی قرار دیں گے۔ مگر ایک ماہر موسیقار اپنی نرم اور موسیقیت بھری آواز میں اس سے یہ کہے گا: عزیز دوست! اگر تم اسی حد تک ہارمونیم بجاتے ہو تو تم ہارمونیم بجانے کا دعویٰ تو کر سکتے ہو مگر ہم آہنگی کو سمجھنے کا دعویٰ نہیں کر سکتے کیونکہ تمھارے پاس ہم آہنگی کا لفظ ابتدائی علم ہے جبکہ مکمل اور اصل ہم آہنگی بہت دور کی شے ہے۔

فیڈرس: بالکل درست۔

سقراط: اسی طرح سوفوکلس المیہ کا ماہر ہونے کا دعویٰ کرنے والے سے کہہ سکتا ہے کہ بھئی یہ تسلیم کہ تمھیں المیے کا کچھ نہ کچھ ابتدائی علم حاصل ہے مگر المیہ (ٹریجڈی) جسے کہتے ہیں وہ کچھ اور ہی چیز ہے اور بے پناہ وسعت کی حامل ہے۔ اسی طرح ایکیومینس طبابت کے دعویدار سے طب اور ادویہ کے علوم کے بارے میں یہی کچھ کہے گا۔ ہے ناں؟

فیڈرس: جی ہاں!

سقراط: اور اگر میلی فلوس (Mellifluous) کے ایڈراسٹس (Adrastus) یا پیریکلس (Pericles) دلچسپ باتوں کو سنے اور وہ مشکل مشکل نام مثلاً بریکا ئیلوجیز (Brachylogies) اور ایکونالوجی اور ایسے ہی علوم جن پر ہم دن بھر روشنی ڈالتے رہیں، اس کے سامنے بیان ہوں تو وہ کیا کہے گا؟ وہ یقیناً میری اور آپ کی طرح بتھے سے اکھڑتے ہوئے سخت سست کہنے پر نہیں اُتر آئے گا، بلکہ ایسے فرضی علوم سے متعلق ہمارے جیسا رویہ اختیار کرنے کی بجائے وہ ہمیں بھی فرمایش کرے گا کہ یہ کہنے والے شخص کو بھی اور وہ اس انداز میں ردعمل ظاہر کرے گا۔ برخورداران فیڈرس اور سقراط! ذرا صبر سے کام لیجیے! آپ کو ان لوگوں سے الجھنے کی کیا ضرورت ہے جو فن خطابت کی جزئیات سے واقف نہ ہونے کے باعث اس سے متعلقہ اصطلاحات کی مناسب تعریف کرنے سے قاصر ہیں اور نتیجے کے طور پر ابتدائی علم کے حصول کے بعد سمجھتے ہیں کہ سب کچھ جان گئے ہیں اور جب وہ یہ فن دوسروں کو سکھاتے ہیں (اپنی استطاعت کے مطابق) تو بھی یہی سمجھتے ہیں کہ انھوں نے اپنے شاگردوں کو اس فن سے متعلق سب کچھ سکھا دیا ہے مگر فن کے کئی آلات کو کامیابی سے استعمال کرنے یا ایک آدھ مکمل کمپوزیشن بنا لینے کے بعد وہ اسے اپنے شاگردوں کے لیے بھی (خود سے کرنا) آسان سمجھنے لگتے ہیں (حالانکہ حقیقتاً ایسا نہیں ہوتا)۔

فیڈرس: آپ کے نقطہ نظر کو میں مکمل طور پر تسلیم کرتا ہوں جناب سقراط! کہ فن خطابت کے بارے میں لوگ وہی کچھ لکھتے ہیں یا بیان کرتے ہیں جیسے آپ نے فرمایا ہے۔ یہاں تک کہ میں آپ سے متفق ہوں۔ مگر اب بھی میں یہ جاننے کے لیے بے تاب ہوں کہ خطابت اور قائل کرنے کی صلاحیت کا حقیقی علم کہاں سے اور کیسے حاصل کیا جا سکتا ہے؟

سقراط: فن خطابت میں کمال کا حصول (ایک منجھے ہوئے مقرر بننے کے لیے) بالکل ویسا ہی ہے جیسے دیگر علوم وفنون کے لیے ہو سکتا ہے بلکہ ہوتا ہے۔ اس کا کچھ حصہ تو خداداد ہوتا ہے مگر کچھ حصہ فن خود عطا

کرتا ہے (یعنی فن کا حصول دل وجان سے شروع کرتے ہی فن خود رہنمائی شروع کر دیتا ہے اور مخصوص رویوں کی پرداخت میں مدد ہوتا ہے) اگر آپ کو فطری صلاحیت بھی دستیاب ہو اور آپ فن سے متعلق علم حاصل کر کے مناسب مشق اور ریاضت بھی بہم پہنچائیں تو یقیناً آپ کو مطلوبہ مہارت حاصل ہو سکتی ہے اور آپ ایک ماہر فن خطیب بن سکتے ہیں اور ان میں سے کسی عنصر میں بھی جس قدر کمی رہ جائے گی اسی قدر آپ کی مہارت اور صلاحیت بھی ناقص ہو گی۔ مگر فن خطابت کم از کم، جو اس کی حقیقی ساخت ہے وہ لائسیاس اور تھریسی میکس (Thrasymachus) کی پیروی سے ممکن نہیں۔

فیڈرس: تب پھر کس کی پیروی ضروری ہے؟

سقراط: میرا خیال ہے کہ فن خطابت کے ماہرین میں پیریکلس کو منفرد مقام حاصل ہے۔

فیڈرس: اس کے متعلق آپ کیا کہہ سکتے ہیں؟

سقراط: تمام علوم وفنون کے لیے وسیع تر بحث وتمحیص اور بلند درجہ صلاحیت تخمینہ کاری درکار ہوتی ہے تاکہ فطرت فن کی حقیقت تک پہنچا جا سکے۔ البتہ ان میں بلند خیالی اور کارکردگی میں اکملیت بھی اہم کردار ادا کرتی ہے اور یہی وہ اضافی خوبی ہے جو پیریکلس نے اینگزاغورث (Anaxagorus) جیسے وہ اتفاق سے جانتا تھا سے یا اس کے ساتھ گھل مل جانے کی بدولت حاصل کی۔ اسی التفات نے اسے فلسفے سے گویا بھر دیا اور اسے ذہن اور منفی ذہن کا علم حاصل ہوا کیونکہ اینگزاغورث نہ صرف اس علم میں ماہر تھا بلکہ اپنی خطابت میں اس کا بھرپور استعمال کرتا تھا۔

فیڈرس: ذرا مزید وضاحت کیجیے!

سقراط: آپ کو پتا ہونا چاہیے کہ فن خطابت بھی علم الادویہ یا علم الطب کی طرح ہے۔

فیڈرس: وہ کیسے جناب۔

سقراط: فرق صرف یہ ہے کہ علم طب کے لیے جسم کے جملہ کوائف جاننے کی ضرورت پڑتی ہے جبکہ فن خطابت کے لیے روح کے تمام کوائف سے واقفیت لازم ہے۔ اگر ہم صرف اندازے سے نہیں بلکہ سائنسی طرز فکر اور رویے کی صورت میں بات کو آگے بڑھائیں تو یہی بات سامنے آئے گی کہ جیسے جسمانی عوارض اور کمزوری کا علاج ادویہ اور خوراک سے ہوتا ہے اسی طرح روح کے عوارض اور کمزوری کو الفاظ اور (ذہنی) تربیت کے ذریعے رفع کیا جا سکتا ہے۔

میرا خیال ہے جناب سقراط، کہ آپ کا تصور درست ہے۔

فیڈرس: اور کیا آپ کو معلوم ہے کہ پورے انسانی وجود کو جانے بغیر فقط روحِ انسانی کو ذہانت کے ذریعے

سقراط: سمجھا جا سکتا ہے۔

مگر اسکلیپاڈ کے شاطر فرہبی (بقراط) نے تو کہا ہے کہ انسانی جسم کا علم اسی صورت میں ممکن ہے

فیڈرس: جب اسے جامعیت کے ساتھ (یعنی کلی صورت میں) حاصل کیا جائے۔

سقراط: ہاں دوست! اور اس نے ایک لحاظ سے بالکل درست کہا ہے مگر ہمیں صرف بقراط کا نام ہی سُن کر مطمئن نہیں ہو جانا چاہیے بلکہ یہ جاننے کی بھی ضرورت پڑتی ہے کہ اس کا یہ فرمان خود اس کے نظریۂ فطرت سے ہم آہنگ بھی ہے یا نہیں۔

فیڈرس: جی ہاں، یہ جاننا تو ضروری ہے۔

سقراط: ایسی صورت میں ہمیں یہ جاننے کی ضرورت پڑتی ہے کہ بقراط نے اس موضوع پر اور فطرت کے دیگر مظاہر کے بارے میں کیا کہا ہے؟ کیا ہمارے لیے، اس ضمن میں، سب سے پہلے یہ جاننا ضروری نہ ہوگا کہ جس شے کو ہم جاننے کے خواہشمند ہیں وہ مفرد ہے یا مرکب اور اگر مفرد یا سادہ ہے تو دیگر اشیا کے ساتھ عمل کرنے کے لیے اسے کس قسم کی قوت درکار ہوتی ہے اور اگر یہ مرکب کثیر نوعیت کی ہے تو یہ کہ اس میں کتنی انواع کی دیگر اشیا موجود ہیں؟ ایسی صورت میں ہمیں ایک ایک عنصر کو لے کر پرکھنا ہوگا کہ آخر کس قوت کے عمل کے ذریعے (چاہے وہ قوت استعمال کر رہی ہوں یا ان پر قوت کا استعمال ہو رہا ہو) وہ موجودہ صورت اختیار کر پائی ہیں؟

فیڈرس: بظاہر تو آپ کی باتیں درست ہی لگتی ہیں۔

سقراط: بغیر تجزیے کے اشیا کی حقیقت دریافت کرنے کی کوشش اندھوں کی طرح ٹامک ٹوئیاں مارنے کے مترادف ہے اور یہ تو ظاہر ہی ہے کہ ایک آرٹسٹ کی حیثیت کسی اندھے اور گونگے بہرے کی سی نہیں ہو سکتی۔ ایک ماہرِ فن خطابت جب اپنے طلبہ کو اس فن کی تعلیم دیتا ہے (خاص طور پر سائنسی بنیادوں پر) تو وہ جن افراد سے مخاطب ہے ان کی فطرت سے آگاہی کا محتاج ضرور ہوتا ہے اور یہی فطرت دراصل ان کی روحوں کا علم ہے۔

فیڈرس: یقیناً!

سقراط: گویا اس کی پوری کوشش ہوتی ہے کہ اس کی باتیں سامعین کی روحوں کو چھو کر گزریں کیونکہ سامعین

میں یقینِ کامل اسی صورت میں پیدا ہو سکتا ہے۔

فیڈرس: بالکل صحیح!

سقراط: یعنی یہ بات واضح ہے کہ تھریسی میکس یا اس قبیل کے دیگر افراد جب فنِ خطابت کی تعلیم وتدریس کا آغاز کرتے ہیں تو سب سے پہلے روح ہی کے مطالعے کو پیش کرتے ہیں اور اسی کارروائی کے ذریعے ہمیں معلوم ہو سکتا ہے کہ روح کوئی مفرد ہے یا جسم کی طرح نوعیت کی حامل ہے۔ اسی کو روح کی فطرت یا اصلیت سے آگاہی کا نام دیں گے۔

فیڈرس: یقیناً ایسا ہی ہوگا۔

سقراط: دوسرے نمبر پر وہ اس طریق کار کی وضاحت کرتے ہیں جس کے ذریعے سے روح کسی شے پر عمل کرتی ہے یا کسی شے کے زیرِ عمل آتی ہے۔

فیڈرس: درست!

سقراط: تیسرے مرحلے پر جب انسان کی روح کا مکمل تجزیہ کر لیا جاتا ہے اور ساتھ ہی تقاریر، ان کی اقسام اور ان کے اثرات کا گہرا مطالعہ کر لیا جاتا ہے تب طلبہ کو بتایا جاتا ہے کہ کن عوامل اور عناصر کی بدولت کسی خاص قسم کی دلیل بعض لوگوں پر اثر انداز ہوتی ہے مگر دوسروں پر نہیں ہوتی۔

فیڈرس: آپ نے حقائق جاننے کے بڑے خوبصورت طریقے کا انکشاف کیا ہے۔

سقراط: جی ہاں۔ یہ اکلوتا اور مناسب ترین طریقہ ہے جس کے ذریعے گفتگو یا تحریر دونوں صورتوں میں کسی موضوع پر فن کے اُصولوں کی روشنی میں اظہارِ خیال ممکن ہو سکتا ہے مگر آج کے لکھنے والوں میں جن میں سے ایک کے نقشِ قدم پر آپ بھی چلنا چاہتے ہیں) یہ بڑا نقص پایا جاتا ہے کہ وہ روح کی فطری کیفیت کو جانتے ہوئے بھی اسے پوشیدہ رکھنے کی کوشش کرتے ہیں اور جب تک وہ ہمارے تسلیم کردہ اُصولوں پر کاربند رہ کر گفتگو یا تقریر قلمبند نہیں کرتے ہم یہی کہیں گے کہ وہ فن کے اُصولوں کی پاسداری نہیں کر رہے ہیں۔

فیڈرس: آپ کہیے میں سُن رہا ہوں۔

سقراط: خطابت ایک ایسا فن ہے جس کے ذریعے روحوں کو مسحور کیا جاتا ہے سو اس کے لیے لازم ہے کہ خطیب مختلف لوگوں کی روحوں کے باہمی امتیازات کو سمجھنے کی کوشش کرے اب یہ روحیں اس قدر زیادہ ہیں اور ان میں اس قدر زیادہ تنوع پایا جاتا ہے کہ ان کی مدد سے ایک انسان کے دوسرے کے

مابین امتیازات کو سمجھنا ایک بہت بڑی اور غیر معمولی صلاحیت کا تقاضا کرتا ہے لہٰذا تھریسی میکس نفس انسانی کے تجزیے کے بعد جب آگے بڑھتا ہے تو وہ تقاریر کو مختلف اقسام میں تقسیم کر لیتا ہے اور وہ باقاعدہ فلاں قسم کی طرزِ پران کے نام رکھ لیتا ہے اور طے کر لیتا ہے کہ فلاں قسم کے لوگ فلاں قسم کی تقریر سے متاثر ہوں گے اور وہ باقاعدہ اس اُصول کے لیے جواز رکھتا ہے۔ سب سے پہلے تو یہ دیکھنا ضروری ہے کہ فنِ خطابت کے طالب علم کی ذات میں (آواز، تلفظ اور اسی قسم کے دیگر) بنیادی مطلوبہ خصائص ہونے چاہئیں اور دوسرے مرحلے میں وہ ان صلاحیتوں کو عملی صورت حال میں متعدد بار استعمال کر چکا ہو اور وہ ان تجربات کو اپنے فن کی باریکیوں کے حوالے سے مختلف مرحلوں پر استعمال کرنے کی صلاحیت کا حامل بھی ہو ورنہ اس کا علم اساتذہ کے خطبات سے آگے نہ بڑھ سکے گا۔ مگر جب وہ یہ معلوم کر لے گا کہ کس قسم کے لوگوں کو کس قسم کی تقریر متاثر کرتی ہے؟ اور جب وہ ان لوگوں کو اپنے سامنے دیکھتا ہے جن کے متعلق وہ مفروضوں میں بات کر رہا تھا اور اب اسے اس کی نوعیت کے حوالے سے پہچان لیتا ہے تو اپنے آپ سے مخاطب ہو کر کہتا ہے: اچھا! تو یہ ہے وہ شخص جس کی شخصیت فلاں نوعیت کی ہے اور اسے کسی خاص نقطۂ نظر اور رائے سے متفق کرنے کے لیے فلاں دلیل کارگر ہو گی۔ جو شخص یہ سب کچھ جانتا ہے اور اس کے علاوہ اس کے علم میں یہ بھی ہے کہ اسے کب بولنا اور کب خاموش ہونا ہے اور کب اسے لوگوں کی ہمدردیوں کو اُکسانے والے الفاظ استعمال کرنے چاہئیں کب لوگوں کے دل کو چھونے والے جملے بولنے چاہئیں، کب ان کے جذبات کو اُبھارنے کا موقع ہوتا ہے اور اس طرح کے دیگر اندازہائے تقریر جو اس نے سیکھ رکھے ہیں کن مواقع پر مؤثر ثابت ہوتے ہیں، جب تک وہ ان صلاحیتوں سے متصف نہیں ہو جاتا، اسے ماہر خطیب اور مقرر کہلانے کا حق حاصل نہیں اور یہ کہ اگر وہ ان متذکرہ نکات میں سے ایک میں بھی خام ہو (خواہ وہ سکھانے کے حوالے سے ہو یا بولنے یا لکھنے سے متعلق) اور اس کے متعلق اس کا دعویٰ یہ ہو کہ وہ ماہر فن ہے اور اُصولوں کی پاسداری کرتا ہے تو اس کی بات پر یقین کر لینے سے بڑی حماقت کوئی اور نہ ہو گی۔ ایسی صورت میں اُستاد یہی کہہ سکتا ہے کہ ہاں بھئی فیڈرس اور سقراط کیا تمھاری بھی ایسے شخص کے بارے میں یہی رائے ہے یا مجھے اس کے لیے کسی اور سے رابطہ کرنا پڑے گا۔

فیڈرس: ایسے ہی آدمی سے (جتنا ممکن ہو سکے) فائدہ اُٹھا لینا چاہیے کیونکہ حقیقی معنوں میں ماہرِ فن کی دستیابی

آسان نہ ہوگی کیونکہ اس حد تک کمال فن کے حامل کا وجود تو تقریباً ناممکنات میں سے ہوگا۔

سقراط: یہ تو آپ نے درست کہا! لہٰذا ہمیں اس معاملے کو ہر امکان کی روشنی میں دیکھنا چاہیے اور ہمیں دیکھنا ہے کہ آیا اس کا کوئی مختصر مگر مؤثر راستہ بھی ہے یا نہیں کیونکہ جب کوئی مختصر اور آسان راستہ دستیاب ہو تو گھماؤ پھراؤ والا راستہ اختیار کرنے میں کوئی معقولیت نہیں اور میں آپ سے کہوں گا کہ آپ (اپنی یادداشت پر زور دے کر) لائسیاس یا ایسے کسی فرد کی کہی ہوئی باتوں میں سے ایسی باتوں کی نشاندہی کریں جو ہمیں یہاں (دریافت حقیقت کے عمل میں) مددگار ثابت ہو سکیں۔

فیڈرس: اگر تلاش سودمند ثابت ہو تو کوئی حرج نہیں مگر اس وقت میرے ذہن میں کچھ بھی نہیں آ رہا۔

سقراط: فرض کیجیے میں ہی آپ کو کسی ماہر کی کہی ہوئی بات بتا دوں تو۔

فیڈرس: مجھے خوشی ہوگی۔

سقراط: کیا، جیسا کہ کہاوت ہے، بھیڑیا سماعت کا دعویدار ہو سکتا ہے؟

فیڈرس: آپ ہی کہیے اسے کیا کہا جائے گا؟

سقراط: وہ تو یہی دلیل پیش کرے گا کہ ان معاملات پر ضرورت سے زیادہ روشنی ڈالنے کی ضرورت ہی نہیں۔ آخر اتنے چکروں کے بعد بھی پہلے ہی اصول سے شروع کرنا ہی ٹھہرا تو پھر یہ سب گھماؤ پھراؤ کس لیے؟ بلکہ جیسا میں نے شروع میں عرض کیا ہے کہ جب سوال عدل یا بھلائی کا یا ان لوگوں کا ہو کہ عدل اور سچائی ان کا شعار رہا ہو (چاہے یہ شعار فطرتاً ہو یا عادتاً) اور پھر وہ خطابت کا پیشہ اپنا لے تب بھی اسے (قانون کورٹ آف لاء وغیرہ کے حوالے سے) کسی بھلائی کا پرچار کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ وہاں سچائی کی اتنی اہمیت نہیں جتنی یقینِ کامل کی ہے۔ سو ایک خطیب کے لیے لازم ہو جاتا ہے کہ وہ امکانات پر اپنی توجہ مرکوز کرے بلکہ لوگ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ اگر کسی مقدمے میں واقعات اگرچہ سچ ہوں مگر بظاہر ناممکن العمل نظر آتے ہوں تو بھی انھیں زیر بحث لانے سے کترانا اور گریز کرنا چاہیے اور معاملہ چاہے الزامات کا ہو یا دفاع کا صرف امکانات ہی کو ملحوظ خاطر رکھنا چاہیے اور اسی لیے اپنی گفتگو یا دلائل کی پیشکش کے دوران ایک خطیب کو حقائق نہیں بلکہ محض امکانات ملحوظ رکھنے چاہئیں۔ اگر پوری تقریر کے دوران اسی اُصول کی پاسداری کی جائے تو تقریر فن خطابت کا ایک بہتر نمونہ شمار ہوگی۔

فیڈرس: محترم سقراط! بالکل یہی بات خطابت کے فن کے پروفیسر بھی کہتے ہیں۔ میں بھولا نہیں ہوں کہ کچھ

دیر قبل ہم نے اسی موضوع کو بیان کیا تھا بہر طور یہ نقطہ بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔

سقراط: میرا خیال ہے آپ ٹسیاس سے تو واقف ہی ہوں گے۔ کیا اس کے ہاں بھی ''امکانات'' کا وہی مفہوم نہیں ہے جو بہت سے دوسرے ماہرین کے ہاں ہے؟

فیڈرس: یقیناً اس نے بھی ایسا ہی کہا ہے۔

سقراط: مجھے یقین ہے کہ اس کے ذہن میں بھی ایک چالاک مگر شریف آدمی کا کیس ہے۔ وہ اس طرح بیان کرتا ہے کہ ایک بظاہر کمزور اور دبلے پتلے مگر فی الحقیقت طاقتور شخص نے ایک موٹے تازے مگر بزدل شخص پر حملہ کر کے اسے قیمتی کوٹ یا ایسی ہی کسی قیمتی شے سے محروم کر دیا ہے۔ اسے جب عدالت میں لایا جاتا ہے تو جسے وکیل کے فرائض سرانجام دینے ہیں دونوں پارٹیوں سے کہتا ہے کہ وہ جھوٹ بولے بغیر اپنا مؤقف ثابت نہیں کر سکتے۔ بظاہر ہٹے کٹے مگر بزدل شخص کو یہ بیان دینا چاہیے کہ اس پر ایک کی بجائے کئی افراد نے حملہ کیا جبکہ دوسری پارٹی اس پر زور دیتے ہوئے کہے وہ تو تنہا تھا یوں اپنے مؤقف کا ثبوت پیش کرنا چاہیے، میرے جیسا ایک کمزور شخص اس ہٹے کٹے اور مضبوط شخص پر اوّل تو حملے کی جرأت ہی نہیں کر سکتا اور کہیں کر بھی بیٹھے تو اُلٹا مار کھائے گا وہ اسے لوٹ کیسے سکتا ہے۔ اس طرح شکایت کنندہ اپنی بزدلی کا اعتراف حتی الامکان نہیں کرے گا اور اس طرح وہ اور جھوٹ گھڑے گا اور اسی مصنوعی استدلال کے کسی کمزور پہلو کو بنیاد بنا کر ہم اس کے دعوے کو رد کر دیں گے۔ اس نظام میں اس طرح کی کارروائیوں کی اور بھی بے شمار مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ جناب فیڈرس! کیا میں نے درست نہیں کہا؟

فیڈرس: یقیناً آپ نے درست فرمایا ہے۔

سقراط: ذرا ملاحظہ فرمائیے۔ یہ کیسا انوکھا فن ہے (جس سے سچ کو جھوٹ اور جھوٹ کو سچ ثابت کیا جا سکتا ہے) جسے ٹسیاس یا ایسے دوسرے ماہرین نے (خواہ وہ کسی ملک اور قوم سے متعلق ہوں) ایجاد کیا ہے۔ کیا اس (ٹسیاس) کے ساتھ ہمیں کچھ اظہارِ خیال اور گفتگو کر نہیں لینی چاہیے؟

فیڈرس: ہم اس کے بارے میں کیا کہہ سکتے ہیں؟

سقراط: ہمیں اپنی موجودہ بحث کے متعلق بات چیت کا آغاز کرنا ہوگا مگر ہم اسے بتا سکتے ہیں کہ اس کے آنے سے قبل ہم یہ کہہ رہے تھے کہ جس امکان کا وہ تذکرہ کر رہا تھا وہ لوگوں کے ذہنوں میں محض اس لیے پیدا ہوتا ہے کہ ان کی حقیقت کے سامنے کچھ مماثلت ظاہر ہوتی ہے اور اسی کو ہم نے ابھی

اپنی گفتگو میں ثابت کیا ہے کہ جو فرد سچائی سے کما حقہٗ واقف ہے، وہی اصل سچائی اور سچائی کا لبادہ اوڑھنے والے جھوٹ کے درمیان ظاہری مشابہت کی حقیقت کو پہچان سکتا ہے۔ اگر وہ فن خطابت سے متعلق اس کے علاوہ کچھ بیان کرنے پر تیار رہے تو ہم گوش برآواز ہیں اور اگر نہیں تو ہم اپنے ہی نقطۂ نظر سے کافی مطمئن ہیں اور وہ نقطۂ نظر یہ ہے کہ جب تک کوئی مقرر اپنے سامعین کو مختلف خصائص کے اعتبار سے شناخت کرتے ہوئے انھیں مختلف گروہوں میں تقسیم نہیں کرتا اور پھر انھیں ایک ہی خیال کی تفہیم کا ذریعہ نہیں بناتا تو وہ کبھی بھی ایک کامیاب خطیب قرار نہیں دیا جا سکتا خواہ وہ اس سلسلے میں تمام ممکنہ انسانی صلاحیتیں ہی کیوں نہ استعمال کر لے اور یہ صلاحیت بے پناہ محنت اور مشقت کے بغیر حاصل نہیں ہو پاتی اور ہر اچھے شخص کو یہ مشقت برداشت کرنی چاہیے۔ محض اس لیے نہیں کہ وہ ایک کامیاب مقرر اور خطیب کی حیثیت سے لوگوں کو متاثر کر سکے بلکہ اس لیے بھی کہ اسے اپنی گفتگو اور انداز اظہار کو خدا کی پسند کے مطابق شکل دے سکے کیونکہ ہم سے زیادہ ذہین و فطین لوگ یہ کہہ چکے ہیں کہ ایک حساس اور باصلاحیت اور صاحب فہم و ادراک شخص کی علامت یہ ہے کہ وہ اپنے جیسے معمولی غلاموں کو مطمئن کرنا کم از کم اپنا اولین مقصد قرار نہ دے بلکہ اس کا مطمح نظر اچھے اور شرفا کو مطمئن کرنا ہونا چاہیے اور اگر یہ راستہ طویل اور اُلجھا ہوا ہو تب بھی حیرانی کی ضرورت نہیں کیونکہ راستہ جتنا طویل اور کٹھن ہوگا۔ منزل اسی قدر شاندار ہوگی (یعنی اگر منزل مقصود عظیم ہو تو راستے کی طوالت اور کٹھنائی سے ڈرنے کا کوئی جواز نہیں، البتہ جیسی معمولی منزل مقصود آپ کی ہے (دنیاوی مقاصد کی صورت میں) اس کے لیے مشکلات اپنانا عقل مندی نہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ جناب ٹیاس! کہ اگر آپ نے یہاں تک ہمارے ساتھ توافق کیا ہے تو یقین کیجیے کہ یہیں سے فن خطابت پر ایک خوبصورت بحث کا آغاز ہوتا ہے۔

فیڈرس: جناب سقراط بات واقعی قابل تعریف ہے، بشرطیکہ قابل عمل بھی ہو۔

سقراط: بھئی! کسی نیک کام میں ناکامی کو بُرائی قرار نہیں دیا جا سکتا (کیونکہ کم از کم کسی اچھے کام کی کوشش تو کی گئی)۔

فیڈرس: ہاں، یہ تو سچ ہے۔

سقراط: فن خطابت سے متعلق جھوٹ اور سچ کے حوالے سے ہم نے کافی بحث کرنی ہے، کیا خیال ہے؟

فیڈرس: یقیناً!

تمرا بھی ہمیں فنِ تحریر سے متعلق معقولیت اور غیر معقولیت کے بارے میں بہت کچھ کہنا ہے۔

سقراط: بالکل صحیح۔

فیڈرس: کیا آپ کو معلوم ہے کہ فنِ خطابت کو خدا کی مرضی کی حدود میں کیسے رکھا جا سکتا ہے یعنی اس کے لیے آدمی کو کون سا انداز اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔

سقراط: نہیں جناب ! مگر کیا آپ جانتے ہیں؟

فیڈرس: میں نے ایک روایت سُن رکھی ہے۔ اس کی صحت یا عدم صحت کے بارے میں تو قدیم علما ہی بہتر جانتے ہوں گے، تاہم کیا آپ کے خیال میں ہمیں حقیقت معلوم ہو جانے کے بعد بھی عوام کی (اس کے خلاف) رائے کا احترام کرنا لازم ہے؟

سقراط: اگرچہ آپ کا سوال محتاج جواب نہیں مگر میں پھر بھی یہی عرض کروں گا جو کچھ آپ نے سُن رکھا ہے، بیان فرمایئے!

فیڈرس: مصر کے شہر نوقراطیس میں ایک دیوتا قیام پذیر ہوا کرتا تھا جس کا نام شیث (Theuth) تھا۔ وہ پرندہ جسے لک لک (Ibis) کہتے ہیں اس کی نظر میں بہت مقدس تھا۔ وہ دیوتا بہت سے فنون مثلاً حساب علم جمع وتفریق، جیومیٹری، فلکیات پانسے اور چوپڑ کے کھیل وغیرہ کا موجد تھا۔ مگر اس کی عظیم ترین ایجاد حروف کی ایجاد ہے۔ ان دنوں پورے مصر پر دیوتا تھیمس (Thamus) کی حکومت تھی اور وہ بالائی مصر کے شہر میں متمکن تھا جسے ہیلینا (یونان) کے لوگ مصری تھیمس کہتے ہیں۔ وہ اس دیوتا کو ایمون (Ammon) کہتے ہیں۔ دیوتا شیث اس کے پاس آیا اور اسے اپنی ایجادات دکھا کر کہا کہ عوام کو ان کے استعمال کی اجازت دی جائے۔ اس نے اعداد و شمار کی مدد سے جمع تفریق کے مناظر بھی دکھائے اور دیگر بے شمار استعمال سے متعلق بادشاہ (دیوتا) کے سوالات کے جوابات بھی فراہم کیے۔ اس نے ان میں سے بعض کی تعریف کی جبکہ دوسروں کو رد کر دیا اور اسی رد و قدح کے مطابق حسب موقع منظوری دے دی۔ مختلف علوم وفنون کی توصیف یا تردید کے ضمن میں تھیمس نے شیث سے جو کچھ کہا وہ ایک طویل داستان ہے تاہم جب شیث حروف کی پیشکش پر آیا تو اس نے کہا کہ یہ وہ ایجاد ہے جو مصریوں کو زیادہ عاقل و دانا اور صاحب یادداشت بنا دے گی کیونکہ یہ ذہانت اور یادداشت کی قوت کے لیے خاص طور پر مفید اور معاون ہے۔ تھیمس نے اسے جواب دیا: اے میری ریاست کے عقل مندترین انسان کسی موجد کی ایجادات کے مضر یا مفید ہونے کے بہترین جج

(اس موجد کی بجائے) ان ایجادوں کو استعمال کرنے والے لوگ ہوتے ہیں۔ ان حروف سے آپ کی محبت بالکل ایسی ہی ہے جیسے کوئی باپ اپنی اولادوں سے محبت کرتا ہے اور اسی محبت کی وجہ سے انھیں ان خوبیوں سے متصف بھی قرار دیتا ہے جو فی الحقیقت ان میں نہیں ہوتیں لیکن ہے آپ کی ایجاد (یہ حروف) لوگوں کی روحوں میں یادداشت کی قوت کی بجائے بھولنے کی کیفیت پیدا کرنے کا سبب زیادہ بنیں اور اس کی وجہ بھی ہے۔ وہ اس عنصر پر انحصار کرنے لگیں گے جس سے فطری بات ہے کہ، ان کی یادداشت کمزور ہوگی۔ دراصل آپ نے جو کچھ ایجاد کیا ہے وہ یادداشت میں معاونت کرنے کی بجائے البتہ بھولی ہوئی شے کو دوبارہ یاددہانی کا سبب ضرور بنے گا۔ آپ اس کے ذریعے اپنے شاگردوں اور چیلوں کو جو کچھ دیں گے وہ فی نفسہٖ حقیقت نہیں بلکہ فقط ایک شے ہوگی جس پر حقیقت کا محض گمان ہوگا۔ اگرچہ وہ بے شمار کوائف سے دوچار ہوں گے مگر وہ کچھ یاد نہیں رکھ پائیں گے اور اگرچہ ان کے تصرف میں بے شمار معلومات ہوں گی۔ مگر ان کی حقیقی دسترس صرف ان کے مجموعی تاثر تک ہوگی اور ان کے دیگر عناصر کے تجزیے کا انھیں کبھی ملکہ حاصل نہ ہو پائے گا۔ وہ ایک ایسے غیر پُرکشش لوگوں کا ہجوم ہوگا جو دانائی کا دعویٰ کریں گے مگر اس میں حقیقت کا دور دور تک گزر نہ ہوگا۔

فیڈرس: جناب سقراط: یہ حقیقت ہے کہ آپ مصر اور ایسی دیگر سرزمینوں کے بارے میں کہانیاں گھڑنے میں جواب نہیں رکھتے۔

سقراط: ڈوڈونا کی عبادت گاہ میں ایک روایت ہے کہ شاہ بلوط کے درختوں سے پیامبرانہ ارشادات صادر ہوا کرتے تھے۔ اس لیے قدیم ادوار کے لوگ (فلسفے کے عہد کی ابتدا کے باوجود) یہ کہا کرتے تھے کہ سچائی چاہے کسی شاہ بلوط کے درخت یا چٹان ہی سے کیوں نہ سُنی جائے، قابلِ اعتبار ہوتی ہے۔ جبکہ آپ کے بارے میں ایسا لگتا ہے کہ آپ کو اس سے غرض نہیں ہوتی کہ کوئی بات سچ ہے یا جھوٹ بلکہ آپ اس امر کو ملحوظ رکھتے ہیں کہ کہنے والا کون ہے اور کہانی کس ملک یا سرزمین سے تعلق رکھتی ہے۔

فیڈرس: میں آپ کے دوٹوک جواب کے جواز کا معترف ہوں اور مجھے یقین ہے کہ تھیبان کے لوگ (The Theban) حروف کے بارے میں اپنا مخصوص نقطۂ نظر رکھنے میں حق بجانب ہیں۔

سقراط: وہ ایک بے حد سیدھا سادہ شخص ہوگا۔ اس لیے تھیمس یا ایمون کے نواہائے سروش پر پورا نہیں اتر

سکا۔ وہ ہر طرح کے فن کو زبانی ذرائع کی بجائے تحریری طور پر قبول کرنے اور دوسروں تک پہنچانے کا قائل معلوم ہوتا ہے اور ایسے لگتا ہے جیسے اس کے خیال میں لکھے ہوئے حروف بہر صورت زبانی ادا ہونے والے حروف سے زیادہ معتبر ہونا چاہئیں۔ کیونکہ کئی روایتوں سے زبانی طور پر گزرنے والی باتوں کے مقابلے میں تحریری باتوں کو سمجھنے میں بہر صورت آسانی ہوتی ہے اور یہ زیادہ قابل بھروسا بھی ہیں۔

فیڈرس: اس میں کوئی شک نہیں۔

سقراط: میں یہ محسوس کرنے پر مجبور ہوں، محترم فیڈرس، کہ بدقسمتی سے تحریر بالکل ایک تصویر (پینٹنگ) کی طرح ہوتی ہے کہ اگرچہ وہ مصور کے نقطۂ نظر کے اظہار کا ذریعہ سمجھی جاتی ہے مگر آپ بعض کوائف سے متعلق استفسار کرنا چاہیں تو تصویر بہرحال جواب فراہم کرنے سے قاصر ہوتی ہے۔ تقاریر پر بھی یہی اُصول لاگو ہوتا ہے۔ کیونکہ اگرچہ تقاریر اپنے مصنف کی ذہانت کا مظہر ہو سکتی ہیں۔ تاہم اگر آپ ان کے کسی ایک پہلو کے بارے میں پوچھنا چاہیں تو جواب سے محروم رہیں گے کیونکہ مقرر نے بہر کیف ایک ہی نقطۂ نظر کو محض اپنے ہی نقطۂ نظر سے پیش کیا ہوتا ہے اور جب ایک بار تقاریر لکھ کر دی جاتی ہیں تو لوگوں تک اس امر کو ملحوظ رکھے بغیر پہنچتی ہیں کہ کون ان کو سمجھے گا اور کون نہیں سمجھے گا اور یہ کہ اس سے کس سوال کا جواب حاصل ہوتا ہے اور کس کا نہیں ہوتا اور اگر کسی تقریر کے خلاف منفی ردعمل ظاہر کیا جائے یا ان کو غلط مقصد کے لیے غلط معانی میں حوالہ پیش کیا جائے تو بھی اس کا مصنف وہاں اپنے نقطۂ نظر کے دفاع کے لیے موجود نہیں ہوتا۔

فیڈرس: یہ بات بھی یقیناً شک وشبہ سے بالاتر ہے۔

سقراط: کیا اس قسم کے الفاظ اور تقریر کے برعکس یا ان سے مختلف کوئی ایسی صورت بھی ممکن ہے جو نہ صرف اس سے بہتر مفہوم دے سکے بلکہ تاثر میں بھی اس سے بہتر ہو۔ گویا اس کنبے کا فرزند جو جائز طریقے سے حاصل ہوا ہو۔

فیڈرس: آپ اس سے کون سا فرزند مراد لے رہے ہیں اور اس کا منبع کیا ہے؟

سقراط: اس سے میری مراد پُر از ذہانت لفظ ہے جو ذہنوں پر نقش ہو اور جو اس ذہن کے مالک کو وہ شعور بھی دے کہ اس لفظ کو کب ادا کرنا ہے اور کب خاموشی اختیار کرنا مناسب ہوگا؟

فیڈرس: کیا آپ اس سے وہ ذی روح یعنی زندہ لفظِ علم مراد لے رہے ہیں کہ لکھا ہوا لفظ درحقیقت اسی کا

عکس ہوتا ہے اور اس سے زیادہ کچھ نہیں؟

سقراط: ہاں میرا مطلب یہی ہے اور کیا گفتگو کے اس مرحلے پر میں آپ سے ایک سوال پوچھ سکتا ہوں؟ کیا ایک کسان یا مالی جو معقول آدمی ہے اپنی پسند اور تسلی کے بیج اچھی طرح سے تیار کی ہوئی زمین میں کاشت کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ اس پر پھل آئے۔ وہ پوری سنجیدگی سے ان بیجوں کو کسی تیز اڈونس (Adonis) کے باغ میں بودے تو وہ آٹھ دن میں انھیں خوبصورت کونپلوں کی صورت میں دیکھ کر ہی خوشی سے پھولا نہیں سمائے گا۔ مگر وہ حقیقی زندگی میں ایک خاوند کی حیثیت سے (کسی عورت یا بیوی کے بطن میں) بیج بوئے تو وہ ویسا ہی منظر (بیج کو روئیدگی میں یا نطفے کو بچے کی پیدائش میں) دیکھنے کے لیے آٹھ ماہ تک انتظار کرے گا اور تب کہیں اس کے بیج کا اسے مکمل نتیجہ ملے گا۔ کیا ایسا ہی ہے ناں؟

فیڈرس: ہاں سقراط، سنجیدگی میں وہ یہی کرے گا۔ ہاں اگر وہ محض وقت گزاری اور وقتی لطف کا خواہاں ہے تو بات دوسری ہے۔

سقراط: اور کیا ہم یہ فرض کر سکتے ہیں کہ کسی عدل و انصاف پر یقین رکھنے والے شخص کو اتنی بھی سمجھ نہیں ہوتی جتنی کسی کسان یا مالی کو اپنے بیجوں سے متعلق میسر ہوتی ہے؟

فیڈرس: ہرگز نہیں جناب!

سقراط: پھر وہ کیسے چاہے گا کہ اپنے خیالات قلم اور روشنائی سے پانی پر تحریر کرے (کہ وہ نقش بر آب ثابت ہوں) کیونکہ یہ تو ایسا ہی ہوگا گویا وہ ایسے الفاظ کا بیج بونا چاہتا ہے جو نہ تو خود کلام کر سکتے ہیں نہ ہی دوسروں کو اس کا سلیقہ سکھا سکتے ہیں۔

فیڈرس: یہ درست نہیں لگتا۔

سقراط: جی ہاں، یہ درست نہیں لگتا۔ وہ لفظوں کے باغ میں وہ حروف کے بیج بوئے گا ضرور مگر محض لطف اندوز ہونے کے لیے اور تفریح طبع کے لیے بھی، وہ ان کو بوئے گا، اس لیے کہ ماضی کی شاندار حقیقتوں کو بھول سے بچانے اور یادداشت میں محفوظ رکھنے کے لیے۔ وہ ایسا کرے گا اپنے لیے بھی اور اس راہ کے دوسرے بوڑھے مسافروں کے لیے بھی! وہ ان کی نازک بڑھوتری کو دیکھ کر لطف اندوز ہوگا۔ بلکہ دوسروں کو ان الفاظ کے گلدستے بنا کر اپنی گفتگو کو سجاتے دیکھ کر بھی وہ خوش ہوگا بلکہ یہ تو اس کے لیے وقت گزاری کا خوشگوار ترین ذریعہ ثابت ہوگا۔

فیڈرس: لیکن جناب سقراط! وقت گزاری تو گھٹیا کام ثابت ہوتا ہے سوائے اس کے کہ اسے سنجیدہ اور معزز لوگوں کی طرح عالمانہ بحث وتمحیص (وہ بھی عدل وانصاف اور نیکی جیسے موضوعات پر) میں خوش دلی سے صرف کیا جائے۔

سقراط: فیڈرس! آپ بالکل درست فرمارہے ہیں۔مگر یہ اس وقت اور بھی قابلِ قدر ہو جاتی ہے (وقت گزاری) جب یہ ایسے سنجیدہ ماہر لسانیات کی مصروفیات کی صورت میں ہو جو کسی روح کو سائنس (علم) کے ذریعے زرخیز پائے اور ان میں الفاظ کی فصل کاشت کرے۔ایسی صورت میں الفاظ خود اپنے لیے بھی مددگار ثابت ہوتے ہیں اور اس کے لیے بھی جو انھیں کاشت کرتا ہے اور یہ اگر بظاہر ثمر بار ثابت نہیں ہوتے ان میں ایسا بیج ہوتا ہے جسے دوسرے لوگوں نے مختلف قسم کی زمین میں پروان چڑھایا ہوتا ہے جہاں وہ لافانی ثابت ہوتے ہیں اور انھیں اپنے مالکان کو حتی الامکان خوش کرنے کی صلاحیت حاصل ہوتی ہے۔

فیڈرس: واقعی یہ معروضیت کہیں زیادہ مقدس ہے۔

سقراط: اور جناب فیڈرس ان تفصیلات کو زیرِ بحث لانے کے بعد اب ہمیں کسی نتیجہ پر پہنچنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

فیڈرس: کس نتیجے کی بات کر رہے ہیں آپ؟

سقراط: ہمیں لائیاس کے بارے میں، جس پر ہم نے اعتراضات وارد کیے ہیں، اس کے فن تحریر وتقریر کے بارے میں اور اس کے بیان میں فنِ خطابت کے اعتبار سے خوبیوں یا خامیوں جیسے سوالات کے جوابات فراہم کرتا ہے جن کے نتیجے میں ہم بحث کی راہ میں یہاں تک آنکلے ہیں اور اس مرحلے پر پہنچ کر، مجھے یقین ہے کہ ہم اس فن کے حسن وقبح کے بارے میں اور فن کی حقیقت اور اس کے عکس کے بارے میں بہت کچھ جان چکے ہیں۔

فیڈرس: جناب سقراط! اگرچہ میں اس ضمن میں آپ کا ہم خیال ہوں مگر میرا جی چاہتا ہے کہ جو کچھ ہم کہہ چکے ہیں اس کا خلاصہ آپ دہرادیں۔

سقراط: جب تک کوئی شخص اپنی بحث یا زیر تحریر موضوع سے متعلق پہلوؤں اور خصائص کے بارے میں بالتفصیل سب کچھ سیکھ نہ سکے، اور ان کو ان کی حقیقت مطلقہ کے مطابق تعریف نہ کرسکتا ہو، اور اس تعریف کے بعد ان کو ایسے اجزا میں تقسیم کرنے پر قادر نہ ہو جائے کہ ان کی مزید تقسیم ممکن نہ رہے

اور جب تک وہ سامعین یا قارئین کی روحوں کی حقیقت کو اس حد تک نہ سمجھتا ہو کہ یہ سطے کر سکے کہ کس نوع کی روح کی تشفی کس انداز کی تحریر یا تقریر سے ممکن ہے اور جب تک وہ سادہ لوگوں کے لیے سادہ تقریر اور پیچیدہ شخصیت افراد کے لیے پیچیدہ تقریر کے انتخاب پر قدرت حاصل نہ کر لے وہ دلائل کو خطابت کے اُصولوں کے عین مطابق پیش کرنے کے قابل نہیں ہو سکتا خواہ اس فن کا اطلاق درس و تدریس کے لیے ہو یا کسی کو مخصوص نقطۂ نظر کا قائل کرنے کے لیے ہو، دلائل کو موثر انداز میں پیش کرنے کے لیے ہمیشہ یہی اُصول کارفرما ہوتا ہے اور اسی نقطۂ نظر کو ہر جگہ اور ہر سطح پر پذیرائی حاصل ہوتی ہے۔

فیڈرس: بالکل درست! ہمارا نقطۂ نظر بھی یہی رہا ہے۔

سقراط: علاوہ ازیں یہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ ہم نے زیرِ بحث تقریر پر کیا کیا اعتراضات کیے ہیں اور یہ کہ ان اعتراضات کا جواز کیا ہے؟ کیا یہ سب ہماری سابقہ بحث و تمحیص سے ظاہر نہیں ہوتا؟

فیڈرس: کیا ظاہر نہیں ہوتا؟

سقراط: یہی کہ کیا لائسیاس یا کوئی بھی دوسرا فرد جس نے ایسی تحریر لکھی ہو یا لکھے گا، وہ کوئی عام شخص ہو یا کوئی سیاستدان، توانین تجویز کرتا ہے اور اس طرح سیاسی معاہدوں کا مصنف قرار پاتا ہے اور اپنے دل میں مطمئن ہوتا ہے کہ جو کچھ اس نے لکھا ہے وہ یقینی، حقیقی اور بالکل واضح ہے، مگر جب لوگ اس تحریر کا جائزہ لیتے ہیں تو وہ سب کچھ اس کے لیے کلنک کا ٹیکا ثابت ہوتا ہے۔ کیونکہ اس کے ذہن میں اچھے اور بُرے، عدل اور ظلم کا تصور واضح نہیں ہوتا۔

بلکہ وہ تو خواب اور حقیقت میں امتیاز کی صلاحیت سے بھی عاری ثابت ہوتا ہے، چاہے ساری دنیا اس کی تعریف و توصیف میں رطب اللسان ہی کیوں نہ ہو، یہ سب کچھ اس کے لیے باعثِ ذلت و رسوائی کے سوا اور کچھ ثابت نہیں ہوتا۔

فیڈرس: یہ بات تو یقینی ہے۔

سقراط: مگر وہ شخص جو یہ سمجھتا ہے کہ تحریر میں کوئی سنجیدگی کا پہلو نہیں ہوتا نہ ہی کسی تحریر میں (خواہ وہ نظم کی شکل میں ہو یا نثر کی صورت میں) کوئی قابلِ قدر مواد ممکن ہے خصوصاً جب وہ محض اس لیے رجزیہ انشا پردازی کی صورت میں ضبطِ تحریر میں لائی جائیں کہ ان پر آنکھیں بند کر کے یقین کر لیا جائے یا تقدس کی غرض سے محض ان کی تلاوت کی جائے اور ان پر کسی طرح کی تنقید و تبصرہ یا مشاورت کو جائز

نہ رکھا گیا ہو، یا وہ شخص جس کے خیال میں بہترین سے بہترین تحریر بھی محض اس لیے ہوتی ہے کہ ہم اپنے علم کی یادداشت کے لیے اسے قابلِ حصول بناسکیں اور لوگوں کو وہ تحریریں پڑھنے کی شکل میں یا سُننے کی صورت میں درس وتدریس کے ذریعے سے اس لیے پہنچائی جائیں کہ ان کے دلوں پر عدل وانصاف، نیکی اور بھلائی کے نقوش کندہ کیے جاسکیں کیونکہ یہی تحریر کا حقیقی انداز ہوسکتا ہے؛ (دونوں صورتوں میں) یہ دیکھنا لازم ہے کہ تحریر میں کوئی سنجیدہ موضوع ہے جس کے بیان میں فصاحت اور جامعیت کو بنیاد بنایا گیا ہو اور یہ اُصول انسان کے اپنے اور اس کی جائز (مستحق) اولادوں کے وضع کردہ ہیں۔ یہی شخص اس فرد کی حیثیت رکھتا ہے کہ سب سے پہلے وہ لفظِ معتبر اس کے اپنے سینے میں پنپتا ہے اس کے بعد وہ اس کے بھائی بندوں، اولادوں اور دیگر متعلقین کے ذریعے آگے بڑھتا ہے۔ یہی انسان کی وہ حیثیت ہے جس پر فخر کیا جانا چاہیے اور عزیزم فیڈرس، میں اور آپ بھی یہی دعا کریں کہ ہم اس جیسے بن سکیں۔

فیڈرس: یقین مانیے میری بھی دلی خواہش اور دعا یہی ہے۔

سقراط: چلیے! اب خطابت کا ڈراما تو ختم ہوا۔ اب آپ جائیے اور لائیسیاس سے کہہ دیجیے کہ ہم فاؤنٹین اور نمفس کے سکول تک گئے تھے۔ انھوں نے ہمیں آپ کے لیے یہ پیغام بھیجا ہے جو کہ نہ صرف اس کے لیے بلکہ ان جیسے دیگر افراد کے لیے (جو تقاریر ترتیب دیتے ہیں) بھی ہے، مثلاً ہومر اور دیگر شعرا جو نظمیں لکھتے ہیں، خواہ ان کی نظمیں موسیقی کے پیمانے پر پوری اُتریں یا نہیں؛ سولون یا دوسرے انشا پرداز جنھوں نے سیاسی تقریریں قلمبند کی ہیں اور جنھیں وہ قانون کا نام دیتے ہیں؛ ہم ایسے تمام لوگوں سے کہنا چاہتے ہیں کہ اگر ان کی نظمیں، تحریریں یا تقریریں اور انشا سچائی اور حق کے فروغ کے لیے ہیں، اور وہ اس کے حق میں ثبوت یا دلیل رکھتے ہوئے حق کے حوالے سے، جب ان کی چھان پھٹک ہو اور زبانی دلائل کے ذریعے ان کی تحریروں کو کم درجہ قرار دیا جائے تو ان کا دفاع کرنے کی پوزیشن میں ہوں تو یقین کیجیے کہ انھیں نہ صرف فی الواقع شعرا، خطبا اور قانون ساز کہا جاسکتا ہے بلکہ ان کی زندگی کو پُرعظمت بنانے کے لیے کوئی بھی اعلیٰ نام دیا جاسکتا ہے۔

فیڈرس: آپ اس سے بلند تر کون سا نام ان کے لیے تجویز کرنا چاہتے ہیں۔

سقراط: میں انھیں صاحبِ حکمت (دانا یا حکیم) تو کہہ نہیں سکتا کیونکہ یہ نام صرف دیوتاؤں کے لیے مخصوص ہے البتہ ان کے لیے حکمت اور دانائی کے عاشق یعنی فلسفی کا نام بہت مناسب معلوم ہوتا ہے جو ان

کے لیے ایک معقول اعزاز ہے۔

فیڈرس: بالکل مناسب ہے!

سقراط: البتہ جو فرد خود اپنی تقریر سے خود کو بلند ثابت نہ کر سکے اور الہامی تسلسل کی بجائے ٹکڑے ٹکڑے کر کے تقریر کے حصوں کو جوڑے اور بار بار اس میں جمع تفریق اور کمی بیشی کر کے بصد مشکل تقریر مکمل کر پائے ان کے لیے نام (یا اعزاز) شاعر، تقریر نویس یا قانون ساز مناسب ہوگا۔

فیڈرس: بہت مناسب بات ہے۔

سقراط: اب جائیے اور اپنے دوست اور ساتھی کو یہ سب بتائیے۔

فیڈرس: مگر آپ کا بھی تو ایک دوست ہے۔ اسے کیوں نظر انداز کیا جائے۔

سقراط: وہ کون ہے؟

فیڈرس: وہ خوش شکل اور خوش خو آئیسوکریٹس (Isocrates) ہے۔ آپ اس کے لیے کیا پیغام دیں گے اور اس کی حیثیت کی وضاحت ہم کیسے کریں گے؟

سقراط: آئیسوکریٹس ابھی بہت کم عمر اور ناتجربہ کار ہے مگر فیڈرس، میں اس کے بارے میں ایک پیشین گوئی کرنا چاہتا ہوں۔

فیڈرس: مثلاً کون سی پیشین گوئی؟

سقراط: میرا خیال ہے اس میں وہ فطانت موجود ہو جو خطابت میں اسے لائسیاس سے کہیں زیادہ بلند مقام دلا سکتی ہے اور اس کے کردار کو ایک خوبصورت سانچے میں ڈھالنے میں مددگار ثابت ہو سکتی ہے۔ میں اپنی چشمِ تصور سے دیکھ رہا ہوں کہ اس کی صلاحیتیں عمر کے ساتھ ساتھ اور اُجاگر ہوں گی اور ایک وقت آئے گا کہ ماضی کے تمام ماہرینِ فنِ خطابت اس کے سامنے بونے نظر آئیں گے اور مجھے یہ بھی یقین ہے کہ وہ محض خطابت ہی پر اکتفا نہیں کرے گا بلکہ اپنے اندر فطری رجحانات کے طفیل وہ اس سے بہت آگے جائے گا اور زیادہ بلند مقام حاصل کرے گا۔ کیونکہ اس کی فطرت اور سرشت میں فلسفے کا عنصر واضح طور پر نظر آتا ہے۔ یہ وہ پیغام ہے جو دراصل یہاں مقیم دیوتاؤں کی طرف سے ہے اور میں یہ پیغام آئیسوکریٹس کو جو مجھے جان سے زیادہ عزیز ہے، خود پہنچاؤں گا البتہ آپ لائسیاس کو اس کا متعلقہ پیغام پہنچا دیجیے کیونکہ وہ آپ کی محبوب شخصیت ہے۔

فیڈرس: میں ضرور پہنچاؤں گا اور اب چونکہ دھوپ کی تپش تقریباً معدوم ہو چکی ہے، ہمیں چل دینا چاہیے۔

سقراط: کیا جدا ہونے سے قبل ہمیں مقامی دیوتاؤں اور مقدس ہستیوں کے حضور دعائیہ کلمات نہیں عرض کر لینے چاہئیں۔

فیڈرس: ضرور! ضرور!

سقراط: اے عزیز از جان اور محبوب آپ اور دیگر دیوتاؤں، کہ اس جگہ پر آپ کا سایہ ہے مجھے روحانی اور باطنی حسن عطا کیجیے! اور میرے ظاہر اور باطن کو ہم آہنگ کر دیجیے مجھے صلاحیت عطا کیجیے کہ میں حکیم الطبع شخص کو ظاہری دولت سے بے نیاز ہو کر پہچان سکوں اور مجھے دولت (سونے) کی اتنی مقدار عطا کیجیے جس قدر کہ ایک معتدل مزاج شخص بلکہ صرف وہی اس کا متحمل ہو سکتا ہو اور بھی کچھ جو وہ آسانی سے لے جا سکتا ہے۔ میرا خیال ہے میرے لیے یہی دعا کافی ہے۔

فیڈرس: میرے لیے بھی اسی سب کچھ کی دعا کیجیے کیونکہ دوستوں کی تمام متعلقات مشترک ہونی چاہئیں۔

سقراط: آیئے اب چلیں۔
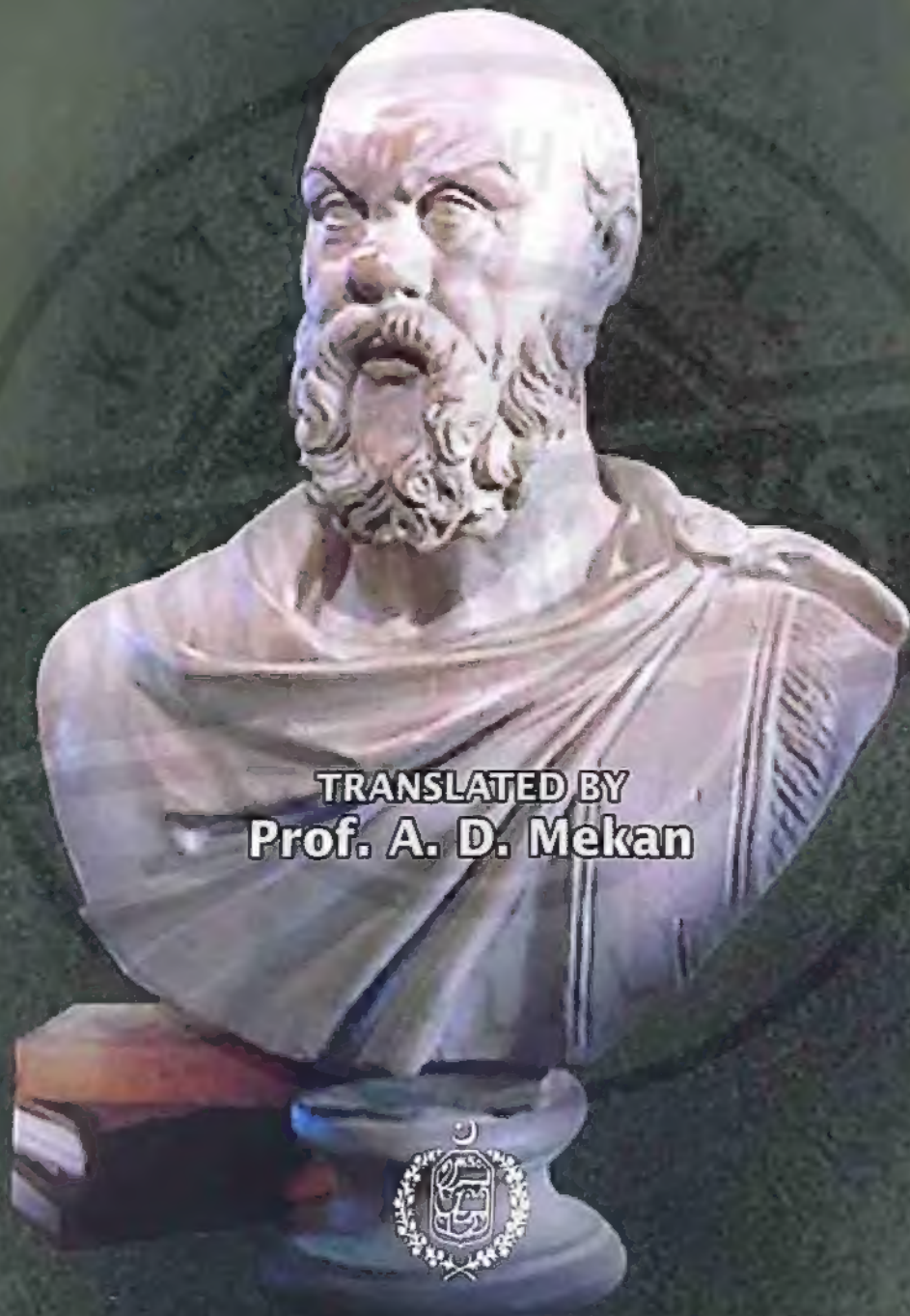
Makalmat-e-Aflatoon
(JILD AWWAL)
TRANSLATED BY
Prof. A. D. Mekan
NATIONAL LANGUAGE AUTHORITY
PAKISTAN